گرداب

اسماء قادری

PDFBOOKSFREE.PK

5

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل.....

جرم، افسر شاہی اور جاگیرداری کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دلچسپ داستان

گرداب

پنجم

اسماء قادری

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہترین کتابیں.....
جدید انداز اور معیار کے ساتھ
ناشر: محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل.....2015ء
مطبع.....نیر اسد پریس
کمپوزنگ.....القریش گرافکس
قیمت.....-/400روپے

''آپ ان پوائنٹس پر اپنے لوگ پہنچا دیں اور پھر انہیں ایکشن میں لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت
ا مالی سے پورے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیں گے اور وہاں سے ایک بھی فرد باہر نکلنے میں کامیاب
نہیں ہو سکے گا۔'' شیشے کی میز پر کراچی کا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا تھا اور اس نقشے کو درمیان میں رکھے ایک مرد اور
ورت ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت سنتھیا جوزف تھی جس کا حلیہ ماضی کی اس سنتھیا سے
بہت مختلف تھا جسے ڈاکٹر ماریہ کی ماں ہونے کی حیثیت سے شہریار کی ساس ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور وہ
والی عرصے تک پیر آباد میں رہ کر جنگل میں جاری افیون کی خفیہ کاشت کی نگرانی کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ
ایک استاد کے روپ میں معصوم ذہنوں میں زہر بھرنے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ تو پیر آباد والوں
کی قسمت اچھی نکلی کہ ماریہ کی حرکات شہریار کی نظر میں آ جانے کے بعد جہاں وہ اپنے انجام کو پہنچی، وہیں
سنتھیا کو بھی دوبارہ پیر آباد جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اگر پیر آباد کا کوئی باسی اس وقت اس پُرتعیش ڈرائنگ
روم میں بیٹھی سنتھیا کو دیکھتا تو اس کے لیے اسے شناخت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

پلاسٹک سرجری کے ذریعے کی جانے والی خدوخال کی تبدیلی سمیت بالوں کی رنگت اور انداز کی تبدیلی
نے اسے بالکل نئی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس نئی شخصیت کے اندر وہی پرانی دشمنی اور نفرت لیے وہ ایک
بار پھر اپنے مذموم ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میدانِ عمل میں تھی اور ایک معروف سیاست دان
کے ساتھ بیٹھی وہ کام انجام دے رہی تھی، جس کے لیے اسے لاہور سے کراچی بھجوایا گیا تھا۔

یہ معروف سیاست دان ریاض انور کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات
میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کرنے یا نہ کرنے، دونوں صورتوں میں ہمیشہ میدانِ سیاست میں ''اِن'' رہتا
تھا۔ اُس کی اس مقبولیت کے پیچھے جو سب سے بڑی وجہ نظر آتی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ ایک نیوٹرل، مخلص اور محبِ
وطن آدمی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جس کا ہر طرح کے فلاحی اور امدادی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ
لینا اس کا ایک اور پلس پوائنٹ تھا۔ لوگ اسے سیاست دان سے بھی زیادہ ایک فلاحی شخصیت کی حیثیت سے
جانتے اور پسند کرتے تھے اور اس وقت وہی ملکی فلاح و بہبود کا علمبردار سنتھیا کے مقابل بیٹھا ایک ایسے نقشے کی
طرف متوجہ تھا جس پر جابجا سرخ روشنائی سے گول دائرے بنائے گئے تھے۔ سنتھیا نے ان دائروں کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے ہی اس سے اپنی بات کہی تھی۔

''را'' کی پاکستان میں موجودگی کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ اپنی حرکات سے پاکستان کو
کمزور کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ہم افسروں اور سیاست دانوں کو پھانس کر ملکی رازوں کے حصول
سے لے کر خودکش حملوں اور لسانی فسادات تک سب کچھ کروانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ سنتھیا کو اس بار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراچی میں لسانی فساد کروانے کا مشن سونپا گیا تھا۔ مختلف قومیت کے لوگوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بیٹھا کراچی جسے بجا طور پر منی پاکستان کہا جاتا تھا، اس قسم کے فسادات کے لیے آئیڈیل تھا۔ فسادات کا آغاز کروانے کے لیے اس وقت سنتھیا نے جس علاقے کا انتخاب کیا تھا، وہاں ایک مخصوص زبان بولنے والوں کی اکثریت آباد تھی جن کی دوسری زبان بولنے والوں سے سیاسی کشمکش جاری رہتی تھی۔ اس کشمکش کو باقاعدہ لڑائی کا رنگ دے کر وہ لوگ کراچی کے امن کو آسانی سے تہس نہس کر سکتے تھے کیونکہ ایک بار لسانی فسادات پھوٹ پڑتے تو پھر اس کا سلسلہ طویل ہوتا چلا جاتا اور اس سلسلے کو طویل کرنے کے لیے بھی ''را'' کی طرف سے کمک ملتی رہتی۔ ''را'' کو اس قسم کے کاموں کو انجام دینے کے لیے زیادہ مشکل اس لیے پیش نہیں آتی تھی کہ ان کے پاس بہت سے ایسے وظیفہ خوار موجود تھے جو سوئس بینکوں میں بڑھتے ہوئے اپنے بینک بیلنس کے عوض کتنی ہی معصوم اور بے گناہ زندگیوں کو بھینٹ چڑھا سکتے تھے۔

''ڈونٹ وری میڈم! میں کام کے آدمیوں کو ان جگہوں پر پہنچا کر پورے علاقے کی ناکہ بندی کروا دوں گا اور آپ دیکھیں گی کہ کوئی انسان تو کیا، چڑیا کا بچہ بھی یہاں سے زندہ باہر نہیں نکل سکے گا۔''

''کوشش کرنا کہ یہاں رہنے والوں کا باہر کی دنیا سے رابطہ کٹ کر رہ جائے۔ اس علاقے کی ٹیلی فون لائنز اور موبائل سگنلز بند کرنے کا بھی انتظام کر لینا تاکہ وہ لوگ بُری طرح بلبلا اُٹھیں اور انتقاماً خود بھی ہتھیار ہاتھوں میں اٹھا لیں۔'' اس نے ایک اور ہدایت جاری کی۔

''علاقے کی لینڈ لائن بند کرنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے البتہ موبائل سروس کو مکمل طور پر بلاک کرنا تھوڑا مشکل ہوگا اور ہم جزوی طور پر ہی یہ کام کر سکیں گے۔ البتہ اس سے بڑھ کر دو کام اور کیے جا سکتے ہیں۔ اوّل علاقے کی الیکٹرک سپلائی روک دی جائے گی، دوسرے واٹر ہائیڈرنٹس بھی بند کر دیئے جائیں گے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ گھروں میں رہنے والے لوگ اس کارروائی سے کتنی بری طرح چراغ پا ہوں گے، آپ خود بعد میں ملاحظہ کر لیں گی۔'' وہ گھر کا بھیدی تھا جو اچھی طرح جانتا تھا کہ لوگوں کی کس رگ کو دبایا جائے تو کیا نتیجہ نکل سکتا ہے، اس لیے لنکا ڈھانے کا کام خوب اچھی طرح انجام دے رہا تھا۔

''گڈ۔ میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر تجویز ہے۔ پریشانی اور تکلیف کا شکار اہلِ علاقہ جب فون کالز اور میسجز کے ذریعے دوسرے علاقوں میں مقیم اپنے عزیز و اقارب کو اپنے حال سے آگاہ کریں گے تو پورے شہر بلکہ ملک میں بھونچال سا آ جائے گا اور لوگ ایک بار پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حکومتی ادارے ہمارے لیے بالکل ناکارہ ہیں۔ پھر احتجاجاً پولیس اور دیگر متعلقہ اداروں کے خلاف پُرتشدد احتجاج کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔'' وہ گویا تصور کی آنکھ سے یہ سب دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے میڈم! لیکن خیال رکھیے گا کہ اس ساری کارروائی پر بہت بڑی رقم خرچ ہوگی۔ کام کے بندے ہائر کرنے کے علاوہ معقول اسلحے اور گولہ بارود کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔''

''پہلے کب تمہیں رقم کے سلسلے میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے جو اب پریشان ہو رہے ہو؟ تم اپنا کام شروع کرو، رقم تمہیں مل جائے گی۔'' ریاض انور لالچی فطرت کا آدمی تھا جو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی رقم کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکا..... اور سنتھیا کو اس کا مطالبہ کرنا برا لگا تھا اس لیے سخت لہجے میں اسے جواب دیا۔

''کام تو میں چٹکی بجاتے میں کرا دوں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ کب اس کام کو کروانے کی خواہش مند ہیں؟'' اس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر ریاض انور نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔

''صرف دو دن بعد۔ کر لو گے نا تم دو دن میں سارا انتظام؟'' سنتھیا نے اسے جانچتی نظروں سے

دیکھا۔

''بالکل ہو جائے گا میڈم!'' ریاض انور نے اعتماد سے جواب دیا۔

''کارروائی میں حصہ لینے والے بندے کام کے ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جدید اسلحہ تو فراہم کر دیں لیکن ان لوگوں کو اس کا استعمال ہی معلوم نہ ہو۔ اس آپریشن میں ہم ایسا اسلحہ استعمال کروانا چاہتے ہیں جو یہاں کی پولیس اور رینجرز نے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح پبلک کو یہ خاموش میسج جائے گا کہ ان کے تحفظ کے ذمے دار ادارے کتنے ناکام اور نااہل ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر ریاض انور کو ہدایت کی۔ اس آپریشن پر ''را'' کو جتنا خرچ کرنا پڑتا، اس حساب سے وہ نتائج حاصل کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔ آپس میں لڑتی ہوئی عوام اور بے بھروسہ حکومتی ادارے ان کے جذبہ نفرت کی تسکین کے لیے اہم تھے اس لیے سب سے زیادہ زور اسی پر دیا جا رہا تھا۔ سنتھیا جو درحقیقت ''موساد'' کی ایجنٹ تھی اور ''را'' میں رہ کر بھی ''موساد'' سے وفاداری نبھاتی رہتی تھی۔ اس آپریشن کے لیے سو فیصد ''را'' سے مخلص و متفق تھی کیونکہ وفاداری چاہے کسی سے بھی نبھائی جاتی، مشن دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو کمزور سے کمزور تر کر کے اسے ایک ناکام ریاست ثابت کرنا۔

''اس بات کی آپ فکر ہی نہ کریں میڈم! میرے پاس ایسے ایسے کام کے بندے ہیں کہ عام ہتھیار تو کیا، ایٹم بم کو بھی آپریٹ کر سکتے ہیں۔ یہاں کی پولیس اور رینجرز ان کے آگے کیا بیچتی ہے، اگر آرمی بھی مقابلے پر آ جائے تو منہ کی کھا کر جائے گی۔'' ریاض انور اپنی اہلیت ثابت کرنے کے احمقانہ حد تک پُرجوش ہو گیا۔ لیکن سنتھیا کو ان مقامی ایجنٹوں سے جو کہ دراصل اپنی زمین کے غدار ہوتے تھے، نمٹنے کا طویل تجربہ تھا۔ اس لیے ریاض انور کی شیخی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی اور پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کل ہمارا ایک اہم بندہ کراچی پہنچ رہا ہے۔ اس کی تربیت پر ہم نے بڑا روپیہ اور وقت خرچ کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جب وہ ہمارے لیے کام کرنا شروع کرے گا تو ہر طرف تہلکہ مچا کر رکھ دے گا۔ میں اس بندے کو تمہارے پاس بھجواؤں گی۔ تم اس کارروائی کے لیے اس سے بھی مشورہ کر لینا۔''

''ٹھیک ہے میڈم!..... جیسی آپ کی مرضی۔ اگر آپ مجھ پر مکمل اعتماد کرنے میں حرج سمجھتی ہیں تو میں آپ کے نمائندے کے مشوروں پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' کسی دوسرے آدمی کی آمد کا سن کر ریاض انور کا منہ لٹک گیا۔ وہ لالچی آدمی اس حد تک بدطینت تھا کہ مادرِ وطن کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے بھی ہیرا پھیری کرنے سے باز نہیں آتا تھا جن سے دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے جو مشن سونپا جا رہا ہے، اس پر کتنی بڑی لاگت آئے گی۔ اس لاگت کو مزید بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کے بعد وہ اچھی خاصی رقم مار سکتا تھا لیکن کسی دوسرے بندے کی موجودگی کے باعث یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ مایوس ہو گیا۔

''دل برداشتہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دوسرے آدمی کی شمولیت کا فیصلہ تم پر عدم اعتماد کی وجہ سے نہیں بلکہ معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر کیا ہے۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانچ لیں گے کہ وہ آدمی ہمارے لیے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تم بہرحال یہ اطمینان رکھو کہ وہ تمہارے سر پر مسلط نہیں رہے گا بلکہ تمہارے انڈر میں کام کرے گا۔'' سنتھیا نے اسے اطمینان دلایا۔

''تھینک یُو میڈم!'' ریاض انور خوش ہو کر بولا۔ ''میں آپ کے اعتماد پر پورا اُترنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔'' غیر ملکی آقا کے تلوے چاٹتے ریاض انور کو کہیں دور تک بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ

ایک ملک دشمن کے اعتماد پر پورا اُترنے کا وعدہ کرتے ہوئے لاکھوں لوگوں کے اعتماد کا خون کر رہا ہے جو اسے کسی ہیرو کی طرح سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور اس کی بے تحاشا عزت کرتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''آپ کو اتنے سال بعد وطن واپس آ کر کیسا لگ رہا ہے؟'' شوخ رنگ کے لباس میں میک اَپ کے جملہ لوازمات سے لیس چلبلی سی رپورٹر نے اس سوال کے ساتھ مائیک کا رخ سلیم عرف سلّو کی طرف کیا تو اس نے پہلے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نروٹھے پن سے بولا۔

''ظاہر ہے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہاں میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار ہیں جن سے مل کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔''

''آپ کی خوشی میں ہمارا چینل بھی شریک ہے اور پورے پاکستان کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن دیکھئے نا، یہ پورا ملک بھی تو آپ کے لیے ایک فیملی کی طرح ہی ہے اس لیے ہم اپنے چینل کے ذریعے آپ کی اس فیملی کے افراد کی آپ سے ملاقات کروانا چاہتے ہیں۔''

زیرک رپورٹر نے فوراً ہی سلّو کی بے رخی کو بھانپ لیا اور چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت دینے لگی۔ اصل میں جب سے سلّو اور اس کے ساتھ بھارت سے آنے والے دوسرے پاکستانی قیدیوں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، نیوز چینلز کے نمائندے کسی بھوت کی طرح ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اور اب یہ رپورٹر اپنے کیمرہ مین کے ساتھ اس کی جھگی میں بھی چلی آئی تھی جس کی حالت گزرے برسوں میں اور بھی ابتر ہو گئی تھی اور غریب والدین اس جھگی سے بھی زیادہ خستہ حال نظر آتے تھے۔

بھارتیوں کی تربیت کے نتیجے میں اینگری ینگ مین بن جانے والا سلّو گھر اور ماں باپ کی حالت دیکھ کر مزید برانگیختہ ہو گیا تھا اور اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں سے نفرت مزید گہری ہو گئی تھی۔ اب یہ نیوز رپورٹر اسے بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ پاکستان کے سارے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں تو اس کے یقین کرنے کا سول ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کا مؤقف تھا کہ اگر کسی کو اس کا خیال ہوتا تو اس کی زندگی کے اتنے بہت سارے سال بھارت کی سرزمین پر نہ گزرتے اور اس کی رہائی کی کوشش کی جاتی یا پھر کم از کم اس کے ماں باپ کا ہی کوئی پرسانِ حال ہوتا جو غربت اور بیٹے کی جدائی کے غم میں وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس نے زبان سے اپنا یہ مؤقف ظاہر نہیں ہونے دیا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میرے وطن کے لوگ میری رہائی پر خوش ہوں گے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے لیکن حکومت کا کام ہے کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہو جانے والے ماہی گیروں کی خبر گیری کرے اور انہیں اتنے سال بھارتی جیلوں میں سڑنے نہ دے۔ کیونکہ جب روزی کی تلاش میں جانے والا ماہی گیر گرفتار ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے اس کے گھر والے بھوک سے مرنے لگتے ہیں۔'' سلّو کے لہجے میں کرب سا تھا۔

''یہ شخص اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہا ہے۔ ہماری حکومت نے کبھی بھی اور کہیں بھی پھنسے ہوئے اپنے شہریوں کی مدد کے لیے کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کیا ہے۔ ایسے میں انسان کے دل میں شکایت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔'' ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھے جاوید علی نے سلّو کا جواب سن کر تبصرہ کیا۔

''یہ صرف شکایت نہیں ہے جاوید! یہ اس نفرت کا بہت معمولی سا اظہار ہے جو بھارتیوں نے اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل و دماغ میں بھر دی ہے۔ تم اس شخص کی آنکھوں کو غور سے دیکھو۔ ان میں کتنی نفرت اور زہر بھرا ہوا ہے۔''

جاوید علی کے قریب ہی بیٹھے عادل خان نے جوابی تبصرہ کیا تو وہ قائل ہونے والے انداز میں خاموش ہو گیا اور توجہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر لی جہاں رپورٹر سلّو سے نیا سوال کر رہی تھی۔

''یہ بتائیں کہ بھارت میں آپ کا وقت کیسا گزرا؟ کیا انتہائی کم عمر ہونے کے باوجود وہاں کی جیل میں آپ پر سختی کی گئی؟''

نیوز رپورٹر وہ سوالات کر رہی تھی جو سلّو کی شخصیت کو کھول کر سامنے لانے میں مدد دے سکیں۔ یہ سوال نامہ اسے کہیں اور سے مرتب شدہ حالت میں ملا تھا۔ دراصل سلّو کے اس مختصر سے انٹرویو کے پیچھے سی ایف پی کا ہاتھ تھا۔ اس انٹرویو کا انتظام کثیر المقاصد نتائج کے حصول کے لیے کیا گیا تھا۔ پہلا مقصد تو سلّو کی ذہنی گرہوں کو سامنے لانا تھا، دوسرے میڈیا کے گھیرے میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی جگہ پر محدود رہنے پر مجبور تھا اور فوری طور پر اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسرے بھارت کی طرف سے جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ماہی گیروں کی رہائش کو ایک بڑی خبر بنا دینے کے نتیجے میں سلّو کا چہرہ ملک بھر کے عوام کے لیے ایک دم ہی شناسا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اگر وہ کہیں کسی تخریبی کارروائی میں ملوث پایا جاتا تو اس بات کا بہت امکان تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے شناخت کر لے گا۔ اگر وہ اپنی شناخت میں تبدیلی کر کے کسی کارروائی میں حصہ لینا چاہتا تو اس کے لیے اسے کچھ مہلت درکار ہوتی۔ بہرحال، یہ سارے احتیاطی اقدامات تو صرف اس لیے کیے گئے تھے کہ اگر کبھی خدانخواستہ سلّو سی ایف پی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو اس پر گرفت کرنے کے لیے کوئی تو سبیل بنے ورنہ تو اسے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی خفیہ نگرانی میں لے لیا گیا تھا۔

''بھارت میں میرا وقت اس حساب سے بہت تکلیف میں گزرا کہ میں اپنے گھر والوں سے دور تھا اور ہر لمحہ مجھے ان کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ لیکن جہاں تک جیل میں مجھ پر سختی یا تشدد کی بات ہے تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ کم عمری کی وجہ سے مجھے بڑی رعایت دی جاتی تھی۔ کھیل اور تفریح کے مواقع بھی ملتے تھے۔ لیکن قید تو بہرحال قید ہوتی ہے، جسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں خوش ہوں کہ بھارت نے خیر سگالی کے اظہار کے لیے مجھے اور میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی آزاد کر دیا ہے۔ ورنہ معلوم نہیں ہمیں اور کتنے سال وہاں رہنا پڑتا۔''

سلّو کے لب و لہجے سے بھارت کے لیے شکر گزاری ٹپک رہی تھی جو خاصی معنی خیز تھی ورنہ اس سے قبل جو بھی لوگ بھارتیوں کی قید سے آزاد ہو کر آئے تھے، وہ وہاں کی جیلوں میں خود پر روا رکھے گئے ظلم و ستم کا ہی ذکر کرتے تھے۔ بھارتی سورما بے ضرر و غریب ماہی گیروں پر بھی تفتیش کے نام پر ایسا ظلم و ستم کرتے تھے جیسے انہوں نے کسی بڑے دہشت گرد کو گرفتار کر رکھا ہو۔ غربت کے مارے یہ عام سے لوگ ان مظالم سے بے حد بری حالت کو پہنچ جاتے تھے اور اکثر کا تو ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا تھا۔

''یہ دیکھو، اسے کہتے ہیں برین واشنگ۔ مجھے یقین ہے کہ واقعی وہاں اس لڑکے کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہوگا۔ لیکن صرف اس لیے کہ بعد میں اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔'' عادل خان نے دانت بھینچتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اتنی زبردست طریقے سے برین واشنگ کی گئی ہے کہ یہ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے کے باوجود چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا۔'' جاوید علی نے اس سے اتفاق کیا۔

ادھر ٹی وی اسکرین پر اب سلّو کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی دکھایا جا رہا تھا اور رپورٹر ان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کے تاثرات معلوم کر رہی تھی۔

برسوں کے بعد بیٹے کی شکل دیکھنے والے والدین اسے سامنے پا کر اتنے خوش تھے کہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بار بار رونے لگتے تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے جاوید علی کو اپنے دل میں گہرا تاسف محسوس ہوا۔ سلیم عرف سلّو جس حالت میں اور جن ارادوں کے ساتھ پاکستان آیا تھا، اس کا انجام اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ اپنے انجام کو پہنچتا تو برسوں بعد خوشی کی شکل دیکھنے والے اس کے والدین پر کیا گزرتی۔ جاوید علی کو لگا کہ اگر اسے سلّو کے وجود میں گولیاں اُتارنے کا کام انجام دینا پڑا تو ایک بار تو ضرور ہی اس کا ہاتھ کانپ جائے گا۔ صرف اور صرف ان دو بوڑھوں کی وجہ سے جو آج خوش تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟' اپنی سوچوں میں گھرے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ٹی وی اسکرین پر چلنے والا منظر بدل چکا ہے اور سلّو کے انٹرویو پر مشتمل رپورٹ کے اختتام پر چینل کے نیوز روم سے دوسری خبریں نشر کی جانے لگی ہیں۔

''کچھ نہیں سر!..... بس اس شخص کا چہرہ اپنے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔'' اس نے عادل خان کے سامنے اپنے اصل احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے بصد اصرار خود عادل خان کے اس مشن میں شمولیت کی خواہش ظاہر کی تھی۔ عادل خان اُس کی فٹنس کی وجہ سے تشویش کا شکار تھا اس لیے بہت مشکل سے راضی ہوا تھا اور وہ بھی اس شرط پر کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ رہ کر حالات پر نظر رکھے۔ فیلڈ میں اُسے اُتارنے یا نہ اُتارنے کا فیصلہ وہ خود بعد میں اپنی صوابدید پر کرے گا۔ مشکل سے راضی ہونے والے عادل خان کے سامنے سلّو کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے نرم گوشے کا اظہار کر کے وہ خود کو اس مشن سے ڈراپ کر دیئے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں ابھی ہسپتال میں موجود شازمین کا زخم زخم وجود اور اس کا آخری خط بالکل تازہ تھا اور بھارتی سورماؤں سے وطنِ عزیز کی خاطر ٹکرانے کے جذبے کے ساتھ ذاتی انتقام کی تپش بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ تپش اتنی شدید تھی کہ وہ اب کبھی بھی نہ تو خود چین سے بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی بھارتیوں کو بیٹھنے دے سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

''بیٹھو نوجوان! تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ عام طور پر میں اتنی رات گئے کسی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن تم سے ملاقات ایسی جگہ سے طے کی گئی تھی کہ میرے لیے وقت کی کمی کے پیش نظر انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔''

قیمتی سگار منہ میں دبائے ریاض انور نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اسے بیٹھنے کی پیشکش تو ضرور کی لیکن یہ جتانا ضروری سمجھا کہ وہ بے وقت آیا ہے۔

''مجھے بھی شوق نہیں ہے کہ ہر ایرے غیرے سے ملتا پھروں۔ اوپر والوں کا آرڈر تھا، اس لیے ادھر آ گیا ہوں۔ ورنہ دن بھر الا بلا چینل والوں کو بھگتاتے بھگتاتے دماغ پکی ہو گیا ہے۔ اوپر سے آرڈر نہیں ہوتا تو اس وقت اپن بھی آرام سے اپنے گھر میں سو رہا ہوتا۔'' نوجوان نے اس کے رعب میں آئے بغیر کسی لاگ لپٹ کے بغیر جواب دیا۔

''میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔'' ریاض انور اس کا انداز دیکھ کر ذرا محتاط ہوا۔ ''گزرے چند برسوں میں اتنے چینلو کھلے ہیں کہ ان کے نام بھی یاد رکھنا پڑتا ہے۔ ذرا جو کسی کو نظر انداز کر دو تو وہ ناطقہ بند کر دیتا

ہے۔ ہم سیاست دان تو ان کا خصوصی ٹارگٹ ہیں لیکن وہ صرف ہمارے متعلق کتنی خبریں دیں گے؟ اس لیے جو بھی ایشو سامنے آ جائے، اسے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تم بھی اسی لیے گھیر لیے گئے۔'' اپنے تبصرے کے اختتام تک اس کا لہجہ بے حد دوستانہ ہو گیا۔ وہ موقع پرست آدمی تھا اس لیے ضرورت کے مطابق اپنا لب و لہجہ تیزی سے بدل لیا کرتا تھا۔ نوجوان کے تیور دیکھ کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ دبنے یا رعب میں آنے والا بندہ نہیں ہے اس لیے اس سے دوستانہ رویہ رکھ کر ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

''کام کی بات کرو۔ ٹائم بچے گا تو اپن تھوڑی دیر سو بھی لے گا۔'' نوجوان نے جو جواب دیا، اسے سن کر ریاض انور کو احساس ہوا کہ اس کا کسی وکھری ٹائپ بندے سے واسطہ پڑ گیا ہے اس لیے گلا کھنکھارتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تمہارے میرے درمیان دو طرح کے معاملات ڈسکس ہونے ہیں پہلا معاملہ سیدھا اور مختصر ہے۔ مجھے تمہیں کسی معقول جگہ ملازمت دلوانے کا کہا گیا ہے۔ یہ کام سمجھو کہ ہو گیا۔ کل میں میڈیا پر اس سلسلے میں اعلان کرنے کے ساتھ تمہارے لیے مالی امداد کا بھی اعلان کر دوں گا۔''

ریاض انور اسے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ اُس کے اس عمل کو کتنا سراہا جائے گا۔ لوگ تعریف کریں گے کہ برسوں بعد بھارتی جیل سے آزاد ہو کر آنے والے نوجوان کا کسی کو خیال آیا تو صرف ریاض انور کو ورنہ حکومت سے کسی کو کوئی اچھی اُمید تھی ہی نہیں۔

''ٹھیک ہے، دوسری بات بولو۔'' نوجوان جو کہ سلّو تھا، اس پر ریاض انور کی مہربانی کا مطلق اثر نہیں ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ملازمت یا مالی امداد کا اعلان کوئی بھی کرے، اصل ادائیگی تو اسے اس کے وہی آقا کریں گے جنہوں نے اس کے اندر نفرت اور لالچ بھر کر میدان میں اُتارا تھا۔

''دوسرے معاملے میں تمہیں میری مدد کرنی ہو گی۔'' ریاض انور نے لہجہ دھیما کر کے اسے جواب دیا اور پھر وہ نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا جس پر جا بجا سنتھیا نے سرخ دائرے بنا رکھے تھے۔ نقشے کی مدد سے وہ سلّو کو سمجھانے لگا کہ وہ وہاں کس قسم کی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس بار سلّو سنجیدہ ہو گیا اور پورے انہماک سے اس کی بات سننے لگا۔

''اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟'' تفصیل سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔ جواب میں ریاض انور اسے بتانے لگا کہ اس کے پاس کون کون سا اسلحہ کتنی تعداد میں موجود ہے۔

''اسلحے کی پوزیشن ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ ہی نائٹ ویژن گاگلز اور دھوئیں کے بموں کا انتظام بھی کر لینا تاکہ ہمارے آدمی اپنا کام صحیح طور پر مکمل کر لینے کے ساتھ ساتھ وہاں سے آسانی سے نکل بھی سکیں۔'' اس نے مشورہ دیا اور پھر مذکورہ علاقے کے ایک ایک چپے کے بارے میں اس طرح ہدایات دینے لگا کہ ریاض انور بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

سلّو کی گفتگو سن کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ نہایت کم عمری میں یہاں سے چلا جانے کے بعد ابھی واپس آیا ہے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ان گلی کوچوں میں ہی کھیل کود کر بڑا ہوا ہے۔ دراصل اُسے دورانِ تربیت پاکستان کے مختلف شہروں کے بارے میں بہت تفصیل سے معلومات ذہن نشین کروائی گئی تھیں۔ خصوصاً بڑے شہروں کا تو مکمل نقشہ اُسے ازبر تھا اس لیے اس وقت وہ ریاض انور سے بڑے اعتماد سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے نقشے میں مزید دو ایسے مقامات کو نشان زد کیا تھا، جنہیں سنتھیا نظر انداز کر گئی تھی۔ مقامات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ کن مقامات پر کس قسم کا اسلحہ اور کن صلاحیتوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے افراد کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ غرضیکہ وہ گفتگو کے اختتام تک ریاض انور کو بری طرح متاثر کر چکا تھا اور وہ قائل ہو گیا تھا کہ سنتھیا نے اسے یونہی سلّو سے ملاقات اور مشورے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''کل تین منی ٹرکس اس علاقے میں قائم چیریٹی اسکول کے لیے میری طرف سے فرنیچر، کتابیں اور اسٹیشنری وغیرہ لے کر جائیں گے۔ ان ٹرکوں میں ہی ہم ضروری اسلحہ بھی منتقل کر دیں گے۔ میری ساکھ ایسی ہے کہ کوئی بھی ان ٹرکس کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی بعد میں یہ شک کیا جائے گا کہ اس کام میں میرا ہاتھ تھا۔'' سلّو کے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا تو اس نے اطمینان سے سر ہلایا اور ایک دو مزید مشورے دینے کے بعد جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس آپریشن میں اس کی حیثیت فقط ایک مشیر کی سی تھی اور اس میں براہِ راست حصہ نہیں لے رہا تھا کیونکہ شروع کے چند دن اسے اس کے عزیز و اقارب کے ساتھ گزارنے کی اجازت دی گئی تھی۔ البتہ اس دوران اسے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہوئے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہنا تھا۔

⊛----✪----⊛

''ہیلو آفتاب!..... آج اتنی دیر سے جا رہے ہو؟'' وہ دو تین موٹی موٹی کتابیں سنبھالے لائبریری سے باہر آ رہا تھا کہ لارا سے ٹکراؤ ہو گیا جس نے اسے دیکھتے ہی خوش خلقی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

لارا تقریباً چوبیس پچیس سال کی ایک قبول صورت اور سنجیدہ مزاج لڑکی تھی جو اس لائبریری میں ہی ملازمت کرتی تھی اور یہیں مطالعے کی غرض سے مستقل آنے والے آفتاب کی اس سے دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ لارا کے سنجیدہ مزاج اور وسیع معلومات نے اس دوستی کو گہرا کرنے میں خاصی مدد دی تھی اور کبھی کبھار وہ دونوں فرصت ملنے پر ساتھ بیٹھ کر کافی یا موسم کی مناسبت سے کوئی دوسرا مشروب پی لیا کرتے تھے۔

''آج کام کچھ زیادہ تھا اور مجھے ہر حال میں اسے آج ہی نمٹانا تھا اس لیے میں زیادہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بس اب گھر ہی جا رہا تھا۔'' آفتاب نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

''تو پھر میرے ساتھ ہی چلو۔ میں بھی گھر ہی جا رہی ہوں۔'' لارا نے اسے پیشکش کی۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب کے پاس اپنی ذاتی سواری موجود نہیں ہے اور حُسنِ اتفاق سے وہ آفتاب کے برابر والے اپارٹمنٹ میں ہی مقیم تھی۔ یہ حُسنِ اتفاق بھی دراصل ان کی دوستی کا ہی نتیجہ تھا۔ اپنے موجودہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے سے قبل آفتاب، کشور کے ساتھ جس اپارٹمنٹ میں مقیم تھا، اس کا کرایہ کافی زیادہ تھا جبکہ سہولیات قدرے کم۔ اس پر مستزاد اس کی لینڈ لیڈی خاصی نک چڑھی عورت تھی جو ہر ہفتے کرایہ وصول کرنے خود آتی تھی اور ساتھ ہی اپارٹمنٹ کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد کوئی نہ کوئی اعتراض کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

اُس کا یہ روّیہ آفتاب سے زیادہ کشور کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنتا تھا۔ ایک دن لارا کے ساتھ کافی پیتے ہوئے اُس نے اُس سے اپنی لینڈ لیڈی کے روّیے کا ذکر کرتے ہوئے کسی اور معقول اپارٹمنٹ کی تلاش کا ذکر کیا تو لارا نے اسے اپنے پڑوس کا اپارٹمنٹ خالی ہونے کی اطلاع دی۔ یوں وہ اور لارا لائبریری کے دوست کے ساتھ ساتھ پڑوسی بھی بن گئے۔ کشور کو ان دونوں کی دوستی کا علم تھا لیکن لارا کے باوقار انداز نے اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے وہ اس دوستی پر معترض نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے خوش ہی تھی کہ اسے نیویارک جیسے شہر میں ایک معقول پڑوسن میسر آ گئی ہے۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ سچ پوچھو تو مجھ میں ہمت بھی نہیں تھی کہ اتنا تھکا ہوا ہو کر طویل واک کر سکوں۔

اپنے کام کا کچھ حصہ مجھے آج ہی گھر جا کر بھی مکمل کرنا ہے۔''

آفتاب نے اسے جواب دیا اور خوش خوش اس کے ساتھ ہو لیا۔ گاڑی میں لائبریری میں ان کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کا راستہ چند منٹوں کا ہی تھا۔ ان چند منٹوں میں ان دونوں کے درمیان کوئی قابل ذکر گفتگو نہیں ہوئی۔ بس لارا نے اس سے کشور اور اُمید کی خیریت دریافت کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ فرصت ملنے پر وہ لوگ کسی ڈِیک اینڈ پر ساتھ گھومنے چلیں گے۔ آفتاب نے بھی اُس کے اس پروگرام کی تائید کی۔ اتنی دیر میں وہ لوگ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ پارکنگ میں گاڑی روکنے کے بعد وہ دونوں لفٹ کی مدد سے چھٹی منزل پر پہنچے اور پھر لارا اسے ''بائے'' کہتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ میں گھس گئی۔ اس نے بھی اپنے اپارٹمنٹ کا رخ جہاں کشور نے اُمید کو گود میں تھامے اس کا استقبال کیا۔ آفتاب کو اپنی ساری تھکن سیکنڈ میں دُور ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتابیں ایک ریک میں رکھ کر فوراً ہی اُمید کو گود میں لے لیا اور اسے خوب پیار کرنے لگا۔ وہ بھی باپ کی گود میں آ کر خوب قلقاریاں مارنے لگی۔

''آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔'' باپ بیٹی کو آپس میں لاڈ کرتے دیکھ کر کشور نے آہستہ سے شکوہ کیا۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ آج کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جائے گی۔ وہ تو شکر ہے کہ واپسی میں لارا مل گئی اور اس کی گاڑی میں آنے کی وجہ سے میرا تھوڑا سا وقت بچ گیا۔'' اس نے امید کے ساتھ لاڈ کو جاری رکھتے ہوئے کشور کو جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ میری فیلنگز کو سمجھ سکتے ہیں۔ جب سے مراد بھائی کے گھر پر ابا جی سے سامنا ہوا ہے، میں بے حد خوف زدہ ہو گئی ہوں اور ہر وقت یہی لگتا ہے کہ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ جائیں گے۔'' اس نے بے چارگی سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ اب بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ چودھری صاحب کتنے ہی غصے والے سہی، نیویارک کی حدود میں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ نتیجے میں وہ خود بھی برے انجام کو پہنچ سکتے ہیں۔'' آفتاب مطمئن تھا اور اسے بھی دلاسا دے رہا تھا۔

''میں ابا جی کو آپ سے بہتر جانتی ہوں آفتاب! وہ ہم دونوں کو قبر میں پہنچانے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔'' کشور اُس کی تسلی کے باوجود خوف زدہ تھی۔

''اور میرا ایمان ہے کہ طے شدہ وقت سے پہلے ہمیں کوئی بھی قبر میں نہیں پہنچا سکتا اس لیے میں آپ کو ایک بار پھر یہی مشورہ دوں گا کہ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور جلدی سے کھانا لگائیں۔ بھوک سے اس غریب کی جان نکلی جا رہی ہے۔'' اس نے کشور کی ناک دباتے ہوئے جان بوجھ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

''کھانا تیار ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں اتنی دیر میں ٹیبل پر کھانا لگاتی ہوں۔'' حسبِ توقع وہ پچھلا موضوع بھول کر اس کے کھانے کی فکر میں مبتلا ہو گئی اور آگے بڑھ کر امید کو بھی اس کی گود سے لے لیا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد آرام دہ شلوار قمیض پہن کر ٹیبل پر پہنچا تو کھانا لگ چکا تھا۔ اس نے نہایت رغبت سے کھانا شروع کر دیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کشور کی کوکنگ کافی بہتر ہوتی جا رہی تھی اور وہ اچھا خاصا کھانا بنانے لگی تھی لیکن اس سے قبل جب وہ ڈھنگ کا کھانا نہیں بناتی تھی، تب بھی آفتاب اس کا پکایا ہوا کھانا اسی رغبت سے کھاتا تھا کہ کہیں کشور کی دل آزاری نہ ہو۔

وہ محلوں میں رہنے والی شہزادی جس نے کبھی تنکا بھی دہرا نہیں کیا تھا، جب اس کی خاطر اس کی محبت میں اپنا لائف اسٹائل بدل کر اتنی مشقت اُٹھا رہی تھی تو کیا وہ ذرا سا بد ذائقہ کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ اور اب تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کشور کی یہ خامی بھی خاصی حد تک دُور ہو گئی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ ایک بار پھر اپنا کام لے کر بیٹھ گیا۔ کشور امید کو اس کے کھلونوں کے ساتھ مصروف کر کے کچن سمیٹنے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ اُمید کو لے کر بیڈ روم میں آئی اور اسے سلاتے سلاتے خود بھی نیند کی وادی میں اُتر گئی۔ اپارٹمنٹ میں چونکہ ایک ہی کمرہ تھا، اس لیے آفتاب کو بیڈ روم میں ہی اپنا کام کرنا پڑتا تھا۔ کشور اور امید کے سو جانے پر اس نے لائٹیں بند کر دیں اور خود ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرنے لگا۔ کام مکمل ہو گیا تو اس نے فوراً ہی انٹرنیٹ کی مدد سے اسے پاکستان میل کر دیا۔ یہ سارا کام کرتے ہوئے وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ کوئی معمولی سی آواز پیدا ہو کر کشور اور امید کی نیند میں خلل ڈالنے کا سبب نہ بنے۔

احتیاط کے پیشِ نظر اس نے اپنا موبائل بھی سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خود بھی سونے کے ارادے سے بیڈ کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی جس کی اسکرین روشن تھی اور کال آنے کا اشارہ مل رہا تھا۔ اس نے اتنی رات گئے کسی کے کال کرنے پر حیرت محسوس کرتے ہوئے موبائل اُٹھا لیا۔

اسکرین پر لارا کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ چونک گیا۔ لارا کبھی بھی اسے اتنی رات کو فون نہیں کرتی تھی اور فون کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہے۔

''ہیلو لارا! ..... خیریت تو ہے؟..... تم نے اتنی رات گئے کیوں کال کی ہے؟'' لارا کی طرف سے تشویش میں مبتلا اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''کہاں تھے تم؟ ..... میں کتنی دیر سے کال کر رہی تھی۔ تم شدید خطرے میں ہو۔ دو افراد تمہارے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور معلوم نہیں کیا کر رہے ہیں۔'' لارا نے چیخنے والے لہجے میں اس سے کہا تو وہ گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا۔

فوراً ہی اُس کی نظر ایک نیلگوں دھوئیں پر گئی جو کی ہول کے ذریعے آہستہ آہستہ اندر داخل ہو کر اپارٹمنٹ میں پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ دھواں کسی بے ہوش کر دینے والی دوا پر مشتمل تھا یا کسی زہریلی گیس کی مدد سے انہیں ہمیشہ کی نیند سلانے کا انتظام کیا جا رہا تھا، وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکاسی کا واحد راستہ وہی دروازہ ہے جس سے اندر دھواں پھینکا جا رہا تھا اور دوسری طرف یقیناً کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو کسی صورت انہیں باہر نہیں نکلنے دیتے۔ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ لیکن کوئی ترکیب سجھائی نہیں دی۔ اُلٹا پریشانی میں اسے یہ بھی دھیان نہیں رہا کہ موبائل فون اب تک اس کے کان سے لگا ہوا ہے اور دوسری طرف لارا ہنوز موجود ہے۔

موبائل کان سے لگائے وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں کی ہول سے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتی دھوئیں کی پتلی سی لکیر کو دیکھ رہا تھا جو یقینی طور پر انہیں ضرر پہنچانے کے لیے ہی تھی۔ اگر یہ دھواں فلیٹ میں بھر جاتا تو اندر موجود سب کی زندگی کے لالے پڑ جاتے۔

مسئلہ یہ تھا کہ اس مہلک دھوئیں سے خود کو اور اپنی بیوی، بچی کو بچانے کے لیے وہ باہر کیسے نکلے۔ اپارٹمنٹ کے خارجی دروازے پر تو وہ لوگ موجود تھے جو اس دھوئیں کو اندر داخل کر رہے تھے اور اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کے باہر نکلنے کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔

''آفتاب! تم کیا کر رہے ہو؟..... جلدی کرو۔ اُمید اور کشور کو لے کر بالکنی میں پہنچو۔ وہاں سے تم لوگ

میری بالکنی میں آ سکتے ہو۔''

بے خیالی میں کان سے لگے فون پر اس نے لارا کی چیختی ہوئی تیز آواز سنی تو ہوش میں آیا اور تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

اُمید اور کشور ابھی تک حالات سے بے خبر گہری نیند میں تھے۔ اس نے کشور کا بازو تھام کر زور سے ہلایا تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

''کک..... کیا ہوا؟''

''جلدی سے بالکنی میں چلو۔ باہر خطرہ ہے۔'' اس نے سوئی ہوئی اُمید کو گود میں اٹھاتے ہوئے کشور سے کہا تو اس کے سارے حواس ایک دم بیدار ہو گئے۔ مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں چودھری سے ہونے والے ٹکراؤ کے بعد سے اس کے دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ اس کا ضدی اور انا پرست باپ اسے یہاں بھی سکون سے نہیں رہنے دے گا اور اس کا یہ خدشہ مختصر مدت میں سچ بن کر سامنے آ گیا تھا۔

سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے آفتاب کے پیچھے بالکنی کا رخ کیا۔ لارا اور ان کے اپارٹمنٹ کی بالکونیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ درمیان میں دیوار موجود تھی۔ دیوار کے اُس طرف موجود لارا اپنی بالکنی پر جھکی اس طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آفتاب نے اُمید کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس طرف لٹکایا کہ لارا اُسے پکڑ سکے۔ لارا کو اُمید کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے میں ایک لمحہ ہی لگا ہو گا لیکن اُس ایک لمحے میں کشور کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ خدانخواستہ اگر لارا سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہو جاتی اور وہ اُمید کو پکڑنے میں ناکام رہتی تو وہ معصوم بچی کئی منزل نیچے پختہ سڑک پر جا گرتی اور اس صورت میں اس کا کیا حشر ہوتا۔ بہرحال خیر گزری اور بچی بخیر و عافیت دوسری طرف پہنچ گئی۔

اس کے بعد آفتاب اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے چند فٹ اونچی بالکنی کی دیوار پر چڑھنے میں مدد دینے لگا۔ دوسری طرف لارا اُس کی مدد کے لیے تیار تھی۔ اس نے اُمید کو نیچے فرش پر بٹھا دیا تھا جس کے زار و قطار رونے کی آواز کشور کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ نرم گرم بستر سے نکالے جانے اور اپنے اپارٹمنٹ سے دوسرے اپارٹمنٹ میں منتقلی کی کارروائی سے وہ بیدار ہو چکی تھی۔

آفتاب کے ہاتھ کا سہارا لیے بالکنی کی دیوار پر کھڑی کشور نے لارا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامنے سے قبل یونہی ایک نظر نیچے کی طرف ڈالی اور ڈگمگا کر رہ گئی۔ اگر اس کا پاؤں پھسل جاتا تو آج اور ابھی قصہ تمام ہو جاتا۔

''کم آن کشور!..... ہری اپ۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ تاکہ میں تمہیں سہارا دے سکوں۔'' لارا نے اسے پکارا لیکن نیچے گر جانے کا خوف اتنا شدید تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکی۔

''ہمت کرو کشور! دیکھو اُمید رو رہی ہے۔ اوھر جا کر اسے چپ کرواؤ۔'' آفتاب نے اُس کی کیفیت بھانپ لی تھی چنانچہ ایسی بات کہی کہ وہ اپنے خوف کو پیچھے چھوڑ کر لارا کی بالکنی میں چھلانگ لگانے کے لیے آمادہ ہو سکے۔ واقعی اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ کشور نے نیچے، بہت نیچے موجود زمین سے نظریں ہٹائیں اور لارا کی بالکنی کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں لارا ہاتھ آگے بڑھائے اس کی منتظر تھی جبکہ اُمید کی وہ صرف آواز سن سکتی تھی۔ بالکنی کے فرش پر بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یک دم ہی اس کی مامتا تڑپ اُٹھی کہ وہ اپنی روتی ہوئی بیٹی کو اپنی بانہوں میں بھر کر چپ کروا سکے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس خواہش نے ہر خوف کو پیچھے چھوڑ دیا اور اس نے اپنی بالکنی سے لارا کی بالکنی کی طرف پیش قدمی کی۔ اتنی بلندی سے ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کا فاصلہ طے کرنا آسان نہیں تھا، وہ بھی ایک گھریلو عورت کے لئے۔ آفتاب کے سہارے کے باوجود وہ اس کوشش میں ڈگمگا سی گئی اور یوں لگا کہ ابھی نیچے جا گرے گی لیکن دوسری طرف موجود لارا نے فوراً ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ادھر آفتاب بھی اسے سہارا دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار وہ سنبھل گئی اور کسی نہ کسی طرح لارا کی بالکنی میں اُترنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کوشش میں وہ موسم کی خنکی کے باوجود پوری کی پوری پسینے میں بھیگ گئی تھی لیکن فی الحال اسے اپنی حالت کی فکر بھی نہیں تھی۔ بالکنی میں اُترتے ہی وہ فرش پر بیٹھ کر روتی اُمید کی طرف بڑھی جو اس بے وقت کی بے آرامی کے باعث گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ اس کے پیچھے آفتاب بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

''اندر چل کر بیٹھو۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ وہ لوگ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔'' تینوں کے بخیریت نکل آنے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے لارا نے کہا تو وہ لوگ بالکنی سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔ لارا اور ان کا اپارٹمنٹ ایک جیسا تھا۔ بالکنی سے وہ پہلے اس کے بیڈ روم میں پہنچے اور پھر وہاں سے گزر کر لاؤنج میں آ گئے۔ لاؤنج میں پہنچنے کے بعد باہر سے سنائی دیتی آوازوں سے انہیں اندازہ ہوا کہ جس دوران وہ لوگ اپنی زندگیاں بچانے کی کوشش کر رہے تھے، نیویارک کی تیز رفتار پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔ ان آوازوں کو سن کر آفتاب نے بیٹھنے کے بجائے دروازے کی طرف پیش قدمی کی اور ڈور آئی سے جھانک کر باہر کا منظر دیکھنا چاہا۔ عین اسی وقت ڈور بیل بج اُٹھی۔ آفتاب کو ڈور آئی سے دوسری طرف کھڑا پولیس مین صاف نظر آ رہا تھا اس لیے اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے دروازہ کھول دیا۔

''مس لارا کلائیو؟'' اسے دیکھتے ہی پولیس والے نے استفسار کیا۔

''میں لارا کلائیو ہوں سر!'' لارا تیزی سے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اس مختصر مدت میں آفتاب دیکھ چکا تھا کہ کئی پولیس والے دو تنومند سیاہ پوشوں کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوئے تھے اور لفٹ تیزی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

''آپ کی کال پر ہم نے ایکشن لے کر مجرمین کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا ہے۔ آپ کے برابر والے اپارٹمنٹ میں ہماری ٹیم ریسکیو آپریشن کر رہی ہے جبکہ میں آپ کا بیان لینے یہاں آیا ہوں۔'' پولیس آفیسر نے مہذب لہجے میں اس سے کہا۔

''شیور آفیسر! آپ اندر آ جائیں۔'' لارا نے قانون سے تعاون کرنے والے ایک اچھے شہری کی طرح خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے اسے اندر آنے کی پیشکش کی۔

''یہ میرے پڑوسی مسٹر آفتاب، ان کی مسز اور بیٹی ہیں۔ انہیں خطرے میں دیکھ کر میں نے ان تینوں کو بالکنی کے راستے اپنی بالکنی میں اُتروا لیا تھا۔'' لاؤنج میں پہنچ کر اس نے تعارف کروایا تو پولیس آفیسر کی نظروں میں اس کے لیے تحسین اُتر آئی۔

''گڈ!..... آپ ایک ذہین خاتون ہیں۔'' اس نے فوراً ہی اس کی تعریف کی۔ جواباً لارا صرف دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی جبکہ پولیس آفیسر واکی ٹاکی کی مدد سے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے لگا کہ جن لوگوں کو ریسکیو کی جانے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ حفاظت سے برابر کے اپارٹمنٹ میں موجود ہیں۔ اس کال سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارے ماہرین آپ کے اپارٹمنٹ کا معائنہ کر کے اپنی رپورٹ تیار کریں گے۔ اس دوران آپ

تینوں مجھے اپنا بیان ریکارڈ کروا دیں۔ سب سے پہلے میں مس لارا کلائیو کا بیان لوں گا کیونکہ انہوں نے ہی پولیس کو کال کیا تھا۔''

''میں رات دیر تک جاگ کر مطالعہ کرنے کی عادی ہوں اس لیے ابھی تک جاگ رہی تھی۔'' لارا نے فوراً ہی اپنا بیان ریکارڈ کروانا شروع کر دیا۔

''ہماری اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا کیئر ٹیکر انتھونی بھی مطالعے کا بہت شوقین ہے اور چونکہ میں ایک لائبریری میں ملازمت کرتی ہوں، اس لیے کتابوں کے حصول کے لیے انتھونی اکثر مجھ سے رابطہ کرتا ہے۔ آج رات جب میں سونے کی تیاری کرنے لگی تو مجھے یاد آیا کہ انتھونی کے پاس لائبریری کی ایک کتاب موجود ہے اسے کل واپس کرنا ضروری ہے۔ میں نے سوچا کہ انٹرکام پر انتھونی سے رابطہ کر کے کہہ دوں کہ صبح آف کر کے جانے سے پہلے کتاب مجھے واپس کر جائے۔ لیکن میرے نمبر ملانے پر اس نے انٹرکام نہیں اٹھایا اور یہ ایک تشویش ناک بات تھی۔ انتھونی کے ساتھ ڈیوٹی پر ایک دوسرا سکیورٹی گارڈ رابرٹ بھی موجود ہوتا ہے۔ اگر انتھونی کسی ضرورت کے تحت اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا تو رابرٹ کو انٹرکام اٹھانا چاہئے تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ لیکن پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے میں نے سوچا کہ ایک بار خود جا کر جائزہ لے لوں کہ واقعی گڑبڑ ہے یا دونوں گارڈز غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس خیال کے تحت میں باہر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچی تو مجھے لگا کہ باہر کوئی موجود ہے۔ میں نے ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے دو نقاب پوش اپنے پڑوسی مسٹر آفتاب کے دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے ایک جھک کر کی ہول پر کچھ کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اندر جا کر پولیس کو کال کی اور پھر مسٹر آفتاب کو ان کے موبائل پر کال کر کے خطرے سے آگاہ کیا۔ میرے مشورے پر ہی یہ لوگ بالکنی کے ذریعے میرے اپارٹمنٹ میں آ گئے اور ہم سب آپ کے سامنے ہیں۔'' بات کے اختتام پر لارا نے اس طرح شانے اچکائے جیسے اب اس کے پاس مزید بتانے کے لیے کچھ نہ ہو۔

''ویل مسٹر آفتاب! آپ بتائیں کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے آپ کو آپ کی فیملی کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی؟..... آپ جانتے ہیں کہ اگر مس کلائیو ہمیں کال نہ کرتیں تو آپ لوگ سونے کے دوران اس زہریلی گیس کا شکار ہو جاتے جو ان دونوں نے کی ہول کے راستے اچھی خاصی مقدار میں آپ کے اپارٹمنٹ میں داخل کر دی تھی اور اب فرار کی تیاری میں تھے۔''

لارا کا بیان مکمل ہو جانے کے بعد پولیس آفیسر نے رُوئے سخن آفتاب کی طرف کر لیا اور اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں آفیسر! میں نے تو ان میں سے کسی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔'' آفتاب نے خود کو مکمل انجان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''وہ دونوں کون تھے، یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ وہ دونوں سگے بھائی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھاری معاوضے پر کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ لیکن دونوں اتنے چالاک ہیں کہ جرم کر کے کبھی بھی اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑتے۔ اور ظاہر ہے پولیس صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر انہیں گرفتار نہیں کر سکتی۔ موجودہ سچویشن میں آپ اور پولیس دونوں اس اعتبار سے خوش قسمت رہے کہ آپ ان کا شکار ہونے سے بچ گئے اور پولیس کو پہلی بار انہیں ثبوتوں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑنے کا موقع مل گیا اور اس کا سارا کریڈٹ ان خاتون کو جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف بروقت پولیس کو انفارم کیا بلکہ آپ کو آپ کے اپارٹمنٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نکالنے میں بھی مدد دی۔'' پولیس آفیسر نے ایک بار پھر لارا کو سراہا۔ پھر یک دم بہت زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب آپ بتائیں، آپ کی کس سے اتنی شدید دشمنی ہے کہ اس نے بھاری معاوضہ دے کر خطرناک کرائے کے قاتلوں کے ذریعے آپ کو قتل کروانے کی کوشش کی؟

آفتاب اس بار خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس کا ایک ہی جانی دشمن ہے لیکن وہ شخص اس کی عزیز بیوی کا باپ تھا اور وہ اس کے خلاف پولیس کو مطلع کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔

''ہمارا دشمن میرا سگا باپ ہے آفیسر!'' بالکل اچانک ہی خاموش بیٹھی کشور نے اپنے لب کھولے اور آفتاب کو مشکل سے نکال دیا۔ پولیس آفیسر فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مکمل تفصیلات حاصل کر چکا تھا، مع اس معلومات کے کہ کشور کا باپ چودھری افتخار عالم شاہ ان دنوں نیویارک میں ہی اپنے بیٹے مراد شاہ کے ساتھ مقیم ہے۔ ساری تفصیلات حاصل کرنے کے بعد پولیس آفیسر ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چند ہدایات دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''امید کو آرام سے کاؤچ پر لٹا دو۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔'' پولیس آفیسر کے جانے کے بعد لارا نے کشور سے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس ساری کارروائی کے دوران اُمید ماں کی بانہوں کی گرمی پا کر ایک بار پھر سو چکی تھی۔ اس معصوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا میں آنے سے قبل ہی وہ ایک ایسی دشمنی کے چکر میں پھنس گئی ہے جس کے باعث اس کی جان کو ہر دم خطرہ لگا رہتا ہے اور وہ ہر بار محض اپنی خوش قسمتی کی بنیاد پر بچ جاتی ہے۔

آپ نے پولیس آفیسر کے سامنے چودھری صاحب کا نام لے کر بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ وہ آپ کے والد ہیں، اگر وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو آپ کو یقیناً اچھا محسوس نہیں ہوگا۔''

تنہائی میسر آتے ہی آفتاب نے اس سے کہا۔ وہ جو اُمید کو کاؤچ پر لٹا کر خود اس کے قریب ہی بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی، ایک پل کے لیے ساکت ہو گئی پھر اسی زاویے پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ابا جی جیسے بھی ہیں، میرے دل میں ان کے لیے ایک فطری محبت موجود ہے۔ اگر معاملہ صرف میری زندگی کا ہوتا تو میں کبھی بھی پولیس آفیسر کے سامنے ان کا نام نہیں لیتی لیکن آپ کی اور اُمید کی زندگی کی قیمت پر میں کسی صورت میں ایک بیٹی کی حیثیت سے ان سے محبت نہیں نبھا سکتی۔ ان کے اتنے حملوں کے بعد اب انہیں بھی تھوڑی پریشانی میں مبتلا کرنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر وہ ایک باپ کی شفقت سے کام لیتے تو کبھی بھی اس حد تک نوبت نہیں آتی کہ مجھے انتخاب کی اس مشکل سے گزرنا پڑتا کہ اپنے انتہائی قریبی رشتوں میں سے کس کو بچانے کی کوشش کروں۔''

اس کی آواز دُکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے آفتاب افسردہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کشور کو اپنی بانہوں میں بھر لے لیکن لارا کی متوقع آمد کے باعث یہ بھی نہ کر سکا۔ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں رہنے کے باوجود وہ اپنی مشرقی روایات کی پاسداری کی کوشش کرتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ کشور کی شرم و حیا اس آزادی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اپنے اپارٹمنٹ کی تنہائی میسر آنے میں ابھی کچھ تاخیر تھی۔ کیونکہ پولیس آفیسر جاتے جاتے انہیں انفارم کر گیا تھا کہ ماہرین کو شواہد اکٹھا کرنے اور اپارٹمنٹ کو گیس کے اثرات سے پاک کرنے کے لیے کچھ مہلت درکار ہے۔ اس عرصے کے لیے لارا نے بخوشی انہیں اپنے پاس رُکنے کی پیشکش کر دی تھی اور ایک اچھے میزبان کی طرح خاطر مدارات کے لیے بھی کمربستہ ہو گئی تھی۔

''میں نے انتھونی کو کال کر کے اس کی خیریت معلوم کی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ حملہ آوروں نے بالکل اچانک ہی ان کے کیبن میں گھس کر اسے اور رابرٹ کو بے بس کر دینے کے ساتھ ساتھ کسی ایسی دوا کا اسپرے کر دیا تھا کہ وہ دونوں فوراً ہی بے ہوش ہو گئے۔ کیونکہ پولیس والوں نے انہیں ہسپتال منتقل کر دیا تھا۔ وہاں انہیں ہوش میں لایا گیا۔ انتھونی نے امید ظاہر کی ہے کہ صبح تک اسے اور رابرٹ کو چھٹی دے دی جائے گی اور اس عرصے میں دو سارجنٹ ان کی جگہ ڈیوٹی پر موجود رہیں گے۔''

لارا ٹرے میں کافی کے تین مگ اور تلی ہوئی مونگ پھلیاں لے کر واپس لاؤنج میں آئی تو اس کے پاس ان کے لیے کچھ اور خبریں بھی موجود تھیں ورنہ پولیس آفیسر نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ سکیورٹی گارڈز کی موجودگی کے باوجود وہ دونوں کرائے کے قاتل اندر کیسے گھسے تھے۔ کافی کے ساتھ مونگ پھلیاں ٹونگتے ہوئے وہ تینوں اس واقعے کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔

اس گفتگو کے دوران پہلی بار آفتاب نے اسے اپنی اور کشور کی شادی کا قصہ بھی سنایا جسے سن کر وہ حیران ہوتی رہی کہ دنیا میں ایسے پسماندہ ممالک بھی ہیں جہاں شادی جیسا اہم اور ذاتی رشتہ جوڑنے کے لیے بھی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اور اگر کوئی کسی طرح اپنی مرضی کر گزرے تو بارسوخ والدین اس حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں جس کا مظاہرہ اس نے کچھ دیر قبل دیکھا تھا۔ آفتاب اور کشور نے بہت کوشش کی کہ اُس کے اس تاثر کو کم کر سکیں لیکن جو کچھ وہ عملی طور پر دیکھ چکی تھی، اس کے بعد زبانی صفائیوں پر یقین کرنا ذرا مشکل ہی تھا۔

⊛----✪----⊛

سلّو کے ساتھ ساتھ ریاض انور کی نگرانی کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن دونوں ہی کی طرف سے کوئی غیر معمولی اطلاع موصول نہیں ہو رہی تھی۔ ریاض انور اپنی معمول کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھا جس میں زیادہ تر فلاحی نوعیت کی تھیں۔ اس نے کراچی کے ایک پسماندہ علاقے میں قائم کردہ اسکولوں کے لیے بڑی تعداد میں ضروری اشیاء فراہم کی تھیں اور جس دوران اس کے ملازمین بھرے ہوئے ٹرکوں سے سامان اُتارتے رہے تھے، وہ ایک غیر رسمی اور غیر اعلانیہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے عوام کو یہ یقین دلاتا رہا تھا کہ اس کے سینے میں ان کے اور ان کے بچوں کے لیے کتنا درد ہے۔

مسجدوں سے کیے گئے اعلان کے نتیجے میں جمع کیے گئے علاقہ مکین کھلے میدان میں کھڑے دلجمعی سے اس کی یہ تقریر سن رہے تھے۔ تقریر کے دوران ریاض انور کے ایک گارڈ نے اس کے سر پر چھتری تان کر اسے دھوپ سے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر اس گارڈ کو چھتری سمیت پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر تم میرے سامنے کھڑے تمام افراد کو چھتریاں مہیا کر سکتے ہو تو تب تو ٹھیک ہے لیکن میں اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتا کہ میرے بھائی میرے سامنے دھوپ میں کھڑے ہوں اور میں اکیلا اپنے لیے سائے کا بندوبست کر لوں۔ لوگ اُس کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور دیر تک تالیاں پیٹ کر اسے سراہتے رہے تھے۔

دوسری طرف سلّو نے دوبارہ ریاض انور سے رابطہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ کسی سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بالکل کسی عام فرد کی طرح جو برسوں بعد اپنے خاندان سے ملتا ہے، ان لوگوں میں مگن ہو گیا تھا۔ اس کے والدین نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس کی چچا زاد سے جو کہ اُس کی بچپن کی منگ تھی، باقاعدہ اُس کی منگنی کریں گے۔ اس منگنی کے بہانے وہ سلّو کی واپسی کا جشن منانا چاہ رہے تھے۔ غریبوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنیا میں منائے جانے والے اس سادہ سے جشن میں ایک بار پھر اس رپورٹر کو پہنچا دیا گیا تھا جس سے سلّو کی آمد پر اس سے انٹرویو کیا تھا۔ اس رپورٹ میں سلّو کی کم عمر اور خوب صورت منگیتر کو بھی دکھایا گیا تھا۔ اپنے طبقے کی دُلہنوں کی طرح عام سی تیاری کے باوجود وہ نوخیز لڑکی بہت حسین لگ رہی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ خود سلّو بھی اس کے ساتھ خاصا جچ رہا تھا۔ نیوز چینل پر اس منگنی کے متعلق مختصر سی رپورٹ ختم ہوتے ہی ایک بریکنگ نیوز نشر کی جانے لگی۔

یہ خبر شہر کے اسی پسماندہ علاقے سے متعلق تھی جہاں دن میں ریاض انور نے اسکولوں کے لیے امدادی سامان پہنچانے کے علاوہ خود موقع پر پہنچ کر تقریر بھی کی تھی۔ خبر کے مطابق علاقے میں زبردست فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور حملہ آوروں نے اس راستے کو مکمل طور پر بلاک کر دیا تھا جس کے ذریعے علاقے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ شر پسندوں کے خلاف کارروائی کے لیے جانے والی پولیس ٹیم کی ایک جیپ کو راکٹ لانچر کی مدد سے اُڑا دیا گیا تھا جبکہ دوسری جیپ پر ہینڈ گرنیڈ سے حملہ ہوا تھا۔ ان دو مہلک اور جان لیوا حملوں کے بعد پولیس والے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے تھے اور دُور دُور سے ہی فائرنگ کرتے رہے تھے۔ ان کی فائرنگ سے حملہ آوروں کا کچھ بھی نہیں بگڑنے والا تھا۔ بلکہ وہ ہر برسٹ کا جواب دُگنی قوت سے دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے پاس اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے بے دریغ استعمال کرتے ہوئے انہیں اس کے ختم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

اس خبر نے شہریار کو بے پناہ مضطرب کر دیا تھا۔ سلّو کی آمد کے ساتھ ہی اس ہنگامے کا آغاز ہو گیا تھا جس کی توقع کی جا رہی تھی لیکن ظاہری طور پر سلّو اس سے بالکل الگ تھلگ نظر آ رہا تھا۔ اس کارروائی سے اس کا جو واحد تعلق جوڑا جا سکتا تھا، وہ رات گئے ریاض انور سے کی جانے والی ملاقات تھی۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جس علاقے میں ریاض نے صبح تقریر کی تھی، اس وقت وہ گولیوں اور دستی بموں کی زوردار آوازوں سے گونج رہا تھا۔

''صبح ریاض انور نے اسکولوں کے لیے جو سامان بھجوایا تھا، یقیناً اسی سامان کی آڑ میں اسلحہ اور دہشت گرد علاقے میں داخل کیے گئے ہیں۔'' جاوید علی نے خبر سن کر فوری تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''یقیناً یہی بات ہے۔ بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس علاقے میں ریاض انور کا جتنا عمل دخل ہے، اس نے لازماً وہاں کوئی ایسا ٹھکانہ بنا رکھا ہوگا جہاں اسلحہ وغیرہ ذخیرہ کیا جا سکے۔ کیونکہ یہ جتنی شدت کی کارروائی ہے اس کے لیے صرف دو تین گاڑیوں میں دوسرے سامان کی آڑ میں چھپا کر لے جایا گیا اسلحہ کافی نہیں ہو سکتا۔'' جاوید علی کی بات سن کر اس نے اپنا اندازہ بھی بیان کیا۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ریاض انور اور سلّو دونوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے ان کے جسموں کو گولیوں سے چھید ڈالے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ خون کی ہولی شروع کروانے والے ان دونوں مجرموں کے خلاف ان کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ دوسری طرف نیوز چینل پر مسلسل اس واقعے کے بارے میں خبریں دی جا رہی تھیں۔ ان خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ علاقے میں بجلی کی سپلائی معطل ہو گئی ہے جبکہ فون کی لینڈ لائن بھی کام نہیں کر رہیں۔ کئی علاقہ مکینوں نے موبائل فونز کی مدد سے نیوز چینلز سے رابطہ کر کے بتایا تھا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔

چنگاریوں کی طرح اُڑتی گولیاں ان کے گھروں میں آ کر گر رہی تھیں اور لوگ اپنے گھروں میں محصور ہو جانے کے باوجود ان گولیوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ لیکن صورتِ حال ایسی تھی کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ ساتھ ایمبولینس اور امدادی ٹیموں کا بھی علاقے تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ علاقے

کو جانے والی سڑک پر جمع ہونے والے مختلف چینلز کے نمائندے بھی ایک خاص فاصلے تک محدود رہنے پر مجبور تھے اور لائیو کوریج میں صرف چلنے والی گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں سناتے ہوئے ہیجانی لہجوں میں عوام کو بدلتے حالات سے باخبر کر رہے تھے۔

''انہوں نے تو تباہی مچا کر رکھ دی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ دشمن ملک کی فوج نے حملہ کر دیا ہو۔'' ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے جاوید علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی کو سب کچھ نہیں سمجھو۔ اصل فساد تو اس کے بعد کھڑا ہوگا۔ جس علاقے میں یہ سب ہو رہا ہے، وہاں ایک مخصوص قوم کے افراد زیادہ تعداد میں آباد ہیں اور ان کی ایک دوسری قوم سے رنجش چل رہی ہے۔ اب وہ اس حملے کا الزام اس دوسری قوم پر لگائیں گے اور شہر بھر میں لسانی فسادات پھوٹ پڑیں گے۔'' شہریار کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔ وہ سلّو کو کنٹرول میں کرنے کے لیے میدان میں اُترا تھا لیکن پہلے ہی مرحلے میں اس نے اپنی برتری واضح کر دی تھی۔ وہ صحیح طور پر ان کی نظروں میں بھی نہیں آیا تھا اور اتنا بڑا اپ سیٹ کر ڈالا تھا۔

''اگر پولیس کو ہائی الرٹ کر دیا جائے تو صورتِ حال کو سنبھالا جا سکتا ہے۔'' جاوید علی نے امید ظاہر کی۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہماری پولیس اتنی اہل نہیں ہے کہ جرم کو پہلے سے روکنے کے لیے اقدامات کر سکے۔ ویسے بھی ہم انہیں یہ ذمے داری نہیں سونپ سکتے۔ ہماری حدود مقرر ہیں اور ہمیں ان حدود میں رہ کر ہی اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہتے شہریوں کا خون بہتا ہوا بھی تو نہیں دیکھ سکتے۔'' جاوید علی جھنجلایا۔

''ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ برسوں بعد والدین کے پاس لوٹنے والے سلّو کو یک دم موت کے گھاٹ اُتار دینے میں مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ دوسرے میرے دل میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اگر ہم کسی طرح اس عفریت کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے تو دشمن کا ہتھیار خود اس کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں، ورنہ کسی کی کھوپڑی میں دو چھٹانک سیسہ اُتارنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ بھی اسی کے انداز میں سوچنے والا بندہ ہے۔ وہ خود بھی تو سلّو کے مارنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ صرف سلّو کے والدین کو دکھ سے بچانے کے لیے کتنی انسانی جانیں قربان کی جاتیں۔ اس کی لگائی گئی آگ میں جلنے والے بھی تو کسی نہ کسی گھر کے چشم و چراغ تھے جن کے والدین کا دکھ بھی ناقابلِ برداشت تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! واقعی سلّو کو مارنا کوئی مشکل بات نہیں ہے لیکن اسے کھلا چھوڑنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اسے یہاں ریاض انور جیسے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں سلّو سے زیادہ ریاض کا ہاتھ ہے، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ سلّو یہاں آتے ہی اتنی بڑی کارروائی کر گزرتا۔ یہاں آ کر اپنا سیٹ اپ بنانے میں اسے کچھ وقت تو لگنا چاہئے تھا۔''

''سیٹ اپ بنانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے اداروں کی نااہلی کی وجہ سے یہاں ''را'' کا بنا بنایا سیٹ اپ موجود ہے۔ ریاض انور اور سلّو جیسے مہروں کو اس بنے بنائے سیٹ اپ میں استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے جاوید علی کی بات کا جواب دیا پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے موبائل سیٹ پر مصروف ہوگیا۔

''بہت سختی اور ہوشیاری سے اس کی نگرانی کرو۔ چاہو تو اپنی نفری بڑھا لو۔ لیکن اسے کسی صورت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔'' جاوید علی جانتا تھا کہ وہ یہ ہدایات سلّو کی نگرانی کرنے والوں میں سے کسی کو دے رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی ہی کوئی ہدایت وہ ریاض انور کے سلسلے میں بھی دے گا لیکن خلافِ توقع اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

''اور ریاض انور.....؟'' آخر کار جاوید علی سے رہا نہیں گیا اور اس نے استفسار کیا۔

''ریاض انور اور سلّو کو ایک طرح سے ڈیل نہیں کیا جا سکتا۔ سلّو کو فیلڈ میں کام کرنے کے لیے ٹرینڈ کیا گیا ہے اس لیے اسے براہِ راست نگرانی کر کے پکڑا جا سکتا ہے۔ ریاض انور اس کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔ اس کے لیے مختلف حکمتِ عملی اختیار کرنی ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنا کوئی آدمی اس کی صفوں میں داخل کر دوں تاکہ وہ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف شواہد بھی جمع کر سکے۔'' اس نے جاوید علی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا جس سے اس نے بھی اتفاق کیا۔

پھر وہ دونوں ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے جہاں خدشات کے عین مطابق شہر کے مختلف حصوں میں بھڑک اُٹھنے والے ہنگاموں کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف سیاست دانوں کی طرف سے بیانات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ قوم کے نام نہاد ہمدرد اپنے اپنے انداز میں حکومت سے حالات کنٹرول میں کرنے کی اپیلیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں ریاض انور بھی شامل تھا جس نے بڑے پُر درد لہجے میں اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ لسانی تفریق کی بنیاد پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنا بند کر دیں اور صرف اور صرف پاکستانی بن کر سوچیں۔

⊛----✪----⊛

''آپ کا شک غلط نہیں تھا۔ پکڑے جانے والے ملزمان نے اعترافِ جرم کر لیا ہے۔ انہیں آپ کو آپ کی فیملی سمیت قتل کرنے کا کام آپ کے والد نے ہی سونپا تھا اور اس کے بدلے خطیر رقم ادا کی تھی۔ اگر اتفاق سے مس لارا کو سکیورٹی گارڈ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تو قاتل اپنا کام پورا کر ڈالتے۔ ہمارے ماہرین نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اس کے مطابق آلۂ قتل کے طور پر جس گیس کو استعمال کیا جا رہا تھا، وہ نہایت زہریلی ہے اور سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہونے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ آپ خوش قسمت تھے کہ اس مہلک گیس کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ میری طرف سے آپ کو نئی زندگی مبارک ہو۔''

وہ دونوں میاں بیوی اس وقت اپنے اپارٹمنٹ کے قریبی پولیس اسٹیشن میں موجود تھے جہاں انہیں فون کر کے بلایا گیا تھا اور اب وہ اسی آفیسر کے روبرو تھے، جس نے لارا کے اپارٹمنٹ میں ان تینوں کے بیانات لیے تھے۔ وہ اس کیس کا تفتیشی آفیسر تھا اور اپنی تفتیش کے بعد اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں انہیں قتل کرنے کی سازش کرنے والا کوئی اور نہیں، کشور کا سگا باپ چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔

''پھر آپ نے اس اصل مجرم کے خلاف کیا کارروائی کی؟'' کشور نے سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ آفیسر سے سوال کیا۔ نیویارک میں قیام کے دوران اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کو خاصا رواں کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ کافی ذہین لڑکی ہے جسے حویلی کی چار دیواری میں محدود رکھنے کے بجائے اگر حصولِ تعلیم

کے لیے باہر نکلنے کا موقع دیا جاتا تو وہ تعلیم کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتی۔

''افسوس کہ ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکے۔ وہ واردات سے کئی گھنٹے پہلے نیویارک سے نکل چکا تھا۔ ریکارڈ کے مطابق اس وقت وہ دبئی میں موجود ہے اور ظاہر ہے وہاں سے ہم اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔'' خوش اخلاقی سے پولیس آفیسر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے صاف گوئی سے جواب دیا۔ پولیس والا ہونے کے باوجود اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ پاکستان کے بجائے نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ کا حصہ تھا ورنہ ہماری پولیس کا جو طریقِ کار ہے، اس میں مجرم سے زیادہ مدعی کی درگت بن جاتی ہے اور وہ خود کو پولیس کے چکر میں پھنسانے کے بجائے انصاف کے حصول کے بغیر خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ جانے کو اپنے حق میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

''لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے ہیں۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ آپ کے بھائی مراد شاہ کی نگرانی کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس طریقے سے اس کیس میں کوئی پیش رفت ہو سکے۔'' اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پولیس آفیسر نے انہیں بتایا۔

''میرے بھائی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔'' کشور نے فوراً مراد شاہ کی صفائی پیش کی۔

''ہم پولیس والوں کی تربیت میں شامل ہے کہ ہم ہر شخص پر شک کرتے ہیں۔ آپ نے جو حالات بیان کیے تھے، ان کے مطابق ایک خیال یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ آپ کا بھائی بظاہر انجان بن کر آپ کے والد کی معاونت کر رہا ہو اور اسی نے پہلے جان بوجھ کر اپنے گھر میں آپ لوگوں کا سامنا کروایا ہو اور پھر آپ کا ایڈریس بھی آپ کے والد کو فراہم کر دیا ہو۔ اس طریقِ کار سے انہیں ایک فائدہ یہ حاصل رہے گا کہ ناکامی کی صورت میں اپنے بھائی سے رابطے میں ہونے کے باعث آپ لوگ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکیں گے اور انہیں دوبارہ حملہ کرنے میں آسانی رہے گی۔'' پولیس آفیسر نے ایک خوفناک خیال پیش کیا جسے سن کر کشور دہل گئی۔

''میں یقین نہیں کر سکتی کہ مراد بھائی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔'' وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑائی۔

''ہو سکتا ہے آپ کا یقین صحیح ہو لیکن ہم تو اپنے طریقِ کار کے مطابق ہی کام کریں گے۔ اس طرح کچھ نہیں تو اتنا فائدہ تو ہوگا کہ ہم آپ کے والد کی دوبارہ نیویارک میں آمد سے باخبر ہو سکیں گے۔'' پولیس آفیسر نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

''بہرحال فی الحال آپ لوگ محفوظ ہیں اور آرام سے اپنے اپارٹمنٹ میں رہ سکتے ہیں۔ کسی مسئلے کی صورت میں فوراً ہم سے رجوع کیجیے گا، ہم ہر ممکن طور پر آپ کی مدد کریں گے۔'' پولیس آفیسر کے یہ جملے اس بات کا اشارہ تھے کہ اس نے انہیں جس مقصد کے تحت بلایا تھا، وہ پورا ہو چکا ہے چنانچہ اب وہ وہاں سے جا سکتے ہیں۔

''تھینک یو آفیسر!'' آفتاب فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''آپ کا تعاون اور اچھا رویہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔''

پولیس آفیسر اُس کی بات کے جواب میں محض ذرا سا مسکرایا اور اس کا بڑھایا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''اگر شہری خود پولیس سے تعاون کریں تو پولیس زیادہ بہتر طریقے سے ان کی مدد اور حفاظت کر سکتی ہے۔ آپ ہوشیار رہیے گا۔ بے شک اصل شخص فرار ہو گیا ہے لیکن وہ دُور رہ کر بھی کرائے کے کسی قاتل کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوبارہ ہائر کرسکتا ہے۔'' پولیس آفیسر نے انہیں متنبہ کیا۔

''جو لوگ پکڑے گئے ہیں، ان کا کیا ہوا؟'' آفتاب کے ساتھ ہی کشور نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی اور اب وہ لوگ کھڑے کھڑے ہی پولیس آفیسر سے بات کر رہے تھے۔ پولیس آفیسر نے اپنی جگہ سے اُٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''وہ ہماری کسٹڈی میں ہیں۔ ان سے قانون کے مطابق نمٹا جائے گا۔ ان پر صرف آپ کے اپارٹمنٹ پر حملہ کرنے کا الزام نہیں ہے بلکہ ہمیں ان سے ان کے تمام اگلے پچھلے کارنامے اُگلوانے ہیں۔ اس کے بعد ہی عدالت ان کے لیے کسی مناسب سزا کا فیصلہ سنا سکے گی۔''

پولیس آفیسر نے جواب دیا اور اپنے سامنے رکھی ایک فائل کھول کر اس میں مصروف ہو گیا۔ یعنی اب اس کے پاس کسی سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں تھی۔ کشور اور آفتاب وہاں سے باہر نکل آئے۔

''کیا واقعی مراد بھائی، ابا جی سے ساز باز کر سکتے ہیں؟'' باہر آ کر کشور نے اُلجھے ہوئے انداز میں آفتاب سے استفسار کیا۔

''بظاہر تو وہ ایسے نہیں لگتے لیکن کسی بھی انسان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے بھی بعض لوگ زہر کے بجائے مٹھاس سے مارنے کے قائل ہوتے ہیں۔ کیا معلوم تمہارے بھائی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہو۔'' آفتاب نے محتاط الفاظ میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''لیکن مراد بھائی ایسے نہیں ہیں۔ مجھ سے تو وہ سب بہنوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ میرے خلاف اتنی بڑی سازش کریں۔'' کشور اب بھی بے یقینی کا شکار تھی۔

''میں خود بھی اس سلسلے میں آپ پر زور نہیں دینا چاہتا۔ لیکن بعض معاملات ایسے ہیں جنہوں نے مراد بھائی کو مشکوک بنا دیا ہے۔ اگر ہم ان کے اپارٹمنٹ میں چودھری صاحب سے ہونے والے ٹکراؤ کو اتفاق تسلیم کر لیں، تب بھی یہ اُلجھن اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ چودھری صاحب کو ہمارے اس اپارٹمنٹ کا پتہ کس طرح چلا جہاں ہم رہ رہے ہیں۔ حقائق کیا ہیں، یہ تو وقت کے ساتھ سامنے آ جائیں گے لیکن فی الحال ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے نرمی سے کشور کو سمجھایا تو وہ قائل ہونے والے انداز میں سر ہلانے لگی پھر شکوہ کرنے والے انداز میں بولی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ ابا جی ہمیں دیکھ کر نچلے نہیں بیٹھیں گے اور وہی ہوا۔ جانے انہوں نے کیسے ہمارا پتہ حاصل کیا اور کرائے کے قاتلوں کو دوڑا دیا۔ خود وہ مزے سے دبئی جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن مجھے آفیسر کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہم پر دوبارہ حملہ ضرور کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم ایک بار پھر اپنی موجودہ جگہ سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں اور مراد بھائی کو بھی اس جگہ سے آگاہ نہ کریں۔'' وہ دونوں کیب میں بیٹھ چکے تھے اور ڈرائیور کے نقش و نگار سے اس کی قومیت کا اندازہ لگانے کے بعد اطمینان سے اُردو میں بات چیت کر رہے تھے۔

''میرے دل میں بھی یہ خیال تھا لیکن صرف اس لیے زبان پر نہیں لایا کہ بار بار کی نقل مکانی آپ کے لیے ذہنی اُلجھن کا باعث بنتی ہے۔''

''کوئی بات انسان کو کتنی ہی ناگوار گزرے لیکن وہ اپنے نصیب سے تو نہیں بھاگ سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ہمارے نصیب میں یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی لکھ دی گئی ہے۔ آپ بتائیں، آپ کے ذہن میں نیویارک سے نکل کر کہاں جانے کا خیال ہے؟'' کشور نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں جب یہاں آ رہا تھا تو شہریار صاحب نے مجھ سے اپنے ایک دوست مصطفیٰ خان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا ایڈریس دیا تھا۔ مصطفیٰ خان آرلینڈو میں رہتا ہے۔ بڑی پُرسکون اور قدرتی نظاروں سے مالا مال جگہ ہے۔ لیکن میں نے صرف اس خیال سے رہائش کے لیے نیویارک کا انتخاب کیا تھا کہ گنجان آبادی والے بڑے شہروں میں خود کو گم کر لینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب قسمت ہی گرداب میں پھنسی ہو تو تدبیریں اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں۔'' موجودہ صورتِ حال نے اسے بھی تھوڑا سا اُداس کر دیا تھا۔ گزشتہ رات ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ساری بھاگ دوڑ بے کار گئی اور اتنی دور آنے کے بعد بھی وہ اور اس کی فیملی پاکستان ہی کی طرح غیر محفوظ ہیں۔

''اُداس نہ ہوں۔ قسمت گرداب میں پھنسی ضرور ہے لیکن ہم خوش قسمت بھی ہیں کہ ہر بار ہی بچ نکلتے ہیں۔'' اُسے اُداس ہوتا دیکھ کر کشور فوراً ہی دل جوئی کے لیے آگے بڑھی اور اس کے شانے پر اپنا گداز ہاتھ رکھتے ہوئے حالات کا روشن پہلو دکھایا۔

''میں اپنی ذات کے لیے اُداس یا پریشان نہیں ہوتا۔ لیکن تمہاری اور اُمید کی زندگی ڈسٹرب ہوتی ہے تو میں شدید تکلیف محسوس کرتا ہوں۔''

''ہمارے لیے سب سے اہم بات آپ کا ساتھ ہے۔ آپ کا ساتھ ہو تو ہم دنیا کے کسی بھی خطے میں خوشی سے رہ سکتے ہیں۔'' کشور نے اپنی گود میں موجود اُمید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے جواب دیا۔ اُمید کو وہ گھر پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے اس لیے اپنے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن لے کر گئے تھے۔ وہ خاصی پُرامن بچی تھی جو عموماً تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے اُنہیں پریشان نہیں کیا تھا اور وہ نہایت سکون سے واپس آ گئے تھے۔ کیب کو فارغ کرنے کے بعد وہ لفٹ کی مدد سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچے تو اُمید کشور کے شانے سے لگ کر سو چکی تھی۔

آفتاب نے چابی کی مدد سے دروازہ کھولا۔ سامنے ہی ان کا بڑی چاہت اور ارمانوں سے سجایا گیا آشیانہ موجود تھا۔ ان دونوں ہی کے دل سے ایک ہوک سی اُٹھی۔ ہجرتی پرندوں کے مانند وہ ایک بار پھر اپنے اس چھوٹے سے آشیانے کو چھوڑ کر اُڑنے پر مجبور تھے۔

⊛----✪----⊛

''یہ کیا تماشا ہے چودھری! تمہارے ذاتی مسائل کسی دن ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دیں گے۔ تم نے کیا سوچ کر نیویارک میں اپنے داماد اور بیٹی کو قتل کروانے کا سوچا؟ نیویارک کوئی تمہارا گاؤں نہیں ہے جہاں تمہارے کارندے دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہوتا۔ مبارک ہو کہ تمہارے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتل نہ صرف ناکام ہو گئے ہیں بلکہ پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بعد انہوں نے ان کے سامنے تمہارا نام بھی لے دیا ہے۔''

اپنے خصوصی فون پر موصول ہونے والی الفا کی کال نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لِنڈا کی طرف سے ٹپ ملنے پر وہ ایک بار ہی ان دونوں قاتل بھائیوں سے ملا تھا اور مکمل پیشگی معاوضہ دے کر معاملات طے کر لیے تھے۔ ان دونوں کا ریکارڈ اس قسم کے معاملات میں بہت شاندار تھا اس لیے چودھری مطمئن تھا کہ اس بار تو اس کے انتقام کی آگ ضرور ہی کشور اور آفتاب کو جلا کر خاک کر دے گی۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے دونوں بھائیوں کے حرکت میں آنے سے کئی گھنٹے قبل نیویارک چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے دبئی روانہ ہو گیا تھا۔ دبئی پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر اس نے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کیا تھا اور ساتھ ہی اپنی کامیابی کا جشن منانے کے لیے عمدہ قسم کی شراب کے ساتھ ایک طرح دار کال گرل کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔

مقررہ وقت پر وہ دونوں بھائیوں کی طرف سے دیے گئے ایک ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کرتا تو اس بات کی تصدیق کر دی جاتی کہ کام مکمل ہو گیا ہے۔ لیکن مقررہ وقت پر تو کیا، بعد میں بھی کئی گھنٹوں تک کوشش کرنے کے باوجود کسی نے اس کی کال ریسیو نہیں کی اور وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں دوسری طرف بجتی گھنٹیوں کی آوازیں سنتا رہا۔

کال ریسیو نہ کیے جانے پر قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ ان دونوں کرائے کے قاتلوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور پیشگی ملنے والی خطیر رقم لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن اب الفا کے فون نے اُس کی یہ غلط فہمی دُور کر دی تھی۔ حقیقتاً اُس کے ساتھ ایڈوانس کی رقم ڈوب جانے سے بھی زیادہ برا ہوا تھا۔ رقم وہ دوبارہ کما سکتا تھا لیکن نیویارک پولیس کے ریکارڈ پر ایک بار اپنا نام آ جانے کے بعد جان چھڑانی مشکل تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے بعد اب اگر اس نے نیویارک جانے کی کوشش کی تو اس کے لیے یہ بات خطرناک ہو سکتی ہے۔

''سوری سر! میں نے اس کام کے لیے بہت تربیت یافتہ لوگوں کی مدد لی تھی اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں ناکام رہیں گے۔''

''ہر کام میں ناکامی کا امکان ہوتا ہے لیکن تم نے اس امکان کو اپنے ذہن میں ہی نہیں رکھا۔ یہ تو شکر کرو کہ لِنڈا نے تمہیں مشورہ دے دیا تھا کہ ایسی کسی کارروائی کے وقت شہر میں موجود رہنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ تو تم اب تک سلاخوں کے پیچھے ہوتے اور اگلا پچھلا سب کچھ اُگل ڈالتے۔''

الفا اُس کے ساتھ جس قسم کا رویّہ رکھتا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بمشکل اسے برداشت کرتا ہے۔ وہ بھی اس مجبوری کی بنا پر کہ جنگل میں پوست کی کاشت چودھری کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ پیر آباد سے متصل جتنے بھی گاؤں دیہات تھے، ان میں چودھری ہی سب سے زیادہ طاقتور بندہ تھا جس کی سرپرستی میں وہ آرام سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ چودھری ہی کی وجہ سے انہیں افرادی قوت بھی میسر تھی۔ پوست کی کاشت اور حفاظت کا کام اسی کے آدمی انجام دیتے تھے۔ ان کی تنظیم نے صرف سرپرستی کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی یا پھر بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے حفاظتی انتظامات کو فول پروف بنانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی مہیا کر دی تھی۔ باقی ہیروئن سازی کے کارخانے یا اس کی سپلائی کا کام چودھری سے لینا ضروری نہیں تھا۔ ایک بار اس کے جوتوں کی فیکٹری میں زیرِ زمین قائم ہیروئن سازی کے کارخانے کی تباہی کے بعد شروع میں تو انہوں نے سوچا تھا کہ کسی اور مقام پر چودھری ہی کی نگرانی میں کام شروع کروا دیا جائے۔ لیکن پھر چودھری کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں آتے دیکھ کر انہوں نے اپنا یہ فیصلہ بدل دیا اور اب کوئی اور شخص ان کے لیے یہ خدمات انجام دے رہا تھا۔

''سوری مسٹر الفا! میں بے شک آپ لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں لیکن میرے بعض ذاتی مسائل ایسے ہیں جنہیں میں کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتا۔ چاہے بے شک آپ کو میرا عمل کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔'' وہ پہلے ہی اُلجھا ہوا تھا، الفا کے فون نے جہاں اسے ایک بار پھر اپنی ناکامی سے آگاہ کیا تھا، وہیں اس کا تلخ لہجہ بھی ناگوار گزرا۔ اس لیے ہمیشہ کی طرح دبنے کے بجائے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

''تو پھر خوشخبری سن لو کہ اب تم ایک ایسے شخص ہو جو نیویارک پولیس کو مطلوب ہے اور جیسے ہی تم نے دوبارہ نیویارک میں قدم رکھا، پولیس کے ہاتھوں گرفتار کر لیے جاؤ گے۔'' الفا بھلا اُس کی صاف گوئی کو کہاں برداشت کر پاتا چنانچہ مزید تلخ ہو گیا۔

''میں نیویارک میں قدم رکھے بغیر بھی اپنے دشمنوں سے نمٹ سکتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد میں دوسری بار بھی ناکام ہی رہوں۔'' اس وقت چودھری اس سے دبنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''پھر بھاڑ میں جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے یہ سن لو کہ اب تمہارا ریکارڈ ایسا نہیں رہا ہے کہ ہم بڑے پیمانے پر تم سے کام لے سکیں۔ تم پاکستان اور نیویارک دونوں جگہوں پر قانون کی نظروں میں آ گئے ہو اس لیے ہمارے درمیان معاملات صرف پوست کی کاشت تک محدود رہیں گے اور اسی حساب سے تمہیں دیا جانے والا معاوضہ بھی گھٹا دیا جائے گا۔''

بالآخر الفا نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا جس سے چودھری کو جھٹکا سا لگا۔ دولت کی ہوس کو وہ کسی طور اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا اور بہت کچھ پاس ہونے کے باوجود مزید کا لالچ رکھتا تھا۔ لیکن اس وقت بات انا کی آ گئی تھی اس لیے اس نے الفا پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کا فیصلہ اس کے لیے تکلیف دہ ہے اور لہجے کے کروفر کو قائم رکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، جو تم لوگ مناسب سمجھو۔ میں کوئی تمہارے ٹکڑوں پر نہیں پل رہا ہوں کہ ذرا سا معاوضہ کم کر دینے سے میرا جینا مشکل ہو جائے گا۔''

''جینے کے لیے صرف رقم کافی نہیں ہوتی چودھری! بڑے بڑے طاقتور ملکوں کے سربراہ صرف ایک گولی سے اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ اس بات کی تاریخ گواہ ہے۔ پھر تم جیسے ایک چھوٹے ملک کے عام سے جاگیردار کی کیا حیثیت ہے؟ آدمی زندہ رہے، تب ہی مال و دولت سے بھی لطف اٹھا سکتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کی دولت اس کے کسی کام کی نہیں رہتی۔'' الفا کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ اپنی بات کہہ کر اس نے چودھری کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

تلملائے ہوئے چودھری نے فوراً ہی لِنڈا کا نمبر ملا دیا۔ دو گھنٹیوں کے بعد اس کی مترنم آواز سنائی دی۔

''تم اپنے مسٹر الفا کو سمجھا لو لِنڈا! میں اتنی بکواس سننے کا عادی نہیں ہوں۔ اگر میرا جاگیردار خون جوش میں آ گیا تو میں اپنا سارا نفع و نقصان بھول کر تم لوگوں سے الگ ہو جاؤں گا۔'' لِنڈا کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے غصے کا اظہار شروع کر دیا۔

''ریلیکس چودھری صاحب! پہلے یہ بتائیں کہ آپ کی مسٹر الفا سے کیا گفتگو ہوئی ہے؟'' لِنڈا نے نرم لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ جواب میں غصے میں بھرا چودھری اسے ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

''غلطی آپ کی ہی ہے چودھری صاحب! آپ کو الفا سے اس انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ کس لیول کا بندہ ہے، آپ کو علم نہیں ہے۔ میں اور ڈیوڈ بھی اس سے کسی معاملے میں باز پرس نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے کام ضرور کرتے ہیں لیکن وہ ہمارے انڈر میں نہیں ہے۔ اگر وہ آپ کے خلاف بھڑک گیا تو ہم آپ سے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ محتاط رہیں۔'' لِنڈا کا جواب خاصا حوصلہ شکن تھا۔ اس نے واضح کر دیا تھا کہ الفا کی ناراضگی کی صورت میں وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تم لوگوں سے الگ ہو جاتا ہوں۔" لنڈا کا جواب سن کر اس کا حوصلہ پست تو ہو گیا لیکن پھر بھی اس نے یہ بات کہہ کر خود کو مورل سپورٹ دینے کی کوشش کی۔

"یہ ممکن نہیں ہے چودھری صاحب! جو لوگ ایک بار ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں، وہ پھر جیتے جی الگ نہیں ہو سکتے۔ بہتر ہے کہ آپ الفا کے ساتھ مفاہمت کر لیں اور اس کی مرضی کے مطابق کام کرتے رہیں۔ میں موقع دیکھ کر اس سے آپ کی سفارش کروں گی۔ امید ہے کہ اس کی ناراضگی دور ہو جائے گی۔"

نرم اور شیریں لہجے میں لنڈا نے بھی اسے وہی دھمکی دی تھی جو الفا دے چکا تھا۔ لیکن لب و لہجہ مختلف ہونے کے باعث چودھری بھڑکا نہیں۔

"ٹھیک ہے ڈارلنگ! تم کہتی ہو تو میں خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ میں کسی کی دھمکیوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں ہوں۔" چودھری کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی چنانچہ مصالحت کی راہ اختیار کرنی ہی پڑی۔ لنڈا نے اس کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بے بس ہو جانے والے چودھری نے جھنجلاتے ہوئے موبائل سیٹ بیڈ پر پٹخ دیا۔ آج تک وہ لوگوں کو دھمکیاں دیتا اور ان کی زندگی کے فیصلے کرتا آیا تھا لیکن اب خود اسے کوئی سوا سیر ٹکرا گیا تھا جس کے چنگل سے نکلنے کے لیے اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔

❀----✪----❀

شہر کے حالات دو دن کے ہنگامے کے بعد آہستہ آہستہ قابو میں آنے لگے تھے۔ وہ علاقہ جو ان ہنگاموں کا مرکز تھا، پولیس کے مطابق انہوں نے بڑی جدوجہد کے بعد کلیئر کروا لیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ جس طرح حملہ آوروں نے اچانک ہنگامہ شروع کیا تھا، اسی طرح خود ہی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ انہوں نے یہ پسپائی اس طرح اختیار کی تھی کہ علاقے کی پُر پیچ گلیوں اور راستوں میں گم ہو گئے تھے اور پولیس ان کی دھول کو بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ انہیں صرف تین لاشیں ملی تھیں جو پولیس کو انتہائی مطلوب ایسے افراد کی تھیں جو ہر قسم کے ہنگاموں میں مختلف گروپوں کے لیے فری لانسر کے طور پر کام کرتے تھے۔

بہرحال کسی نہ کسی طرح شہر کا امن بحال ہونے لگا تھا۔ وزراء اور اعلیٰ عہدے داروں نے میڈیا پر بیانات دینا شروع کر دیئے تھے کہ دہشت گردوں کو دیوار سے لگا دیا گیا ہے اور وہ کسی شخص کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ شہر کا امن و امان برباد کر دے۔ اس بیان بازی سے قطع نظر شہریار تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ جس شخص کی آمد کے ساتھ ہی شہر کا امن تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا، وہ آگے چل کر جانے کیا گل کھلائے گا۔

سلّو کی مکمل نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے جدید آلات سے بھی مدد لی جا رہی تھی۔ نگرانی پر مامور لوگ اس کے گھر میں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن سکتے تھے لیکن ابھی تک انہیں کوئی کلیو نہیں مل سکا تھا۔ ان دو دنوں میں سلّو مستقل گھر میں ہی رہا تھا اور گھر سے جو آوازیں سنائی دی تھیں، وہ بالکل عام نوعیت کی تھیں۔ اس نے اپنے پاس موبائل فون بھی نہیں رکھا تھا کہ اس سے کی جانے والی کالز ٹریس کر کے کسی طرح اس کے خلاف ثبوت حاصل کیے جا سکیں۔

اس کے طرزِ عمل سے بالکل ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ ایک عام سا شخص ہے جو برسوں بعد اپنوں سے ملنے پر بہت خوش ہے۔ ان دو دنوں میں وقتاً فوقتاً اس کے مختلف رشتے دار اس سے ملنے آتے رہے تھے۔ آنے والے اس کے لیے تحائف بھی ضرور لاتے تھے۔ سلّو کا سارا خاندان اس کے والدین ہی کی طرح غریب

لیکن غربت کے باوجود کسی نے برسوں بعد آنے والے سلّو کی رہائی کی خوشی میں شامل ہونے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ سی ایف پی کے نگراں یہ سب دیکھ کر مستقل شہریار کو جو کہ ان کے لیے عادل خان تھا، رپورٹ پہنچا رہے تھے۔ ان رپورٹس کو سن کر اسے ایسا لگتا تھا کہ حالات پر جمود طاری ہو گیا ہے لیکن آخر کار ایک ایسی خبر آئی جس نے کچھ ہلچل پیدا کر دی۔ رپورٹ دینے والے کے مطابق سلّو اپنی منگیتر کے لیے کوئی تحفہ خریدنے کے ارادے سے گھر سے باہر نکلا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم اسے فالو کرو اور مجھے رپورٹ دیتے رہو۔" شہریار نے اسے حکم دیا۔ سلّو کی نگرانی کرنے والوں کی طرف سے اسے رپورٹ دی جاتی رہی۔ سلّو نے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے اپنی منگیتر کو تحفے میں دینے کے لیے بڑے سائز کا ایک خاصا مہنگا شولڈر بیگ خریدا تھا۔ بیگ خریدتے وقت اس نے سیلز مین سے طے کر لیا تھا کہ چونکہ وہ یہ بیگ اپنی منگیتر کے لیے خرید رہا ہے، اس لیے منگیتر کو پسند نہ آنے کی صورت میں اسے بیگ تبدیل کروانے کی رعایت حاصل ہو گی۔

سیلز مین نے اس سے تعاون کا وعدہ کیا تھا اور سلّو رقم ادا کر کے سیدھا گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس بیگ کے علاوہ اس نے پوری مارکیٹ میں سے کچھ اور خریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دیکھا جائے تو وہ جس حیثیت کا بندہ تھا، اس حساب سے وہ لیدر بیگ بھی خاصا مہنگا تھا۔ پھر سلّو ابھی تو پاکستان آیا تھا۔ اس کا کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں تھا کہ وہ اس قسم کی خریداری کر سکتا۔ بس یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے بھارتی آقاؤں کی عنایت کردہ رقم خرچ کر رہا ہے لیکن کافی محتاط انداز میں، ورنہ بیگ کے علاوہ منگیتر کے لیے دوسرے تحائف بھی خرید سکتا تھا۔

"سر! وہ ایک بار پھر باہر جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں وہی بیگ ہے جو اس نے کچھ دیر پہلے خریدا تھا۔" ابھی سلّو کو واپس گھر پہنچے گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا کہ اس کے ماتحت نے اسے رپورٹ دی۔

"ممکن ہے وہ اپنی منگیتر سے ملنے جا رہا ہو تاکہ اسے وہ تحفہ دے سکے۔" شہریار نے خیال ظاہر کیا۔

"مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے سر! گھر میں داخل ہونے کے بعد سلّو مستقل خاموش رہا ہے اور اب گھر سے دوبارہ باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنے والدین سے یہ کہا ہے کہ وہ اپنی منگیتر کے لیے جو تحفہ خرید کر لایا ہے، اس میں کچھ خرابی ہے اس لیے اسے تبدیل کروانے جا رہا ہے۔"

ماتحت نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ بیگ خریدتے وقت ہی سلّو نے یہ طے کر لیا تھا کہ منگیتر کو پسند نہ ہونے کی صورت میں وہ اس بیگ کو تبدیل کروا لے گا۔ بیگ منگیتر کو دکھانے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اس نے ایک گھنٹے کے اندر خاصے مہنگے خریدے گئے اس بیگ میں کوئی ایسی خامی ڈھونڈ لی تھی جس کے باعث اسے تبدیل کروانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہا ہو جس کے مطابق خریدے گئے بیگ کو واپس ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہنچانا ضروری ہو۔ اس بار خود شہریار کے لیے اپنے دماغ میں گھنٹی بج اٹھی۔

"تم اسے نظروں میں رکھو۔ میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے عجلت میں فیصلہ کیا اور جاوید علی کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود گاڑی میں جا بیٹھا۔ ابھی تک وہ اور جاوید علی کراچی یونٹ کے ایک ٹھکانے میں ہی بیٹھ کر اس کیس کو ہینڈل کرتے رہے تھے لیکن وہ ہر دم اس بات کے لیے تیار رہتے تھے کہ اگر ایمرجنسی میں باہر نکلنا پڑے تو فوراً روانہ ہو سکیں۔ اس وقت بھی وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ ان کے اسٹور تک پہنچنے تک سلّو بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس سلّو خاصا مہذب اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات یا چال ڈھال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی، جس کی وجہ سے اسے دہشت گرد سمجھا جا سکتا۔ وہ بیگ لیے ہوئے اسی سیلز مین کے پاس گیا جس سے اس نے پیشگی بیگ تبدیل کروانے کا معاملہ طے کر لیا تھا۔ سیلز مین نے خوش دلی سے اسے اجازت دے دی۔

''سوری یار!..... میں اس قسم کا بندہ نہیں ہوں کہ چیزیں تبدیل کرواتا پھروں۔ لیکن تمہیں لڑکیوں کے نخروں کا تو معلوم ہوگا کہ انہیں مشکل سے ہی کوئی چیز پسند آتی ہے۔ اوپر سے میرے سسرالی ذرا قدامت پسند ہیں اس لیے میری منگیتر کو میرے ساتھ شاپنگ کے لیے آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔''

سلّو نے بے تکلفانہ انداز میں معذرت کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی تو سیلز مین مسکرا دیا پھر خود بھی قدرے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر اس بار بھی آپ کی منگیتر کو آپ کا لے جایا ہوا بیگ پسند نہیں آیا تو آپ کیا کریں گے؟''

''پھر میں کہوں گا کہ رکھنا ہے تو رکھو ورنہ مجھ سے گفٹ لینے کے لیے شادی کا انتظار کرو تاکہ خود ساتھ چل کر اپنی پسند کی چیز لے سکو۔''

سلّو نے بے ساختگی سے جواب دیا اور اپنے ہاتھ سے بیگ کو اس ریک میں واپس رکھ دیا جہاں اور بھی ڈھیر سارے بیگ رکھے ہوئے تھے۔ بیگ واپس رکھنے کے بعد اس نے وہاں سے ایک دوسرا بیگ اُٹھا لیا اور پھر بولا۔

''ویسے مجھے یقین ہے کہ اب ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس بار میں اس کی پسند کے بارے میں آئیڈیا لے کر آیا ہوں۔''

اس گفتگو کے بعد اسے مشکل سے ڈیڑھ دو منٹ ہی اسٹور میں گزارنے پڑے ہوں گے۔ واپس کروائے ہوئے بیگ کی جگہ اس نے جو دوسرا بیگ لیا تھا، وہ مساوی قیمت کا ہی تھا اس لیے زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں پڑی۔

''تعاون کے لیے شکریہ۔'' اسٹور سے روانہ ہونے سے قبل اس نے سیلز مین کا شکریہ ادا کیا۔ اسٹور میں اس کی جگہ کئی اور سیلز مین بھی تھے اس لیے اس کے سلّو کے ساتھ مصروف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی وہ اس نوعیت کا اسٹور تھا جہاں اپنی مدد آپ کے تحت خریداری کی جاتی ہے اور گاہک آخر میں منتخب کردہ اشیاء سے بھری باسکٹیں سیلز مین کے سامنے رکھ کر بل بنوانے کے بعد قیمت ادا کر دیتے ہیں۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں سر! میں دعا کروں گا کہ اس بار آپ کی منگیتر کو آپ کا گفٹ پسند آ جائے گا۔'' سیلز مین نے خوش دلی سے جواب دیا تو سلّو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اس کا تعاقب جاری رکھو۔'' شہریار نے جو کہ ایک قریبی شیلف کی آڑ میں کھڑا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا، آپریٹس پر اپنے ماتحت کو حکم دیا اور خود تیزی سے اس بڑے سے شیلف کی طرف بڑھا جہاں مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے ڈھیر سارے لیڈیز بیگز رکھے ہوئے تھے۔ سلّو کا بیگ خرید کر ایک گھنٹے کی مختصر مدت میں تبدیل کروا لینا اُسے کھٹک رہا تھا۔ بیگ کی تبدیلی کے لیے اس نے سیلز مین کو جو کہانی سنائی تھی، وہ جھوٹ کا پلندا تھی۔ سلّو کی نگرانی کے نتیجے میں وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ سلّو وہ بیگ لے کر اپنے گھر ضرور گیا تھا لیکن اس نے وہ بیگ اپنی منگیتر کو نہیں دکھایا تھا کہ وہ اسے پسند یا ناپسند کرتی۔

اس کے علاوہ ایک دوسری بات یہ بھی تھی کہ اس نے جو دوسرا بیگ لیا تھا، اس کے انتخاب میں ذرا بھی

دلچسپی نہیں لگایا تھا حالانکہ رجیکشن کے ڈر سے دوسری بار تو اسے بہت دیکھ بھال کر اور احتیاط سے انتخاب کرنا چاہیے تھا۔

شیلف کے قریب کھڑے ہو کر اس نے پہلے نظروں ہی نظروں میں بیگ کا جائزہ لیا۔ وہ اندر سے بھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فروخت کی غرض سے رکھے گئے سارے ہی بیگز کے اندر اخبار وغیرہ رکھے جاتے ہیں تاکہ پھول کر ان کی خوب صورتی واضح ہو جائے۔ لیکن اس طرح کی اشیاء اندر بھرنے سے وزن پر کچھ خاص فرق نہیں پڑتا اور بیگز ہلکے پھلکے ہی محسوس ہوتے ہیں۔ جبکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ سلّو نے واپس کردہ بیگ کو اس طرح تھام رکھا تھا جیسے اس میں کافی وزن ہو۔ تشویش میں مبتلا شہریار نے بیگ کو اس کی جگہ سے ہلائے بغیر احتیاط کے ساتھ اس کی زِپ کھولی اور متحیر رہ گیا۔

''سر! یہ تو.....'' اس کے ساتھ موجود جاوید علی نے بھی بیگ کے اندر رکھی چیز دیکھ لی تھی۔

''شش..... کچھ نہیں کہنا۔ جاؤ کاؤنٹر پر، اس کی قیمت ادا کرو۔'' اس نے جاوید علی کو تنبیہہ کی اور بیگ کی زِپ دوبارہ احتیاط کے ساتھ بند کر کے اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

سلّو نے جس طرح اس بیگ کو لا کر وہاں رکھا تھا، اس سے یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ بیگ کے اندر رکھا بم صرف ہاتھ لگانے یا اِدھر سے اُدھر لے جانے پر نہیں پھٹے گا۔ وہ ایک ٹائم بم تھا جسے سیٹ کیے گئے ٹائم پر ہی پھٹنا تھا۔ موجودہ حالات میں اس کے پاس دو ہی آپشنز تھے۔ اوّل یہ کہ وہ بم ڈسپوزل اسکواڈ کو طلب کرے اور اسٹور خالی کروا لے۔ کیونکہ اس میں خطرات و خدشات زیادہ تھے۔ اسکواڈ کے پہنچنے میں دیر ہونے کی صورت میں بم پھٹ سکتا تھا۔ دوسرے اسکواڈ کو بلانے سے قبل انہیں ایمرجنسی میں اسٹور خالی کروانا پڑتا جس سے لوگوں میں بھگدڑ مچ جاتی اور خوف و ہراس پھیل جاتا۔ اس لیے اس نے سیکنڈ آپشن پر عمل کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا اور جاوید علی کے پے منٹ کر کے واپس لوٹنے سے قبل ہی عجلت میں بیگ سمیت باہر نکل گیا تھا۔

باہر اس کی گاڑی موجود تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اسے فل اسپیڈ میں دوڑا دیا۔ بم کے ساتھ موجود ٹائمر دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بم پھٹنے میں تقریباً آٹھ منٹ باقی تھے۔ ان آٹھ میں سے تین منٹ تو اسٹور میں ہی گزر چکے تھے اور گاڑی میں بیٹھنے کے بعد صرف پانچ منٹ باقی بچے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان پانچ منٹوں میں وہ اس میدان میں پہنچ جائے گا جسے یہاں آتے ہوئے اس نے راستے میں دیکھا تھا۔ وہ میدان تو تھا شاید بچوں کے کھیلنے کے لیے لیکن متعلقہ محکمے کی لاتعلقی اور اہلِ علاقہ کی بے حسی کی وجہ سے کچرا گھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہاں کچرے اور گندگی کا اتنا بڑا ڈھیر موجود تھا کہ بچوں کے وہاں کھیلنے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ تین منٹ کے اندر وہ اس میدان تک پہنچ گیا اور احتیاط سے رکھا بیگ اٹھا کر کچرے کے ڈھیر کی طرف بھاگا۔ اصولاً اسے وہ بیگ دور ہی سے پھینک کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن تیزی سے گزرتے وقت کے باوجود اس نے رِسک لے لیا اور کچرے کے ڈھیر کے عین درمیان میں پہنچ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑا ہٹا کر بیگ کو اندر دبانے کے بعد ہی واپس پلٹا۔ اس دوران اس کے اندر کا نفاست پسند اور نازک مزاج اور وکریٹ جانے کہاں گیا تھا۔ زندہ تھا تو صرف ایک سپاہی جسے سب کچھ قربان کر کے اپنا فرض انجام دینے کے جذبے کے علاوہ کچھ یاد نہیں تھا۔ گندگی کے ڈھیر اور بدبو کے بھبکے اس کے جذبے کی راہ میں ذرا بھی مزاحم نہیں ہوئے تھے اور جب وہ اپنا کام نمٹا کر واپس پلٹ رہا تھا تو بم پھٹنے میں مشکل سے پچیس سیکنڈ باقی تھے۔

اس نے دوڑ کر میدان پار کیا اور اپنی گاڑی تک واپس پہنچا۔ وقت کی کمی کے پیشِ نظر اس نے گاڑی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجن چلتا ہوا ہی چھوڑ دیا تھا پھر بھی جب اس نے ایکسیلریٹر پر دباؤ ڈال کر گاڑی کو آگے بڑھایا تو اسے ایک زوردار دھماکا سنائی دیا جس کے زور سے گاڑی ڈگمگا سی گئی لیکن اس نے بریکس نہیں لگائے۔ البتہ بیک ویو مرر میں دھماکے کے زور سے اوپر اُچھلتے کچرے کے ڈھیر کو ضرور دیکھا۔

اسے معلوم تھا کہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ اردگرد موجود گھروں کے در و دیوار لرز اُٹھے ہوں گے اور شاید چند گھروں کی کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے ہوں گے۔ لیکن قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ اس دھماکے سے کسی انسانی جان کے نقصان کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ جس راستے پر گاڑی چلا رہا تھا، وہ بھی کوئی مصروف شاہراہ نہیں تھی جہاں ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے کسی حادثے کا اندیشہ ہو۔ وہ لوگ تو محض شارٹ کٹ کے خیال سے یہاں سے گزر کر اسٹور تک پہنچے تھے اسی لیے وہ گراؤنڈ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

''سر! آپ کہاں ہیں؟'' دھماکے کے فوراً بعد ہی اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے جاوید علی کی تشویش میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ اس کی طرح وہ بھی دیکھ چکا تھا کہ بیگ میں ٹائم بم رکھا ہے۔ شہریار کا بیگ سمیت اسٹور سے بھاگ کھڑا ہونا اس کے لیے تشویش کا باعث بنا تھا اور پھر سنائی دینے والے دھماکے کی آواز نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا اس لیے اس نے گھبرا کر فون کیا تھا۔

''میں خیریت سے ہوں اور واپس جا رہا ہوں۔ تم بھی ضروری معلومات حاصل کر کے واپس آ جاؤ۔'' اس نے جاوید علی کو حکم دیا۔ دھماکے کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے اسے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اہلِ علاقہ خود پولیس کو کال کر لیں گے اور پولیس معمول کی کارروائی کرنے کے بعد نامعلوم دہشت گردوں کے کھاتے میں اس واردات کو ڈال کر مطمئن ہو جائے گی۔

اس کے لیے اہمیت اس بات کی تھی کہ ایک بھی انسانی زندگی ضائع ہوئے بغیر یہ مصیبت ٹل گئی تھی اور وہ اس جرم کے ذمے دار کو جانتا تھا اور اب اسے اس کی بیخ کنی کے لیے کوئی نہ کوئی راست قدم اٹھانا تھا۔ انہی خطوط پر سوچتا ہوا وہ اپنے ٹھکانے پر واپس چلا گیا۔ راستے میں اس نے کنفرم کر لیا تھا کہ سلّو واپس اپنے گھر ہی گیا ہے۔ وہ واپس پہنچا تو اس کے تھوڑی دیر بعد جاوید علی بھی واپس آ گیا۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا سر! آپ نے بہت بڑا رِسک لیا تھا۔ آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی وہ خفگی کا اظہار کر پڑا۔

''سپاہی کو اپنے نقصان سے نہیں ڈرنا چاہئے، بس یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اپنے لوگوں کو کس طرح نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں مجھے جو بہتر لگا، وہ میں نے کیا۔ اب تم اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بحث نہیں کرنا۔ بس یہ بتاؤ کہ کیا معلومات حاصل کر کے آئے ہو؟'' اس نے جاوید علی کے پاس مزید بحث کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی چنانچہ وہ بھی ایک فرماں بردار ماتحت کی طرح حکم کے مطابق اسے رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''سلّو نے جس ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں دھماکا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خاصا بڑا ہے اور اسی حساب سے وہاں لوگ بڑی تعداد میں خریداری کرنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹور کی لوکیشن بھی ایسی ہے کہ اردگرد کئی دوسرے اسٹورز اور ریسٹورنٹس وغیرہ موجود ہیں۔ چنانچہ اگر وہاں دھماکا ہو جاتا تو کئی انسانی جانوں کے نقصان کے علاوہ شدید خوف و ہراس پھیل جاتا۔ اہم بات یہ ہے کہ اسٹور کے مالک نے سکیورٹی کے مناسب انتظامات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ وہاں جو سکیورٹی گارڈز موجود ہیں، ان کے پاس عام سا اسلحہ موجود ہے اور چیکنگ کے لیے موجود آلہ صرف داخلی دروازے پر موجود گارڈ کے پاس موجود ہوتا ہے جو ان

آلوں خراب ہے اور گزشتہ کئی دنوں سے استعمال نہیں کیا جا رہا۔ نگرانی کے لیے موجود کیمروں کی تعداد بھی قابلِ ذکر نہیں ہے۔ ایک کیمرہ داخلی دروازے پر موجود ہے جبکہ باقی دو ایسے مقامات پر لگائے گئے ہیں جہاں چھوٹے سائز کی یا قیمتی اشیاء رکھی گئی ہیں تاکہ کوئی کسٹمر ان اشیاء کو اپنی جیب یا پرس میں رکھ کر چلتا نہ بنے۔ میگزین، شوز اور کتابوں وغیرہ والے حصوں میں کیمرے موجود نہیں ہیں۔ میں نے سلّو کے دونوں بار اسٹور میں داخل ہونے کے اوقات کی ویڈیو دیکھی ہے۔ ایک بار اس نے بالوں کو سنوارنے کے بہانے چہرے کو ہاتھ کی آڑ میں چھپا لیا ہے اور دوسری بار وہ دونوں ہاتھ منہ کے آگے لا کر اس طرح چھینکتا ہوا اندر داخل ہوا ہے جیسے اسے شدید نزلہ زکام ہو رہا ہو۔ ویڈیو میں اس کے ہاتھ میں موجود رومال بھی صاف نظر آ رہا ہے۔ کیمرہ اس زاویے سے لگا ہوا ہے کہ اسٹور میں آنے والے کی تو واضح تصویر لے سکتا ہے لیکن جانے والے کی پشت ہی ریکارڈ ہو پاتی ہے۔ اس طرح کیمرے کی آنکھ نے سلّو کی ایسی کوئی تصویر محفوظ نہیں کی، جس کی مدد سے اسے شناخت کیا جا سکے۔ اگر ہم لوگ اس کے پیچھے نہ ہوتے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔'' جاوید علی نے تفصیلی رپورٹ پیش کی۔

''ہوں۔'' ساری بات سن کر اس نے ایک ہنکارا بھرا اور بولا۔ ''تفصیلات سے واضح ہے کہ سلّو نے ساری پلاننگ سے وہاں وہ بم رکھا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسٹور میں سکیورٹی کے کیا انتظامات ہیں اور کارروائی کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ ظاہر ہے اسے یہ معلومات کہیں نہ کہیں سے فراہم کی گئی ہوں گی۔ ورنہ وہ خود تو ابھی حال ہی میں پاکستان آیا ہے اور جب سے آیا ہے ہماری نظروں میں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''را'' یہاں کتنی زیادہ ایکٹیو ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں، کر گزرتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ سلّو کے پاس دھماکا خیز مواد کہاں سے آیا؟''

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اس مختصر مدت میں مسلسل سلّو کے رشتے دار اس سے ملاقات کے لیے آتے رہے ہیں۔ آنے والوں میں سے اکثر و بیشتر تحائف بھی لاتے تھے۔ لہٰذا دشمن کو ایک زبردست کورمل مل گیا۔ ان کا کوئی بھی بندہ رشتے دار کے روپ میں گفٹ پیک کی آڑ لے کر مطلوبہ معلومات اور ٹائم بم سلّو کو فراہم کر کے چلا گیا ہوگا۔ مجھے اصل افسوس اس بات کا ہے کہ ہم یہ سب جاننے کے باوجود ثبوتوں کی عدم دستیابی کی بنا پر اسے گرفتار نہیں کر سکتے۔ اس نے کہیں کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس نے اسٹور میں ٹائم بم رکھا تھا۔'' وہ کفِ افسوس ملنے لگا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے سر! ہم جانتے ہیں کہ وہ مجرم ہے اس لیے اسے اپنے ذرائع سے اغوا کروا لیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی زبان کھلوانا ہمارے لیے کون سا مشکل ہوگا۔ بلکہ وہ زبان نہ بھی کھولے تو ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم اس کی حقیقت جانتے ہیں اس لیے اسے اس کے انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔'' جاوید علی کے دل میں موجود سلّو کی ہمدردی اس وقت مکمل طور پر سوئی ہوئی تھی کیونکہ اس سفاک شخص نے مختصر مدت میں جس طرح اپنا خونیں کھیل شروع کر دیا تھا، اس کے بعد وہ کوئی گنجائش محسوس نہیں کر رہا تھا کہ اسے ڈھیل دی جائے۔

''اگر یہی کرنا تھا تو انتظار کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم اس کی آمد کے ساتھ ہی کارروائی کر گزرتے۔ میں چاہتا ہوں کہ سلّو کے ذریعے باقی دوسرے لوگوں تک بھی پہنچ سکوں۔ ابھی تو صرف ایک ریاض انور ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس جیسے اور بھی ہوں گے جو یہاں اس کا ساتھ دے رہے ہوں گے اور ہمیں ان سب کی گردنیں ناپنی ہیں۔'' اس نے جاوید علی کی بات کا جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اسے اپنے سینئر افسر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رائے سے اختلاف نہیں تھا البتہ وہ تشویش میں مبتلا تھا کہ آزادانہ پھرتا سلو کہیں کوئی بڑا نقصان نہ پہنچا دے۔

⊛----✪----⊛

ایئرپورٹ سے نکل کر آبادی کی طرف جانے والے راستے پر سفر کرنا ان کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا تھا اور انہوں نے فوراً ہی محسوس کرلیا تھا کہ یہاں زندگی کے رنگ نیویارک سے بہت مختلف اور خوش نما ہیں۔ نیویارک میں فلک بوس عمارتوں، جھلملاتی روشنیوں اور ٹریفک کے اژدھام میں زندگی اتنی تیز رفتار تھی کہ اس کی تیزی کا ساتھ دینے کے چکر میں آدمی گھن چکر بن کر رہ جاتا تھا پھر وہاں کے مصنوعی پن میں بھی وہ کشش نہیں تھی جو ساری زندگی دیہات میں گزارنے والی کشور کو اپنی طرف متوجہ کرتی جبکہ یہاں تو آتے کے ساتھ ہی بڑا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ قلانچیں بھرتے ہرن کا جنگل کی وسعتوں میں گم ہو جانا، آسمان پر پرندوں کا ٹولیوں کی صورت میں اُڑنا اور ہوا میں سبزے کی مہک کو محسوس کرنا بہت پُرلطف تھا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی بہت اچھا لگا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے سڑک سے گزرتے ایک سانپ کو آرام سے گزر جانے کی مہلت دینے کے لیے گاڑی کو روک لیا تھا۔ اُس کی اس حرکت پر کشور کو بے ساختہ پیرآباد یاد آیا تھا۔ وہاں بھی یہ سب کچھ موجود تھا لیکن جانور تو دور کی بات، انسانی جانوں کی بھی اتنی قدر نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن انسان تو جانور سے بھی زیادہ بے وقعت تھا۔ پھر وہاں صفائی اور سہولتوں کا بھی شدید فقدان تھا۔ آرلینڈو کی چوڑی اور چکنی سڑکوں پر سفر کرتے اسے پیرآباد کے وہ کچے پکے راستے یاد آئے جن پر سفر کرتے ہوئے آرام دہ گاڑی کے باوجود بھی چند جھٹکے لگ ہی جاتے تھے۔

سبزہ، جنگلی حیات اور کھلی فضا جیسی خصوصیات مشترک ہونے کے باوجود آرلینڈو اور پیرآباد ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ پینٹنگ کے جملہ لوازمات ایک طرف کسی ماہر مصور کے ہاتھوں میں ہوں تو دوسری طرف کسی اناڑی کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح بننے والی تصویروں کا فرق جتنا واضح ہوسکتا تھا، اتنا ہی واضح فرق یہاں اور وہاں میں تھا۔ یہاں والوں کو اللہ نے جن نعمتوں سے نوازا تھا، انہوں نے نہ صرف ان سے استفادہ کیا تھا بلکہ انہیں خوب سنبھال سنوار کر رکھا تھا جبکہ پاکستان میں نعمتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے تو بہت تھے لیکن ان کی قدر اور دیکھ بھال کرنا کوئی نہیں جانتا تھا۔

خوش نما مناظر کو دیکھنے اور مختلف باتوں کو سوچنے میں ان کا ایئرپورٹ سے مصطفیٰ خان کے گھر تک کا سفر طے ہوتا چلا گیا۔ مصطفیٰ خان سے ان کا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا لیکن وہ صرف شہریار کے حوالے پر ان کی مدد کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے جب آفتاب نے اسے اپنی آمد کے وقت سے آگاہ کیا تھا تو اس نے انہیں ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن آفتاب نے اسے زحمت دینا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پاکستان نہیں ہے جہاں لوگ کسی مہمان کی آمد پر گاڑیاں بھر بھر کر اسے خوش آمدید کہنے ایئرپورٹ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں انسان کو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بندھ کر چلنا پڑتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی غیر ضروری تکلفات میں پڑ جائے تو خاصی زحمت اٹھاتا ہے۔ اس لیے اس نے مصطفیٰ کو انکار کردیا تھا۔ اس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا البتہ انہیں اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت ضرور دی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ انہیں اس گھر تک پہنچا دیتا جو اس نے آفتاب کی خواہش کے مطابق ان کے لیے کرائے پر لیا تھا۔ اس گھر میں ضرورت کا سارا ساز و سامان بھی موجود تھا جس کی وجہ سے انہیں اضافی کرایہ دینا پڑتا۔ لیکن نیویارک والے اپارٹمنٹ کا سامان بیچتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ خود چیزیں

خرید کر گھر کو سجانے سنوارنے کی زحمت نہیں کریں گے۔ اس طرح ان کے وقت اور پیسے کی بچت بھی ہوتی اور ایک ان سب چیزوں کو چھوڑنے کی صورت میں یہ دکھ بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے اتنے شوق سے اپنی گرہستی بنائی تھی، اسے ایمرجنسی میں چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ ایک طرح سے انہوں نے خانہ بدوشوں کی سی زندگی کو قبول کرلیا تھا اور اب اسی کے مطابق اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مصطفیٰ خان کے گھر کے دروازے پر گاڑی رُکی تو وہ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے نیچے اُتر آئے۔ گھر اچھا خاصا بڑا لگ رہا تھا اور احاطے کی دیوار زیادہ اونچی نہ ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ رہے تھے کہ جتنے حصے پر بنائی عمارت تعمیر کی گئی تھی، اس سے زیادہ ایریا لان کے لیے استعمال ہوا تھا۔

آفتاب نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ٹریک سوٹ میں جو شخص کھڑا تھا، وہ یقیناً مصطفیٰ خان ہی تھا جو شاید کچھ دیر قبل ہی جاگنگ وغیرہ سے فارغ ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی فراخ پیشانی پر اس وقت بھی پسینے کے ننھے ننھے قطرے دیکھے جاسکتے تھے۔

''مصطفیٰ خان اور آپ دونوں یقیناً مسٹر اینڈ مسز آفتاب ہیں۔'' اس نے خوش دلی سے اپنا مضبوط ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

''اندر تشریف لے آئیں۔ میں آپ لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' آفتاب کی تصدیقی مسکراہٹ کا اپنی مسکراہٹ سے جواب دیتے ہوئے اس نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی ان کے سامنے مصطفیٰ خان کے گھر کا خوب صورت لان آگیا لان کو دیکھتے ہی اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ اسے کسی صاحبِ ذوق نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے ترتیب دیا ہے۔ آنکھوں کو تراوٹ دیتی سبز گھاس، ایک خاص ترتیب سے لگائے گئے پھل دار اور پھول دار درخت و پودے، اسٹائلش سی لان چیئرز اور خوب صورت سے جھولے میں سے کوئی شے ایسی نہیں تھی جو اس منظر میں غیر ضروری یا غیر منظم محسوس ہوتی۔

''آپ کا لان بہت خوب صورت ہے۔'' کشور تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''شکریہ، یہ میری بیگم کا شوق ہے۔ وہ خاصی سگھڑ خاتون ہیں۔ ابھی آپ ان کے ہاتھ کا بنا ناشتہ تناول کریں گے تو خود میری اس رائے کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ البتہ میں اس اعتبار سے بڑا مظلوم آدمی ہوں کہ مجھے ان کے ہر شوق کی تکمیل کے لیے ان کے اسسٹنٹ کا کردار ادا کرنا پڑتا ہے اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ عموماً بے چارے اسسٹنٹ کو ہی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔''

مصطفیٰ خان نے ایسے لب و لہجے میں یہ سب کہا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن کشور کے چہرے کی مسکراہٹ بڑی تیزی سے حیرت کے رنگوں میں ڈوب گئی۔ اس حیرت کا سبب وہ لڑکی تھی جسے وہ گیٹ پر سے ہی دیکھتے ہوئے آرہے تھے۔ لڑکی ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ مصروف اُسے جھولا جھلا رہی تھی لیکن وہ کچھ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ انہیں اس کی پشت ہی نظر آرہی تھی۔ پشت پر لہراتی ناگن جیسی لمبی چوٹی والی لڑکی اور جھولا جھولتی بچی نے مصطفیٰ خان کے لان کی خوب صورتی کو مزید بڑھا دیا تھا اور انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ مصطفیٰ خان کی بیوی اور بیٹی ہیں لیکن یک دم ہی لڑکی پلٹی تو کشور کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ وہ اس کا شناسا چہرہ تھا اور وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ یہاں اس سے سامنا ہوسکتا ہے۔

''ماہ بانو.....!'' اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی۔

''یہ مہرین ہیں۔ یہ اور ان کے شوہر اسلم صاحب یہیں اس گھر کی انیکسی میں رہتے ہیں اور ان کی ہماری نٹ کھٹ سی بیٹی سے خوب دوستی ہے۔'' کشور کی حیرت سے بے خبر چند قدم کا درمیانی فاصلہ طے کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد مصطفیٰ خان ان کا تعارف کروانے لگا۔ یہ تعارف دونوں طرف کے لوگوں کا کروایا گیا تھا لیکن کشور نے زیادہ غور نہیں کیا۔ وہ تو حیران تھی کہ ماہ بانو یہاں کیسے پہنچ گئی؟

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں چھوٹی بی بی؟ جیسے آپ حالات کے گرداب میں پھنس کر یہاں پہنچی ہیں، ویسے ہی میں بھی آ گئی ہوں۔'' اس کے تاثرات دیکھ کر ماہ بانو نے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ حالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن یہ طے تھا کہ جس شخص کے خوف سے وہ بھاگتی پھر رہی تھی، وہی شخص ماہ بانو کی دربدری کا بھی ذمے دار تھا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ ہم ایک سے حالات سے مفرور لوگ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔'' اس نے فوراً ہی ایک قدم آگے بڑھ کر نہ صرف ماہ بانو سے ہاتھ ملایا بلکہ اسے گلے بھی لگا لیا۔ اس ایک قدم نے پیر آباد کی حویلی کی چھوٹی بی بی اور وہاں ملازمہ جیسی حیثیت رکھنے والی ماہ بانو کے درمیان تفریق کو ختم کر دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

سنتھیا اضطراب کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ ''را'' والوں نے خصوصیت سے اسے کراچی کے حالات پر نظر رکھنے اور اُنہیں وقتاً فوقتاً بگاڑتے رہنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔

یہاں رہ کر اسے اپنی ٹیم سے زیادہ ریاض انور اور سلّو جیسے لوگوں سے کام لینا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے جو پہلا منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت کامیاب رہا تھا اور دو تین دن کے اندر ہی شہریوں کو اچھا خاصا جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن یہاں کے باسیوں کی خصوصیت تھی کہ حالات چاہے کتنے بھی خراب ہو جائیں، وہ زیادہ دنوں تک اپنے گھروں میں محصور ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور حالات میں ذرا سی بہتری آتے ہی یہاں کاروبارِ زندگی دوبارہ شروع ہو جاتا تھا۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن اس نے پہلے ہی منصوبہ تیار کر رکھا تھا کہ جیسے ہی شہر میں دوبارہ سے رونقیں جاگنا شروع ہوں گی۔ تخریب کاری کی ایک اور واردات کی مدد سے لوگوں کو ہراساں کر دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے شہر کے ایک بارونق کاروباری علاقے کا انتخاب کیا تھا اور کام کی ذمے داری سلّو کو سونپی گئی تھی۔ اسے یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ سلّو نے نہایت چابک دستی اور ہوشیاری سے مکمل کر لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کے کان وہ خبر نہیں سن سکے تھے جس کی وہ منتظر تھی۔

نیوز چینلز سے بم بلاسٹ کے حوالے سے خبر نشر تو ہوئی تھی لیکن اس خبر میں ان کے منتخب کردہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے بجائے کسی خالی میدان میں کچرے کے ڈھیر پر بم دھماکے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کارروائی پر مختلف تبصرے کیے جا رہے تھے۔ اسے ان تبصروں سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ اس بات پر ضرور برانگیختہ تھی کہ منصوبے کے مطابق وہ دھماکا شہر کے بارونق علاقے کے بجائے کسی خالی میدان میں کیسے ہو گیا؟

''یس، کم اِن۔'' ٹہلتے ٹہلتے اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی تو آنے والے کو اجازت دے کر خود کرسی پر جا بیٹھی۔ اس کی اجازت ملتے ہی آہستگی سے دروازہ کھلا اور اس کا ماتحت موہن اندر داخل ہوا۔

''بیٹھو۔'' اُس نے مؤدب کھڑے موہن کو سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جس کمرے میں وہ لوگ اس وقت موجود تھے، وہ دفتر کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ دراصل انہوں نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کی آڑ میں اپنا یہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ ایجنسی ظاہری طور پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام ہی کرتی تھی لیکن یہاں کے مالکان

و با اختیار لوگ ''را'' سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ایجنسی میں اپنی ضرورت کے تحت آنے جانے والوں کے ساتھ کب کوئی خفیہ ایجنٹ شامل ہو جاتا تھا، کوئی اندازہ بھی نہیں کر پاتا تھا اور بڑے بڑے منصوبے یہیں بیٹھ کر طے کر لیے جاتے تھے۔ اس ایجنسی کے علاوہ بھی انہوں نے کچھ اور ایسے خفیہ ٹھکانے بنا رکھے تھے جہاں بظاہر تو کوئی اور کام ہوتا تھا لیکن جس کی آڑ میں ''را'' والے سرگرم رہتے تھے۔

''سلّو جب اسٹور میں بم رکھنے گیا تھا تو تم ہی اس کا تعاقب کر رہے تھے نا موہن؟'' لمحہ بھر میں موہن کا جائزہ لینے کے بعد اس نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یس میڈم! سلّو نے میرے سامنے ہی بم والا لیدر بیگ اس شیلف میں رکھا تھا جہاں اور بھی دوسرے بہت سارے بیگ سجے ہوئے تھے۔''

اُس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ سنتھیا یہاں ایجنسی کے مالک کی ایک ایسی کزن کی حیثیت سے موجود تھی جو بیرونِ ملک سے آئی تھی اور اپنا کوئی کاروبار شروع کرنے سے پہلے مختلف امکانات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایجنسی میں کام کرنے والے ایسے ملازمین جو خالصتاً جائیداد کی خرید و فروخت وغیرہ کے کام ہی انجام دیتے تھے اور انہیں حقائق کا کوئی علم نہیں تھا، اس حیثیت سے اسے بہت عزت و احترام دیتے تھے اور انہیں اس کی وہاں وقت بے وقت آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ وہ مالک کی کزن تھی اور صرف اس کاروبار کے اسرار و رموز سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے نہ تو دیگر ملازمین کی طرح اس پر کوئی پابندی عائد ہوتی تھی اور نہ ہی اس کے احکامات سے رُوگردانی کی جا سکتی تھی۔ ویسے بھی اس عرصے میں سنتھیا نے جو کہ مسز سمانتا کے نام سے یہاں متعارف کروائی گئی تھی، کسی ملازم سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اس لیے لوگ اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔

''میں تمہاری رپورٹ کو درست مان لوں تو پھر اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ بم اسٹور کے بجائے کسی میدان میں جا کر کیسے پھٹا؟ ایسا تو صرف دو ہی صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ سلّو نے ہمیں دھوکا دیا ہو اور اچانک دل میں جاگ جانے والے جذبۂ حب الوطنی سے مجبور ہو کر پبلک میں بم بلاسٹ کرنا پسند نہ کیا ہو۔ لیکن جس طرح کی اس کی تربیت کی گئی تھی، اس کے بعد اس چیز کا امکان کم بلکہ بہت ہی کم ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کر رہے ہوں اور انہوں نے اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہوئی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نگرانی کرنے والوں میں سے کوئی بم والا بیگ اٹھا کر اسٹور سے لے گیا ہو اور اسے میدان میں پھینک دیا ہو لیکن پھر ذمے داری تم لوگوں پر عائد ہوتی ہے۔ تم اور تمہارے ساتھ سلّو کی نگرانی کرنے والے کو دھیان رکھنا چاہیے تھا کہ کہیں کوئی اور بھی تو اس کے اردگرد نہیں منڈلا رہا ہے۔''

حالات کا تجزیہ کرتی سنتھیا کا لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ موہن کو اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے سے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ وہ اور اس کے دو ساتھی آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹوں میں سلّو کی نگرانی کا کام کر رہے تھے لیکن اتفاق سے ان میں سے کسی نے بھی وہاں کسی دوسرے نگراں کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس کے بعد اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ کچھ اور لوگ بھی سلّو کی نگرانی کر رہے تھے۔

''اسٹور میں نصب کیمروں کی فلم نکلوا کر دیکھو کہ وہ کون لوگ تھے جو سلّو کے اردگرد منڈلا رہے تھے اور انہوں نے اس کے ایک اہم مشن کو ناکام بنا ڈالا۔'' موہن کی حالت سے بے نیاز سنتھیا نے اسے حکم دیا۔

''میں اس سلسلے میں پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں میڈم! لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ داخلی دروازے پر نصب کیمرے کی فلم غائب ہے جبکہ باقی دو کیمرے تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایسی جگہ نصب ہیں کہ ان کی ریکارڈنگ سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔'' موہن نے ڈرتے ڈرتے رپورٹ پیش کی۔

''شٹ.....'' سنتھیا نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ سلّو واقعی کسی خفیہ ادارے کی نظر میں آ گیا ہے اور وہ لوگ کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔''

''آپ کا اندازہ درست ہوسکتا ہے میڈم! لیکن ابھی تک کسی نے اسے چھیڑا نہیں ہے اور وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور واپس آنے کے بعد آرام سے اپنے گھر میں سویا پڑا ہے۔'' موہن نے اسے بتایا۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے سلّو پر اتنا کثیر سرمایہ اور محنت اس لیے نہیں لگائی تھی کہ اس سے کوئی کام لیے بغیر اسے ضائع کر دیں۔ لیکن حالات کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اپنا یہ مہرہ بساط سے اٹھانا ہی پڑے گا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور موہن کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اتنی آسانی سے جان چھوٹ جانے پر تیزی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سنتھیا نے ریاض انور سے رابطہ کیا۔

''آپ نے سلّو کی ملازمت کا کیا بندوبست کیا ہے ریاض انور صاحب؟'' کوشش سے اپنے لہجے کو معتدل بناتے ہوئے اس نے ریاض انور سے پوچھا۔

''میں آپ کو بتانے ہی والا تھا۔ میں نے اس کے لیے وزیر اعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں جگہ بنالی ہے۔ کل اس کا رسمی سا انٹرویو اور ٹرائل وغیرہ ہوگا۔ اس کے بعد وہ فوراً اپنی ڈیوٹی شروع کرسکتا ہے۔'' ریاض انور نے اسے بتایا تو وہ خوش ہوگئی اور اس کے شیطانی دماغ میں فوراً ہی ایک منصوبہ ترتیب پانے لگا۔

''میں تمہیں ایسے ہی ضائع نہیں ہونے دوں گی سلّو!..... تمہیں کچھ نہ کچھ تو ایسا کرنا ہوگا کہ اپنی تربیت کا حق ادا کرسکو۔''

ریاض انور سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ بڑبڑائی اور سامنے رکھے پیڈ پر بظاہر اُلٹی سیدھی لکیریں بنانے لگی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان اُلٹی سیدھی لکیروں کو بنانے کے دوران اس نے ایک بڑا مربوط منصوبہ بنا ڈالا تھا اور اب منتظر تھی کہ موقع ملے تو اس منصوبے پر عمل کر سکے۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان کے قدم بہت تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ وہ بہت ایمرجنسی میں پیرآباد سے لاہور پہنچا تھا جہاں کے ایک ہسپتال میں کچھ عرصہ قبل ہی اس کی ماں کو اسلام آباد سے منتقل کیا گیا تھا۔ پیرآباد سے اسلام آباد آنے جانے میں اسے مشکل پیش آتی تھی اور بعض اوقات وہ ایسی مصروفیات میں گھر جاتا تھا کہ چاہنے کے باوجود ماں سے ملنے کے لیے نہیں جا پاتا تھا۔ بے شک وہ کومے میں تھی اور ایک اعتبار سے دنیا کے کاروبار سے بے نیاز ہوگئی تھی لیکن پھر بھی اُسے ایسا لگتا تھا کہ ماں اس کا انتظار کرتی ہے اور اس سے ملنے نہیں جا پاتا تو اُداس ہوتی ہے۔ اس لیے اس نے خود اسے اسلام آباد سے لاہور منتقل کروالیا تھا۔ پیرآباد سے لاہور تک کا فاصلہ نسبتاً کم تھا اور وہ جلدی جلدی ماں کے پاس چکر لگا لیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ بہت ایمرجنسی میں اور خاصی جذباتی کیفیت میں ہسپتال پہنچا تھا۔

ہسپتال کی طرف سے اُسے اطلاع دی گئی تھی کہ اُس کی ماں کومے سے باہر آ گئی ہے اور اس اطلاع کے بعد تو اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایک پل کے لیے بھی پیرآباد میں رک سکے۔ عمیر آفندی کو اطلاع دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر وہ فوراً ہی روانہ ہوگیا تھا اور اب چند قدم کا فاصلہ اُڑ کر پار کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن ماں کے کمرے کے دروازے پر اسے روک لیا گیا۔

''میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں مسٹر خان! کہ آپ کی والدہ بے شک کومے سے باہر آ گئی ہیں لیکن ان کی جسمانی حالت بہت خراب ہے۔ ان کے اعضاء مناسب طریقے سے اپنا کام نہیں کر رہے ہیں۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زندگی بچانے کے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مگر آپ ان سے ملتے وقت یہ بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس مہلت بہت کم ہے۔ آپ کتنے گھنٹوں یا دنوں کے لیے انہیں اس عالم میں دیکھ سکیں گے، یہ تو صرف اللہ ہی جانتا ہے لیکن ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وقت بہت کم ہے۔''

دروازے پر اسے روک لینے والے ڈاکٹر نے تلخ حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے اس ساری خوشی کو کافور کر دیا تھا جو وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

ڈاکٹر کے راستہ دینے پر اس نے ماں کے کمرے کی طرف پیش قدمی کی تو اس جوش وخروش کی جگہ جو وہ پیرآباد سے اپنے دل میں لے کر آیا تھا۔ ایک تھکن سی قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی بستر پر ماں کا ڈھانچا سا وجود نظر آ گیا۔ جوانی میں خاصی صحت مند اور تندرست اس کی ماں پے در پے صدموں کو سہتے سہتے اپنا رنگ روپ، ہوش وحواس اور صحت سب کچھ کھو بیٹھی تھی لیکن یہ کمزور ونحیف وجود اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ تھی تو لگتا تھا کہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہے لیکن اب وہ چراغِ سحری کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے اپنی بوڑھی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ماں کی کھلی آنکھیں دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں جھلملا گئیں۔ وہ جو بڑے سے بڑے خطرے میں گھر کر کبھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا، ماں کے بچھڑ جانے کے ڈر سے رو پڑا۔

''مشابرم خان!'' ماں نے اپنی نحیف آواز میں اسے پکارا تو وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

''پہاڑوں کے بیٹے کی آنکھ میں آنسو اچھے نہیں لگتے بیٹا!'' اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور اس کا ہر لفظ سننے کے لیے مشابرم خان کو بھرپور توجہ دینی پڑ رہی تھی۔

اس نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اپنی مرتی ہوئی ماں کو اپنے آنسوؤں سے دُکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر کے بتائے حقائق ذہن میں ہونے کے باوجود لہجے میں بشاشت بھرتے ہوئے بولا

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں ماں! آج اتنے دنوں بعد تم نے مجھے دیکھا ہے ورنہ ہر بار تو میں ہی تمہیں دیکھ کر چلا جاتا تھا۔''

''میں بھی بس تجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے جاگی ہوں میرے بیٹے! ورنہ اس جسم میں اب جان نہیں ہے۔'' وہ سچ مچ چراغِ آخرِ شب تھی۔

''ایسا مت کہو ماں! تمہارے سوا میرا اس دنیا میں ہے ہی کون؟'' مشابرم خان نے اس کے گوشت سے محروم ہاتھ کو محبت سے چوما۔

''تو کسی اور کو اپنا بنا لے نا۔'' اس نے فرمائش کی۔

''وہ کیسے؟'' مشابرم خان نے اُلجھن آمیز انداز میں استفسار کیا۔

''تو گل سے شادی کر لے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اسے اپنی بہو بناتی۔'' ماں کی خواہش نے اسے بھونچکا کر دیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی ماں اس سے اس کے بھائی کی محبت اور منگ کو اپنانے کی فرمائش کرے گی۔ اکرم خان مر چکا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اکرم خان کو اپنی منگیتر سے کتنی محبت تھی اور وہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے چاہتی تھی۔ آخر وہ کیسے اسے اپنا سکتا تھا۔

''انکار نہ کرنا مشابرم خان! یہ میری آخری خواہش ہے۔'' ماں نے اس سے اعتراض کا ہر حق چھین لیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے بعد وہ کیا کہہ سکتا ہے۔ اپنے بھائی کی منگیتر کو اپنانا مشکل تھا تو مری ہوئی ماں کی خواہش کو رد کرنا مشکل ترین۔

''آپ اس سے ملتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ آپ کے پاس مہلت بہت کم ہے۔'' ڈاکٹر کے کہے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے تو انکار کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اگر وہ ناخوش رہ کر ماں کو خوش کر سکتا تھا تو یہ سودا زیادہ مہنگا نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے ماں!..... جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن پہلے تم جلدی سے صحت یاب تو ہو جاؤ تا کہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھ سکو۔'' اس نے ہامی بھرنے کے ساتھ ماں کو بہلانے کی کوشش کی۔

''اب اتنی مہلت نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے کہتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن لب بس ذرا سا کھنچ کر رہ گئے۔

''سوری سر! آپ کو پیشنٹ کے پاس کافی دیر ہو گئی ہے۔ زیادہ بولنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ باہر آ جائیں تا کہ یہ ریسٹ کر سکیں۔''

ایک نرس نے اندر آ کر ماں بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کی تو مشابرم خان کو نہ چاہتے ہوئے بھی باہر جانا پڑا۔ باہر نکل کر وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

زندگی آج اسے عجیب مقام پر لے آئی تھی۔ ایک طرف ماں سے جدائی کی گھڑی سامنے کھڑی تھی تو دوسری طرف اس کی خواہش کو پورا کرنے کی آزمائش سامنے تھی۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔ اسی پل کوئی اس کے برابر میں آ کر بیٹھا اور اس کی پیٹھ شفقت سے سہلانے لگا۔ اس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔

''ماموں! آپ.....'' برابر میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہاں ہسپتال میں ماموں سے ملاقات ہو جائے گی۔

''میں اور گل کل رات کو ہی یہاں پہنچے تھے۔ گل نے خواب میں تمہاری ماں کو دیکھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی، بابا! بی جان سے ملنے چلتے ہیں۔ مجھے بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بی جان مجھے یاد کر رہی ہیں۔ بس پھر ہم باپ بیٹی یہاں پہنچ گئے اور خدا کی قدرت دیکھو کہ اچانک ہی تمہاری ماں کو ہوش آ گیا۔ مجھے اور گل کو سامنے دیکھ کر بہت خوش بھی ہوئی اور روئی بھی۔ گل کو شروع سے اس نے اپنی بہو بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ اکرم خان زندہ ہوتا تو اب تک اس کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہوتی۔ لیکن اب..... اب تو سب تمہاری مرضی پر ہے۔ اس نے مجھ سے اپنی خواہش ظاہر کی تو میں انکار نہیں کر سکا۔ میں نے یہی کہا کہ اگر مشابرم خان راضی ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے۔ نہ ہی میری بیٹی میری بات ماننے سے انکار کرے گی۔ ہمارے ہاں بہنوں کو خالی ہاتھ لوٹانے کا رواج نہیں ہے اور یہ تو میری مرتی ہوئی بہن کی خواہش ہے۔'' مشابرم خان کا ماموں اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔ لیکن مشابرم خان خود بہت دیر تک کچھ نہیں کہہ سکا۔

''میں بھی ماں کی بات ماننا چاہتا ہوں۔ لیکن بار بار اکرم خان کا خیال آ جاتا ہے۔ گل مینا اس کی منگ تھی اس لیے میں نے ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن اور بھائی کی نظر سے دیکھا۔ اب اچانک اس رشتے کو بدلنا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔'' بالآخر اس نے ماموں کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار کر ہی دیا۔

''ہم سمجھتا ہے بچہ! ہمیں تمہارا دل کا بات معلوم ہے۔ لیکن کبھی کبھی حالات کے ساتھ ساتھ دل کو بھی

انا پڑتا ہے۔ تمہیں اپنا خالہ زاد بھائی یاد ہے نا۔ اس کو تو اپنے بھتیجا بھتیجی کو سہارا دینے کے لیے بھائی کی بیوہ ے نکاح پڑھانا پڑا تھا۔ عمر میں پورے دس سال بڑی تھی وہ عورت لیکن اس جوان کے بچے نے اپنے گھر کی ٹی کے لیے قربانی دی۔ اور آج دیکھ لو، دونوں میاں بیوی کتنے آرام سے رہ رہے ہیں۔ ان کی اور اولادیں ھی ہو گئی ہیں۔ جب بھائی کی بیوہ سے نکاح ہو سکتا ہے تو منگیتر کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ لیکن میں تم پر زور ہیں دیتا۔ جو تمہاری مرضی ہے کرو۔ میں نے جتنی بات کی، وہ بھی بہن کے خیال سے اور تمہارا ماموں ہونے ی وجہ سے ورنہ گل مینا کا باپ ہو کر تو میں ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میری بیٹی مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ اس ے لیے دو رشتے پہلے بھی آئے ہوئے ہیں۔ نہ بھی آتے تو میں اسے زندگی بھر اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔''

مشابرم خان کے ماموں کی رگوں میں دوڑتا پہاڑی خون بول اُٹھا۔ یقیناً اس نے بہن کی وجہ سے جتنی عاجزی دکھا دی تھی، وہ اس کے مزاج کے خلاف تھی اور اب فطری غیرت جاگ اُٹھی تھی۔

''ناراض نہیں ماموں! مجھے معلوم ہے کہ گل مینا جیسی اچھی لڑکی کے لیے کتنے لوگ خواہش رکھتے ہوں گے۔ میں تو بس آپ کو اپنے دل کی بات بتا رہا تھا ورنہ ماں کے دل کی خواہش تو میں رد نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ میرے بزرگ ہیں۔ ماں کی اس آخری خوشی کو پورا کرنے کے لیے میں آپ کو سارے اختیارات دیتا ہوں۔'' آخر کار مشابرم خان نے ہامی بھر ہی لی۔

اس کے بعد کے سارے مراحل بڑی تیزی سے طے ہوئے اور گل مینا جو اس کے بھائی کی محبت تھی، اس کی بنا دی گئی۔ بہت سادگی سے ہونے والے اس نکاح میں کسی قسم کا روایتی اہتمام نہیں تھا۔ نہ گل مینا کو چاندی کی جھانجھریں پہنائی گئی تھیں، نہ اس نے بلتی دولہاؤں کی طرح پھندنے والی سرخ ٹوپی لگائی تھی۔ یہاں تو دولہا دلہن کے لیے نئے جوڑوں کا بھی اہتمام نہیں ہو سکا تھا اور وہ بس چند بولوں کے بدلے ایک دوسرے کے نام لکھ دیئے گئے تھے۔

نکاح کے وقت اس نے گل مینا کو دیکھا تھا۔ سرخ انگارہ آنکھوں والی گل مینا بھی یقیناً اُس کی طرح اس بندھن کے لیے بادل ناخواستہ ہی تیار ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ دل میں پچھتا بھی رہی ہو کہ کیوں پھوپھی کی محبت میں ہوشے سے یہاں کھنچی چلی آئی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ بھی اس کی طرح صرف ماں کی خوشی کے لیے اس راستے میں بندھنے کے لیے راضی ہوئی ہو گی۔ یا ہو سکتا ہے کہ اس سے اس کی رضامندی معلوم ہی نہ کی گئی ہو۔ ان کے ہاں لڑکیوں سے شادی کے وقت ان کی پسند ناپسند معلوم کرنے کا رواج ہی کہاں تھا؟

اُس نے ایسی ہی اُلٹی سیدھی باتیں سوچتے ہوئے ایجاب و قبول کے مراحل طے کیے لیکن پھر اس کے بعد اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چراغِ سحری کی طرح بھڑکتی اس کی ماں کی زندگی کی لو نکاح کے فوراً بعد ہی بری طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ ڈاکٹرز نے فوراً ہی تمام متعلقین کو باہر نکال دیا کہ مریضہ کو طبی امداد دی جا سکے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے اور انہوں نے آگاہ بھی کر دیا تھا کہ ان کا بچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی آخری سانس تک کوشش تو کرنی ہی تھی۔ ڈاکٹرز کے تمام تر خلوص کے باوجود یہ کوشش رنگ نہ لا سکی اور انہیں بے چینی سے باہر ٹہلتے مشابرم خان، اس کے ماموں اور گل مینا کو بری خبر سنانی پڑی۔

سب کچھ واضح ہونے کے باوجود مشابرم خان کو اپنے حواس جواب دیتے ہوئے محسوس ہونے لگے اور یوں لگا کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ اس خبر کو سننے کے بعد اسے آگے کیا کرنا تھا اور کیا نہیں، اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ بے چارے ماموں کے لیے بھی لاہور اجنبی شہر تھا۔ ہوشے جیسی چھوٹی جگہ سے آ کر وہ یہاں ویسے بھی گھبرایا ہوا تھا، اب جو سر پر یہ نئی افتاد پڑی تو اور بھی پریشان ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی طرح مشابرم خان کے حواس ہی قابو میں لا سکے۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں موجود گل بینا بھی کچھ کرنے سے قاصر تھی اور سوائے رونے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یہی کام پوری دلجمعی سے کر رہی تھی۔ حواس باختہ کر دینے والی اس صورتِ حال میں لیاقت رانا کی فون کال رحمت ثابت ہوئی۔

انہوں نے شہریار کی سونپی ہوئی دیگر ذمے داریوں کی طرح یہ ذمے داری بھی بہت احسن طریقے سے سنبھال رکھی تھی اور مسلسل مشابرم خان کی ماں کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ ہسپتال انتظامیہ کو حکم تھا کہ کسی بھی غیر معمولی بات کی اطلاع انہیں ضرور دی جائے چنانچہ مشابرم خان کی ماں کی موت کی اطلاع بھی انہیں پہنچا دی گئی تھی۔ وہ فوراً ہی ایکٹیو ہو گئے اور مشابرم خان کو فون کر کے تدفین کے سلسلے میں اس کی رائے لینے لگے کہ آیا وہ ماں کی یہیں تدفین پسند کرے گا یا ان کی ڈیڈ باڈی بلتستان میں واقع اپنے گاؤں لے جانا پسند کرے گا۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے خود انتظامات کروانے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ ان کا فون سن کر مشابرم خان ذرا ہوش میں آیا اور سوچنے سمجھنے کے لائق ہو سکا۔

کاندے میں اب اس کا کچھ نہیں بچا تھا جس کے لیے وہ وہاں جانے کی خواہش کرتا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اپنی زمین سے کتنا پیار تھا۔ اگر مرنے سے پہلے اس سے اس کی رائے پوچھی جاتی تو وہ یقیناً اسی زمین میں دفن ہونے کی خواہش کرتی۔ اس نے ماں کی اُن کہی خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا اور لیاقت رانا سے بلتستان جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ بلتستان جس کے پہاڑوں میں اس کے باپ اور بھائیوں کی قبریں تھیں اور اب وہ وہاں ایک اور قبر میں اضافے کے لیے جانے کو تیار تھا۔ تکلیف کے ان لمحات میں اس کے دل نے شہریار کو بڑی شدت سے یاد کیا اور ماں کے ساتھ ساتھ بھائیوں جیسے مہربان باس کے لیے بھی چند آنسو سے چھلک پڑے۔

وہ اتنا مہربان تھا کہ آج اس کے نہ ہونے کے باوجود بھی اس کا کیا ایک انتظام اس مشکل گھڑی میں اس کے لیے سہارا بن گیا تھا۔ ورنہ لیاقت رانا کو کیا پڑی تھی کہ ایک عام سے ڈرائیور کی فکر کرتے؟ وہ دل کی گہرائیوں سے دعا کرنے لگا کہ اللہ کوئی ایسا معجزہ دکھا دے کہ ایک بار پھر اسے شہریار کا ساتھ نصیب ہو جائے اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ اگر اُسے ایک بار پھر یہ موقع ملتا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاں فشانی سے اس کی خدمت کرتا۔

❀----✪----❀

سلّو کو وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں شامل کر لیا گیا ہے۔"

یہ خبر سن کر شہریار انگشت بدنداں رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بھی وی آئی پی کا سکیورٹی اسٹاف ایسے ہی چلتے پھرتے نہیں رکھ لیا جاتا۔ اس مقصد کے لیے بہت دیکھ بھال کر قابلِ اعتماد لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں چار دن ہوئے وطن واپس آئے سلّو کو ملازمت دے دی گئی تھی۔ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ ملازمت ریاض انور کی خصوصی سفارش پر دی گئی ہے۔

ریاض انور اور وزیراعلیٰ صاحب میں خصوصی دوستانہ مراسم تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات رد نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ایک بار ریاض انور صرف اس وجہ سے عین وقت پر الیکشن میں بیٹھ گیا تھا کہ اس کا حریف موجودہ وزیراعلیٰ کی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی پارٹی کی خواہش پر انہوں نے ریاض انور سے فرمائش کی تھی کہ وہ ان کے امیدوار کے مقابل کھڑا نہ ہو۔

ریاض انور نے دوستی نبھانے کے لیے اتنی بڑی بات مان لی تھی لیکن یہ بھی کہا جاتا تھا کہ معاملہ صرف دوستی کا نہیں تھا، درونِ خانہ کوئی خاص ڈیل ہوئی تھی جس کے سبب ریاض انور کو لگ بھگ اتنا ہی فائدہ ہوا تھا جتنا کہ ایم پی اے بننے کی صورت میں ہوتا۔ ڈیل کا ایک ثبوت یوں بھی ملا کہ اگلے الیکشن میں وزیراعلیٰ کی پارٹی نے ریاض انور کے حلقے سے اپنا کوئی امیدوار کھڑا ہی نہیں کیا اور ریاض انور نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن جیتنے کے بعد وزیراعلیٰ کی پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ ماضی کے معاملات جو بھی تھے، بہرحال ابھی تو سلّو کے وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں شامل ہونے کا مسئلہ تھا۔

سلّو کی یہ ملازمت خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی اور یقیناً اس کے پیچھے کوئی گہری سازش تھی۔ سازش خدانخواستہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی، تب بھی ریاض انور پر براہِ راست کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔ ظاہراً تو وہ سلّو کے لیے بس ایک سماجی لیڈر کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس نے اپنے تعلقات استعمال کر کے برسوں بعد وطن واپس آنے والے ایک نوجوان کے لیے روزگار کا بندوبست کیا تھا جس میں ظاہر ہے کوئی برائی نہیں تھی۔ بعد میں وہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا، خلوصِ نیت سے کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سلّو کی نیت میں کھوٹ ہے یا یہ کہ وہ دشمن کی قید سے دشمن کا ایجنٹ بن کر آیا ہے، اس بات کی کسے خبر تھی۔ ریاض انور کی اچھی شہرت کے باعث اس کا یہ عذر قبول کر لیا جاتا لیکن شہریار کی تو یہ خواہش تھی کہ سلّو کا وار چلنے ہی نہ دے اور کسی نقصان سے قبل ہی اسے قابو کر لے۔ چنانچہ وہ فوری طور پر سرگرم ہو گیا۔ یہ تو اسے ذرا سی تفتیش سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اگلے ہفتے وزیراعلیٰ کے بیٹے کا ولیمہ ہے اور ولیمے کی اس دعوت میں صدر اور وزیراعظم سمیت ملک بھر سے بہت سی سیاسی اور سماجی شخصیات شرکت کے لیے آئیں گی۔ اس حساب سے اس تقریب میں سکیورٹی کے سخت انتظامات کا بھی اندازہ تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سلّو کے لیے جگہ ہی سکیورٹی اسٹاف میں بنائی گئی تھی اور یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ جہاں محافظ سے ہی حملے کا ڈر ہو، وہاں کوئی بھی سکیورٹی پلان کامیاب ہونے کا امکان نہیں رہتا۔

"مجھے بھی اپنے ایک بندے کے لیے وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں جگہ چاہیے۔" اس بات کا تعین کر لینے کے بعد کہ سلّو دہشت گردی کی جو بھی کارروائی کرے گا، اس کے لیے دعوتِ ولیمہ سب سے بہترین موقع ہو گا تو اس نے کرنل توحید سے مطالبہ کیا۔

"یہ اتنی آسان بات نہیں ہے۔ سکیورٹی اسٹاف میں اتنی اچانک اور آسانی سے کسی کو شامل نہیں کیا جاتا۔" اس کا مطالبہ سن کر انہوں نے اعتراض کیا۔

"کمال ہے۔ ریاض انور جیسا دوغلا اور ملک دشمن آدمی تو یہ کام لمحوں میں کر لیتا ہے لیکن آپ کے لیے یہ مشکل ہے؟" اس نے جھنجلا کر انہیں آڑے ہاتھوں لینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔

"وہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے، یہ تم بھی جانتے ہو۔ سلّو کو وزیراعلیٰ نے خود اپنی ذمے داری پر اپائنٹ کیا ہے اور اس کے ہر عمل کے لیے وہ خود جواب دہ ہوں گے۔ کسی متعلقہ محکمے یا افسر پر اس کی ذمے داری عائد نہیں ہو گی..... جبکہ میں اس حساب سے مجبور ہوں کہ میرا وزیراعلیٰ سے براہِ راست ایسا کوئی تعلق نہیں بنتا کہ وہ ریاض انور کے سفارشی کی طرح میرے سفارشی کو بھی فٹافٹ اپنے سکیورٹی اسٹاف میں شامل کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کروں گا، تب بھی تھرو پراپر چینل ہی کام کرنا ہو گا اور ڈر ہے کہ میرا بھجوایا ہوا بندہ خود نظروں میں آ جائے۔ ہم سے تو سیاست دان ویسے ہی بدکتے ہیں۔ وزیراعلیٰ میرے بھیجے ہوئے بندے کو سکیورٹی گارڈ سے بڑھ کر آئی ایس آئی کا کوئی جاسوس سمجھیں گے۔" کرنل توحید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے بہت تحمل سے اس پر صورتِ حال واضح کی تو جھنجلاہٹ کی جگہ بے بسی نے لے لی۔

''ایسی صورت میں تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے سر!..... دشمن کو کھل کھیلنے کا موقع مل جائے گا۔ ایک ایسی جگہ جہاں ہماری پہنچ ہی نہیں ہے، ہم کیا کر سکیں گے؟''

''تم اتنی ٹینشن مت لو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تھوڑی مہلت دو کہ میں وہاں تمہاری اور تمہارے کسی بندے کی موجودگی کو ممکن بنانے کے لیے جائزہ لے سکوں۔''

انہوں نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا تو اسے بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوا کہ کرنل توحید کتنے مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں جنہوں نے خراب حالات کا اندازہ ہونے کے باوجود کسی قسم کی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا..... جبکہ خود اس کا یہ حال تھا کہ بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح، کسی کو سلّو کے سر پر مسلط کر دے تاکہ اس کی بہترین نگرانی ہو سکے۔ ریاض انور سے وہ البتہ بعد میں ذرا اطمینان سے نمٹنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا کیونکہ جانتا تھا کہ سلّو کی طرح ریاض انور سے فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کرنل توحید نے اس سے دوبارہ تقریباً دس گھنٹے بعد رابطہ کیا۔

''سلّو کی نگرانی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں آئی ایس آئی کا ایک بندہ بھی شامل ہے۔ موجودہ حالات میں، میں نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے ذمے داری سونپ دی گئی ہے کہ وہ سلّو کی نگرانی کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ روٹین سے ہٹ کر بھرتی کیا جانے والا یہ شخص کسی سازش میں تو ملوث نہیں ہے۔ اس لیے تم بے فکر رہو کہ سلّو کسی بڑی تخریبی کارروائی کا بندوبست کر لے گا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہو سکے گی۔''

''تھینک یو سر!..... میری بھی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح سلّو کو نظر میں رکھا جا سکے۔ اس طرح کسی بہت بڑی کارروائی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے اور صرف یہ خدشہ رہے گا کہ وہ دعوت میں موجود کسی خاص شخصیت کو نشانہ نہ بنا لے۔ سب سے زیادہ خطرہ صدر اور وزیرِ اعظم کے لیے ہے۔ سلّو کے جو کوائف ہمارے پاس موجود ہیں، اس کے مطابق وہ بہت ماہر اور شاندار نشانچی ہے۔۔ اور ظاہر ہے کہ سکیورٹی اسٹاف میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کے پاس گن تو لازماً موجود ہو گی۔ وہ بے شک وہاں کوئی بم بلاسٹ نہیں کر سکے گا لیکن اپنے پاس موجود گن سے دو چار گولیاں چلا کر پورے ملک میں تہلکہ مچا دے گا۔ آپ جانتے ہیں نا کہ یہاں کسی وی آئی پی کی موت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہمارے وی آئی پیز خود زمین کے اندر جاتے جاتے بھی بے گناہ عوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کھینچ لے جاتے ہیں۔'' وہ از حد فکر مند تھا۔

''اس خطرے سے نمٹنے کے لیے تمہیں ہی کچھ کرنا ہو گا۔'' کرنل توحید نے جواب دیا۔

''مگر کیسے؟..... میرے ہاتھ پیر تو بندھے ہوئے ہیں۔ میرے پاس اس تقریب میں شامل ہونے کا کوئی راستہ ہوتا تو میں سلّو سے نمٹ لیتا۔ لیکن اب تو بالکل مجبور ہوں۔ اگر مجھے حفاظت کے بجائے تخریب کاری کے لیے وہاں جانا ہوتا تو پھر بھی اتنی مشکل نہیں ہوتی اور میں زبردستی وہاں جا گھستا۔ لیکن اب کیا کروں؟ رہ رہ کر اسی بات پر پچھتا رہا ہے کہ آتے کے ساتھ ہی سلّو کو شوٹ کیوں نہ کر ڈالا۔ اسے اتنی چھوٹ کیوں دے دی؟'' اس نے یہ سوچے بغیر کہ کرنل توحید اس کی باتوں سے اسے نا اہل آدمی تصور کر سکتے ہیں، ان کے سامنے اپنے مسائل بیان کیے کیونکہ اس وقت مسئلہ اپنی ذاتی انا یا خودداری کی حفاظت کا نہیں، ملکی سلامتی کا تھا جس کے آگے کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

''اتنے جذباتی پن سے نہ سوچو۔ تم نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک ہے۔ سلّو کو گولی مار دینا کوئی حل نہیں تھا۔

ب بھی تم حالات دیکھ کر اس کے لیے کوئی فیصلہ کرنا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے کہ تم اور تمہارا ایک ساتھی اس ت میں شریک ہو سکیں۔ تم ایک ٹی وی رپورٹر کے ساتھ کیمرہ مین کی حیثیت سے اس تقریب کی کوریج کے ے جاؤ گے جبکہ تمہارے ساتھی کے لیے میں نے بیروں میں جگہ بنا لی ہے۔ تم بتا دو کہ کسے اپنے ساتھ رکھنا کرو گے؟ تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی آئی ڈی کارڈ وغیرہ بنوایا جا سکے۔'' انہوں نے ایسی ش خبری سنائی کہ اس کا دل جھوم اٹھا اور ساری ٹینشن دُور ہو گئی۔ اب کم از کم سلّو اندھیرے کا تیر بن کر کسی کو میں نہیں لے سکتا تھا۔

⊛----✪----⊛

مشابرم خان نے اپنی ماں کی تدفین کاندے میں کی تھی۔ اسے اکرم خان کی قبر کے ساتھ ہی جگہ ملی تھی شاید یوں ایک ماں کو دوبارہ اپنے اس بیٹے کا قرب مل گیا تھا، جس کے بچھڑ جانے کے غم نے اسے ہوش بیگانہ کر دیا تھا۔

تدفین میں شرکت کے لیے ہوشے سے اس کے ماموں کے خاندان کے باقی افراد بھی کاندے آ گئے گل مینا، اس کی بھابی اور ماں نے مل کر مشابرم خان کے گھر کا نظام سنبھال لیا تھا کئی دنوں سے بند گھر کی صفائی پونچھ کر کے اسے دوبارہ رہنے کے قابل بنا لیا گیا تھا۔ غم بانٹنے کے لیے وہاں آنے والی گاؤں کی عورتوں کے لیے بھی وہی تینوں نمٹتی تھیں۔ رواج کے مطابق پہلے تو گاؤں کے مختلف گھروں سے کھانا بھیجا گیا پھر انہوں نے خود گھر کا چولہا جلا لیا۔ وہاں غربت و افلاس کے ڈیرے تھے اور کوئی بھی اتنا خوش حال نہیں تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو مسلسل تین وقت کا کھانا بھیجتا رہے۔ اس لیے مشابرم خان نے خود اس سلسلے کو روک دیا تھا۔ ماں کی تدفین ہو جانے کے باوجود وہ فوری طور پر وہاں سے روانہ نہیں ہوا تھا اور دو چار دن اپنے گھر اور گاؤں میں رہنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے ماموں کے خاندان نے البتہ تیسرے دن ہی واپسی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

''اگر تم چاہو تو ان لوگوں کے ساتھ ہوشے جا سکتی ہو۔'' سب لوگ روانگی سے قبل بیٹھے قہوے کے گھونٹ لے رہے تھے جب اس نے گل مینا سے یہ بات کہی۔

''یہ اب ہمارے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟ یہ یہیں رہ کر تمہاری خدمت کرے گی اور تم جہاں رہو گے ہمارے ساتھ جائے گی۔ ہمارے ہاں بیاہی بیٹیاں میکے میں نہیں رہتیں بلکہ خاوند کے ساتھ رہ کر اس کی خدمت کرتی ہیں۔''

گل مینا کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کا باپ بول اٹھا تو مشابرم خان کو خاموش ہونا پڑا۔ بے چاری گل مینا تو شروع سے ہی خاموش تھی اور نظریں جھکائے کسی چابی کی گڑیا کی طرح اپنے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

اس وقت میں مشابرم خان کو اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ اس ٹینشن یا باپ کے ردِ عمل میں سے کس بات پر خوش اور کس پر ناخوش تھی۔ قہوہ پی کر سب لوگ رخصت ہوئے تو گل مینا نے خالی پیالیاں سمیٹیں اور انہیں دھونے کے لیے لے گئی۔ مشابرم خان اکیلا ہی گھر کے آنگن میں رہ گیا۔ اس طرح اکیلے بیٹھ کر اسے شدت سے تنہائی کا احساس ہوا اور وہ وحشت زدہ سا ہو کر ماں کی قبر پر جانے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبرستان میں بالکل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں وہ سکون سے ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہا۔ ساتھ ہی اکرم خان کی قبر بھی تھی لیکن وہ اس قبر سے ایسے نظریں چرا رہا تھا جیسے اکرم خان اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہو اور نظریں ملیں تو شکوہ کرنے لگے کہ بھائی! تم نے میری محبت اور منگیتر کو اپنے نام کیسے لکھوالیا؟ کافی دیر ماں کی قبر پر گزارنے کے بعد وہ واپس پلٹا تو یہاں سے روانگی کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''تیاری کرلو۔ کل صبح ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' گھر پہنچتے ہی اس نے گل مینا کو یہ حکم سنایا جس کے جواب میں وہ زبان سے کچھ نہیں بولی لیکن اس کی حرکات وسکنات سے اس نے اندازہ کرلیا کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں روانگی کی تیاری کر رہی ہے۔ اس تیاری میں اپنا اسباب سمیٹنے کے ساتھ ساتھ گھر میں موجود سامان کو محفوظ طریقے سے رکھنا بھی شامل تھا۔

وہ مشابرم خان کے معمول سے واقف تھی کہ جب وہ شہر جاتا ہے تو طویل مدت تک واپس پلٹ کر نہیں آتا اس لیے ضروری تھا کہ گھر میں موجود سامان کو اس طریقے سے رکھا جائے کہ لمبی مدت تک بحفاظت رہ سکے۔ اس کام کو نمٹانے کے ساتھ ساتھ اس نے رات کا کھانا بھی تیار کیا اور سلیقے سے لا کر مشابرم خان کے سامنے رکھ دیا۔ مسور کی دال اور سرخ موٹی موٹی روٹیوں پر مشتمل یہ کھانا اسے بس کاندے میں ہی ملتا تھا شہری بود و باش میں ایسے کھانے کا کوئی گزر نہیں تھا۔ وہاں وہ چھنے ہوئے سفید آٹے کی پتلی پتلی چپاتیاں کھاتا تھا لیکن اسے اپنے گاؤں میں اُگنے والی ناقص گندم کے آٹے کی روٹیاں اب بھی بھاتی تھیں۔

کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نکاح کے بعد یہ پہلی رات تھی جب وہ اور گل مینا ایک چھت کے نیچے تنہا تھے لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے جھجک رہے تھے۔ چنانچہ وہ پوری رات سوتا جاگتے عجیب اضطراب کے عالم میں گزری۔ کل قبرستان سے واپس گھر آتے ہوئے وہ سواری کا انتظام کرتا آیا تھا اس لیے اس طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی، بس وقتِ مقررہ پر روانہ ہونا ضروری تھا۔

گل مینا نے صبح اُٹھ کر چابک دستی سے سب کام نمٹالیا۔ سامان تک وہ رات کو ہی سمیٹ کر رکھ چکی تھی ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے برتن دھو کر رکھے اور پھر وہ لوگ گھر کو اچھی طرح بند کر کے روانہ ہو گئے کاندے سے اسکردو تک کا سفر انہوں نے بذریعہ جیپ طے کیا۔ اس سفر میں ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ راستے بھر مشابرم خان کی ان لوگوں سے ہلکی پھلکی گفتگو چلتی رہی۔ البتہ گل مینا کا سفر خاموشی سے کٹا۔

اسکردو پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر گل مینا کو وہاں ٹھہرایا اور خود آگے کے سفر کے لیے ڈائیوو کے ٹکٹ لینے چلا گیا۔ ٹکٹ اسے مل گئے لیکن یہ اگلے دن کے تھے۔ آج کے دن یہاں سے لاہور جانے والی آخری ڈائیوو اس کے پہنچنے سے کچھ دیر قبل روانہ ہو چکی تھی۔

ٹکٹ حاصل کر کے وہ سیدھا ہوٹل کی طرف نہیں گیا۔ وہاں جانے کے لیے اس کا دل راضی ہی نہیں تھا۔ دل کی یہ کیفیت اس وجہ سے نہیں تھی کہ اسے گل مینا پسند نہیں تھی۔ وہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی اگر اس کی اکرم خان سے رشتے کی بات نہ چلی ہوتی تو وہ خود اس سے رشتہ جوڑنے میں خوشی محسوس کرتا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس نے گل مینا کے انداز میں بھی اپنے لیے جھجک محسوس کی تھی اور اسے یوں لگا تھا کہ وہ زبردستی اس نئے رشتے میں باندھ دی گئی ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ مزید کوئی جبر نہیں کرنا چاہتا تھا جان بوجھ کر اس سے دور رہ رہا تھا۔

اس وقت بھی ہوٹل جانے کے بجائے وہ خیالوں میں اُلجھا اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ بے خیالی ایسی تھی کہ اسے

ہی نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے قدم اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے وہ شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر ویرانے میں جا نکلا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کئی گڑھے بھی تھے۔

اس کے قدموں سے تھکن لپٹی تو وہ آرام کے لیے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اسے اس اندھیرے میں بیٹھ کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک سکون اور ٹھنڈک سی اُس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی ہو لیکن وہ زیادہ تر اس منظر پر اپنا ارتکاز قائم نہیں کر سکا۔ کوئی بہت دھیمی سی آواز تھی جو اسے اپنی پشت پر سے آتی سنائی دے رہی تھی۔ یہاں اس ویرانے میں انسانی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ پوری توجہ سے اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہیلو..... زیرو زیرو ون..... دِس اِز زیرو زیرو ٹو کالنگ یو۔'' غور کرنے پر اسے الفاظ سمجھ آنے لگے تو اس کے سارے حواس جاگ اُٹھے۔ یہاں کوئی آدمی تھا جو چھپ کر ٹرانسمیٹر پر کہیں رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یقینی طور پر اس کے دوست ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ احتیاط سے کچھ اور اس سمت کھسک گیا جہاں سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس بار اسے اندازہ ہو گیا کہ بات کرنے والا ایک گڑھے میں دبکا ہوا ہے اور بار بار کسی زیرو زیرو ون کو پکار رہا ہے۔ آخر کار اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں مر گئے تھے؟..... میں کب سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔ اوور۔'' کال ریسیو کرنے والے پر اس نے اپنا غصہ نکالا۔

''میں کھانا کھانے چلا گیا تھا۔ تم کہو، کیا خبر ہے؟ اوور۔'' دوسری طرف کی آواز قدرے مدھم ہونے کے باوجود مشابرم خان نے ہر لفظ واضح طور پر سنا۔

''تجھے ان حالات میں کھانے کی پڑی تھی۔ اگر باس کو پتہ لگ گیا نا تو تجھے اپنے پالتو کتوں اور بھیڑیوں کے آگے ڈال دے گا، اوور۔'' خود کو زیرو زیرو ٹو کہنے والے نے غصے کا اظہار کیا۔

''بھاشن چھوڑ اور یہ بتا کہ خبر کیا ہے؟ اوور۔'' دوسری طرف کوئی ڈھیٹ بندہ تھا جس نے ڈرے بغیر بیزاری سے پوچھا۔

''مچھلی دریا میں آ گئی ہے۔ تم لوگ اپنی جگہ پر کانٹا ڈال کر بیٹھ جاؤ، اوور۔'' اس نے جو جواب دیا، وہ کوڈ ورڈز میں تھا اس لیے مشابرم خان کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس سلسلے میں گفتگو کر رہے ہیں۔

''ہم بالکل تیار ہیں۔ تم فکر نہ کرو اور آرام سے جا کر سو جاؤ۔ کل صبح کا اخبار تمہیں مچھلی کے شکار کی تفصیل سنائے گا۔ اوور اینڈ آل۔'' دوسری طرف موجود شخص کی آواز میں ایسی سفاکی در آئی تھی کہ مشابرم خان نے اپنے وجود میں پھریری سی دوڑتی محسوس کی اور کچھ نہ سمجھنے کے باوجود وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ ٹرانسمیٹر پر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے وہ دو لوگ کسی خطرناک گہری سازش میں شامل ہیں۔ دوسرے شخص تک تو اس کی رسائی نہیں تھی لیکن یہاں موجود شخص کو وہ اب بخشنے والا نہیں تھا۔ اس شخص کے گڑھے سے باہر نکلنے سے قبل وہ بڑی سی حرکت میں آیا اور خود گڑھے کے کنارے پر جا پہنچا۔

''ہاتھ اٹھا کر شرافت سے باہر نکل آؤ ورنہ گولی مار دوں گا'' کنارے پر کھڑا ہونے کی وجہ سے اسے اندھیرے میں موجود شخص نظر آ رہا تھا۔ اسے نشانے پر رکھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں حکم دیا تو وہ شخص جو اس ویرانے میں کسی کی موجودگی کا گمان نہیں رکھتا تھا، بری طرح اُچھل پڑا۔ لیکن اچانک لگنے والے جھٹکے کے باوجود اس کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ اس نے مشابرم خان کے حکم پر عمل کرنے کے بجائے بہت تیزی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرکت کرتے ہوئے اس پر ایک فائر جھونک دیا تھا۔ مشابرم خان نے اس کے ریوالور سے نکلنے والا شعلہ دیکھ لیا تھا اس لیے پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا لیکن ہٹتے ہٹتے بھی اس نے ایک فائر جھونک دیا تھا۔

اب یہ اُس کی قسمت کی خوبی تھی یا گڑھے میں موجود شخص کی بدقسمتی کہ بغیر کسی نشانے کے چلائی گئی اندھی گولی سیدھی اس کے ہاتھ پر جا کر لگی جس میں اس نے ریوالور تھام رکھا تھا۔ اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔ مشابرم خان یہ تو نہیں جانتا تھا کہ اس کی چلائی گئی گولی نے کیا کمال دکھایا ہے لیکن چیخ سن کر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔

اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر خود بھی گڑھے میں چھلانگ لگا دی اور سیدھا اس شخص پر جا کر گرا۔ پہلے سے زخمی وہ شخص مشابرم خان کے مضبوط جسم کے نیچے دب کر بری طرح ڈکرایا لیکن پھر اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیے اور دونوں گھٹنوں کو موڑ کر مشابرم خان کی ناف کے نیچے ضرب لگائی۔ اس ضرب کو کھا کر مشابرم خان بری طرح بلبلا اُٹھا اور غصے میں ایک زوردار تھپڑ اپنے مقابل کے منہ پر دے مارا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اُس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون بہنے لگا۔ اندھیرے کی وجہ سے مشابرم خان کو خون نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے ہاتھوں نے خون کی چپچپاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔

جنونی کیفیت میں اُس نے اپنے مقابل کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑا اور گڑھے کی دیوار پر اس کا سر دے مارا۔ اس ضرب کو کھا کر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ڈھیلے پڑ جانے والے ہاتھ پیروں نے مشابرم خان کو ڈرا دیا کہ کہیں وہ جان سے ہی نہ چلا گیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اس کی نبض چیک کی تو اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے اور صرف بے ہوش ہوا ہے۔ اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کی اندرونی جیب میں حفاظت سے رکھا ہوا موبائل باہر نکالا اور اس میں موجود ٹارچ کو روشن کیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اب وہ اس شخص کے نقش و نگار کا جائزہ لے سکتا تھا۔ گوری رنگت، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے چغلی کھائی کہ وہ کوئی مقامی آدمی ہی ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کا گھیردار شلوار قمیض پہن رکھا تھا اور مقصد یقیناً خود کو اندھیرے میں گم کر لینا تھا۔ اگر مشابرم خان اتفاقاً اس طرف نہ نکلتا تو وہ بڑے آرام سے اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے نکل جاتا۔

ٹارچ کی روشنی میں مشابرم خان نے اس کے زخموں کا بھی جائزہ لیا۔ ہاتھ پر لگنے والی گولی نے اس کی کلائی کی ہڈی کو تھوڑا سا نقصان پہنچایا تھا لیکن گولی اٹکی نہیں تھی، جسم سے باہر نکل گئی تھی۔ زخم سے خون کا معمولی اخراج اب بھی جاری تھا۔ منہ پر بھی تھوڑا خون جما ہوا تھا۔ البتہ اس نے سر پر جو ضرب لگائی تھی، اس سے خون تو نہیں نکلا تھا لیکن ایک بڑا سا گومڑ ضرور بن گیا تھا۔

بے ہوش آدمی کے معائنے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اس کی جامہ تلاشی لی تو چمڑے کا ایک پرس برآمد ہوا۔ پرس میں اس کا شناختی کارڈ اور چند ہزار کی رقم موجود تھی۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام احمد یار خان لکھا تھا اور اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ وہ اسکردو گلگت کا رہنے والا ہے۔

مشابرم خان نے موبائل میں موجود ٹارچ کو گڑھے میں اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا تو اُسے اُس شخص کا ریوالور کے علاوہ ٹرانسمیٹر بھی مل گیا۔ ان سب چیزوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد اُس نے اس آدمی کی شلوار سے ازار بند کھینچ کر نکالا اور اس کی مدد سے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے نتیجے میں وہ کراہتا ہوا ہوش میں آ گیا۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں اسے مشابرم خان کا چہرہ صحیح طرح نظر نہیں آ

تھا لیکن اسے دیکھتے ہی یہ یاد آ گیا تھا کہ بے ہوش ہونے سے قبل اس پر کیا گزری تھی۔

''کک..... کون ہو تم؟ اور مجھ سے تمہیں کیا دشمنی ہے؟'' دانتوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس سے صحیح طور پر بولا نہیں جا رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے یہ جملے ادا کر پایا تھا۔

''دشمنی اور دوستی کا تعین اس وقت ہو گا، جب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے۔'' مشابرم خان نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''میرا نام احمد یار ہے۔ میں یہیں کا رہنے والا ہوں اور پولیس میں ملازمت کرتا ہوں۔'' اس نے بغیر کسی جھجک کے اپنا تعارف کروا دیا۔ نام اور پتہ تو مشابرم خان نے اس کے شناختی کارڈ پر خود بھی دیکھ لیا تھا، پیشے کا سن کر چونک پڑا۔

''پولیس میں کس عہدے پر کام کرتے ہو؟''

''میں اے ایس آئی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس ٹرانسمیٹر کا کیا کام ہے؟ کسی اے ایس آئی کے پاس میں نے کبھی ٹرانسمیٹر نہیں دیکھا۔ اس کے محکمۂ پولیس سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ تھوڑی نرمی سے کام لے رہا تھا لیکن اس کے شکوک و شبہات بہرحال دور نہیں ہوئے تھے۔ ''جھوٹ بولنے سے پہلے خیال رکھنا کہ میری بہت اوپر تک پہنچ ہے اور میں تمہارے محکمے سے تصدیق کر سکتا ہوں۔'' اس نے احمد یار کو تنبیہہ کی۔

''یہ میرا ذاتی شوق ہے۔'' احمد یار نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''شوق..... شوق میں ٹرانسمیٹر کون اپنے پاس رکھتا ہے؟'' مشابرم خان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس ہم چند دوستوں نے ایسے ہی شوق شوق میں دو تین ٹرانسمیٹر خرید لیے تھے اور کبھی کبھار ایک دوسرے سے رابطے کے لیے انہیں استعمال کر لیتے ہیں۔'' وہ ایک ایسی بات کہہ رہا تھا جو کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔

''اور اس کے لیے تم ایسے ویرانوں کا استعمال کرتے ہو؟'' مشابرم خان نے طنز سے پوچھا۔

''ہاں۔ کیونکہ لوگوں کے درمیان استعمال کرنے سے مسئلہ ہو سکتا تھا۔ کوئی شکایت کر دیتا تو خوامخواہ ہماری کھنچائی ہو جاتی۔'' وہ پوری ڈھٹائی سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

''بکواس بند کرو اور سچ سچ بتاؤ کہ تم کس مچھلی کے شکار کی بات کر رہے تھے؟'' اس بار مشابرم خان نے اس سے سختی سے پوچھا۔

''میرے دوستوں نے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا تھا لیکن جا نہیں سکا۔ بس انہیں بتا رہا تھا کہ شکار کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا۔'' اس نے کوئی اثر لیے بغیر اسی اطمینان سے جواب دیا۔ اس بار مشابرم خان کا ہاتھ اُس پر اُٹھ گیا۔

''میں نے تیری بکواس بہت سن لی۔ اب سچ بولنا شروع کر دے ورنہ ساری ہوشیاری ناک کے راستے باہر نکال دوں گا۔'' وہ غرّایا۔

''میں نے سچ بتا دیا، یقین کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی ہے۔'' مشابرم خان کا ہتھوڑے جیسا ہاتھ کھا کر بھی وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ اس بار مشابرم خان نے اس پر اپنا ہاتھ چھوڑا تو روکنا گوارا نہیں کیا۔ جگہ اور درد کی شدت کا تعین کیے بغیر وہ اسے بے تحاشا پیٹتا چلا گیا۔ غیر ملکی ساخت کے ٹرانسمیٹر نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ مقامی ہونے کے باوجود وہ ملک دشمنوں کا آلۂ کار ہے۔ پھر کچھ اس کی ذاتی فرسٹریشن بھی تھی جسے نکالنے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موقع مل گیا تھا اس لیے اس نے احمد یار کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ چیختا چلاتا اُس کی مار سہتا رہا لیکن ایک بار بھی یہ نہیں بولا کہ سچ بتانے کے لیے راضی ہے۔ اُس کی اس ڈھٹائی کو دیکھ کر مشابرم خان کو مزید تاؤ آ گیا اور اُس نے اُس کی زخمی کلائی پکڑ کر اُسے ایک جھٹکا دیا۔ گولی نے ویسے ہی اُس کی کلائی کا حشر بگاڑ دیا تھا۔ مشابرم خان نے جھٹکا دیا تو وہ بری طرح بلبلا اُٹھا۔

''ابھی یہ صرف ایک جھٹکا ہے۔ تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے اس زخم میں اُنگلی ڈال کر اتنی بری طرح کریدوں گا کہ تمہاری روح تک بلبلا اُٹھے گی۔''

مشابرم خان نے اُسے سفاکی سے دھمکی دی۔ ملک دشمنوں کے لیے ویسے بھی اس کے دل میں رحم کا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ احمد یار نے اس کی دھمکی کو سمجھ کر زبان کھولنے میں ہی عافیت جانی۔

''بب..... بتاتا ہوں، رُک جاؤ۔'' آخر کار اُس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ زبان کھولنے پر راضی ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مشابرم خان کو اس کے چہرے پر بے پناہ اذیت کے آثار نظر آئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ شخص جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

''بولو..... لیکن صرف سچ۔ مجھے جھوٹ کا گمان بھی ہوا تو تمہارے پورے جسم میں آگ بھر دوں گا۔ میرے پستول میں ابھی بہت گولیاں ہیں۔ یہ گولیاں تمہارے جسم کے ایسے حصوں میں اُتاروں گا کہ تم تڑپ اُٹھو گے لیکن موت نہیں آئے گی۔'' گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دیتے ہوئے اس نے ایسی دھمکی دی کہ احمد یار کا اذیت سے مسخ ہوتا چہرہ خوف کی دُھند میں چھپ گیا۔

''میں سچ بول رہا ہوں۔ اصل میں ہم اپنے نظریات و خیالات میں بہت پکے ہیں۔ جو ہمارے خلاف بولتا ہے، اسے ہم زندہ نہیں رہنے دیتے۔ آج جو آخری بس یہاں سے روانہ ہوئی ہے، اس میں ہمارے مخالفین بھی سفر کر رہے ہیں۔ راستے میں اس بس کو میرے ساتھی روک کر اس میں سوار ہمارے خلاف بات کرنے والوں کو قتل کر دیں گے۔''

آخر کار اس نے بھیانک سچائی اُگل ہی دی جسے سن کر مشابرم خان کا خون کھول اُٹھا۔ وہ جنونی قاتل نہ جانے کس کے سدھائے ہوئے تھے لیکن یہ طے تھا کہ ان کے جنون کا نشانہ بننے والے بے گناہ معصوم افراد ہوتے اور پھر قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس واردات کے بعد شروع ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں مزید کئی لوگ مارے جاتے۔

''اپنے ساتھی سے رابطہ کرو اور اسے روکو۔ اس سے کہو کہ کسی وجہ سے یہ مشن روک دیا گیا ہے۔'' اس نے وحشت کے عالم میں احمد یار کا گلا دبوچ لیا۔

''اب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے ساتھی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا تو مشابرم خان جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے احمد یار سے سچ اُگلوانے میں اتنی دیر لگ گئی تھی کہ سچائی کا جاننا اس کے لیے بیکار ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس شخص کو گولی مار دے۔ عالمِ وحشت میں اس نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔ قریب تھا کہ وہ اسے گولی مار دیتا لیکن احمد یار کے سکون نے اسے روک دیا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر یوں پُرسکون ہو گیا تھا جیسے یہی اس کی خواہش اور راہِ نجات ہو۔

مشابرم خان کو یک دم ہی ہوش آ گیا۔ اگر وہ اس شخص کو مار دیتا تو اس کے باقی ساتھیوں اور اس بارے تک کیسے پہنچتا جس کا ذکر اس نے ٹرانسمیٹر پر اپنے ساتھی سے کیا تھا۔ اُس کی انگلی پستول کی لبلبی سے ہٹ گئی اور اس نے ریوالور کا دستہ اُس کے سر پر اتنی قوت سے مارا کہ وہ صرف بے ہوش ہو جائے۔ اس کام سے

فارغ ہو کر وہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس پر سگنل درست طریقے سے نہیں آ رہے تھے۔ مجبوراً اُسے اس گڑھے سے نکل کر واپس سڑک پر آنا پڑا۔ یہاں اس کے اتنے مضبوط روابط نہیں تھے جو وہ اس نازک معاملے کو اوپر تک لے جا پاتا۔ مجبوراً اسے مشورے اور مدد کے لیے یہاں سے بہت دُور لاہور میں بیٹھے ذیشان سے رابطہ کرنا پڑا۔

''تم وہیں رُکو۔ میں کسی سے بات کر کے تمہارا نمبر اسے دیتا ہوں تاکہ کوئی ذمے دار شخص خود تم سے رابطہ کر لے۔'' اس کی زبانی تفصیلات سن کر ذیشان نے اسے ہدایت دی۔ جواباً وہ صرف ''یس سر'' ہی کہہ سکا لیکن اس ویرانے میں تنہا کھڑے ہو کر انتظار میں وقت گزارنا آسان نہیں تھا۔

اتنے ہنگامے کے بعد وہ قنوطیت زدہ کیفیت بھی باقی نہیں رہی تھی جس میں تنہا بیٹھ کر تارے گننا اچھا لگتا ہے۔ اسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ہوٹل کے کمرے میں تنہا موجود گل مینا پریشان ہو رہی ہو گی۔ اسے معلوم تھا کہ ہوشے کی مختصر آبادی میں کھیل کُود کر بڑی ہونے والی گل مینا کی زندگی میں گنتی کے چند ہی ایسے مواقع آئے ہوں گے جب وہ اپنے گاؤں سے باہر نکلی ہو اور ان چند مواقع میں سے کوئی ایک بھی موقع ایسا نہیں ہو سکتا تھا جب اسے کسی ہوٹل میں تنہا رہنے کا اتفاق ہوا ہو۔ لیکن آج اس کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کے ارادے کا بہت زیادہ دخل نہیں تھا اور وہ صرف کچھ دیر باہر کھلی ہوا میں تنہا وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن پھر حالات ہی ایسے ہو گئے کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا اور اب بھی معلوم نہیں تھا کہ کتنی دیر میں خلاصی ہو۔ ذیشان کے کہیں رابطہ کرنے اور کسی ذمے دار شخص کے یہاں تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا۔

اُسے افسوس ہوا کہ ہوٹل سے نکلنے سے قبل اس نے وہاں کا فون نمبر کیوں نہیں لیا، ورنہ کم از کم فون پر ہی گل مینا کے لیے پیغام دے دیتا۔ پیغام ملنے کی صورت میں وہ زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتی لیکن اب تو جانے کیا کیا سوچ رہی ہو گی۔ شاید اسے یہ گمان ہوا ہو کہ مشابرم خان اسے ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر خود کہیں فرار ہو گیا ہے۔ عجیب لایعنی سی سوچیں تھیں جنہوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

سوچوں کی اس یلغار سے بچنے کے لیے وہ ایک چکر اس گڑھے تک بھی لگا آیا جہاں احمد یار بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی نبض چیک کر کے اس نے اطمینان کر لیا کہ ابھی اسے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگے گا۔ ویسے اگر وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو بندھے ہوئے ہاتھ پیروں اور زخمی وجود کی وجہ سے وہاں سے فرار ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

احمد یار کی طرف سے اطمینان ہو جانے پر وہ ایک بار پھر سڑک پر واپس آ گیا کیونکہ وہاں سے ہٹ کر موبائل پر سگنل ہی نہیں آ رہے تھے اور ذیشان کے مطابق اس سے تعاون کے لیے آنے والوں میں سے کسی کو پہلے اس کے موبائل پر ہی رابطہ کرنا تھا۔ آخر کار یہ انتظار ختم ہوا اور اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔

''میں میجر اسفندیار بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ مسٹر مشابرم خان ہیں؟'' کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ہی اس کے بارے میں بھی تصدیق چاہی۔

''جی ہاں، میں مشابرم خان ہی ہوں۔ آپ کو میرا نمبر یقیناً میجر ذیشان سے ملا ہو گا۔'' اس نے اپنے بارے میں تصدیق کرتے ہوئے ذیشان کا حوالہ دینا مناسب سمجھا۔

''یس، مجھے اُن کا ریفرنس دیا گیا ہے۔ آپ سب سے پہلے مجھے اپنی لوکیشن سے آگاہ کریں تاکہ ہماری ٹیم آپ تک پہنچ سکے۔'' مزید باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔ مشابرم خان نے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر کوئی غیر متعلق بات نہیں کی اور تفصیل سے اس جگہ کے بارے میں بتانے لگا جہاں اس وقت وہ موجود تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ ویٹ کریں، ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ پوائنٹ پر پہنچ کر میں اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس تین بار بجھا کر جلاؤں گا۔ تیسری بار لائٹ جلنے پر آپ روشنی میں آ جایئے گا۔'' لوکیشن کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد میجر اسفندیار نے اسے ہدایت کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

مشابرم خان ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھ کر گھڑیاں گننے لگا۔ ویسے تو اس وقت یہاں کسی اور کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن کسی حادثاتی اتفاق سے بچنے کے لیے اس نے یہ احتیاط مناسب سمجھی تھی کہ خود کو چھپا کر رکھے۔ آخر کار اسے سڑک پر گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دے گئی۔ اس آواز کو سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے لیکن اس نے فوری طور پر سامنے آنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی پتھر کی آڑ میں دبک کر سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔

آخر کار سڑک پر جیپ کی روشنیاں نمودار ہو گئیں۔ یہ متحرک روشنیاں اس سے کچھ فاصلے پر آ کر ساکت ہو گئیں تو وہ سمجھ گیا کہ آنے والے آ گئے ہیں۔ مزید تصدیق گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے تین بار جلنے بجھنے سے ہو گئی۔ تیسری بار بجھ کر لائٹ روشن ہوئی تو وہ سامنے آ گیا۔ فوراً ہی جیپ سے دو تین افراد کود کر اُترے۔

''میجر اسفندیار.....'' آنے والوں میں سے سب سے زیادہ دراز قد شخص نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''میں مشابرم خان ہوں۔ میری ہی اطلاع پر آپ کو زحمت دی گئی ہے۔'' جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں تنہا تھا اس لیے یہ بات قابلِ فہم تھی کہ وہی مشابرم خان ہو سکتا ہے۔

''ہمیں اس مشکوک آدمی تک گائیڈ کر دو۔'' اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر میجر اسفندیار نے اسے حکم دیا تو وہ چپ چاپ ان لوگوں کی راہنمائی کے لیے آگے بڑھ گیا۔ گڑھے میں احمد یار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

''یہ تو خاصا زخمی ہے۔ اسے فوری طبی امداد دینی پڑے گی۔'' وہ لوگ اپنے ساتھ طاقتور سرچ لائٹس لائے تھے جن کی روشنی میں انہوں نے احمد یار کی ابتر حالت کو فوراً ہی محسوس کر لیا۔ اب تک موبائل کی محدود روشنی پر گزارہ کرنے والے مشابرم خان کو بھی پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے احمد یار کے ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو اس کے زخموں کو صحیح ہونے میں خاصا وقت لگتا

''سوری مسٹر خان! آپ کو تکلیف ہو گی لیکن اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے لیے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ اس شخص کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم یہاں مزید وقت ضائع کر سکیں۔ اگر یہ مر گیا تو ہمارے لیے راستہ بند ہو جائے گا اور ہم سولہ بے گناہ شہریوں کے اصل قاتلوں تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔''

میجر اسفندیار نے جتنے اعتماد سے مقتولین کی تعداد کا ذکر کیا، اس سے مشابرم خان نے سمجھ لیا کہ واقعی احمد یار نے صحیح کہا تھا کہ اب تک اس کے ساتھی اپنا کام کر چکے ہوں گے۔ احمد یار سمیت جیپ واپسی کے راستے پر گامزن ہوئی تو اس نے میجر سے اس بارے میں تصدیق بھی کر لی۔ اس نے دھیمی آواز میں نہایت دکھ کے ساتھ تصدیق کی کہ واقعی وہ واقعہ پیش آ چکا ہے اور کئی بے گناہ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔

میجر اسفندیار کی زبانی واقعے کی تفصیلات سن کر اس کا دل افسردہ ہو گیا پھر وہ سارے راستے کوئی بات

ں کر سکا۔ یہاں تک کہ زخمی کو دو فوجی اہلکاروں کی نگرانی میں ہسپتال پہنچا کر وہ لوگ آرمی کے ایک ٹھکانے لے گئے۔ یہاں مشابرم خان کا تفصیلی بیان ریکارڈ کیا گیا اور پھر اسے ہوٹل واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہار کا ریوالور اور ٹرانسمیٹر اُس نے راستے میں ہی میجر کے حوالے کر دیا تھا اور اس بھرپور تعاون کے بعد وہاں روکے جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ چنانچہ نہ صرف واپسی کی اجازت مل گئی بلکہ اسے پورے ت و احترام کے ساتھ آرمی کی جیپ میں ہوٹل تک پہنچایا گیا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ سیدھا اس کمرے کی طرف گیا جو اس نے اپنے اور گل مینا کے لیے بک کروایا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔

''کون.....؟'' اندر سے گل مینا کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو گل! میں ہوں، مشابرم خان۔'' اس نے جواب دیا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اس نے ے دروازے سے ابھی پہلا قدم ہی اندر رکھا تھا کہ گل مینا اس سے بری طرح لپٹ گئی اور زور زور سے نے لگی۔ مشابرم خان اس افتاد پر بوکھلا گیا۔ اسے اندازہ تو تھا کہ اس کے اتنی دیر تک غائب رہنے پر وہ گھبرا ی ہو گی لیکن اس درجے خوف زدہ ہو گی، یہ اندازہ نہیں تھا۔

''کیا ہو گیا ہے گل مینا! خود کو سنبھالو۔'' وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟..... یہ بھی نہیں سوچا کہ اکیلی گل مینا یہاں اس اجنبی جگہ پر کیا ے گی؟'' وہ اس سے بدستور لپٹی ہوئی روتے روتے شکوہ کرنے لگی۔

''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا، بس ایک کام میں پھنس گیا تھا۔ تم میری بیوی ہو، بھلا میں تمہیں ڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟'' وہ اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔ کمرے کا دروازہ اس نے ہی دھکا دے کر بند کر دیا تا کہ یہ منظر اور گل مینا کی آواز کسی کو متوجہ نہ کر سکے۔

''تم سچ کہہ رہے ہو..... تم مجھے چھوڑو گے تو نہیں؟'' بے یقینی سے کہتی ہوئی وہ اس سے الگ ہوئی اور ی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''کہہ دیا نا بابا! نہیں چھوڑوں گا۔ چھوڑنا ہوتا تو تمہیں وہیں گاؤں میں چھوڑ کر آ جاتا، یہاں تک لانے ا کیا ضرورت پڑی تھی؟'' اس نے کچھ جھلا کر اسے یقین دلایا لیکن یہ طے تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہونے ہ باوجود اس پر زیادہ غصہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی متورم آنکھیں اور چھوٹی سی سرخ ناک کو دیکھ کر اندازہ ہو ا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔

''چھوڑ کر آئے نہیں، لیکن آنا تو چاہتے تھے۔ جب ہی تو مجھے بابا کے ساتھ ہوشے جانے کے لیے کہہ ے تھے۔'' اس نے کاندے والے گھر میں کہی گئی اس کی بات کا حوالہ دیتے ہوئے شکوہ کیا۔

''وہ تو میں اس خیال سے کہہ رہا تھا کہ اگر تمہارا دل میرے ساتھ آنے کے لیے راضی نہ ہو تو تم اپنے اپ کے گھر چلی جاؤ۔'' مشابرم خان زندگی میں پہلی بار ایسی نازک صورتِ حال میں پھنسا تھا جس میں ہاتھ پیروں سے دشمن کے وار سے بچنے کے بجائے زبان سے ایک نازک اندام حسینہ کے سامنے اپنا ع کرنا پڑ رہا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے ہاں بیاہی ہوئی بیٹیوں کا ماں باپ کے گھر رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا؟'' ے یاقوتی لبوں پر شکوہ مچلا۔

وقت کے ان لمحات میں وہ کہیں سے بھی اکرم خان کی محبوبہ یا منگیتر نہیں لگ رہی تھی، وہ بس ایک بیوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ روایتی بیوی جسے اپنے شوہر کا گھر اور قرب ہی سب سے زیادہ بھاتا ہے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مشا
خان کے سارے واہمے اور شکوک بھی اُڑن چھو ہو گئے اور یاد رہا تو صرف اتنا کہ سامنے موجود دل رُبا سی لڑ
اس کی بیوی ہے جس پر اسے شرعی اور قانونی سارے حقوق حاصل ہیں۔ پہلی بار اس نے گل مینا کو صرف ا
صرف اپنے رشتے کے حوالے سے دیکھا تو غیر آباد دل میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔

''معاف کر دو۔ آئندہ کبھی میں تمہیں تمہارے باپ کے گھر بھیجنے کی بات نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ ا
گھر میں اور اپنے پاس رکھوں گا۔'' گل مینا اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑی تھی۔ اس لیے اسے اپنی بانہو
کے حصار میں قید کر لینے میں اسے ذرا مشکل پیش نہیں آئی۔ کچھ دیر قبل بے ساختگی میں اس سے ازخود لپ
جانے والی گل مینا اُس کی اس اچانک پیار بھری پیش قدمی پر سٹپٹا سی گئی لیکن کہیں جائے فرار نہیں تھی۔ وہ
سے دہری ہوتی کسی لچکیلی شاخ کی طرح مشابرم خان کی بانہوں میں لرزنے لگی۔ مشابرم خان نے اس لرز
کانپتی، شرماتی دوشیزہ کو بڑی نرمی اور احتیاط سے اپنے وجود میں سمو لیا۔ پہاڑوں کے سنگلاخ بیٹے نے زندگی
یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا اور بہت خوش تھا۔

⊛----✪----⊛

ولیمے کی تقریب کا اہتمام وزیراعلیٰ ہاؤس میں ہی کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں مہمانوں کی بڑی تعداد
مدعو کیا گیا تھا اور اس حساب سے سکیورٹی کا بھی سخت انتظام تھا۔ وزیراعلیٰ ہاؤس جانے والی سڑک اس روز
ٹریفک کے لیے بند کر دی گئی تھی اور مقررہ اوقات میں صرف وہی لوگ وہاں سے گزر سکتے تھے، جن
پاس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ موجود تھا۔ آنے والوں کو دعوت نامہ دکھانے کے لیے علاوہ اپنی شناخ
بھی ظاہر کرنی پڑتی تھی۔

شہریار جو عادل خان کی شخصیت اختیار کرنے کے بعد ویسے ہی بالکل بدل گیا تھا، اس موقع پر بھی ا
حلیے میں کچھ تبدیلیاں کر کے آیا تھا۔ ہفتے بھر میں اس نے اپنی شیو خاصی بڑھا لی تھی۔ گھنی مونچھوں، کاشک
لینس اور بدلے ہوئے ہیئر اسٹائل نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کافی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ اس
میں اس کے لیے نیوز چینل کے کیمرہ مین کی حیثیت سے کارڈ بھی بنوا دیا گیا تھا اور یوں اس کے دعوت
میں شرکت کا انتظام ہو گیا تھا۔

دوسری طرف جاوید علی پہلے ہی بیرے کی حیثیت سے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کام کے لیے اسے
تھوڑی سی تربیت بھی لینی پڑی تھی جبکہ شہریار کو کیمرہ مین کی جگہ لینے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا
طالب علمی کے زمانے میں اسے فوٹو گرافی کا شوق رہا تھا اور اس شوق میں وہ مختلف کیمروں کے ساتھ
ہینڈی کیم بھی استعمال کرتا رہا تھا۔ چنانچہ اب جو کیمرہ اسے استعمال کے لیے دیا گیا، اس کے بارے میں
بنیادی معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اسے استعمال کرنے کے لائق ہو گیا۔ یوں بھی اس بات سے
فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ تقریب کے مناظر فلما پاتا ہے یا نہیں۔ اس کی تقریب میں شرکت کا مقصد سلّو
رکھنا اور اسے دہشت گردی کی کسی کارروائی سے روکنا تھا۔

پورے ہفتے کے دوران آئی ایس آئی کے اہلکار کی مدد سے سلّو پر بھرپور نگاہ رکھی گئی تھی۔ اس اہلکار
مطابق اس عرصے میں سلّو نے کوئی مشتبہ حرکت نہیں کی تھی بلکہ پوری دیانت داری سے اپنے فرائض انجام
رہا تھا۔ اس مرحلے میں باہر کے کسی فرد نے اس سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا، نہ ہی وہ خود کہیں گیا تھا۔ اس کی

روانگی میں اس کے کوارٹر کی تلاشی بھی لے لی گئی تھی لیکن اس کے سامان میں سے کوئی مشکوک شے برآمد نہیں
ہوئی تھی۔

ساری تفصیلات سن کر ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ سلّو پر بے جا شک کر رہے ہیں لیکن شہریار جانتا تھا کہ سب
ٹھیک نظر آنے کے باوجود ٹھیک نہیں ہے کیونکہ سلّو کا وہاں موجود ہونا ہی سب سے بڑی گڑبڑ کی نشانی تھی
ہر طرف سے کلیئرنس ملنے پر وہ اپنے اس خیال پر راسخ ہوتا جا رہا تھا کہ سلّو اس تقریب میں بم بلاسٹ
جیسی کوئی کارروائی کرنے کے بجائے اپنے پاس موجود ہتھیار سے کام لے گا۔ اور زیادہ امکان یہی تھا
کہ وہ کسی اہم شخصیت کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔

صدر اور وزیراعظم دونوں کی تقریب میں شرکت کی اطلاع کی وجہ سے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ
ان میں سے کسی ایک یا دونوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ البتہ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اس
کارروائی کے بعد سلّو نے اپنے انجام کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اتنی زیادہ سکیورٹی کے بعد یہ تو ممکن
نہیں تھا کہ وہ وہاں سے صحیح سلامت نکل پاتا۔ اس لیے خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے آقاؤں سے اپنی
جان کی قیمت وصول کر لی ہو۔ دنیا میں ایسے سرپھروں کی کمی نہیں تھی جو اپنی جان کے عوض اپنے پیاروں کے
لیے عیش و عشرت کی زندگی خرید لیتے ہیں۔ شاید سلّو نے بھی ایسا ہی کوئی سودا کیا تھا لیکن مسلسل نگرانی کے
باوجود ان کی نظر میں ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔

اس نے ملک بھر کے بینکوں کا ریکارڈ چیک کروا کر اس بات کی بھی تصدیق کر لی تھی کہ سلّو، اس کے
والدین یا منگیتر میں سے کسی کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں کوئی بڑی رقم تو جمع نہیں کروائی گئی تھی.....
لیکن ایسا بھی کچھ نہیں تھا۔ سلّو کے نام سے ایک اکاؤنٹ موجود ضرور تھا لیکن اس میں موجود ایک ڈیڑھ لاکھ کی
رقم ایسی نہیں تھی جسے اس کی جان کی قیمت سمجھا جا سکتا۔ یہ رقم پچھلی تاریخوں میں شاید اس کے انجام دیے گئے
ان دو کاموں کا معاوضہ تھی جو پہلے ہی ان کی نظر میں تھے۔ ویسے بھی اب تک ان کے سامنے سلّو کی جو شخصیت
آئی تھی، اس کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ قطعی خودکشی کا رجحان رکھنے والا آدمی نہیں ہے اور زندگی کو
انجوائے کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔

سلّو کے بارے میں اس کے اندازے کتنے درست تھے اور کتنے غلط، اس بات کا اندازہ تو بعد میں ہی ہو
سکتا تھا۔ فی الحال تو اُسے اس پر نظر رکھنی تھی اور وہ یہ کام کیمرے کی آنکھ کی مدد سے بخوبی کر رہا تھا۔ اس کے
ساتھ موجود رپورٹر کو پہلے ہی اس کے بارے میں ہدایات دی جا چکی تھیں اس لیے وہ اس کے معاملات میں
دخل اندازی کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنا کام نمٹا رہی تھی بلکہ اس کے کہنے پر اس طرف کا رخ کرنے پر
بھی تیار ہو جاتی تھی جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ بظاہر تقریب کی کوریج کرتا ہوا وہ سلّو پر پوری نظر رکھے ہوئے
تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جاوید علی بھی یہی کام کر رہا تھا۔ بیرے کی سفید براق یونیفارم میں اس نے بھی اپنا
حلیہ خاصا تبدیل کر رکھا تھا اور مشروبات کے گلاس ٹرے میں رکھ کر اِدھر اُدھر گھومتا بظاہر مہمانوں کی خاطر
تواضع کر رہا تھا لیکن حقیقتاً سلّو ہی کی نگرانی کر رہا تھا۔

سلّو کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے اور وہ کسی ماہر سکیورٹی گارڈ ہی کی طرح چاروں طرف نگاہ
رکھے ہوئے تھا۔ اس کی نگاہ میں کسی شکرے کی سی لپک تھی۔ ہر آنے والے نئے مہمان کو وہ بڑی جانچتی ہوئی
نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وزیراعلیٰ کی سخت سیاسی مخالف شخصیت کی آمد تقریباً وزیراعظم کے ساتھ ساتھ ہی ہوئی
اور اس وقت شہریار نے نوٹ کیا کہ سلّو کی آنکھوں کی شکاری چمک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے اور چہرے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نارمل نظر آنے والے تاثرات میں بھی کچھ تناؤ کی سی کیفیت آ گئی ہے۔ اس نے جاوید علی کو اشارہ کیا کہ ہوشیار رہے۔ اس کے خیال کے مطابق اب وہ وقت آ گیا تھا، جب سلّو حرکت میں آ سکتا تھا۔ وہ خود بھی پوری تندہی سے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

وزیراعظم کی آمد کے بعد تقریب کے شرکاء کی ساری توجہ اُنہی کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور دُولہا دُلہن کی حیثیت ثانوی سی رہ گئی تھی۔ وزیراعلیٰ خود ان کا ہاتھ تھام کر اُنہیں اسٹیج پر لے گئے تھے جہاں دُولہا دُلہن نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور پھر فوٹو سیشن شروع ہو گیا۔

لوگ دُولہا دُلہن سے زیادہ وزیراعظم کے ساتھ تصویر اُتروانے کے خواہش مند تھے۔ وزیراعظم کی حیثیت اس تقریب میں اس لیے بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی کہ صدر نے عین وقت پر ناسازیٔ طبع کی وجہ سے تقریب میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

سننے میں آ رہا تھا کہ ان کے ساتھ دل کا کوئی مسئلہ ہے اور عنقریب وہ چیک اپ کے لیے بیرونِ ملک روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کی عدم شرکت کی وجہ سے اس بات کا امکان بہت بڑھ گیا تھا کہ سلّو کا نشانہ وزیراعظم ہی ہوں گے۔ کیمرہ مین کی حیثیت سے شہریار کو موقع مل گیا تھا کہ وہ اسٹیج کے قریب رہ سکے۔

وہاں موجود رہتے ہوئے اس نے دیکھا کہ سلّو بھی غیر محسوس طریقے سے اسٹیج کی طرف کھسک آیا ہے اور عین اس وقت پر جبکہ وزیراعلیٰ کی مخالف سیاسی شخصیت تصویر بنوانے کے لیے اسٹیج پر چڑھ رہی تھی، اس نے سلّو کی گن کو سیدھا ہوتا ہوا دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ لرز گیا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ سلّو کا نشانہ وزیراعظم نہیں بلکہ اُن کی شخصیت ہے۔ اسے دشمن کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ اگر وزیراعلیٰ کے ہاں ہونے والی تقریب میں انہی کے ایک ایسے سکیورٹی گارڈ کی گولی سے جسے صرف ہفتہ بھر قبل انہوں نے خود بالکل غیر رسمی طریقے سے اپائنٹ کیا تھا، اگر ان کے مخالف سیاست دان کا قتل ہو جاتا تو ملک بھر میں ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ وزیراعلیٰ کے مخالفین اس قتل کو اُن کی سازش قرار دے کر ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے اور اس کے بعد احتجاج، دھرنے، لانگ مارچ وغیرہ جیسے نہ جانے کون کون سے سلسلے شروع ہو جاتے جن میں نقصان صرف اور صرف عوام کی جان اور مال کا ہوتا اور یہاں لگی آگ پر دشمن اپنے ایوانوں میں جشن مناتے۔

یہ سارے خیالات لمحہ بھر میں ہی اس کے ذہن سے گزر گئے اور وہ پوری طرح سلّو سے نمٹنے کے لیے تیار اس کی طرف لپکا لیکن اس کا اور سلّو کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا اور اس کی انگلی گن کا ٹریگر دبانے ہی لگی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنا کیمرہ سلّو پر دے مارا۔ کیمرے کا دھکا لگنے سے سلّو کا نشانہ بہک گیا اور گن سے نکلنے والی گولی اسٹیج کی سیڑھیوں میں کہیں دھنس گئی۔

سلّو نے بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن شہریار اُڑتا ہوا اس پر جا گرا۔ جب تک وہاں موجود سکیورٹی اسٹاف کچھ سمجھتا، شہریار خود سلّو کو قابو کر چکا تھا۔ مضبوط ہاتھ پیروں والا سلّو اُسے خود پر سے ہٹا کر پھینکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن شہریار بھی عمر فاروق کا تربیت یافتہ تھا اس لیے سلّو کے لیے اس سے نجات حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ پھر وہ اس سے بچتا بھی تو کہاں جاتا؟ لاتعداد گنیں تھیں جنہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ مجبوراً اسے ہاتھ پیر ڈالنے پڑے۔ سکیورٹی والوں نے اسے پوری طرح گھیر لیا۔

شہریار اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا تو اس طرف نگاہ ڈالنے کی مہلت ملی جہاں سے وہ سلّو سے نمٹنے کے دوران آوازیں سنتا رہا تھا۔ وہاں جاوید علی ایک اور سکیورٹی گارڈ سے اُلجھا ہوا نظر آیا لیکن یہ جھگڑا بھی طول نہیں پکڑ

سکا اور مسلح افراد نے اُنہیں گھیرے میں لے لیا۔

ذرا دیر میں ہی شہریار، جاوید علی، سلّو اور وہ دوسرا سکیورٹی اہلکار مسلح افراد کے حصار میں وہاں سے باہر لے جائے جا رہے تھے۔ شہریار نے نکلتے نکلتے وزیراعلیٰ پر نظر ڈالی۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا تو یہ ایک فطری سی بات تھی۔ ان کے بیٹے کے ولیمے میں کھڑا ہونے والا یہ ہنگامہ ان کے لیے باعثِ رسوائی تھا لیکن ان کے پیچھے کھڑے ریاض انور کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں زیادہ معنی خیز تھیں۔ تقریب کے دیگر شرکاء کی طرح اگر وہ بھی تھوڑا بہت پریشان نظر آتا تو بات سمجھنے والی تھی لیکن وہ تو وزیراعلیٰ سے بھی زیادہ حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تو تم اپنے ٹیسٹ میں کامیاب ہو ہی گئے؟'' عمر فاروق نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''استاد اچھا ہو تو شاگرد کے ناکام ہونے کا کیا سوال؟'' وہ بھی جواباً مسکرایا۔

''نہیں، صرف استاد کا اچھا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اگر شاگرد ہونہار نہ ہو تو استاد کی ساری استادی دھری رہ جاتی ہے۔'' انہوں نے بڑی بے ساختگی سے کہا تو سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس وقت ان کی محفل میں ذیشان بھی موجود تھا۔ شہریار کی کراچی سے واپسی ہو گئی تھی۔ سلّو کی گرفتاری کے بعد اس کا کام وہاں مکمل ہو گیا تھا اس لیے اسے بہت پھرتی سے وہاں کے منظرنامے سے غائب کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ساتھ دینے والا جاوید علی بھی نہیں جان سکا کہ عادل خان نامی وہ اسپیشل ایجنٹ جس کے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی، اچانک گدھے کے سر سے سینگ کی طرح کیسے غائب ہو گیا تھا۔

''میں نے اکیلے کچھ نہیں کیا۔ یہ سارا ٹیم ورک تھا۔ اگر مجھے اپنے ساتھیوں خصوصاً جاوید علی کا ساتھ میسر نہیں ہوتا تو میں اتنی آسانی سے یہ کیس ہینڈل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا مخلص اور انرجیٹک لڑکا ہے۔ ہمیں اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس کے پاس ٹیلنٹ ہے۔ اگر تھوڑی سی توجہ ملے گی تو بہت کارآمد ثابت ہو گا۔'' اس نے کھلے دل سے جاوید علی کو سراہا۔

''وہ خود بھی تم سے بہت متاثر ہے۔ کراچی یونٹ کے انچارج سے تمہارے بارے میں بہت کچھ پوچھ رہا تھا لیکن ظاہر ہے وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے کیا بتاتا۔ بس یہ تنبیہہ کر دی کہ جس بات کا جاننا ضروری نہیں، اس کے لیے ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی کا ذکر آنے پر ذیشان نے اسے بتایا۔

''مجبوری نہ ہوتی تو میں خود اس سے مل کر شاباش دینا پسند کرتا۔ اُس نے اس شخص کو قابو کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا جو سلّو کو گولی مارنے کے چکر میں تھا۔ دشمن نے بڑی زبردست پلاننگ کی تھی۔ ایک طرف وہ سلّو سے اپنی مرضی کا بندہ قتل کروا کر بھرپور نتائج حاصل کرتے تو دوسری طرف اسے قتل کروا کر اس سے نجات حاصل کر لیتے۔ شاید انہیں کسی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ سلّو ہماری نظروں میں ہے اس لیے انہوں نے اسے اپنے لیے بیکار جانتے ہوئے اس سے چھٹکارا حاصل کرتے کرتے بھی فائدہ اٹھانے کی سوچی تھی۔ وہ مار دیا جاتا تو ہمارے پاس کیا ثبوت ہوتا کہ اسے کہاں تربیت دی گئی اور کس مقصد کے تحت پاکستان بھجوایا گیا۔ اس کے قاتل پر بھی کوئی الزام نہ آتا کہ ایک طرح سے اس نے اپنا فرض ہی انجام دیا ہوتا۔''

''مؤقف تو اس نے اب بھی یہی اختیار کیا تھا کہ سلّو کو گولی چلاتے دیکھ کر اُس نے اُس پر گولی چلانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوشش کی تھی ورنہ حقیقتاً وہ اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے آدمیوں کی ٹھیک ٹھاک تواضع کے بعد اس نے سچ اُگلا کہ اسے کسی انجان آدمی نے بھاری رقم کے عوض اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ پہلے وہ یہ آفر قبول کرتے ہوئے ہچکچایا لیکن پھر یہ سوچ کر مان گیا کہ ایک قاتل کو قتل کرنے پر اس سے کون باز پرس کرے گا بلکہ وہ تو ایک طرح سے ہیرو ہی بن جائے گا۔ لیکن بے چارے کی قسمت خراب تھی کہ تم اور جاوید علی وہاں پہنچ گئے اور ساری چالیں ہی اُلٹی پڑ گئیں ورنہ اس وقت ملک کے حالات بالکل مختلف ہوتے اور ہر طرف ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی۔'' ذیشان نے اس کی بات کو آگے بڑھایا تو اس کے لہجے میں واضح اطمینان تھا۔

''ہنگامہ تو اب بھی ہوا ہوگا۔ بہت سے لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ وہ دو افراد کون تھے جنہوں نے اتنی بڑی سازش کو ناکام بنایا اور پھر خود منظر سے غائب ہو گئے؟'' وہ چونکہ ہنگامی طور پر کراچی سے واپس آ گیا تھا، اس لیے بہت سی باتوں سے واقف نہیں تھا اور اب ذیشان ہی اسے حقائق سے باخبر کر سکتا تھا اس لیے اس سے استفسار کیا۔

''یقیناً ایسا ہوا تھا۔ لیکن کرنل صاحب نے معاملات سنبھال لئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ آئی ایس آئی کے پاس رپورٹ تھی کہ وزیر اعلیٰ کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ میں کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے اس لیے انہوں نے اپنے آدمی وہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ کئی اعلیٰ عہدے داروں کے دباؤ کے باوجود انہوں نے تم دونوں کی شناخت ظاہر کرنے سے معذرت کر لی لیکن بدلے میں انہیں یہ سارا معاملہ آئی ایس آئی کے سپرد کرنا پڑا اور یوں ہم باوجود خواہش کے سلّو کو اپنی تحویل میں نہیں لے سکے۔ سی ایف پی کے وجود کو خفیہ رکھنے کے لیے یہ قربانی دینا ہماری مجبوری تھی۔ بہرحال، امید ہے کہ آئی ایس آئی بھی اسے بہتر طور پر ڈیل کر لے گی۔ ویسے بھی خبر ہے کہ یہ جاننے کے بعد کہ اس سے کام نکلوانے کے بعد خود اسے بھی ختم کرنے کا انتظام رکھا گیا تھا، سلّو ازخود تعاون پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ بھارت میں ''را'' والوں نے دورانِ قید اسے دہشت گردی کی تربیت دینے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف اس کے دل و دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ اسی لیے وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ یہاں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے اپنی جان کی پروا نہیں ہے۔ ولیمے کی تقریب میں قتل کی کارروائی بھی اُس نے اس یقین دہانی کے بعد کرنے کی ہامی بھری تھی کہ اسے وہاں سے بحفاظت نکال لیا جائے گا اور پھر طویل عرصے تک انڈر گراؤنڈ رکھ کر اس کے حلیے میں اتنی نمایاں تبدیلیاں کر دی جائیں گی کہ جب وہ دوبارہ منظر پر آئے گا تو کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔''

''اوہ..... آئی سی۔'' ذیشان کی بات سن کر اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی حیران تھا کہ وہ اس طرح اپنی جان گنوانے پر کیوں تُل گیا تھا..... تو اصل بات یہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح اسے ایک بار پھر بے وقوف بنایا گیا تھا۔''

''بالکل ایسا ہی تھا۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ زندگی گنوانے سے قبل اس نے یہ بات جان لی ہے اور ہمیں ''را'' والوں کے خلاف ایک مضبوط گواہ مل گیا ہے۔ سنا ہے کہ سلّو کی حقیقت کو منظر پر نہ لانے کے لیے آئی ایس آئی، ''را'' سے کوئی بڑی ڈیل کرنے والی ہے۔ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اسے کسی فرضی کہانی میں چھپا دیا جائے گا اور اس کے بدلے بھارت مشرقی بارڈر پر جمع کی گئی اپنی فورسز کو پیچھے ہٹا لے گا۔'' ذیشان نے اسے اندر کی خبر دی۔

''میں اگر پالیسی ساز ہوتا تو اس قسم کی ڈیل کرنے کے بجائے دنیا کے سامنے ''را'' کا اصل چہرہ لانا مناسب سمجھتا۔'' اس نے فوراً اپنے قلبی جذبات کا اظہار کیا۔

''دنیا ''را'' کے اصل چہرے سے پہلے ہی واقف ہے۔ اگر یہ کیس سامنے آ بھی جاتا تو دنیا کی معلومات میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ہم وہ کرتے جو ملکی سلامتی کے لیے زیادہ بہتر ہو۔'' پہلی بار ذیشان نے اس سے اختلاف کیا تو اسے خاموش ہونا پڑا۔ ذیشان کی بات میں وزن تھا۔ کون جانتا تھا کہ ''را'' کے بارے میں خبر نہیں تھی بلکہ پاکستان کے دیگر دشمن بھی ''را'' کے کردار سے واقف ہونے کی وجہ سے پاکستان کے خلاف کوئی سازش کرتے ہوئے اکثر و بیشتر اس سے مدد لے لیا کرتے تھے۔

''اگر اس معاملے کو اس طرح نمٹایا جائے گا تو پھر سلّو کا کیا ہوگا؟'' اس نے سوال اٹھایا۔

''اسے زندگی بھر کے لیے کسی کال کوٹھڑی میں ڈال کر اس کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا۔ ویسے لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہے۔ کچھ عرصے بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ سلّو کون تھا اور اس نے کیا کیا تھا؟'' ذیشان نے حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

''اور ریاض انور..... اس کا کیا ہوگا؟'' سلّو نے اپنے اعترافی بیان میں اس کا نام بھی تو لیا ہوگا؟''

''اتفاق سے سلّو نے اپنے بیان میں اس کا نام نہیں لیا۔ اصل میں اُس نے اپنے بیان میں صرف ایمپائر سنیما اسٹور میں بم دھماکے کی کوشش کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس کی وہ کوشش ناکام رہی تھی لیکن ریاض انور والے معاملے میں تو ٹھیک ٹھاک لوگ مارے گئے تھے اس لیے اُس نے اُس کا ذکر کر کے اپنی گردن مزید پھنسانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔'' اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے ذیشان نے قیاس آرائی کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ خبیث اب تک آزادی سے دندناتا پھر رہا ہے؟'' اس نے غصے سے دانت پیسے۔

''آزادی سے نہیں، اس کی نقل و حمل پر ہماری پوری نظر ہے۔ جاوید علی کو ابھی تک کراچی میں ہی روکے رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ ریاض انور سے نمٹ سکے۔ اگر تمہارے سلسلے میں مجبوری نہ ہوتی تو شاید ہم یہ معاملہ بھی تمہارے سپرد کر دیتے۔ لیکن بہرحال جاوید علی اسے دیکھ لے گا۔ ہمیں اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ ہے۔'' اس بار عمر فاروق نے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ مزید کوئی سوال نہیں کر سکا۔ ذیشان کی بات اور تھی۔ وہ اس کا ساتھی اور دوست تھا جس سے وہ بے تکلفانہ ہر طرح کی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ بحث و مباحثہ بھی کر لیتا تھا لیکن عمر فاروق کے ساتھ ادب و احترام کا رشتہ تھا۔ وہ اس کے استاد تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ سوال جواب کرنا خلافِ ادب تصور کرتا تھا۔

''میرے خیال میں اب تم سلّو والے معاملے میں اُلجھنا چھوڑ دو۔ یہ کیس ایک طرح سے ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس تمہارے لیے اس کے علاوہ بھی کچھ اور خبریں ہیں۔'' اُسے خاموش پا کر ذیشان نے بھی موقع کا فائدہ اٹھایا اور موضوعِ گفتگو بدل ڈالا۔

''خبریں اچھی ہیں یا بری.....؟'' اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے ذیشان سے پوچھا۔

''سو فیصد اچھی خبریں ہمارے پاس کم ہی ہوتی ہیں۔ ہم کچھ اچھا بھی اسی وقت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جب کہیں کچھ بہت برا ہو چکا تھا۔'' ذیشان کے لہجے میں واضح افسردگی تھی۔

''مطلب؟'' وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اسکردو سے روانہ ہونے والی ایک بس کے سولہ مسافروں کو قتل کر دیا گیا اور اس کی وجہ ان کے مخصوص نظریات تھے۔'' ذیشان نے اسے بتایا۔

''یہ تو بہت افسوس ناک خبر ہے اور اس کے سرے یقینی طور پر اسی سازش سے جا کر ملتے ہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بھڑکانے اور بہکانے کے لیے بہت منظم طریقے سے کی جا رہی ہے۔'' اس نے فوراً رائے دی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ نظریات کا اختلاف کوئی اتنی انوکھی بات نہیں ہے۔ لیکن دشمنوں نے بڑی ہوشیاری سے اس اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمارے ہاں انتہا پسندی کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کیس میں بھی اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں، اس سے یہی لگتا ہے کہ اس کارروائی کے پیچھے غیر ملکی دشمنوں کی سازش کارفرما ہے۔''

وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا کہ کس طرح مشابرم خان نے اسے اسکردو سے فون کر کے اس وہاں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا اور اس کے بعد اس نے خان کی مدد کے لیے کیا کارروائی کی۔

''تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ کارروائی واقعی ملک دشمن عناصر کی کارستانی نظر آتی ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ دشمن نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ان برف پوش پہاڑوں میں اپنا خفیہ اڈا قائم کر رکھا تھا، جہاں وہ انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو تربیت دے رہے تھے۔ مشابرم خان کی جرأت مندی کی وجہ سے ہی ہم ان کا وہ ٹھکانا تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ وہاں اب پھر سازشیں جاری ہیں اور دشمن اپنوں کے ہاتھوں ہمارے لوگوں کو قتل کروانے کا مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس معاملے کو نظر انداز نہیں کرنا بلکہ ایسا کرو کہ اس کیس پر کام کرنے والے افسر کو ہدایت کر دو کہ وہ اس معاملے میں مشابرم خان سے کام لینے میں قطعی ہچکچاہٹ نہ دکھائے۔ مشابرم خان بہت کام کا بندہ ہے۔ اس کی ذمے داری سونپے جانے پر بہت کچھ کر گزرے گا۔''

حالات نے مشابرم خان کو اس سے الگ کر دیا تھا لیکن وہ آج بھی اس سے خصوصی اُنسیت رکھتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا دل سے معترف تھا۔

''میں یہ کام پہلے ہی کر چکا ہوں اور مشابرم خان کو بھی ہدایت کر دی ہے کہ انکوائری افسر کی طرف سے اجازت ملنے تک وہیں ٹھہرے۔''

''یہ تم نے اچھا کیا لیکن یہ تو بتاؤ کہ مشابرم خان اچانک اسکردو کیسے پہنچ گیا؟ اسے تو پیر آباد میں ہی رہ کر عمیر آفندی کی معاونت کرنی تھی نا.....؟'' اسے خیال آیا تو اس نے ذیشان سے وضاحت چاہی۔

''وہ اپنی والدہ کی تدفین کے لیے اپنے گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسکردو میں ٹھہرا تو یہ واقعہ پیش آ گیا۔''

''اوہ.....تو اس بے چارے کی والدہ فوت ہو گئیں۔ وہ تو اس واقعے پر بہت دُکھی ہوا ہو گا۔ کاش میں اس کے اس غم میں شریک ہو سکتا۔'' ذیشان کی زبانی مشابرم خان کی والدہ کے انتقال کا سن کر وہ خود بھی افسردہ ہو گیا۔ مجبوری تھی کہ وہ ہر دم خود پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہنے والے مشابرم خان کی زندگی کے اس المیے پر اس سے تسلی کے دو حرف بھی نہیں بول سکتا تھا۔

''مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے لیکن تم نے اپنے لیے جو راہ چنی ہے، اس پر چلتے ہوئے یہ سب برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ شہریار عادل سے عادل خان تک کے سفر میں جذبات کی یہ قربانی ہی سب سے

ہے۔ ویسے تم اطمینان رکھو کہ رانا صاحب نے اس موقع پر مشابرم خان کا بھرپور خیال رکھا۔ میت کو لاہور سے اس کے گاؤں پہنچانے اور تدفین تک کے سارے انتظامات انہی کی طرف سے کیے گئے تھے۔'' ذیشان نے تلخ حقیقت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسے تسلی بھی دی۔

''ذیشان ٹھیک کہہ رہا ہے شہریار! تمہاری زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کے بعد اس طرح کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اُلجھنے اور افسردہ ہونے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ تم نے اپنی شخصیت مٹا کر ایک بہت بڑی قربانی دی ہے اور یہ قربانی اس لیے ہے کہ تمہیں بہت بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ سلو والا کیس تمہارے لیے صرف ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ اس ٹیسٹ میں کامیابی کے بعد تمہیں بڑا اور زیادہ اہم کام سونپا جائے گا اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں وہ کام سونپ دیا جائے۔''

عمر فاروق نے بالکل اچانک مداخلت کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر کار وہ گھڑی آ ہی گئی تھی جس کے لیے اسے تیار کیا جاتا رہا تھا۔

''بھارت؟'' وہ اب بھی حیران تھا۔

''ہاں بھارت۔ تمہیں بھارت جانا ہو گا اور وہاں سے ڈاکٹر فرحان جمیل کو آزاد کروا کر وطن واپس لانا ہو گا۔ پاکستان میں ہر سُو دندناتے ''را'' والوں کو بھی تو پتہ چلنا چاہئے کہ ان کے منہ سے بھی شکار چھینا جا سکتا ہے۔'' عمر فاروق کے لہجے میں چنگاریاں سی تھیں۔

''لیکن یہ ڈاکٹر فرحان جمیل ہیں کون؟ کچھ ان کا حدود اربعہ تو پتہ چلے؟'' ایک شخص کو اگر بھارت جا کر چھڑانے کی ذمے داری اسے سونپی جا رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی بہت خاص آدمی تھا لیکن خود وہ فرحان جمیل نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں تھا۔

''ڈاکٹر فرحان جمیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہم فخریہ اپنے ملک کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں لیکن حقیقتاً ایک بڑے ریسرچر ہیں۔ دورانِ تعلیم انہوں نے انگلینڈ اور امریکہ کی بڑی لیبارٹریز میں بھی کام کیا تھا اور وہیں سے انہیں مائیکرو اور جینئرمز پر کام کرنے کا شوق ہوا۔ پاکستان واپس آنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ریسرچ جاری رکھی۔ ان کا تعلق چونکہ ایک متمول خاندان سے ہے، اس لیے کافی عرصے تک وہ اپنے طور پر اپنی ذاتی لیبارٹری میں کام کرتے رہے پھر بعد میں انہوں نے حکومت سے رابطہ کر کے بتایا کہ انہوں نے تحقیق سے وہ طریقہ ڈھونڈ لیا ہے جس کے ذریعے وہ حیاتیاتی ہتھیار تیار کر سکتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ پاکستان کوئی جارحیت پسند ملک نہیں ہے لیکن ہمیں مسلسل دوسری طاقتوں سے خطرہ لاحق رہتا ہے اس لیے ہم اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ دفاع پر خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔ دفاعی نقطۂ نظر سے ہی ہم نے ایٹم بم بھی تیار کیا ہے اور اگر ڈاکٹر فرحان کی وجہ سے ہم ایک اور کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمارے دشمنوں کو یہ ایک اشارہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی طرف بری نظر ڈالنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لیں کہ پاکستان اتنا بھی کمزور نہیں ہے کہ وہ تر نوالہ سمجھ کر اسے نگل سکیں۔

حکومت کی طرف سے ڈاکٹر فرحان کو منظوری مل گئی کہ وہ اپنی ذاتی تحقیق کو آگے بڑھائیں اور اس کے لیے حکومتی وسائل کو استعمال کریں۔ لیکن اس سے قبل کہ ڈاکٹر فرحان کام شروع کرتے، بھارت میں مقیم ان کی اہل کا پیغام آ گیا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو اکلوتے نواسے کو دیکھ لیں۔ یہ ایک جذباتی معاملہ تھا۔ ڈاکٹر فرحان اپنی والدہ اور نانی کو مایوس نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے چند دن کی مہلت لی اور بھارت روانہ ہو گئے۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہاں جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر ان کا بھرپور استقبال ہوتا اور ان کے ماموں اور کزنز خوش ہوتے کہ برسوں بعد بہن اور اس کے بیٹے کی شکلیں دیکھنے کو ملیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر فرحان کی نانی نے انہیں اور ان کی والدہ کو بطور خاص اس لیے وہاں بلوایا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ بات ان کے ماموؤں کو منظور نہیں تھی کہ بہن جس کے دور ہونے کی وجہ سے وہ اس کے حصے کو اپنا ہی سمجھتے تھے اور برسوں سے اس کے حصے کی زمین پر کاشت کر کے لاکھوں کما رہے تھے، زمین کے بدلے کروڑوں روپے سمیٹ کر لے جائے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی اور ڈاکٹر صاحب کو ایک جاسوس کی حیثیت سے گرفتار کرلیا گیا۔

بدقسمتی سے بھارتی انٹیلی جنس کو کسی طرح اس بات کی بھنک بھی مل گئی کہ ڈاکٹر فرحان کسی قسم کی تحقیق کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا کیس پکا ہوگیا۔ ادھر ان کی والدہ کو بھائیوں نے باور کروایا کہ وہ جائیداد میں حصہ لینے کا خیال دل سے نکال دیں تو اس کی آمدنی سے ان کے بیٹے کی آزادی کے لیے کوشش کی جاسکے۔ ایک ماں کے لیے بیٹے سے بڑھ کر کیا ہوسکتا تھا۔ وہ راضی ہوگئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انڈین گورنمنٹ نے انہیں ناپسندیدہ قرار دے کر انہیں پاکستان واپس بھیج دیا۔ اب وہ بے چاری یہاں ہیں اور فون اور خطوں کے ذریعے اپنے بھائیوں سے درخواست کرتی رہتی ہیں کہ کسی طرح ان کے بیٹے کو آزاد کروا کر پاکستان بھجوایا جائے۔ بھائی کچھ کرتے نہیں لیکن بہن کو اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ فرحان کی آزادی کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں لیکن فرحان پر اتنے سخت الزامات ہیں کہ اس کی رہائی کی کوئی صورت نہیں بن پا رہی۔

ڈاکٹر فرحان کی والدہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں ہیں۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ اس لیے اچھے خاصے باحیثیت خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود ان کی رہائی کے لیے بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کو آزاد کروانے کے لیے ایک کوشش کی تھی کہ قیدیوں کے تبادلے کے ذریعے ڈاکٹر فرحان کو یہاں واپس لایا جاسکے لیکن بھارتی حکومت نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ ایک مبینہ جاسوس کو کسی طور آزاد نہیں کر سکتے۔ اس جواب کے بعد ہمارے پاس مزید اصرار کی گنجائش نہیں تھی اور یوں پانچ سال سے ڈاکٹر فرحان وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ اب ہم تمہارے سپرد یہ کام کر رہے ہیں کہ تم کسی بھی طرح انہیں وہاں سے آزاد کروا کر لاؤ تاکہ وہ واپس آکر دوبارہ اپنا کام سرانجام دے سکیں۔ اس سلسلے میں تمہیں جو بھی وسائل درکار ہوں گے، وہ کسی نہ کسی طرح ہماری طرف سے مہیا کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن ہم کھل کر کہیں بھی تمہاری حمایت نہیں کریں گے۔'' عمر فاروق نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''سر بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شہریار! اس مشن پر جاتے ہوئے تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ایک جاسوس یا سیکرٹ ایجنٹ بلاشبہ کسی ملک کے لیے اس کا سرمایۂ افتخار ہوتا ہے اور پوری قوم اُس کے اس احسان تلے دبی ہوتی ہے کہ اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر دفاعِ وطن کے لیے کام کیا لیکن مصلحتیں کبھی کھل کر اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتیں۔ کوئی سیکرٹ ایجنٹ جب دشمن کی سرزمین پر پکڑا یا مارا جاتا ہے تو اس کی حکومت کبھی اسے قبول نہیں کرتی۔ تم بھی یہاں سے بے شک پاکستان کی بہتری اور استحکام کی خاطر اپنی جان ہاتھ میں لے کر بھارت کی سرزمین پر پہنچو گے لیکن وہاں پہنچتے ہی تمہاری پاکستانی شناخت ختم ہو جائے گی، تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوگا کہ تم خود کو پاکستانی ثابت کر سکو۔''

ذیشان نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے تلخ حقائق سے آگاہ کیا۔ ان باتوں سے بظاہر ایسا لگ رہا

کہ اسے جان بوجھ کر جہنم میں جھونکا جا رہا ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے جذبۂ حب الوطنی کو بہت ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی اسے سی ایف پی میں شامل کیا گیا تھا اور اس کے اوپر اتنا کثیر سرمایہ خرچ کر کے اس کی تربیت کے ساتھ ساتھ ظاہری تبدیلی کے عمل سے گزارا گیا تھا۔ ان سب باتوں کے پیچھے کسی قسم کی بدنیتی کارفرما نہیں تھی۔ نہ ہی اسے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا بلکہ اس کا انتخاب صرف اور صرف اس حقیقت کی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر وطن پر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتا تھا۔ آج اُس کے اس جذبے کی آزمائش تھی تو وہ کیسے پیچھے ہٹتا۔ سر اُٹھا کر متانت اور سنجیدگی سے بولا۔

''گرفتاری یا موت کا ڈر مجھے میرے دشمن سے پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ نہ ہی میں نے اپنے سینے پر تمغے سجانے کے لیے اس آگ میں کودنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے ساتھ وہاں کیا ہوگا۔ نہ ہی مجھے یہ لالچ ہے کہ مجھے گارڈ آف آنر پیش کرتے ہوئے قبر میں اُتارا جائے۔ اگر اپنے وطن کی خاطر کام کرتے ہوئے میں کسی گندے نالے یا جوہڑ میں گر کر بھی مر جاؤں گا تو میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہوگا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی ضائع نہیں کی۔''

''مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم سے ہمیں ایسا ہی جواب سننے کو ملے گا۔'' عمر فاروق بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے۔ وہ بھی فوراً ہی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے اسے گلے لگایا اور جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ان کے ساتھ کمرے میں موجود ذیشان بھی سحر زدہ سا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس کے دل نے بے ساختہ یہ خواہش کی تھی کہ کاش شہریار کی جگہ وہ ہوتا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص کی اپنی ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے جہاں رہ کر اسے اپنے حصے کا کام انجام دینا پڑتا ہے اور اس کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام ایمانداری سے انجام دیتا رہے۔

''ذیشان، ڈاکٹر فرحان کے کوائف پر مشتمل ایک فائل اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔ تم اطمینان سے اس فائل کو پڑھ لینا۔ تمہیں ابھی فوری طور پر روانہ نہیں ہونا ہے۔ چند دن ملیں گے تاکہ تم آرام سے یہ کیس سمجھ سکو۔ مزید کچھ معلومات درکار ہوں گی تو وہ بھی ذیشان فراہم کر دے گا۔ اس عرصے میں تمہارے خدوخال کو ایک فائنل ٹچ دیا جائے گا تاکہ تم اس عادل خان سے مختلف نظر آؤ جو کراچی میں سلّو والے کیس پر کام کر رہا تھا۔ میں نے تمہارے سرجن کو کراچی جانے سے پہلے فائنل ٹچر سے اسی لیے روک دیا تھا کہ تمہارا چہرہ کسی کے لیے بھی آشنا نہ رہے۔ چاہے وہ سی ایف پی کے اہلکار ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اب تو یہ تبدیلی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تم بہت سوں کی نظروں میں آگئے ہو۔ اس لیے تمہیں مزید تبدیلی کے عمل سے گزارنا ہماری مجبوری ہے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں سر!'' عمر فاروق کی لمبی چوڑی وضاحت کا اس نے بہت اختصار سے جواب دیا البتہ نظریں اس فائل پر جما کر رکھیں جو سینٹرل ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔

''اس فائل میں ڈاکٹر فرحان جمیل کے کوائف موجود ہیں۔'' اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ذیشان نے فائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے خاموشی سے فائل لینے کے بعد اسے کھول کر دیکھا۔ سامنے ہی ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر لگی ہوئی تھی جس میں فراخ پیشانی، روشن آنکھوں اور تیکھے نقوش والا ایک پینتیس چھتیس سالہ شخص مسکرا رہا تھا۔ اس کی ذہانت اور آسودہ حالی اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ بھارت جانے سے قبل کھینچی گئی ڈاکٹر فرحان کی آخری تصویر ہے۔ گرفتاری کے بعد کبھی انہیں منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ ابتدا میں عدالتی کارروائی کے لیے انہیں عدالت لایا جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی اس طرح کہ ان کا چہرہ موٹی چادر میں چھپا ہوا ہوتا تھا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت کے روبرو جس شخص کو پیش کیا جاتا رہا، وہ واقعی ڈاکٹر فرحان ہیں یا کوئی اور..... لیکن ہماری انٹیلی جنس رپورٹ بہرحال یہ بتاتی ہے کہ ڈاکٹر فرحان زندہ ہیں چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ ہم کسی طرح انہیں وطن واپس لا سکیں۔ ہمارے وطن میں گنتی کے چند ہی تو لوگ ہیں جن سے ہم وطن کی ترقی اور بہبود کی امید رکھ سکتے ہیں۔ اور ان چند میں سے ایک سے بھی محروم ہو جانا ہمارے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ اس لیے تم سمجھ سکتے ہو کہ اس مشن کے لیے تمہارا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟''

اسے تصویر کا جائزہ لیتے دیکھ کر ذیشان نے اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کیا لیکن اس کا ذہن تو اس کے آخری جملے میں ہی اٹک گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے فائل کو بند کیا اور نہایت سنجیدگی سے ذیشان اور عمر فاروق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بار بار وضاحتیں دے کر آپ لوگ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے نہ تو آپ کی نیک نیتی پر کوئی شک ہے، نہ ہی میرا جذبہ اتنا کمزور کہ ذرا سی آزمائش سامنے آنے پر ایمان ڈولنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وضاحتیں دینے سے آپس کا باہمی اعتماد بڑھتا نہیں، کم ہوتا ہے اور اس کیس میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے برائے مہربانی اب آپ میں سے کوئی ایسی بات نہ کرے جس کو سن کر مجھے شرمندگی ہو یا میری دل آزاری ہو۔ میں آپ لوگوں کا حصہ ہوں اور آپ لوگوں جیسا ہی ہوں۔ ہاں اگر آپ کو میرے جذبے پر کوئی شک ہو تو الگ بات ہے۔''

''تم غلط سمجھ.....'' ذیشان نے تیزی سے وضاحت کرنی چاہی لیکن عمر فاروق نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''کوئی وضاحت نہیں ذیشان! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ہمیں سے ہے اور ہماری طرح ہی کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس لیے اسے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے ذیشان سے کہا اور پھر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''گڈ لک مائی سن! تم اس کیس کو اچھی طرح اسٹڈی کرو۔ اس دوران تمہارے جانے کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔ اور وہاں تمہیں اجازت ہے کہ اس مشن میں اپنے ساتھ کسی مددگار کو لے جا سکتے ہو۔ وہ شخص کون ہوگا، اس کا انتخاب تم کرو گے۔''

''ٹھیک ہے سر! میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' اس پیشکش کے جواب میں کوئی مطالبہ کرنے کے لیے ابھی اس کا ذہن واضح نہیں تھا اس لیے اس نے مہلت لے لی۔

''اچھی طرح سوچ لو۔ تم مجھ سمیت جس کی طرف اشارہ کرو گے، وہ خوشی سے تمہارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو جائے گا۔'' انہوں نے جواب دیا اور اپنی جگہ سے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔

''تم ریسٹ کرو۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' انہوں نے ذیشان کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانے کا عندیہ دیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کی فائل ہاتھ میں لیے گہری سوچ میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

⊛----✪----⊛

''بیٹھو!'' میجر اسفندیار نے اپنے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ پروگرام کے مطابق گل مینا کے ساتھ واپسی کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ اپنے تئیں وہ احمد یار کو میجر اسفندیار کے لے کر کے اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ لیکن صبح ہی صبح ہوٹل میں اسے میجر اسفندیار کی طرف سے پیغام ملا کہ فی الحال وہ اپنا واپسی کا ارادہ ملتوی کر دے، انہیں اس سے کچھ کام ہے۔

اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے یہ بات مان لی۔ بعد میں اسے پتہ چلا کہ وہ جس ڈائیوو سے جانے والا تھا اس کی روانگی بھی ملتوی ہو گئی ہے۔ اصل میں گزشتہ روز جو واقعہ ہوا تھا، اس نے لوگوں پر دہشت سی طاری کر دی تھی۔ ایک ساتھ اتنے افراد قتل کیے جانے پر شہری سراپا احتجاج تھے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ احتجاج کرنے والوں میں تمام مکتبہ ہائے فکر کے لوگ شامل تھے جو اس قسم کے ہر واقعے کی مذمت کرتے ہیں۔

فی الحال شہر کے حالات کشیدہ تھے۔ شریف لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ اس کا ردِعمل انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ اس صورتِ حال پر مشابر خان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ ایسی دہشت گرد کارروائی میں حصہ لینے والے تمام مجرموں کو ایک قطار میں کھڑے کر کے گولیوں سے بھون ڈالے یا پھر کوئی اور بہت سخت سزا دے۔ یونہی بہت جلتے کڑھتے بہت سا وقت گزر گیا تو میجر اسفندیار کا ایک آدمی گاڑی لے کر اس کے ہوٹل آ پہنچا۔ اس آدمی کے ساتھ روانہ ہونے سے قبل اس نے گل مینا کو بہت سی تسلیوں کے ساتھ کمرے کو لاک کر کے وہیں تک محدود رہنے کی ہدایت کی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب وہ میجر اسفندیار کے سامنے تھا اور وہ دراز قد میجر بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آخر کار وہ اپنے اس کام سے فارغ ہوا تو لب کشائی کی۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نہایت کام کے بندے ہو اس لیے مجھے چاہئے کہ تمہیں اپنی معاونت کے لیے بلاؤں۔ اب تم بتاؤ کہ تم میرے لیے کیا کیا کام کر سکتے ہو؟''

''جو بھی آپ کہیں۔ بشرطیکہ وہ ملکی مفاد میں ہو۔'' مشابرم خان نے نہایت اعتماد سے اسے جواب دیا۔

''ظاہر ہے ایسا ہی ہوگا۔ میں نے اپنے جسم پر یہ یونیفارم ملکی مفاد کی حفاظت کے لیے ہی پہنی ہے۔'' اسفندیار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ شاید اسے باہر کے ایک بندے کو اپنے ساتھ شامل کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس لیے مجبور تھا کہ حکم اوپر سے آیا تھا۔ پھر وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ صرف مشابرم خان تھا جس کی وجہ سے وہ دہشت گردی کے واقعے کے ایک اہم مجرم کو بغیر ہاتھ پیر ہلائے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس سے بے حد اہم معلومات حاصل کر لی تھیں۔

''کل تمہاری مدد سے ہم نے احمد یار نامی جس آدمی کو گرفتار کیا تھا، اس سے ہمیں بہت اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔'' مشابرم خان کی طرف سے کئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر اس نے خود کو سنبھالا اور تفصیلات بتانا شروع کر لیں۔

''احمد یار سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں نہایت محنت اور نزاکت سے کام کرنا پڑا۔ اس شخص نے اپنے جوتے کی ایڑی میں زہر کا ایک کیپسول چھپا رکھا تھا۔ اگر تم نے اسے اتنی تکنیک سے باندھ کر نہ ڈالا ہوتا تو وہ ہوش میں آتے ہی وہ کیپسول کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ اسے یہی سبق دیا گیا ہے کہ جب تم یہ محسوس کرو کہ تمہارے ذریعے کچھ قیمتی راز ظاہر ہونے والے ہیں تو اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو اور ہمیشہ کی زندگی پا کر ہمیشہ میں چلے جاؤ۔ ہمارا طریقِ کار ہے کہ کسی مجرم کے اپنی تحویل میں آتے ہی لباس سمیت اسے اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر شے سے محروم کر دیتے ہیں اور وہ ہمارے مہیا کیے گئے لباس میں ہماری تفتیش کا سامنا کرتا ہے۔ اس طر
اگر مجرم نے کوئی نقصان دہ شے یا ڈیوائس وغیرہ چھپا رکھی ہو تو وہ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ احمد یار
سامان کے تجزیے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ اس کے دائیں جوتے کی ایڑی گھوم سکتی ہے اور ایڑی کے گھوم
سامنے آ جانے والے حصے میں ایک ایسا خلا موجود ہے جس میں زہریلا کیسول رکھا گیا ہے۔ باقی اس
پاس سے ایسی کوئی قابلِ ذکر شے نہیں نکلی۔ ایک ٹرانسمیٹر ہے جو پہلے ہی سامنے آ گیا تھا۔'' میجر اسفندیار
ذرا رُک کر اپنے سامنے رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ احمد یار سے تفتیش کے دوران ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ ا
لوگ خودکشی کا رجحان رکھنے کے باعث کچھ بھی اُگلنے کے لیے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تفتیش کے لیے
اسے اس مقام پر لے گئے جہاں آدمی خود اپنے منہ سے موت کی تمنا کرتا ہے لیکن موت بھی اس کی مدد
لیے نہیں آتی۔ بالآخر تنگ آ کر اسے اپنی زبان کھولنی پڑی اور اس نے انکشاف کیا کہ وہ اور اس کے سا
یہاں کے ایک راہنما بشیر اکبر کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ بشیر وہی شخص ہے جو مارے جانے والوں
نظریات کا سخت مخالف ہے اور اپنی باتوں سے اس نے اپنے ساتھیوں کے دلوں میں ان لوگوں کے لیے
نفرت بھر دی ہے۔ چند قریبی لوگوں کے دلوں میں یہ نفرت انتہا کو پہنچا دی گئی ہے اور یہ قریبی لوگ اس
اشارے پر کسی بھی شخص کی جان لینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ احمد یار کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ
ہے کہ بشیر اکبر نے ان کے ذہنوں کو اس بری طرح ماؤف کر دیا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے
محروم ہو چکے ہیں اور کسی معمول کی طرح ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جس کا حکم اُنہیں بشیر
ہے۔ احمد یار کے خون کے نمونے کا تجزیہ کرنے پر یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ وہ نشے کا عادی ہے اور یقیناً
اس عادت میں اسی لیے مبتلا کیا گیا ہوگا کہ وہ بنا سوچے سمجھے بے دام غلام کی طرح احکامات کی پیروی
رہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہمارے لیے بشیر کا کردار بہت مشکوک ہو چلا ہے اور ہمیں کوشش کرنی
کہ اس بندے کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص تم سے اس لیے مدد چاہتا ہوں کہ
ماتحتوں میں بھی بشیر کے مداح شامل ہیں جو اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈریں گے۔ اس لیے ان حالات
تم ہی سب سے کارآمد آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔''

میجر اسفندیار جو تفصیلات بتا رہا تھا، انہیں سن کر مشابرم خان کے ذہن میں پیر آباد کے غلام علی اور
آباد کے شاہنواز کی صورتیں اُبھر رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی تو مذہبی راہنما کے بہروپ میں دشمن کے ا
ثابت ہوئے تھے جو معصوم ذہنوں میں زہر گھول کر انہیں دہشت گرد بنانے میں مصروفِ عمل تھے۔

''میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ بتائیں کہ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں کیا
ہے؟'' اس نے ٹھوس لہجے میں نہایت عزم کے ساتھ میجر اسفندیار سے کہا تو وہ اس کے ساتھ اپنا پلان ڈ
کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

''یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ اتنی خوب صورت کہ میں عادی نہ ہونے کے باوجود ہر روز نیند
اُٹھ کر مارننگ واک پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں اور جب واپس آتا ہوں تو لگتا ہے آنکھوں میں
رنگ مناظر بھر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ آنکھوں میں بسے ان مناظر اور ہر سُو بکھری پرندوں کی چہچہاہٹو

ساتھ بیٹھ کر لکھنا کتنا خوشگوار تجربہ ہے، میں آپ کے سامنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔''

مصطفیٰ خان کے گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ جملے ادا کرنے والا شخص آفتاب تھا۔ آرلینڈو آمد کے بعد وہ
ری طور پر کشور کے ساتھ اپنے گھر منتقل ہو گیا تھا اور آج مصطفیٰ خان نے بطورِ خاص انہیں کھانے پر مدعو کیا تھا۔

اس دعوت میں اسلم اور ماہ بانو بھی شریک تھے۔ کشور اور ماہ بانو اس وقت کچن میں مصطفیٰ خان کی بیوی کی
مدد کروا رہی تھیں جبکہ اسلم اس محفل میں شامل تھا جس میں بیٹھ کر آفتاب آرلینڈو کی شان میں رطب اللسان
تھا۔ ذاتی طور پر اسلم کو بھی یہ شہر رہائش کے لیے پسند آیا تھا لیکن وہ آفتاب جتنا متاثر اس لیے نہیں تھا کہ اس
نے اپنی زندگی کے بے شمار شب و روز جنگل کے قدرتی ماحول میں گزارے تھے۔ اس کی قوتِ شامہ اس مہک
سے آشنا تھی جو صبح آنکھ کھلتے ہی مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے اور وہ ان پنکھ پکھیرو کو بھی خوب جانتا تھا جن کی
چہچہاہٹیں کسی محبوبۂ دلنواز کی طرح بڑی مٹھاس سے انسان کو نیند سے جگا ڈالتی ہیں اور وہ ڈسٹرب کیے جانے
کے باوجود بے مزہ نہیں ہوتا۔ آفتاب نے بھی اپنی زندگی کے کچھ ماہ و سال اسی جنگل سے متصل پیر آباد میں
گزارے تھے لیکن بدقسمتی سے پیر آباد اور آرلینڈو کو سنبھالنے والے ہاتھ مختلف تھے اس لیے وہاں کا ماحول اور
نقشہ بھی مختلف تھا اور آفتاب کا متاثر ہونا سمجھ آتا تھا لیکن اسلم بہرحال اس جتنا متاثر نہیں تھا۔

''آپ لکھنے لکھانے والے آدمی ہیں نا، اس لیے آپ کے لیے یہ جگہ بہترین ثابت ہوئی ہے لیکن ایک
انجینئر کی حیثیت سے آپ میری رائے لیں تو یہاں کام کرنا بہت مشکل ہے۔ قدم قدم پر آدمی کو جنگلی حیات
کے تحفظ کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اچھے بھلے چلتے کام کو صرف اس وجہ سے روک دینا پڑتا ہے کہ جس جگہ پر ہم
کام کر رہے ہیں وہاں کسی نایاب نسل کے جانور کا مسکن تو موجود نہیں ہے۔ اس وقت بڑی شدید جھنجلاہٹ
ہوتی ہے کہ اب کیا کریں اور دل میں خیال آتا ہے کہ کاش ہم پاکستان میں ہوتے جہاں اپنی من مانی کرتے
ہوئے کسی کو بھی نیست و نابود کر دیتے اور کوئی بھی ہمیں پوچھنے والا نہ ہوتا کہ یہاں جو نادر انواع پائی جاتی
تھیں، وہ معدوم ہو گئیں تو کیونکر۔''

مصطفیٰ خان کے لہجے میں جو طنز کی کاٹ سی تھی، اسے آفتاب اور اسلم بخوبی محسوس کر سکتے تھے کہ وہ بھی ایسے
احساس دلوں کے مالک تھے جو وطنِ عزیز میں ہر سُو راج کرتی بدنظمی پر کُڑھتے تھے اور کُڑھتے چلے جاتے تھے۔

''آپ کی مشکل اپنی جگہ لیکن میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں۔ یہاں آنے کے بعد میرے کام میں اتنی
روانی آ گئی ہے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک ناول لکھنا بھی شروع کر دوں بلکہ ناول کا خاکہ بھی میرے ذہن
میں ترتیب پا چکا ہے اور جلد میں اسے شروع کرنے والا ہوں۔ حقیقتاً میں یہاں آ کر بہت پچھتا رہا ہوں کہ
پہلے میں نے شہریار صاحب کا مشورہ قبول کیوں نہ کیا اور پاکستان سے سیدھا یہاں آنے کے بجائے نیویارک
میں کس لیے آباد ہو گیا؟''

مصطفیٰ خان کی تلخ بات کے تسلسل کو جاری رکھنے کے بجائے آفتاب نے آرلینڈو کی شان میں قصیدہ
خوانی کو زیادہ مناسب سمجھا اور مصنوعی سرد آہیں بھرتا اپنے پچھتاوے کا اظہار کرنے لگا۔

''شہریار کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے اکثر بعد میں اس طرح پچھتاتے نظر آتے ہیں۔ ویسے اچھا
ہوا کہ آپ نے پہلے نیویارک میں قیام کر کے دیکھ لیا تب ہی تو آپ آرلینڈو کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ سکے
ہیں۔'' مصطفیٰ خان نے بھی خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ ان کی تعداد تین ہونے کے باوجود
صرف وہ دونوں ہی گفتگو میں حصہ لے رہے تھے اور اسلم محض خاموش سامع کا کردار نبھاتا ضرورت پڑنے پر
اخلاقاً مسکرا دیتا تھا۔ اس کی زندگی کے اتنے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بستے ان آزاد منش اور قدرے وحشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں کے ساتھ گزرے تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی کسی محفل میں سرے سے شرکت ہی نہ کی تھی اور وہ ہر طرح کے ادب و آداب سے قطعی آزاد تھے.....تو ان بگڑے ہوئے لوگوں میں رہتے ہوئے وہ بھی ذرا بگڑ گیا تھا، اگرچہ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ خود کو وہاں بھی منفرد رکھ سکے لیکن آدمی کے لیے کسی ماحول میں رہتے ہوئے اس سے مکمل فرار ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ماحول کسی نہ کسی کمزور مقام سے نقب لگا کر اس کے اندر اُتر ہی جاتا ہے، سو اسلم بھی اس ماحول کو چھوڑ دینے کے باوجود مہذب دنیا میں رہتے ہوئے کبھی کبھار خود کو اس دنیا کے لیے اجنبی محسوس کرنے لگتا تھا اور یہ اجنبیت اس کے لبوں پر چپ کا تالا ڈالتی رہتی تھی جیسا کہ آج وہ اس محفل میں محض خاموش سامع تھا۔

''آپ صحیح کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شہریار صاحب کے مشوروں پر عمل نہ کرنے والے ضرور پچھتاتے ہوں گے کیونکہ ان کے مشورے میں پورا پورا خلوص شامل ہوتا تھا۔ ان جیسا مقام و مرتبہ رکھنے والوں میں ایسے مخلص لوگ مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مجھے تو جب ان کا خیال آتا ہے، یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور زندگی دے۔''

''آمین! مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لمبی زندگی پائے گا کیونکہ دنیا کو اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' آفتاب کو آنکھ سے خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے مصطفیٰ خان نے اس کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے دیا اور خود بولنا شروع کر دیا۔

''شہریار شروع سے بڑی حساس اور مہم جو طبیعت کا مالک ہے۔ دورانِ تعلیم ہم لوگ اکثر ہی چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں کسی ایڈونچر کے لیے نکل جاتے تھے۔ ایک بار ہم میں سے کچھ لڑکے شرارت میں آ کر پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش کرنے لگے تو شہریار بڑا سخت ناراض ہوا کہ گاڑی میں انواع و اقسام کے ٹن پیک کھانے موجود ہونے کے باوجود وہ لوگ کیوں ان معصوم پرندوں کو زندگی کا نغمہ گانے سے روک دینا چاہتے ہیں جو اگر پکنے کے بعد پلیٹوں تک پہنچیں تو شاید کسی ایک شخص کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی کافی نہ ہوں لیکن زندہ رہ کر اپنے گیت الاپتے رہیں تو بہت سے لوگوں کو زندگی کی تازگی اور سرخوشی کا احساس دلاتے رہیں۔ اس بات پر ان لوگوں نے شہریار کا بہت مذاق اُڑایا تھا کہ اس مستقبل کے بیوروکریٹ کے اندر تو کسی شاعر کی روح حلول کر گئی ہے اور جا کر اس کے ماموں کو اطلاع دینی چاہئے کہ آپ کا ہونہار بھانجا ہرگز وہ بننے کے لائق نہیں رہا جو آپ اسے بنانا چاہتے ہیں۔ شہریار نے ان کے مذاق اُڑانے کی بالکل پروا نہیں کی اور اس بات پر اڑا رہا کہ ان پرندوں کو شکار نہیں کیا جائے گا۔ ممکن تھا کہ نوبت مار کٹائی تک جا پہنچتی کیونکہ وہ لڑکے مسلسل اسے زِچ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ہم باقی ساتھیوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اب اتفاق دیکھو کہ ہم آگے چلے تو ان شریر لڑکوں میں سے پھر کسی کے اندر شکار کی خواہش مچلی اور اس نے زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنی ایئر گن نکالی اور ایک درخت پر بیٹھے پرندوں پر استعمال بھی کر ڈالی۔ بدقسمتی سے وہ کسی پرندے کو تو شکار نہ کر پایا لیکن ایک کوّے کا گھونسلا نشانے پر آ گیا اور پھر مت پوچھو کہ کوّوں نے اس لڑکے کا کیا حال کیا؟ وہ جہاں جہاں جاتا تھا، کوّے اس کے پیچھے چلے آتے تھے اور اس کے سر پر ٹھونگیں برساتے تھے۔ بڑا برا حال ہو گیا تھا اس بے چارے کا۔ تنگ آ کر اس نے ٹرپ ہی ادھورا چھوڑ دیا اور واپس گھر چلا گیا۔ بعد میں گروپ کے سارے لڑکے شہریار کو چھیڑتے رہے کہ اس بے چارے کو تمہاری بد دعا لگی ہے۔ بس وہ ایسے ہی دن تھے۔ نوجوانی کی بے فکری میں ہم موج میلا کرتے پھرتے تھے اور اب اپنی ذمے داریوں میں گھرے لمبے عرصے تک ایک دوسرے سے فون پر رابطہ کرنے کا بھی

موقع نہیں ملتا۔'' مصطفیٰ خان بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

آفتاب حیران تھا کہ وہ شہریار کی حالت سے جان بوجھ کر تغافل کیوں برت رہا ہے اور کیوں نہیں چاہتا کہ اس محفل میں اس حوالے سے کوئی گفتگو ہو کہ شہریار پاکستان کے ایک ہسپتال میں نیم مُردہ حالت میں پڑا ہوا ہے اور اسے ان سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ صحافی ہونے کی حیثیت سے وہ پاکستان سے اتنی دور ہونے کے باوجود بھی وہاں کے حالات سے واقف رہتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ شہریار ایک قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہونے کے بعد کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹر حتمی طور پر کچھ نہیں کہتے کہ وہ کب ہوش میں آئے گا یا آ بھی سکے گا یا نہیں؟ بہرحال یہ تو طے تھا کہ مصطفیٰ خان ناواقف نہیں تھا، اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ مصطفیٰ خان نے خود گفتگو کا رُخ بدل دیا تھا اور پھر اسے وہ خفیف سا اشارہ بھی تو کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے اس موضوع کو چھیڑنے سے روک رہا ہو۔

اس اشارے کو سمجھ کر وہ چپ تو ہو گیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ اس اشارۂ زباں بندی کے پیچھے کوئی تو راز ہے جسے شہریار کا بچپن کا دوست مصطفیٰ خان جانتا ہو گا۔ مصطفیٰ خان بھی خوب ہی آدمی تھا۔ جدی پشتی رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والے شخص نے صرف دوستی نبھانے کی خاطر اپنے سے بہت ہی کم حیثیت لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک قابل انجینئر کی حیثیت سے یہاں کی ایک نامور تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کرنے کے علاوہ سٹی سینٹر میں ایک عدد اسٹور کا مالک بھی ہے جس کی آمدنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس آمدنی میں سے اسٹور پر کام کرنے والے درجن بھر ملازمین کو اتنی معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں کہ ان کے اپنے گھر بخوبی چلتے تھے۔ ماہ بانو اور اسلم بھی ان ملازمین میں شامل تھے جنہیں مصطفیٰ خان کے گھر میں قریبی دوستوں اور عزیزوں کی سی حیثیت حاصل تھی اور یہ سب اس لیے تھا کہ وہ شہریار کے بھجوائے ہوئے مہمان تھے اور شہریار جیسے باکمال آدمی کا دوست بھی باکمال تھا کہ دوستی کی خاطر پھر کسی فرق کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد ایک دور کافی کا بھی چلا پھر محفل برخاست کر دی گئی۔ مصطفیٰ خان نے اصرار کر کے آفتاب اور کشور کو ان کے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ آرلینڈو میں ایک آرام دہ گھر کرائے پر لے لینے کے بعد آفتاب کے مالی حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ گاڑی خریدنا بھی افورڈ کر سکے اس لیے وہ لوگ اس سہولت سے محروم تھے۔ مصطفیٰ خان کو تکلیف نہ دینے کا خیال دل میں ہونے کے باوجود اس کے اصرار کے باعث آفتاب کو اس کی لفٹ کی پیشکش قبول کرنی پڑی۔

''آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ میں نے آپ کو ڈائننگ ٹیبل پر شہریار سے متعلق بات مکمل کیوں نہیں کرنے دی؟'' گاڑی آگے بڑھاتے ہی مصطفیٰ خان نے آفتاب سے ذکر چھیڑ دیا۔

''بالکل حیرانی تو ہوئی تھی لیکن خاموش اس لیے رہا کہ جانے اس کے پیچھے کیا مصلحت ہو؟'' اس نے اعتراف کیا۔

''اصل میں یہ خود شہریار کی خواہش تھی۔ مسلسل دشمنوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے شاید اسے اندازہ تھا کہ کسی روز وہ ان کا نشانہ بن سکتا ہے اس لیے اس نے جب میرے پاس ماہ بانو عرف مہرین اور اسلم کو بھجوایا تو مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ مجھے کچھ ہونے کی صورت میں ان دونوں میاں بیوی کو کوئی خبر نہ ہونے دینا۔ اس خواہش کے پیچھے کیا وجہ تھی، یہ میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کی خواہش کا خیال ضرور رکھا اسی لیے وہ دونوں میاں بیوی نہیں جانتے کہ ان کے پیچھے پاکستان میں شہریار پر کیا گزر چکی ہے۔ آپ سے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری یہی درخواست ہے کہ آئندہ آپ دونوں بھی اس سلسلے میں محتاط رہیے گا۔"

اپنی مختصر سی وضاحت میں اس نے آفتاب کی اُلجھن تو دُور کر دی لیکن اس بات سے بے خبر رہا کہ ایک اُلجھن نے اسلم کے ذہن میں بھی جگہ بنالی ہے جو بے شک ان کی محفل میں خاموش سامع کا کردار نبھا رہا تھا لیکن مصطفیٰ خان کا یک دم موضوع بدل دینا اور آنکھ سے اشارہ کرنا اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

⊛-----✪-----⊛

"آج میں تمہیں ایک بڑی حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی۔" شیخ زید روڈ پر دوڑتی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان طرح دار حسینہ نے جو خود کو لائلہ کہلاتی تھی اور شاید حقیقت میں لیلیٰ تھی، اپنی سنہری زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا تو اس کے پہلو میں براجمان چودھری افتخار جو پہلے ہی اس پر ریشہ خطمی تھا، اس ادا پر مزید نثار ہونے لگا اور نثار ہونے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اُس نے اپنے ہاتھوں کا بے باکانہ استعمال شروع کر دیا۔

"نائی مین۔ میں گاڑی چلا رہی ہوں۔ کوئی حادثہ ہو گیا تو ہم دونوں سیدھے اوپر جائیں گے۔" چودھری کی جسارت پر برا ماننے بغیر لائلہ نے اسے بڑے پیار سے ہنستے ہوئے بالکل ایسے تنبیہہ کی جیسے کوئی بے پروا مزاج کی ماں اپنے لاڈلے سپوت کو محض دنیا دکھاوے کے لیے تکلفاً ٹوکے۔ ورنہ حقیقتاً اسے ذرا پروا نہ ہو کہ اس کا بچہ اپنی شرارتوں کے نام پر کون کون سی تباہیاں مچاتا پھر رہا ہے۔ لائلہ نے چودھری کو اتنی چھوٹ دی تھی تو اس لیے کہ وہ اس کال گرل کو بے حد وحساب نواز رہا تھا۔

اپنے دبئی کے قیام کو رنگین بنانے کے لیے اس نے یہ بندوبست کیا تھا اور بہت خوش تھا کہ لمبے قد، سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی یہ حسینہ اس پر دل و جان سے فدا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سر سے پیر تک مصنوعی رنگوں میں رنگی اس حسینہ کا یوں فدا ہونا بھی مصنوعی ہے اور وہ اس طرح ہر اس شخص پر فدا ہو جاتی ہے جو اسے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق نوازنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

بہر حال اس حسینہ میں کوئی ایسا جادو ضرور تھا کہ چودھری نے پچھلے تین دن سے اسے ہی اپنا رفیق بنا رکھا تھا۔ اس میں لڑکی کے حُسن سے زیادہ ذہانت کا بھی دخل تھا اور صرف خلوت میں ہی نہیں، جلوت میں بھی چودھری کو خوش کرتی تھی۔ اس کے ساتھ دبئی میں گھومنے میں اسے خوب لطف آ رہا تھا اور حسبِ عادت لڑکی اور شراب کی بوتل کے ساتھ کمرے تک محدود رہنے کو ہی ترجیح نہیں دے رہا تھا۔

اپنی ذہانت کے اس کمال کی وجہ سے لائلہ نے ایک طرف تو خود کو حد سے زیادہ "استعمال" ہونے سے بچا رکھا تھا تو دوسری طرف وہ جی بھر کر چودھری کی جیبیں خالی کروا رہی تھی۔ کل وہ اسے اسی طرح "آج میں آپ کو ایک حیرت انگیز جگہ لے جاؤں گی" کہہ کر سونے کے بازار میں لے گئی تھی اور یہ بازار ایسا تھا کہ اس میں ہر طرف سونا بکھرا پڑا تھا۔ بے شمار جگمگاتی دکانیں تھیں جن کے اندر ہر طرح کے زیورات بھرے پڑے تھے۔ بھاری بھرکم زیورات، جنہیں تیل کی دولت سے مالا مال شیخ بخوشی اپنی بیگمات کی نذر کرتے تھے، دیکھنے والے کو متاثر کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔

چودھری صاحب کی فریفتگی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے لائلہ نے بھاری بھرکم زیورات کا ایک سیٹ معاوضے کے علاوہ بطور بونس حاصل کر لیا۔ اس قسم کے دوسرے کئی بونس وہ گزشتہ تین دنوں میں حاصل کر چکی تھی کہ دبئی میں گھومنے پھرنے کے لیے بھی عموماً شاپنگ مالز کا ہی رخ کرنے کا رواج تھا۔ اور اگر کسی شاپنگ

مال میں گھومتے ہوئے چودھری صاحب کی منظورِ نظر کو کوئی قیمتی سوٹ، پرس، جیولری یا شوپیس بھا جاتا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ محض قیمت کی گرانی کی وجہ سے چودھری صاحب کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی من پسند چیز سے محروم ہو جاتی۔ چنانچہ خوب شاپنگ ہو رہی تھی جس سے چودھری کے خزانے میں کمی ہونے کا سوال اس لیے پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ اس خزانے کو اپنے کمزور مزارعوں کی خون پسینے کی محنت سے بھرنے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ اب تو اس خزانے میں ہیروئن کی آمدنی سے ہونے والا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا چنانچہ چودھری تفریح کے نام پر خوب دولت اُڑا رہا تھا۔ اب بھی لائلہ نے اسے ایک حیرت انگیز جگہ لے چلنے کا ذکر کیا تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً راضی ہو گیا کہ اسے اس حسینہ پر لٹائے جانے والے درہموں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

لائلہ نے گاڑی "امارات" نامی مال کی وسیع پارکنگ میں پارک کی اور پھر وہ دونوں جگمگاتی روشنیوں میں گاڑی سے نکل کر یوں ساتھ چلے کہ اپنے شانے سے لگی لائلہ کے گرد چودھری نے ایک ہاتھ کا حلقہ اس طرح سے بنا رکھا تھا کہ اس کی انگلیاں لائلہ کی جینز اور ٹاپ کے درمیان موجود ایک خاصی بڑی خالی جگہ پر اس کی ناف پر تھرکتی تھیں۔ لائلہ کو اس جسارت پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ یہی سب برداشت کرنے کی تو لیس لیتی تھی۔ چنانچہ مگن سی اسے مختصر راستوں اور خودکار زینوں سے گزار کر ایک ایسی جگہ لے گئی جس نے چودھری کو سچ مچ مبہوت کر دیا۔ یہاں اس نے شیشے کی دیوار کے پار ایسا نظارہ دیکھا کہ لمحہ بھر کے لیے کنفیوز ہو گیا کہ دبئی میں ہے یا واپس نیویارک پہنچ گیا ہے۔ اور مراد شاہ کے اپارٹمنٹ کی فرنچ ونڈو میں کھڑا باہر کا نظارہ کر رہا ہے۔

"یہ "اسکی دبئی" ہے۔" اس کی کیفیت دیکھ کر لائلہ نے فخر سے بتایا۔

"کمال ہے بھئی۔ مجھے تو ایسا لگا کہ میں دبئی کے بجائے نیویارک میں ہوں۔ ایسی برف باری کا دبئی میں کہاں تصور کیا جا سکتا ہے؟"

چودھری متاثر تھا۔ حقیقتاً ساڑھے بائیس ہزار میٹر پر مشتمل یہ برفانی علاقہ تھا ہی متاثر کن کہ گرم لُو اُڑاتے صحرا میں اس کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن عربوں نے یہ کمال کر دکھایا تھا۔ بلندی سے گرتی برف، پھسلواں راستوں پر اسکیٹنگ بورڈ پر گرم لباسوں میں پھسلتے لوگ، پتوں پر برف کے ذرّات لیے کھڑے پائن کے درخت، برف پر پھسلنے والی گاڑیاں اور ایک دوسرے پر برف اُڑاتے سرخوشی سے کھیلتے بچوں کو دیکھ کر بھلا کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ یہ سب نقلی ہے۔ لیکن یہ تھا بہر حال نقل ہی جسے عربوں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر نقل بمطابق اصل حسبِ خواہش بنا کر دکھا ڈالا تھا۔

"جس کے پاس دھن دولت ہو، وہ ہر شے کا تصور کر سکتا ہے۔ ورنہ تو "اسکی دبئی" کی تعمیر تو کیا، لائلہ جیسی عورت کی قربت بھی خواب بن جاتی ہے۔" لائلہ نے ہنستے ہوئے چودھری کی بات کا جواب دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "آئیں چلیں، ذرا چل کر اس موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔"

اگرچہ چودھری کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا کہ زندگی میں اپنے وطن کے شمالی علاقہ جات کے علاوہ بہت سے سرد ممالک کا بغرض تفریح سفر کیا تھا، پھر بھی وہ لائلہ کو خوش کرنے کے لیے اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ تھرموں اور گرم لباس کے حصول کے بعد وہ دونوں اس علاقے میں داخل ہوئے تو یکدم ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس جگہ پر درجۂ حرارت منفی ایک یا دو ہوتا تھا اور گرم علاقوں میں رہنے والوں کے، چاہے وہ چوبیس گھنٹے ہی اے سی میں رہتے ہوں، مزاج پوچھنے کے لیے کافی تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندر گھستے ہی لائلہ تو ہوا ہو گئی اور پیروں سے اسکیٹنگ بورڈ باندھے برف پر پھسلنے کا لطف اٹھانے لگی۔ البتہ چودھری کے لیے یہ تجربہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگرچہ شوق ہی شوق میں پھسل جاتا تو نہ تسلیم کیے جانے والے بڑھاپے کی ہڈیاں جو اگرچہ بہت سنبھال کر رکھی گئی تھیں، پھر بھی تھیں تو بوڑھی ہی، ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد مرمت میں خاصی مدت لیتیں اور اس عرصے کے لیے وہ زندگی سے لطف اندوز ہونے سے محروم ہو جاتا۔ اس لیے بہتر سمجھا کہ ایسے کسی خطرناک تجربے سے دور ہی رہے۔ لیکن جب یہاں تک آ گیا تھا تو کچھ تو کرنا ہی تھا، اس لیے برف پر پھسلنے والی گاڑی کا رخ کیا۔ اس گاڑی کو انسان دوڑاتے تھے۔ چنانچہ اس میں بیٹھ کر اس کی انا کو خاصی تقویت ملی۔ لیکن پھر وہ جلد ہی اس کھیل سے بھی اُکتا گیا اور اسکیٹنگ کا لطف اُٹھاتی لائلہ کو اشارے سے باہر نکلنے کا کہا۔ وہ فوراً آ گئی۔

''مزہ آ گیا۔ بہت دنوں بعد یہاں آئی ہوں۔ اگر آپ نہ بلاتے تو میں اپنا گھنٹہ پورا کیے بغیر باہر نکلنے والی نہیں تھی۔'' مال سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بچوں کی سی خوشی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا کروں گا کہ جب کبھی میرا دُبئی دوبارہ آنا ہوگا تو تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ نیویارک لے چلوں گا، تم وہاں برف باری کے سیزن میں چلنا اور خوب انجوائے کرنا۔''

یہ سوچے بغیر کہ اب شاید خود اس کا نیویارک میں داخلہ بھی مشکل ہو، اس نے لائلہ سے وعدہ کیا۔ ویسے بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ایک کال گرل سے کیے ہر وعدے کو نبھایا جائے۔ ایسے وعدے صرف اسے خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش کر سکے۔

ان کا اگلا پروگرام دُبئی کی ہوائی سیر کا تھا۔ اُس کی فرمائش بھی لائلہ نے ہی کی تھی اور چودھری کو اس لیے انکار نہیں تھا کہ خود اس نے بھی کبھی دُبئی کو اس انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ دُبئی کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر دیکھنا اس کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اس سفر میں بھی اسے لائلہ کی قربت میسر تھی۔ بلند و بالا عمارتوں سے بھرے دُبئی کی فضائی سیر کرتا ہوا وہ نظروں سے عمارتوں کی بلندی کم ناپ رہا تھا، لائلہ کے جسمانی نشیب و فراز میں زیادہ اُلجھا ہوا تھا۔

''یہ برج دُبئی ہوٹل ہے۔ اسے برج العرب بھی کہتے ہیں۔'' ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے کی طرف پہنچ کر نیچی پرواز کرنے لگا تو لائلہ نے ایک کھلے ہوئے بادبانوں والی کشتی جیسی عمارت کی طرف چودھری کی توجہ مبذول کروائی۔

''یہ ہوٹل ہمارے دُبئی کی پہچان ہے۔ یہاں دنیا کی ہر سہولت میسر ہے۔ باغ، ریسٹورنٹ، کلب سمیت یہاں ہر وہ شے موجود ہے جس کے بارے میں کوئی انسان سوچ سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک کمرے کا کرایہ اتنا زیادہ ہے کہ عام آدمی یہاں قیام کا تصور نہیں کر سکتا۔'' لائلہ برج العرب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں کل ہی اس ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا ہوں۔ پھر جب تک میں یہاں ہوں، تم میرے ساتھ وہیں رہنا۔''

چودھری کو ایسا لگا کہ اس کے برج العرب کو چھوڑ کر کسی اور ہوٹل میں منتقل ہونے کی وجہ سے لائلہ اسے عام آدمی قرار دے رہی ہے اس لیے فوراً ہی اعلان کر دیا کہ وہ خود وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ اس خبر کو سن کر لائلہ بے حد خوش ہوئی۔

''اوہ..... سو سویٹ ڈارلنگ! تم نے تو میری دلی خواہش پوری کر دی۔'' اس نے پائلٹ کی پروا کیے بغیر چودھری کے چٹاچٹ کئی بوسے لے ڈالے۔

اس تفریحی پرواز سے فارغ ہو کر وہ کھانے کے لیے حجرہ ہوٹل پہنچے، تب بھی چودھری پر ان بوسوں کا سرور طاری تھا۔ یہ سحر اس وقت ٹوٹا جب اس کے خاص موبائل نے جیب میں پڑے پڑے وائبریشن کی۔ یہ موبائل اسے الفا کی طرف سے بھجوایا گیا تھا اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سے کی جانے والی کال ٹریس نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی ٹریس کرنے کی کوشش کرے تو کال ہی ڈس کنیکٹ ہو جاتی تھی۔ پہلے پہل جب دنیا کا یہ منفرد ترین موبائل اس کی ملکیت میں آیا تھا تو اسے بڑا احساسِ تفاخر ہوا تھا لیکن اب یہ بوجھ لگنے لگا تھا۔ کیونکہ دوسری طرف سے اس سے رابطہ کرنے والے عموماً احکامات ہی صادر کرتے تھے اور کسی کا حکم ماننا آج بھی اسے بڑا دُشوار لگتا تھا۔ اب بھی موبائل نے وائبریٹ کیا تو اس کا دل چاہا کہ کال ریسیو نہ کرے اور لائلہ کی قربت سے لطف اندوز ہوتا رہے لیکن خیال کو عملی جامہ پہنانے سے قبل ہی اسے یاد آ گیا کہ الفا نیویارک میں کشور اور آفتاب کے اپارٹمنٹ پر کروائے جانے والے قاتلانہ حملے کے بعد پہلے ہی اس سے ناراض ہے اور کال ریسیو نہ کرنے کی صورت میں اس کی ناراضگی مزید بڑھ سکتی ہے، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کر ہی لی۔

''اُمید ہے کہ اب تک تمہارا تفریحی ٹور مکمل ہو گیا ہوگا۔ اس لیے مہربانی کر کے پاکستان واپس چلے جاؤ تاکہ وہاں تمہیں تمہارے حصے کی ڈیوٹی سونپی جا سکے۔''

الفا نے ایسے لہجے میں اس سے یہ جملے کہے جیسے وہ فون پر اس کی تصویریں دیکھ رہا ہو اور جانتا ہو کہ وہ ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کسی طرح دار حسینہ کی معیت میں زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔

''میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ بتائیں کہ آپ مجھے وہاں کب دیکھنا چاہتے ہیں؟'' اس نے مینو کارڈ کا جائزہ لیتی لائلہ کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کل..... پہلی دستیاب فلائٹ سے۔'' الفا نے حکم جاری کر کے فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا تو اس نے بے آواز سے جھنجلاتے ہوئے موبائل واپس جیب میں ڈال لیا۔

''خیریت ڈارلنگ! کس کا فون تھا؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو'' اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے ہوئے لائلہ نے اس سے پوچھا۔

''پاکستان سے میرے پی اے کی کال تھی۔ کل ایک اہم بزنس پارٹی، میٹنگ کے لیے وہاں پہنچ رہی ہے اس لیے کل میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' اس نے اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا کہ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اس نے لائلہ سے کل رات برج العرب میں شفٹ ہونے کا وعدہ کیا تھا اور اب فوراً ہی اسے یہاں سے روانگی کا حکم نامہ مل گیا تھا۔

''اوہ نو..... یہ تو سارا پروگرام ہی خراب ہو گیا۔ کیا تم اس میٹنگ کو دو چار دن کے لیے ٹال نہیں سکتے؟ یا پھر کسی اور اعتماد کے بندے سے کہو کہ وہ یہ میٹنگ نمٹا لے۔'' وہ بڑی ادا سے ٹھنکی۔

''سوری ڈارلنگ! پارٹی بہت بڑی ہے اور میٹنگ بھی بہت اہم، اس لیے ہمیں ہی اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنی ہو گی۔ تم اُداس نہ ہو، میں بہت جلد دوبارہ یہاں کا چکر لگاؤں گا اور آنے سے پہلے ہی برج العرب میں ڈبل بیڈ روم بک کروا لوں گا۔ پھر ہم دونوں بہت سارے دن وہاں ساتھ رہیں گے۔'' چودھری اس کی ادا سے متاثر تو ضرور ہوا تھا لیکن زیر اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جو زبردست تھا، اس کی جان کو آ جاتا۔ چنانچہ فی الحال اس کے حکم کی تعمیل میں ہی بھلائی تھی۔

⊛----✪----⊛

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشابرم خان بری طرح لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم تھے جن سے نکلتے خو
نے اس کے لباس کو رنگ ڈالا تھا۔

جسم پر موجود یہ زخم اسے کسی لڑائی یا حادثے کے نتیجے میں نہیں لگے تھے بلکہ اس نے خود اپنے آ
لگائے تھے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ بشیر تک رسائی حاصل کر سکے۔

اس نے اور میجر اسفندیار نے بہت غور کیا تھا کہ اس شخص پر کس طرح ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے؟ لیکن کو
بھی طریقہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اتنی مضبوط حیثیت کا مالک تھا کہ اگر فوج اس کے خلاف براہ راس
ایکشن لینا چاہتی تو پورے علاقے میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور اس کے ہزاروں پیروکار بپھر کر فوج
خلاف ہی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ صرف احمد یار کے بیان کی بنیاد پر اسے گرفتار کر
کے بارے میں سوچا جا سکے۔ خفیہ طور پر اغوا کرنا بھی اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جہاں رہتا تھا، وہاں ہر وقت
مسلح افراد پہرہ دیتے تھے اور ان مسلح افراد سے بھڑے بغیر اس تک رسائی ممکن نہیں تھی۔

اپنی قیام گاہ سے وہ بہت کم باہر نکلتا تھا اور جب بھی نکلتا تھا، اس کے ساتھ اس کے ذاتی محافظوں
فوج موجود ہوتی تھی۔ ان مسلح محافظوں کے نرغے میں گھس کر اس تک پہنچنے کے لیے بھی فوج ہی کی ضرور
پڑتی تھی۔ پھر اس کے بعد بھی نتائج بدترین ہی نکلنے تھے کہ سب سے بڑا مسئلہ اس کے حواریوں کا تھا۔ بشیر
کچھ ہوتا تو وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سڑکوں پر نکل آتے اور انہیں سنبھالنا انتظامیہ کے لیے مشکل ہو جا
چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے تو یہی غور کرنا شروع کیا کہ بغیر کسی ہنگامے کے اس تک کس طرح
جائے۔

آخر کار مشابرم خان کو ہی ترکیب سوجھی۔ میجر اسفندیار اس ترکیب پر عمل کرنے میں ہچکچاہٹ کا
تھا۔ اپنے کسی آدمی کو اس طرح سے زک پہنچانا کہ وہ شدید زخمی نظر آئے، بڑی عجیب سی بات تھی۔ پھر اسے
بھی فکر تھی کہ اپنے پروگرام کے مطابق اگر مشابرم خان بشیر کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو اکیلا
کر سکے گا۔ لیکن مشابرم خان نے اسے راضی کر لیا۔ میجر اسفندیار کو بھی آخر کار ہتھیار ڈالنے پڑے کہ اس
سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ مشابرم خان کو زخمی کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ زخم اس نوعیت کے تھے کہ
دیکھنے میں وہ خاصا زخمی نظر آئے لیکن اسے ایسا کوئی خطرناک زخم نہیں لگایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی
ہڈی ٹوٹ پھوٹ جائے یا بہت زیادہ خون بہنے کی وجہ سے وہ نقاہت محسوس کرنے لگے۔ احتیاطاً اسے
سے طاقتور ادویات کے ساتھ ساتھ خون کے بہاؤ کو روکنے والی ادویات بھی استعمال کروا دی گئی تھیں اور
اس کا لیر لیر پیراہن خون میں تر بتر نظر آتا تھا، اس میں اس کا اپنا خون بہت کم موجود تھا اور بیشتر رنگینی اس
چارے بکرے کے خون کی تھی، جسے آج کھانے کے لیے ذبح کیا گیا تھا۔

حسب پروگرام لڑکھڑا کر چلتا مشابرم خان جب پتھروں سے بنی اس عمارت کے دروازے پر پہنچا
کے ایک حصے میں بشیر کی رہائش تھی۔ باقی حصہ محافل وغیرہ کے لیے مخصوص تھا، تو جان بوجھ کر گر گیا۔ ا
گرتے دیکھ کر دروازے پر موجود محافظوں میں سے ایک لپک کر اس کے قریب آیا۔ مشابرم خان نے ایسا
سادھ لیا جیسے وہ بے ہوش ہو۔ محافظ نے قریب آ کر اس کا جائزہ لیا اور پھر وہیں سے چیخ کر اپنے ساتھیوں
اطلاع دی۔

"یہ تو بڑا زخمی ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی نے اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

جواب میں ایک اور محافظ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا۔

"واقعی..... اس بے چارے کی تو بہت بری حالت ہے۔ ایسا کرتے ہیں، اسے اندر پہنچا دیتے ہیں۔
اندر ڈاکٹر تو ہے ہی، وہ اس کی مرہم پٹی کر دے گا۔ بعد میں یہ ہوش میں آ کر خود ہی بتا دے گا کہ اس کی یہ
درگت کس نے بنائی ہے۔" دوسرے محافظ نے بھی قریب آنے پر اس کی حالت دیکھی تو ہمدردی سے بولا۔ پھر
فوراً ہی وہاں ایسی ہلچل مچ گئی جو کسی شدید زخمی کو ہسپتال منتقل کرنے کے وقت مچتی ہے۔

مشابرم خان نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور صرف آوازوں سے اردگرد کی صورت حال کا اندازہ لگا
رہا تھا۔ کسی کے کہنے پر اندر سے اسٹریچر منگوایا گیا اور دو تین آدمیوں نے مل کر اسے اس اسٹریچر پر منتقل کیا۔
پھر اسٹریچر حرکت کرتا ہوا اندر کی طرف جانے لگا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اپنے منصوبے کے
پہلے حصے میں تو کامیاب ہو گیا تھا اور اندر تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ ورنہ یہی مرحلہ سب سے مشکل تھا۔

وہ ایک دو بار بہانے سے یہاں آ کر امکانات کا جائزہ لے چکا تھا۔ عبادت کے اوقات میں وہاں
موجود محافظ زیادہ محتاط رہتے تھے اور کسی بھی شخص کو بلا ضرورت وہاں رکنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں
وہ بشیر کی رہائش گاہ تک رسائی کیسے حاصل کرتا؟ البتہ اس نے بشیر کو دیکھا ضرور تھا۔ چگی داڑھی والے اس
شخص کی رنگت گوری تھی۔ قد کاٹھ اچھا تھا، لیکن آنکھوں میں جو سانپ جیسی چمک تھی، وہ مقابل کو زیادہ دیر اس
سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں دیتی تھی۔ اس نے کچھ دیر بشیر کے پیچھے وہاں عبادت کی اور اس میں کوئی شک
نہیں تھا کہ وہ ایک خوش الحان شخص تھا۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں وہ شخص اس کے دل کو بھایا نہیں تھا اور نہ ہی
دل میں احترام کے وہ جذبات اُبھرتے تھے جو کسی نیک نام اور پرہیزگار شخص کو دیکھ کر اُبھرتے ہیں۔

مشابرم خان تو ایسا شخص تھا کہ کسی بھی قسم کے فرق کو خاطر میں لائے بغیر ہر عالم دین کا احترام کرتا تھا۔
کیونکہ اس کا نظریہ تھا کہ معمولی اختلافات کے ساتھ ان میں سے ہر شخص دین کی خدمت کر رہا ہے اور اگر اس
نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر رکھی ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اس کے اسٹریچر کو احاطے میں ہی عبادت گاہ سے ہٹ کر بنائی گئی ایک نسبتاً چھوٹی عمارت میں لے جایا
گیا۔ آنکھ کی جھری سے گردوپیش کا جائزہ لیتے مشابرم خان نے وہاں کے مخصوص ماحول سے اندازہ کر لیا کہ
یہ وہی چھوٹا سا ہسپتال ہے جس کے بارے میں اسے علم ہوا تھا کہ یہاں چوبیس گھنٹے ڈاکٹر اور نرسنگ اسٹاف
ڈیوٹی پر رہتا ہے اور نہ صرف بشیر کے معمولی اشارے پر اس کی خدمت کے لیے پہنچ جاتا ہے بلکہ اس کے
منظورِ نظر افراد کو بھی یہاں علاج کی سہولت میسر رہتی ہے۔

اس کا اسٹریچر اندر پہنچا تو ڈیوٹی پر موجود اسٹاف نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ فوراً ہی اس کے پھٹے ہوئے
خستہ لباس کو اس کے جسم سے الگ کر کے اس کے زخموں کی صفائی اور مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس مرہم پٹی کے
دوران وہ منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج کرتا رہا تاکہ ایک تو طبی امداد دینے والوں کو اس کی تکلیف کا یقین ہو
جائے، دوسرے یہ بھی واضح ہو جائے کہ وہ بے ہوش نہیں ہے۔ بے ہوشی کا ڈرامہ کر کے وہ باہر موجود محافظوں کو
تو بے وقوف بنا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے طبی عملہ جعلی بے ہوشی کے دھوکے میں نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ ان کے سامنے
نیم غنودگی اور نقاہت کی اداکاری تو کی ہی جا سکتی تھی۔

"اسے چین کر دو۔" شاید اس کی مسلسل کراہوں سے تنگ آ کر ڈاکٹر نے یہ ہدایت دی تھی۔ فوراً ہی
اس ہدایت پر عمل ہوا اور اس کا بازو پکڑ کر کسی نے اس میں سوئی چبھو دی۔ سوئی کی چبھن کے ساتھ اس نے
اپنے جسم میں اترتی دوا کو محسوس کیا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد وہ احساسات سے عاری ہو گیا۔ اسے دیا گیا چین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کلر یقیناً نشہ آور تھا جس نے اسے سکون کی نیند سلا دیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چھوٹے لیکن صاف ستھرے کمرے میں موجود تھا۔ کمرے میں سفید رنگ کا غالب استعمال ظاہر کر رہا تھا کہ یہ ہسپتال کا کمرہ ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں کینولا لگا تھا جس کی مدد سے قطرہ قطرہ گلوکوز اس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ قریب ہی کرسی ڈالے ایک نوعمر و خوش شکل لڑکی بیٹھی اس کی صورت تک رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ لڑکی مسکراتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں مسٹر!'' قریب آ کر اس کی کلائی کو تھامتے ہوئے اس نے شیریں لہجے میں دریافت کیا۔

''میں کہاں ہوں؟'' نرس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے غائب دماغی سے سوال کیا۔

''آپ ہسپتال میں ہیں، آپ کو شدید زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ ہم نے آپ کی مرہم پٹی کر کے لباس تبدیل کروایا۔ آپ بتائیں کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' نرس نے نرم لہجے میں اس کی یادداشت بحال کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں ٹھیک ہوں..... لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہاں تک کیسے پہنچا؟'' اس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ اپنے ذہن پر زور دیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔'' اسے تسلی دے کر نرس کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر اپنے ذہن میں وہ کہانی دہرانے لگا جو یہاں والوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اسے سنانی تھی۔ چند منٹوں میں ہی نرس، ڈاکٹر کے ساتھ واپس آ گئی۔ ڈاکٹر نے سپاٹ تاثرات کے ساتھ اس کا معائنہ کیا اور اپنے کام سے فارغ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے مسٹر؟''

''مشابرم خان۔'' اس نے سچ بتایا۔

''ویل مسٹر مشابرم خان! اب تمہاری حالت کافی بہتر ہے۔ زخم بہت زیادہ ہیں لیکن کوئی بھی زخم زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تمہیں یہ زخم کیسے آئے؟'' اپنے سپاٹ لہجے کے باوجود ڈاکٹر کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ کیونکہ بحیثیت ڈاکٹر زخموں کی نوعیت دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ زخم کسی حادثے کے نتیجے میں نہیں آئے ہیں بلکہ کسی تیز دھار ہتھیار سے لگائے گئے ہیں۔

''مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے ڈاکٹر صاحب! میں بے چارہ غریب مسافر یہاں آ کر خوامخواہ پھنس گیا۔ میں اپنی ماں کی میت میں شریک ہونے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر پنجاب جا رہا تھا۔ وہاں میری ڈرائیور کی نوکری ہے۔ گاؤں سے ادھر آ کر گاڑی میں سیٹیں بھی بک کروالی تھیں۔ پھر پتہ چلا کہ حالات کی وجہ سے گاڑیاں آگے نہیں جا رہی ہیں۔ میں اور میری بیوی ادھر ہی پھنس گئے۔ بیوی نے کہا بھی کہ واپس گاؤں چلو لیکن میں اس انتظار میں رک گیا کہ گاڑیاں چلیں گی تو آگے چلے جائیں گے۔ واپس گاؤں جانے اور پھر آنے میں وقت بھی لگتا اور خرچہ بھی ہوتا۔ بیوی میری بات مان گئی۔ ہم یہیں ایک ہوٹل میں رہنے لگے۔ ہوٹل سے میں کبھی کبھی نماز پڑھنے ادھر بھی آ جاتا تھا۔ کل بھی مغرب کی نماز میں آیا تھا۔ نماز پڑھ کر نکلا تو ایسے میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا اور گھومتے ہوئے ذرا سنسان جگہ پر پہنچ گیا۔ وہاں فوراً ہی دو آدمیوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے ساتھ مار پیٹ کرنے لگے۔ میں نے ان سے اپنا جرم پوچھا تو کہنے لگے تیرا جرم یہ ہے کہ تُو ان کا پیروکار

ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بھائی! میں ایک مسافر ہوں لیکن اُنہیں میری بات سمجھ نہیں آئی۔ وہ مجھ پر تشدد کرتے رہے اور کہنے لگے جن سترہ افراد کو بس سے اُتار کر ہلاک کیا گیا، وہ بھی غریب مسافر تھے۔ ان پر رحم نہیں کیا گیا تو ہم تم پر کیوں رحم کریں؟ ہم تو تم سے اور تمہارے جیسے دوسروں سے اپنے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لیں گے۔ ہم تمہیں تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ وہ مجھے زخمی کرتے رہے اور ہنستے رہے۔ میں تکلیف اور خوف سے بے ہوش ہو گیا اور شاید وہ لوگ مجھے مُردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے بہت دیر میں ہوش آیا تو میں ہمت کر کے اس ویرانے سے نکل پڑا۔ اس وقت ایسا نہیں تھا کہ اُجالا ہوتا اور مجھے راستے سمجھ آتے، بس ایسے ہی چل پڑا۔ تکلیف اور کمزوری کی وجہ سے ٹھیک طرح سے چلا جا رہا تھا اور نہ ہی راستے سمجھ آ رہے تھے۔ میں ہمت کر کے چلتا رہا۔ چلتے چلتے سورج نکل آیا اور میں نے دیکھا کہ میں ادھر آنے والی سڑک پر ہوں تو ہمت بڑھ گئی کہ تھوڑی اور کوشش کروں گا تو ٹھیک جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے آگے تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ میں عبادت گاہ کے سامنے پہنچ کر گر گیا تھا، جہاں سے گیٹ پر موجود گارڈز مجھے لے کر یہاں آئے اور آپ لوگوں نے مہربانی کر کے میری مرہم پٹی کر دی۔'' اس نے نہایت روانی سے وہ کہانی سنا دی جو پہلے سے یاد رکھی تھی۔

''تم نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے تمہیں اس طرح زخمی کیا؟'' ڈاکٹر اُس کی سنائی داستان سے متاثر نظر آ رہا تھا چنانچہ ذرا نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! ان لوگوں نے چہرے پر نقابیں لگا رکھی تھیں اور وہاں اندھیرا بھی بہت تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ان لوگوں کو پہچان سکتے تو بہت اچھا ہوتا۔ تمہارے مجرموں کو تمہارے سامنے سزا دی جاتی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہ تو سمجھ آ ہی گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اب بھی انہیں ایسے ہی چھوڑا نہیں جائے گا۔ ہم اسلحے کا جواب پتھر سے دینے والے لوگ ہیں اور ہم سے ٹکرانے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ خاصا سنگین تھا اور اس کے الفاظ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ یہاں صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہی کام نہیں کر رہا بلکہ بشیر کا مقرب خاص ہے اسی لیے اس قسم کے عزائم کا اظہار کر رہا ہے۔

''آپ جو کریں آپ کی مرضی ہے ڈاکٹر صاحب! میں غریب آدمی ہوں اور کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آپ مجھ پر اتنی مہربانی کریں کہ ہوٹل میں میری بیوی کو اطلاع کروا دیں کہ میں یہاں ہوں۔ وہ بے چاری بڑی پریشان ہو گی کہ میں رات واپس کیوں نہیں آیا اور اب بھی دن چڑھے تک کہاں ہوں۔'' اس نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اسے کسی انتقام وغیرہ سے دلچسپی نہیں ہے، اپنی بیوی کے لیے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''تم نے دن چڑھے کے الفاظ غلط استعمال کیے ہیں۔ تم بے ہوش تھے، اس لیے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ دن چڑھنے کے بعد دوبارہ ڈھلنے کے لیے تیار ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اطلاع دی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ میری بیوی بے چاری نے تو رو رو کر اپنی حالت خراب کر لی ہو گی۔'' وہ مضطرب نظر آنے لگا۔

''جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ تم ہمیں ہوٹل کا نام اور اپنا کمرہ نمبر وغیرہ بتاؤ۔ میں یہاں سے کسی کو بھیج کر تمہاری بیوی کو یہیں بلوا لیتا ہوں۔ اچھا ہے وہ ہو گی تو تمہاری دیکھ بھال بھی کر لے گی اور تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔ آج کی رات کم از کم تم کو یہیں گزارنی پڑے گی۔ پھر کل صبح تمہارا چیک اپ کرنے کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں چھٹی کب دی جائے۔'' ڈاکٹر اس سے کہہ کر باہر نکل گیا جبکہ نرس وہیں موجود رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ڈاکٹر صاحب تو بہت مہربان آدمی لگتے ہیں۔" نرس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔

"اپنے لوگوں کے لیے وہ بہت مہربان ہیں۔ ورنہ باہر والوں کو تو منہ بھی نہیں لگاتے۔" نرس نے جواب دیا۔

مشابرم خان نے اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا، اپنے لوگوں سے اس کا کیا مطلب ہے۔

"بشیر صاحب یعنی بڑے صاحب کو آپ کے بارے میں بتایا جائے گا تو انہیں بھی بہت افسوس ہوگا۔ ہم میں سے کسی کے پیر میں کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ میں نے ان کی طرح اپنے دیوانوں سے اتنی محبت کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ جب ہی تو ہم بھی ان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" وہ چھوٹی سی لڑکی بڑی عقیدت سے بتا رہی تھی اور مشابرم خان سوچ رہا تھا کہ بشیر کیسا جادوگر ہے جس نے سب کے دل اپنی مٹھی میں لے رکھے ہیں۔

"میری ان سے زیادہ واقفیت نہیں ہے، بس آتے جاتے یہاں ٹھہرتا ہوں تو عبادت کے دوران ان سے دیدار بھی کر لیتا ہوں۔" اس نے ایسے لہجے میں بتایا جیسے اپنی اس محرومی پر بڑا افسردہ ہو۔

"ہم میں سے زیادہ تر کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی خوش ہونا پڑتا ہے۔ ان کے اتنے چاہنے والے ہیں وہ آخر کس کس سے ملیں گے؟ لیکن تم اُداس نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری داستان ان تک پہنچی تو وہ تمہیں ملاقات کے لیے اپنے پاس ضرور بلائیں گے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے اسے اُمید دلائی۔

"پھر تو میں اپنے اس طرح زخمی ہونے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔" اس نے بے ساختگی سے کہا تو نرس دھیمے سُروں میں ہنس دی۔ وہ بڑی نوخیز لڑکی تھی جو یوں ہنستے ہوئے اچھی لگ رہی تھی۔

"تم کب سے یہاں ملازمت کر رہی ہو؟ تمہاری تو بڑے صاحب سے ملاقات ہوئی ہوگی۔" مشابرم خان نے اسے کھوجنا شروع کر دیا۔

"نہیں، میں یہاں دو مہینے پہلے ہی تو آئی ہوں۔ میری ڈیوٹی یہیں پر ہوتی ہے جبکہ ان کو ضرورت پڑے تو ڈاکٹر صاحب خود ان کے پاس چلے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ظاہر ہے کوئی سینئر نرس ہوتی ہے۔" اس نے بھولپن سے بتایا۔

"یہاں کتنے ڈاکٹرز اور نرسیں ہیں۔ کیا یہ کافی بڑا ہسپتال ہے؟" اس نے اپنی کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

"یہ زیادہ بڑا ہسپتال نہیں ہے، بس یوں سمجھ لو کہ یہاں صرف بڑے صاحب، ان کے ذاتی ملازمین اور عبادت گاہ کے اسٹاف کا علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھار باہر سے تمہارے جیسا کوئی مریض آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں چوبیس گھنٹے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جونیئر ڈاکٹرز ہیں جن میں سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہیں جبکہ نرسیں مجھ سمیت چار ہیں۔ ہم دو دو کر کے دن رات کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ کبھی کسی چھٹی کی ضرورت پڑے تو ایک نرس سے بھی کام چل جاتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر ہسپتال میں کوئی مریض داخل نہیں ہوتا۔" وہ بھولپن سے اسے ساری معلومات فراہم کرتی چلی گئی۔

"کیا دونوں جونیئر ڈاکٹرز بھی شفٹوں میں کام کرتے ہیں؟" اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا، اس پر عمل کرنے کے لیے مکمل معلومات ہونا ضروری تھا۔

"نہیں، دونوں ڈاکٹرز دن کے اوقات میں چھ چھ گھنٹوں کی شفٹ میں کام کرتے ہیں۔ رات میں صرف بڑے ڈاکٹر صاحب ہی ہوتے ہیں۔ البتہ دونوں جونیئر ڈاکٹرز اس بات کے پابند ہیں کہ اگر

ایمرجنسی میں رات کو یہاں بلوایا جائے گا تو وہ فوراً پہنچ جائیں گے۔" نرس نے بتایا۔

مشابرم خان اس سے اسی نوعیت کے مزید سوالات بھی کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ فطرتاً کچھ معصوم لڑکی تھی جو سادگی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ تقریباً پون گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر دوبارہ وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر تھے۔

مشابرم خان جانتا تھا کہ اس کے پاس اس کے لیے کیا خبر ہوگی پھر بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"میری بیوی تو ٹھیک ہے نا؟" مشابرم خان نے گھبرانے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے لوگوں کی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ریسپشن پر موجود بندے نے بتایا ہے کہ کل رات گئے دو افراد وہاں آئے تھے اور تمہاری بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کے ساتھ جاتے ہوئے تمہاری بیوی نے کسی قسم کا ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اسے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف لے جایا گیا ہے۔" ڈاکٹر نے اسے وہی اطلاع دی جو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ میجر اسفندیار کے ساتھ اس کا یہ پروگرام پہلے طے پا چکا تھا کہ وہ لوگ گل مینا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس طرح ایک تو وہ گل مینا کے محفوظ مقام پر ہونے سے مطمئن بھی رہتا، دوسرے یہ ڈرامہ بھی کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کی خبر دیتے ہی پریشان ہونے کی اداکاری شروع کر دی۔

"وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی ڈاکٹر صاحب! یہاں ہمارا ایسا کوئی جاننے والا نہیں ہے جس کے ساتھ وہ اتنی رات کو جا سکے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے ڈرا دھمکا کر یا پھر دھوکے سے کہیں لے جایا گیا ہے۔" اس نے تقریباً رونے والی شکل بنا لی۔

"ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ دونوں تمہاری بیوی کے پاس پہنچے ہوں گے اور انہوں نے اسے اطلاع دی ہوگی کہ مشابرم خان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں داخل ہے اور تمہیں بلا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے وہ اس کے جال میں آ کر ان کے ساتھ چل پڑی ہوگی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے والے لوگ کون تھے؟"

ڈاکٹرز نے خود ہی ایسا تجزیہ پیش کر دیا کہ مشابرم خان کو کہانی سنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ سوال کر کے اٹھائے گئے سوال کا جواب اسے دینا تھا۔

"میرے خیال میں تو یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے مجھے تشدد کر کے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مار کھانے کے دوران میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں یہاں کون سے ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"اور ان کمینوں نے انتقام کے جوش میں ایک معصوم عورت کو اغوا کر ڈالا۔ جانے وہ ظالم اس بے چاری کے ساتھ کیا کریں گے۔ اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ رات بھر میں اس کی عزت کسی طور محفوظ نہیں رہی ہوگی اور پتہ نہیں کتنے درندے اس کے جسم کو بھنبھوڑتے رہے ہوں گے۔ تم دیکھنا کہ جلد ہمیں کہیں سے اس کی بھی پھٹی لاش مل جائے گی۔"

مشابرم خان کی بات سن کر ڈاکٹر نے ایسے الفاظ میں ایک اَن دیکھے منظر کا نقشہ اس کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا کہ مشابرم خان حقائق سے واقف ہونے کے باوجود کانپ اٹھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر میری گل کو کچھ ہوا تو میں ان میں سے ایک ایک کی تکا بوٹی کر ڈالوں گا۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں عزم کا اظہار کیا۔

"تم خود کو تنہا مت سمجھو۔ تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اس کا حساب لینے کے لیے ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے۔ میں خود بڑے صاحب سے تمہارے سلسلے میں بات کروں گا۔ فی الحال تم یہاں ریسٹ کرو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہاری بیوی کو تلاش کیا جا سکے۔"

ڈاکٹر اسے تسلی دے کر باہر نکل گیا تو اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ یہ اداکاری اس لیے ضروری تھی کہ کمرے میں مستقل موجود نرس کے ذریعے دوسروں کو بھی خبر ہو سکے کہ اس اپنی بیوی کے غیاب پر کتنا افسردہ ہے۔ حسبِ توقع نرس اُس کے قریب چلی آئی اور اُس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے تسلی دینے لگی۔

"اتنے پریشان مت ہو مسٹر! ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اندازے غلط ہوں اور تمہاری بیوی بالکل محفوظ ہو۔" وہ بہت معصومیت سے اُسے اُمید دلا رہی تھی۔ مشاہرم خان کو افسوس ہوا کہ اسے اتنی معصوم لڑکی کو دھوکا دینا پڑ رہا ہے اور یہ صرف اس لیے تھا کہ وہ لڑکی ان لوگوں کا حصہ تھی جن کے خلاف اسے کارروائی کرنی تھی۔ اس نے رونے کی اداکاری بند کر دی اور نرس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیا تم رات میں بھی یہاں رہو گی؟" یہ سوال اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے رات کا وقت سب سے مناسب تھا لیکن ایک پہرہ دیتی نرس کی موجودگی میں کچھ کرنا بہت مشکل تھا۔ علاوہ ازیں کہ اسے کسی طرح ناک آؤٹ کر دیا جاتا اور اس کا اس نرس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ہم یہاں بارہ بارہ گھنٹوں کی شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ میری جگہ سسٹر کشمالہ آ جائیں گی۔ لیکن آج ان کی ساتھی نرس چھٹی پر ہیں اس لیے میرا طرح وہ فل ٹائم تمہارے کمرے میں نہیں رہ سکیں گی۔ ہیں دوسرے کام بھی نمٹانے ہوں گے۔ لیکن تم فکر کرو، تم اب بہتر ہو اور تمہارے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں کہ رات بھر کسی کا تمہارے پاس رہنا ضروری ہو۔ بھی اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اپنے بیڈ کے ساتھ موجود یہ گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ سسٹر کشمالہ فوراً تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔" وہ نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

"ٹھیک ہے، تم چلی جاؤ۔ صبح تو آ ہی جاؤ گی اور یہ زیادہ اچھی بات ہے۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔ اگر مجھے گل مینا کی طرف سے پریشانی نہیں ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ آرام سے لمبی تان کر سو جاتا۔" وہ ایک بار پھر افسردہ نظر آنے لگا۔

"تمہاری یہ پریشانی بھی اللہ دُور کر دے گا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں گی کہ وہ بڑے صاحب سے تمہارے لیے دعا کرنے کو کہیں۔ ان کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی دعا سے تمہاری گل مینا بالکل صحیح سلامت مل جائے گی۔"

نرس کے لہجے میں بشیر کے لیے گہری عقیدت تھی۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اتنی معصوم اور ہمدرد لڑکی ایسے فریبی کے چاہنے والوں میں شامل ہے لیکن اصل المیہ بھی یہی تھا کہ معصوم اور بھولے بھالے لوگ ایسے چالبازوں کے جال میں زیادہ آسانی سے پھنس جاتے تھے جو انہیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہتے تھے۔

"اچھا اب تم آرام کرو۔ میں چلتی ہوں۔ مجھے گھر جانے سے پہلے اپنا یونیفارم بھی بدلنا ہے۔ تم اگر

ان پر زیادہ دباؤ محسوس کرو تو دواؤں میں یہ نیلے رنگ کی گولی ہے، اسے کھا لینا۔ اسے کھانے سے تمہیں فوراً نیند آ جائے گی۔"

وہ اسے ہدایات دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ بھی آنکھیں موند کر چپ چاپ لیٹ گیا۔ ابھی ایکشن میں آنے کے لیے تھوڑا وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا اس لیے اتنی دیر آرام کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

⊛----✪----⊛

سی ایف پی والوں نے ریاض انور کا پیچھا چھوڑا نہیں تھا۔ اس کی مسلسل نگرانی ہو رہی تھی اور اس نگرانی کے نتیجے میں اس کے معمولات جاوید علی کے علم میں آ گئے تھے جو کہ ریاض انور کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ہی کراچی میں رُکا ہوا تھا۔ یوں تو یہ کام کراچی یونٹ والے بھی کر سکتے تھے لیکن چونکہ لاہور یونٹ پہلے سے اس کیس پر کام کر رہا تھا، اس لیے کیس اُنہی کے پاس رہنے دیا گیا تھا۔ البتہ مدد کے لیے کراچی کے اہلکار ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ اب بھی نگرانی کا کام وہی انجام دے رہے تھے۔ جاوید علی بس اپنی جگہ بیٹھے رپورٹیں وصول کرتا رہتا تھا۔ وہ ابھی جان بوجھ کر بھی باہر نہیں نکل رہا تھا۔

اگرچہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں سلّو کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اس نے اور عادل خان دونوں نے اپنے حلیے کافی تبدیل کر لیے تھے لیکن پھر بھی اوپر سے اسے احتیاط برتنے کی ہدایت کی گئی تھی اور وہ انتظار کر رہا تھا کہ داڑھی مونچھیں مزید بڑھ جائیں تو وہ خود کو نئے روپ میں ڈھال کر باہر نکل سکے۔ اس دوران اس نے منصوبہ بندی البتہ کر لی تھی اور اب ایکشن کے لیے تیار تھا۔ اس مقصد کے لیے کراچی یونٹ کے انچارج نے اس سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا اور اس کے مطالبے پر گاڑیوں سمیت دیگر اشیاء کا انتظام کر دیا تھا۔ ان انتظامات کے ساتھ جاوید علی اور چند دوسرے اہلکار منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے۔

وہ دو الگ الگ گاڑیوں میں تھے جن میں سے ایک گاڑی ٹنٹڈ گلاسز والی تھی۔ اس گاڑی میں جاوید علی خود موجود تھا اور ان کا رخ اس پارک کی طرف تھا جہاں ان کی معلومات کے مطابق ہر روز علی الصباح ریاض انور جاگنگ کے لیے جاتا تھا۔ نگرانی کے باعث یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ طویل ٹریک پر جاگنگ کیے بغیر ریاض انور کا دن شروع نہیں ہوتا تھا اور یہی ایک معمول تھا جو بنا کسی تعطل کے جاری رہتا تھا ورنہ اس کے علاوہ تو پورا دن اس کا شیڈول ہر روز مختلف ہی رہتا تھا۔

جاوید علی نے جاگنگ کے اوقات سے ہی فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ آج کل ریاض انور کی شوگر بہت بڑھی ہوئی ہے اور ڈاکٹرز کے مطابق یہ بے پناہ ذہنی دباؤ اور بڑھتے ہوئے وزن کا نتیجہ ہے۔ ذہنی دباؤ کم کرنا تو اس کے بس میں نہیں تھا البتہ جاگنگ کا دورانیہ بڑھا کر وزن کم کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

جاوید علی کی ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی کے ساتھ نکلنے والی دوسری گاڑی نے تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا اور دیکھتے دیکھتے اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی لیکن ان میں سے کسی کو تشویش اس لیے نہیں تھی کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔

وہ مقررہ رفتار سے سفر کرتے ہوئے جب اطمینان سے اپنے مطلوبہ پارک تک پہنچے تو گاڑی سے اترتے ہی انہیں دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی لوگوں کی پریشان چیخیں بھی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اندازہ ہو رہا تھا کہ پارک میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ چکی ہے۔

شہر میں آئے دن ہونے والے بم دھماکوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں کسی پبلک پلیس پر جانے میں ویسے ہی خوف سا پایا جاتا تھا اور وہ پٹاخوں کی آوازیں سن کر بھی ہراساں ہو جاتے تھے۔ یہاں تو پھر ٹھیک ٹھاک زوردار دھماکے ہو رہے تھے اور ہر طرف دھواں دھواں محسوس ہو رہا تھا۔

گاڑی سے اُترنے والے اہلکار دھوئیں یا بھگدڑ کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور ایک مختصر وقفے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے تو ان میں سے ایک کے شانے پر ایک بھاری بوری لدی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی کے قریب پہنچ کر اس بوری کو پچھلی سیٹوں کے پائیدان میں پٹخ دیا۔ پچھلی نشست پر براجمان جاوید علی نے اپنا پیر بوری پر رکھ کر آہستہ سے دبایا تو اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ بوری میں ایک انسانی جسم موجود ہے۔ اطمینان کے اظہار کے لیے جیب سے چیونگم نکال کر اسے چبانے لگا جبکہ اس اثنا میں نیچے اُترنے والے دو ہاں سوار ہو چکے تھے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" اس نے بوری پر سے پیر اٹھائے بغیر اپنے ساتھ بیٹھے شخص سے دریافت کیا۔

"نو سر! ہم بہت آسانی سے اسے نکال کر لے آئے۔ دھماکوں اور دھوئیں کی وجہ سے ہر شخص پریشان تھا۔ اس کے ساتھ آئے باڈی گارڈز بھی گھبرا گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ حالات کے پیشِ نظر ریاض انور کو اپنے گھیرے میں لے کر وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے، ہم نے انہیں ناک آؤٹ کر دیا اور ریاض انور کو بھی کلوروفام سے بے ہوش کرنے کے بعد بوری میں ڈال کر لے آئے۔" اس نے رپورٹ دی۔

"اُس کے گارڈز کو تو نقصان نہیں پہنچا؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ ٹھیک ہیں سر! صرف بے ہوش کیا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں خود ہی ہوش میں آ جائیں گے۔ ورنہ کوئی لے آئے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"گڈ!" اس بار جاوید علی نے اختصار سے کام لیا۔ گاڑی نے واپسی کا سفر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے طے کیا۔ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ کر انہوں نے ریاض انور کو تفتیش کے لیے مخصوص کمرے میں منتقل کر دیا اور اس کے ہوش میں آنے تک فیصلہ کیا گیا کہ ناشتہ کر لیا جائے۔ وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ اس دوران ہی ٹی وی چینلز سے واقعے کی خبر نشر ہونا شروع ہو گئی۔ حسبِ معمول مختلف چینلز کے نمائندے ہیجان خیز لہجے میں اس واقعے کی رپورٹنگ کر رہے تھے اور سوال اٹھائے جا رہے تھے کہ ریاض انور جیسے نیک نام سیاست دان کو اغوا کرنے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں اور اس اغوا کا کیا مقصد ہے۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے ریاض انور کے گارڈز، قریبی ساتھیوں اور اہلِ خانہ کے تاثرات معلوم کرنے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر اس واقعے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کر رہا تھا کہ ریاض انور کو فوری طور پر بازیافت کروا کر اس کے اغوا کاروں کو کڑی سزا دی جائے۔ ایک نیوز چینل والے پھرتی دکھاتے ہوئے ریاض انور کی بیوی اور بیٹی تک بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں فطری طور پر اس واقعے پر افسردہ نظر آ رہی تھیں۔ خصوصاً ریاض انور کی جواں سالہ بیٹی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بتا رہی تھی کہ اُس کا باپ کتنی محبت کرنے والا آدمی ہے اور ایک باپ کی حیثیت سے اس سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ وہ روتے ہوئے صدر، وزیراعظم سمیت قانون نافذ کرنے والے اداروں سے اپیل کر رہی تھی کہ اسے اس کا باپ واپس لوٹایا جائے۔ یہ ایک بیٹی کے اپنے باپ کے لیے حقیقی جذبات تھے اور اس کے لیے دل میں صرف افسوس ہی محسوس کر سکتے تھے

اور اللہ ریاض انور جیسے کردار کے شخص کو جس کی وجہ سے بے شمار گھر اُجڑے تھے، رعایت دینا ان کے بس میں نہیں تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جاوید علی اور اس کے مددگاروں نے اس خصوصی کمرے کا رخ کیا جہاں ریاض انور کو رکھا گیا تھا۔ وہ اس دوران ہوش میں آ چکا تھا اور خوف زدہ سا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کیونکہ اس کمرے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ اندر داخل ہونے والے کو بھی فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک عقوبت خانہ ہے۔ دیواروں پر لٹکے تشدد کے کئی آلات، چھتوں میں فکس کنڈے جن سے رسیاں لٹکی ہوئی تھیں، خودکار ہتھکڑیوں والی کرسیاں جن میں سے ایک پر اس وقت ریاض انور براجمان تھا اور ایسی ہی بے شمار دوسری اشیاء سے کمرہ بھرا پڑا تھا جو گواہی دیتی تھیں کہ اس عقوبت خانے میں لائے جانے والے کی روح تک بلبلا اُٹھتی ہو گی۔

جاوید علی اور اس کے ساتھیوں نے چہروں پر ایسی نقابیں لگائی ہوئی تھیں جنہوں نے ان کی آنکھوں کے علاوہ پورے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ جاوید علی کمرے میں داخل ہو کر سیدھا ریاض انور کی طرف بڑھا اور اس کے مقابل کھڑے ہو کر اسے کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی نظروں میں ایسی شعلوں کی سی لپک تھی کہ ریاض انور نے ذرا دیر میں ہی گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"صرف نظریں جھکانے سے کام نہیں چلے گا ریاض انور! تجھ جیسے بے غیرت کو تو زندہ زمین میں دفن کر دینا چاہیے۔ تیرے جو کرتوت ہیں، وہ سات سمندروں کا پانی بہانے کے بعد بھی تجھے پوتر نہیں ہونے دیں گے۔" جاوید علی نے نفرت سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ریاض انور کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ جاوید علی کے رویے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ اسے جسمانی اذیت میں مبتلا کرنے سے پہلے اتنے زیادہ نفسیاتی دباؤ میں لے لینا چاہتا تھا کہ وہ فوراً ہی ٹوٹ جائے اور حقائق جاننے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہ آئے۔

"تم کون لوگ ہو؟" آخر کار ریاض انور نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم جہنم کے داروغے ہیں اور تمہیں تمہاری بداعمالیوں کی سزا دینے کے لیے پکڑ لائے ہیں۔" اس نے سفاک لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو، مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور میرے اچھے کردار کی گواہی بے شمار لوگ دیتے ہیں۔" اس نے اپنے خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"لیکن ہمارا شمار ان بے شمار لوگوں میں نہیں ہوتا جو تمہارے پرستار ہیں۔ ہم ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں تمہاری حقیقت معلوم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تم "را" کے پٹھو ہو اور شریف بن کر اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔"

جاوید علی نے آخر بلی کو تھیلے سے باہر نکال ہی لیا تاکہ ریاض انور اگر اپنے اغوا کے سلسلے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو وہ غلط فہمی دور ہو جائے۔

"یہ غلط ہے۔ میں اپنے ملک سے محبت کرتا ہوں جب ہی تو میں نے یہاں کئی فلاحی ادارے قائم کر کے عوام کی فلاح و بہبود کی ذمے داری اُٹھا رکھی ہے۔" وہ حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اور اس فلاح و بہبود کے بہانے تم جب چاہتے ہو، امدادی سامان کے ساتھ ہتھیار اور بارود بھیج کر کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی علاقے میں آگ لگا دیتے ہو۔'' جاوید علی نے طنز کیا تو ریاض انور کے چہرے پر چھائی پریشانی میں
اور اضافہ ہو گیا اور پورے جسم پر پسینے کی دھاریں سی بہنے لگیں۔

''یہ..... یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر الزام ہے۔'' وہ ہذیانی لہجے میں تردید کرنے لگا۔

''اب تم اس بات سے بھی انکار کر دو گے کہ جس روز کراچی میں خون کی ہولی کھیلی گئی، اس سے
ایک دن پہلے تم سے رات گئے سلّو نامی دہشت گرد ملنے آیا تھا۔ یہ دہشت گرد انڈیا کا تربیت یافتہ ہے اور
نے وزیراعلیٰ کے بیٹے کے ولیمے کے موقع پر ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جو ان کا سیاسی مخالف
ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ وزیراعلیٰ نے صرف تمہاری سفارش پر سلّو کو قواعد وضوابط کے خلاف اپنے سکیورٹی
اسٹاف میں شامل کیا تھا۔''

وہ ریاض انور پر اپنی معلومات ظاہر کر کے اسے بتا رہا تھا کہ اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالا گیا بلکہ بہت
سمجھ کر یہاں لایا گیا ہے۔

''کیا تمہارا تعلق آئی ایس آئی سے ہے؟'' ریاض انور نے دہشت زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ہم جہنم کے داروغہ ہیں اور تم جیسے بداعمالوں کو ان کے اعمال کے سبب
کی سیر کرواتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔'' جاوید علی نے اسے اطلاع دی۔

''دیکھو، تم میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں
کیا۔ ہاں، سلّو کو وزیراعلیٰ کے سکیورٹی اسٹاف میں ملازمت ضرور دلوائی تھی۔ لیکن صرف اور صرف انسانی
ہمدردی کی بنیاد پر اور وہ بھی اس وجہ سے کہ سلّو نے مجھ سے خود اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ چونکہ وہ اسلحہ
استعمال جانتا ہے، اس لیے اسے کسی خاص شخصیت کا باڈی گارڈ رکھوا دیا جائے۔ میرے وزیراعلیٰ سے اچھے
دوستانہ تعلقات ہیں اس لیے میں نے ان سے اس کی سفارش کر دی۔ بعد میں وہ کیا نکلا، کیا نہیں اس میں میرا
کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو نیک نیتی سے ایک بے سہارا لڑکے کی مدد کی تھی۔'' ریاض انور نے سنبھالا لینے کی
کوشش کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

''میرے خیال میں ہمیں انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی۔'' اس کی ڈھٹائی دیکھ کر جاوید علی نے کہا اور باہر
سے جانے کیا اشارہ کیا کہ ریاض انور پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ بری طرح لرزتا ہوا ذبح کیے جانے والے
بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ دراصل وہ جس دھاتی کرسی پر بیٹھا تھا، اس میں کرنٹ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کرنٹ
کی شدت اتنی نہیں تھی کہ وہ جان سے چلا جاتا لیکن تکلیف تو بہرحال اُسے ہوئی تھی۔ وہ بھی اتنی شدید کہ وہ
سے پیر تک کانپ اُٹھا تھا۔ چند سیکنڈز کا یہ جھٹکا برداشت کرنے کے بعد جب اسے اس عذاب سے نجات ملی
وہ نڈھال سا بری طرح ہانپنے لگا۔

''یہ ابھی صرف ٹریلر ہے۔ اگر تم نے اپنی زبان نہیں کھولی تو اگلا جھٹکا اس سے زیادہ شدید ہوگا۔''

''تم لوگ کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہو؟..... میں سچ کہتا ہوں کہ میرا ''را'' سے کوئی رابطہ نہیں
ہے۔'' وہ اپنے بیان پر قائم رہا جس کی پاداش میں اس کا جسم ایک بار پھر جھٹکوں کی زد میں آ گیا۔ اس بار
دورانیہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ریاض انور سہہ نہ سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے بڑی بے دردی کے
ساتھ پھر ہوش میں لایا گیا۔ اس بار اس کا دم خم واضح طور پر غائب لگ رہا تھا۔ دراصل وہ کوئی تربیت یافتہ
سیکرٹ ایجنٹ یا جاسوس تو تھا نہیں کہ اس قسم کے تشدد کو حوصلے سے سہہ سکتا۔ آرام اور آسائش سے بھرپور
زندگی گزارنے والے جسم میں اتنا دم خم ہی نہیں تھا کہ زیادہ دیر ہمت کا مظاہرہ کر سکتا چنانچہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بالآخر جب اس کا خشک ہو جانے والا حلق اور اکڑ جانے والی
ان اس قابل ہوئے کہ وہ کچھ بول سکے تو اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم ''را'' کے لیے کب سے اور کیا کام کر رہے ہو؟'' جاوید علی نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''دس سال ہو گئے مجھے ان کے چنگل میں پھنسے ہوئے۔ دس سال سے میں مجبور ہوں کہ ان کے ہر
مارے اور ہر حکم پر عمل کروں۔'' اس نے مظلومیت سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا تم اپنی مرضی سے ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے ہو؟'' جاوید علی چونکا۔

''نہیں۔ بلکہ دس سال پہلے انہوں نے میرے لیے یہ جال تیار کیا تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھے
الرات کے بہانے ایک جگہ بلایا اور پھر میری بیٹی کو اس کے اسکول سے اغوا بھی کر لیا۔ میں ان کے دیئے
ئے میں شاید نہ آتا لیکن بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے ان کا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اب جو کچھ وہ کہتے ہیں،
ں اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ ورنہ میری بیٹی ان کے نشانے پر رہتی ہے اب تو وہ جوان ہو چکی ہے
ور مجھے دھمکایا جاتا ہے کہ اگر میں نے ان کا کوئی حکم ماننے سے انکار کیا تو وہ میری بیٹی کو اغوا کر کے پہلے تو اس
ی آبروریزی کریں گے پھر اس کی نچی ہوئی بے لباس لاش کسی مصروف چوراہے پر پھینک دیں گے۔ تم ہی
تاؤ ان حالات میں، میں کیسے ان کا حکم نہیں مانتا؟''

مظلومیت کی اداکاری کرتا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور خود کو مجبور ظاہر کرتے ہوئے ان مراعات اور
عیاشیوں کا ذکر گول کر دیا جو اسے ''را'' کی خدمت کے عوض دستیاب تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے بلیک میل
رنے کے لیے اس کی لاڈلی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا لیکن ایسا صرف ایک بار ہوا تھا جبکہ بعد میں وہ لالچ میں ان
کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ ''را'' کے سوراؤں نے اسے دولت، شراب اور شباب کی لت لگا دی تھی۔ فراوانی سے
ملنے ان تینوں چیزوں نے اس کے ضمیر کو مکمل طور پر سُلا دیا تھا اور اب وہ بے حد بے شرمی سے ان کے لیے کام
کر رہا تھا۔

''اگر یہ سچ بھی ہے تو مجھے تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ تم نے ایک اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اس
ملک کی ہزاروں بیٹیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ کیا تمہارے پاس کوئی حساب ہے کہ تمہاری وجہ سے کتنی عورتیں بیوہ اور
یتیم ہوئیں اور کتنوں کو آبروریزی کی اذیت سے گزرنا پڑا؟''

جاوید علی کے اس سوال کے جواب میں اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ جاوید علی کے پاس
ایسے کئی سوال تھے جن کے جواب وہ دے سکتا تھا۔ جاوید علی پے در پے اس سے وہ سوالات پوچھتا چلا گیا اور
ریاض انور نے جہاں اس کے جوابات دینے میں مزاحمت کی، وہاں اس کی مناسب تواضع بھی کر ڈالی۔

⊛----✪----⊛

''تم نے کیا سوچا ہے؟..... کسے اپنے ساتھ بھارت لے جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس کے بالمقابل
بیٹھے ذیشان نے اس سے پوچھا۔

''دیکھو کسے لے جاتا ہوں، ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ بس ایک نام ذہن میں ہے لیکن معلوم نہیں کہ
اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوگا بھی یا نہیں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''وہ کون؟..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم جاوید علی کو اپنے ساتھ لے جانا پسند کرو گے۔ وہ خاصا ایکٹیولر کا
ہے اور تمہاری اس کے ساتھ خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں، جاوید علی کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ فی الحال اسے یہیں رہ کر کام کرنے دو۔'' اس نے ذیشان کا سوال گول کر کے اس کی بات کے صرف ایک حصے کا جواب دیا۔

''میں بھی ذاتی طور پر اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اگر تم خواہش کرتے تو تمہیں انکار بھی نہیں کیا جاتا۔ جاوید نے اس مختصر عرصے میں بڑی کارکردگی دکھائی ہے۔ پہلے نوازش علی کی کوٹھی میں نہایت خوبصورتی سے کام کیا، پھر وزیراعلیٰ ہاؤس میں تمہارے ساتھ مل کر بڑا کارنامہ انجام دیا اور اب ریاض انور کے مزاج پوچھ رہا ہے۔'' ذیشان کے لہجے میں اپنے ماتحت کے لیے تحسین تھی۔

''میں تم سے ریاض انور کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا۔ کیا رہا اس کا؟'' اس نے فوراً دریافت کیا۔

جواباً ذیشان نے اسے ریاض انور کے اغوا سے لے کر اس پر تشدد تک کی ساری کہانی سنا دی۔

''جاوید علی نے تو ریاض انور کی ناک میں رسّی ڈال کر اسے کسی سدھائے ہوئے فرمانبردار جانور کی طرح بنا ڈالا ہے۔ اگلا پچھلا سب اُگل ڈالا ہے اس نے کہ کب کب اور کیا کیا، کیا۔ بڑا مال کمایا ہے اس خبیث نے بھارتیوں کی خدمت کے عوض۔ اور اسی رقم میں سے تھوڑا بہت فلاحی کاموں میں لگا کر عوام کو اُلّو بناتا رہا ہے۔ سلّو کے سلسلے میں بھی وہ ''را'' کے اشارے پر ایک خوفناک منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ ''را'' والوں نے حکومت سے ڈیل ہو جانے کے باوجود سلّو کے وجود کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے اسے راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کو عملی جامہ ریاض انور نے پہنچانا ہے۔ وہ اتنی پہنچی ہوئی چیز ہے کہ اتنی رازداری برتنے کے باوجود اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سلّو کو کس جیل میں رکھا گیا ہے اور اس نے پورا منصوبہ تیار کر لیا ہے کہ کس طرح جیل میں سلّو کو ہلاک کروانا ہے۔''

ذیشان اسے جاوید علی کی ریاض انور سے حاصل کردہ معلومات سے آگاہ کرنے لگا جس میں سب سے قابلِ ذکر بات سلّو کی ہلاکت کے منصوبے سے متعلق تھی۔ بھارتی حکومت سے معاملات طے ہو جانے کے بعد سلّو کے معاملے کو بہت رازداری سے ہینڈل کیا جا رہا تھا اور اس کی تقدیر کا فیصلہ عدالت کے بند کمرے میں کیا جانا تھا۔ میڈیا والوں کو جس حد تک مناسب سمجھا جاتا، بعد میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے آگاہ کر دیا جاتا۔ البتہ فی الحال ہر ایک نے اپنے ہونٹ سی رکھے تھے اور اس کیس کی کھوج میں لگے صحافیوں کو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں معلومات کے حصول کے لیے کس شخص کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان حالات میں ریاض انور کی ''باخبری'' واقعی بڑی معنی خیز اور حیرت انگیز تھی۔

''منصوبہ کیا ہے؟'' شہریار نے اس معاملے میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جس جیل میں سلّو کو رکھا گیا ہے، وہاں ریاض انور کے کچھ گرگے پہلے ہی سے قید ہیں اور عرصے سے وہاں یہ سازش تیار کی جا رہی ہے کہ کس طرح جیل توڑ کر وہاں سے فرار ہوا جائے۔ ریاض انور کے بقول اب اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے کچھ اور خطرناک گرگوں کو جیل میں داخل کروا چکا ہے۔ کسی دن اچانک لوگوں کو خبر ملے گی کہ سینٹرل جیل میں قیدیوں کے درمیان دنگا فساد ہوا اور معاملات اس حد تک آگے چلے گئے کہ جیل انتظامیہ کے لیے حالات پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ ان خراب حالات سے فائدہ اُٹھا کر ایک طرف تو وہ لوگ سلّو اور شاید اس کے ساتھ کسی ایک آدھ قیدی کو مزید ہلاک کر دیں گے، کچھ لوگ لازماً زخمی بھی ہوں گے اور دوسری طرف خطرناک مجرموں کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔''

''اس منصوبے پر اندر کے لوگوں کی شمولیت کے بغیر تو عمل نہیں ہو سکتا۔'' ذیشان سے تفصیلات سن کر اس

نے تبصرہ کیا۔

''بالکل، یہ اندر کے لوگ ہی تو ہوں گے جو ان دنگا کرنے والوں کو ہتھوڑی، پانے، ڈنڈے وغیرہ جیسی اشیاء فراہم کریں گے اور مؤقف یہ اختیار کیا جائے گا کہ قیدیوں نے یہ چیزیں جیل کی ورکشاپ سے چرائی ہیں۔ آتشیں ہتھیاروں کا مسئلہ یوں حل ہو گا کہ قیدی چند سپاہیوں سے ان کی رائفلیں چھین لیں گے جو اصل میں انہیں چھیننے سے زیادہ خود پیش کی جائیں گی۔''

ذیشان کے جوابات سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض انور کو کتنا بروقت اغوا کر لیا گیا ورنہ وہ موذی تو اپنا کام دکھا چکا تھا۔

''ایسا کرو کہ جو کچھ ہونے جا رہا ہے، اسے ہونے دو اور بس سلّو کو کسی طرح وہاں سے نکال لو۔'' ذیشان نے اتنی ساری تفصیلات سنا کر شاید اسے اتنا حیران نہ کیا ہو جتنا اس نے اپنے ایک جملے سے اسے حیران کر دیا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا ہوں۔ ہم کیسے ایسا کر سکتے ہیں کہ اتنی بڑی سازش کے بے نقاب ہو جانے کے باوجود اس پر عمل ہو جانے دیں؟'' وہ اپنی حیرت کو لبوں پر سوال بنا کر لے آیا۔

''تم نے کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ اپنے ساتھ بھارت لے جانے کے لیے میرے ذہن میں کس کا نام ہے تو سنو..... میں سلّو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے دھماکا کیا۔

''کیا؟'' ذیشان کا منہ کھل گیا۔

''سلّو کے کیس پر کام کرتے ہوئے میں نے مسلسل اس پہلو پر نظر رکھی ہے کہ کسی طرح بھارتیوں کو ان کا تیار کردہ سلّو نامی مہلک ہتھیار اس طرح واپس لوٹا دوں کہ اس ہتھیار سے اُگلتے شعلے اُنہیں ہی بھسم کر ڈالیں۔ حکومت نے اس سلسلے میں ہم پر بڑی مہربانی کی ہے اور سلّو پر واضح ہو گیا ہے کہ بھارت اس کا ہمدرد نہیں ہے اور وہ لوگ اسے صرف اور صرف اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ سلّو جیسا جذباتی لڑکا بھارتیوں کی اس حرکت پر بری طرح بھڑکا ہوا ہو گا اور اگر ہم ان شعلوں کو ذرا سی ہوا دیں گے تو وہ ان پر قہر بن کر ٹوٹنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو مہم درپیش ہے، اس میں سلّو جیسا نڈر اور بے جگر شخص ساتھ دینے کے لیے سب سے مناسب رہے گا۔'' اس نے اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔

''پھر بھی، بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ تم سلّو کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں جس مہم پر جانا ہے، اس میں کسی قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہو گی اور سلّو کو میں قابلِ بھروسہ نہیں سمجھتا۔'' ذیشان نے اعتراض اُٹھایا۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ میں اسے کس طرح ہینڈل کرتا ہوں اور کیسے اس سے کام لیتا ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام لیا ہے اور سچ پوچھو تو مجھے اس مہم پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اس سے زیادہ مناسب کوئی نہیں لگا۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

''لیکن مشکل یہ ہے کہ ریاض انور کو اغوا کر لینے کے بعد جیل والی سازش پر عمل کیسے ہو گا؟ اس سازش کا آپریٹر مائنڈ تو وہی ہے جسے ظاہر ہے ہم کسی سے رابطہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی آزاد کر سکتے ہیں۔'' ذیشان کی اپنی ہی اُلجھنیں اور پریشانیاں تھیں۔

''ہمیں ریاض انور کو آزاد کرنا ہو گا لیکن ذرا سلیقے سے۔ ہم ریاض انور کے اغوا کو اغوا برائے تاوان کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روپ دے سکتے ہیں۔ ریاض انور سے ڈسکس کر کے معلوم کر لو کہ اس کی فیملی جلد از جلد کتنی بڑی رقم کا بندوبست کر سکتی ہے۔ وہ رقم لے کر اسے چھوڑ دینا پھر وہ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہوگا اور ہمارا کام بن جائے گا۔'' اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اور تمہارے خیال میں ریاض انور اتنا بیبا بچہ ہے کہ ہماری بنائی گئی کہانی کو اپنے بھارتی آقاؤں سے چھپا لے گا۔'' ذیشان نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ خبیث آدمی ضرور اپنے آقاؤں کو اطلاع دینے کی کوشش کرے گا لیکن اُسے اس حرکت سے روکنے کے لیے ہم اپنا کوئی آدمی اس کے ساتھ نتھی کر سکتے ہیں جو ہر وقت اس کے قریب رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہے گا۔''

''ایسا آدمی تو خود مشکوک ہو جائے گا۔'' ذیشان نے اعتراض کیا۔

''نہیں ہوگا مشکوک۔ اگر ہم ذرا سلیقے سے منصوبہ بندی کریں گے تو سب ممکن ہو جائے گا۔ ویسے بھی ہم کوئی زندگی بھر کے لیے تو اس خبیث کا ٹھیکہ لینے والے نہیں ہیں۔ اُس سے اس منصوبے پر عمل کرواؤ اور پھر اس کا کام تمام کر کے اپنے آدمی واپس بلوا لو۔ یہ تو پہلے سے طے ہے نا کہ ریاض انور جیسے غدار کو اب زیادہ عرصے کے لیے اس دھرتی کا بوجھ بنا کر نہیں رکھنا ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ اپنا ایک لڑکا ریاض انور کے ساتھ بھیج دیں اور ریاض انور اپنے منہ سے لوگوں کو یہ کہانی سنائے کہ اغوا کاروں نے رقم کی وصولی کے بعد اسے شدید زخمی اور بے ہوش حالت میں ایک ایسی ویران جگہ پر ڈال دیا تھا جہاں سے وہ اتفاقاً وہاں پہنچ جانے والے اس نوجوان کی مدد سے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ وہ تعریف کرے گا کہ نوجوان نے بڑی ہمدردی سے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور خود گھر تک چھوڑنے آیا۔ نوجوان کے اتنے احسانات کے بدلے میں اگر وہ اسے اپنے قریبی اسٹاف میں ملازمت دے دے گا یا یونہی اپنے ساتھ رکھے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا بلکہ لوگ اس کی احسان شناسی کو سراہیں گے۔ بس یوں ہمارا کام بن جائے گا۔'' اب ذیشان کا دماغ بھی چل پڑا تھا۔

''گڈ! اب تم اسی ٹریک پر سوچ رہے ہو جس پر میں سوچ رہا ہوں۔ میری مانو تو ایک کام اور کرنا۔ ریاض انور کو اس کی جوان بیٹی کے حوالے سے بھی تھوڑا ڈرا دینا تاکہ اگر اس کے ذہن میں ہم سے دھوکے کا خیال آئے بھی تو وہ اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔'' ذیشان کو شاباش دینے کے ساتھ اس نے ایک اہم مشورہ بھی دیا۔

''بس اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ اب میں تمہارا منصوبہ سمجھ چکا ہوں تو ہر کام بہترین طریقے سے انجام پا جائے گا۔ لیکن یاد رکھو کہ سلّو کے سلسلے میں تمہیں پہلے کرنل صاحب سے اجازت لینی ہوگی تب ہی ہم اس منصوبے پر عمل کر سکیں گے۔ ورنہ تو سب سے آسان حل یہ ہے کہ ریاض انور کو گولی مار کر اس کی لاش کسی کھڈ، کنڈی یا نالے میں پھینک دی جائے۔''

''اس کی تم فکر نہیں کرو۔ میں کرنل صاحب سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔'' اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ ریسیور واپس کریڈل پر رکھ رہا تھا تو کرنل توحید کو راضی کر چکا تھا۔

''اوکے، یہ کام تو ہو گیا۔ میں جاوید علی سے بات کر کے اس منصوبے کی جزئیات کو ڈسکس کر لوں گا اور ہم اس پر عمل کر گزریں گے۔'' کرنل صاحب کی اجازت مل جانے پر ذیشان نے آگے کا پروگرام سیٹ کرنا

شروع کر دیا۔ یہ کیس کیونکہ جاوید علی کے پاس تھا اس لیے اس سے ڈسکس کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ ذیشان نے فوری طور پر اس سے رابطہ کیا اور ریاض انور کے حوالے سے جو کچھ ان کے درمیان طے ہوا، اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ ان تفصیلات میں یہ ذکر شامل نہیں تھا کہ سلّو کو جیل سے نکال کر شہریار کے ساتھ عمارت بھیجا جا رہا ہے۔ جاوید علی کو بس اتنا بتا دینا کافی تھا کہ منصوبے کے مطابق سلّو کو ہلاک کرنے سے بچا کر اسے اس طرح جیل سے فرار کروانا ہے کہ وہ سی ایف پی کی تحویل میں آ جائے۔ یہ حکم سن کر جاوید علی نے سوچا یہ گمان کیا ہوگا کہ اپنے ایک اہم مجرم کا ہاتھ سے نکل جانا سی ایف پی کو اچھا نہیں لگا اس لیے وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے دوبارہ اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں تاکہ اس سے مزید معلومات وغیرہ حاصل کی جا سکیں۔

''میں نے آپ کا سارا پلان سمجھ لیا ہے سر!..... اس پر انشاء اللہ کامیابی سے عمل بھی ہو جائے گا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد ریاض انور کا کیا، کیا جائے گا؟..... کیا ہم اسے موذی کو ایسے ہی آزاد چھوڑ دیں گے؟'' اس نے نہایت غور سے ذیشان کی ساری بات سننے کے بعد سوال اُٹھایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... ہم اسے صرف وقتی طور پر ڈھیل دے رہے ہیں۔ بعد میں اس کا پتا بھی صاف کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں پلان تمہیں خود ہی تیار کرنا ہوگا۔ بس ٹائمنگ کا خیال رکھنا۔ جیل والی سازش پر عمل ہونے سے پہلے اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے اور وہ پوری طرح تمہاری نگرانی میں بھی رہنا چاہئے۔'' ذیشان نے فوراً ہی اس کا ذہن صاف کیا۔

''اس طرف سے آپ بے فکر رہیں سر! میں ریاض انور کے ساتھ اپنا آدمی لگانے کے ساتھ ساتھ اُس کے جسم سے ایک ایسی ڈیوائس بھی اٹیچ کروا دوں گا کہ جن اوقات میں ہمارے بندے کا اس کے قریب رہنا ممکن نہیں ہوگا، اس وقت بھی ہم اُس کی سرگرمیوں سے آگاہ رہیں گے۔''

''گڈ۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے اس لیے میں نے اپنا مقصد تم پر واضح کر کے تمہیں فری ہینڈ دے دیا ہے۔ اپنی سہولت اور طریقِ کار کے مطابق کام کرو اور نتیجہ وہ دو جس کے ہم خواہش مند ہیں۔'' ذیشان نے کھلے دل سے اس کی تعریف کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''ایک اہم مرحلہ تو سمجھو طے ہو گیا۔ اب دوسرا کام یہ کرو کہ اپنا ایک بندہ اس جیل میں پہنچا دو جہاں سلّو موجود ہے۔ اس کا کام یہ ہوگا کہ سارا وقت سلّو کے قریب رہ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرے۔ خصوصاً اس وقت جب پلان کے مطابق اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت ہمارے آدمی کو نہ صرف سلّو کو شیلڈ کرنا ہوگا بلکہ اسے اپنے ساتھ لے کر فرار بھی ہونا ہوگا تاکہ سلّو ہم تک پہنچ جائے۔''

ذیشان، جاوید علی کو اس کا کام سمجھا کر فارغ ہوا تو شہریار نے ایک اور اہم کام کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ ذیشان نے اس پوائنٹ کو نوٹ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ یہیں بیٹھے بیٹھے فوری طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے جیل کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنا پڑتا اور یہ کام بھی وہ براہِ راست کرنے کے بجائے کرنل توحید کے ذریعے ہی کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ کرنل توحید ہی تھے جو آئی ایس آئی اور سی ایف پی کے درمیان توازن قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ سی ایف پی کے وجود کو پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور اس جدوجہد میں ان جیسے چند اور بھی اعلیٰ فوجی عہدے دار شامل تھے۔

کرنل توحید جیل کی انتظامیہ میں سے کسی قابلِ اعتماد آدمی سے رابطہ کرتے تو ایک طرف ان کا کام آسان ہو جاتا اور دوسری طرف فرار کی سازش کرنے والے خطرناک مجرموں کے فرار کو بھی ناکام بنانے یا سرے سے گرفتار کرنے کے سلسلے میں کارروائی کی جا سکتی تھی۔ معاملہ بہت نازک تھا اور مقابل موجود دشمن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے خطرناک سازشی اور مکار ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس لیے وہ دونوں سر جوڑے بہت دیر تک ایک ایک پوائنٹ کو ڈسکس کرتے رہے۔ ساتھ ہی جاوید علی کے لیے بھی ہدایات تیار ہوتی رہیں کہ سب سے اہم رول اسی کا تھا۔ اگر ریاض انور کی اغوا برائے تاوان والی کہانی میں کہیں جھول آ جاتا تو دشمن چوکنا ہو جاتا اس لیے پلے کا یہی ایکٹ سب سے زیادہ جان دار اور نیچرل ہونا ضروری تھا۔ بہرحال، بہت دیر کی دماغ پاشی کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو خاصے مطمئن تھے۔

⊛----✪----⊛

''تم کھانے سے فارغ ہو چکے ہو، اس لیے بہتر ہے کہ اپنی دوائیں لے کر تھوڑی دیر میں سو جاؤ۔ تم جو آرام کرو گے تمہارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرس کشمالہ نے اس کے سامنے سے کھانے کی ٹیبل ہٹاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والی کم سن نرس کے مقابلے میں پختہ عمر کی خاصی ہوشیار عورت تھی جس کی حرکات وسکنات سے ہی ایک خاص قسم کی طراری جھلکتی تھی۔

''بڑے ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں نرس؟'' مشابرم خان نے اُس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر اس سے پوچھا۔

''کیوں؟..... تم انہیں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کوئی تکلیف ہے کیا؟..... مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ میں ہی تمہارا مسئلہ حل کر دوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ ایک تجربہ کار نرس بھی ڈاکٹر سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ میں تمہیں بہت اچھی دوا دے سکتی ہوں۔'' وہ ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ نہیں تھی۔

''مجھے جسمانی تکلیف کا مسئلہ نہیں ہے نرس! میں اپنی بیوی کی وجہ سے پریشانی میں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ وہ اسے تلاش کرنے میں میری مدد کریں گے لیکن ابھی تک کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے کسی پریشان حال شخص کی طرح تھکے تھکے لہجے میں اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اوہ آئی سی، مجھے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہاری بیوی کو کون لوگ لے گئے ہیں۔ بہرحال تم فکر مند نہ کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جلد تمہاری بیوی کو تلاش کر لیا جائے گا اور اسے اغوا کرنے والوں کو عبرتناک سزا بھی دی جائے گی۔'' کشمالہ نامی نرس اُسے تسلیاں دینے لگی۔

''آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں نرس! لیکن جب تک میری بیوی نہیں مل جاتی، مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' اس نے اُداسی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کی کیفیت سمجھ رہی ہوں مسٹر مشابرم خان! آپ واقعی بہت پریشانی میں ہیں لیکن فی الحال صبر اور حوصلے سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ آپ ہمت کریں اور یقین رکھیں کہ ان مشکل حالات میں آپ تنہا نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر اس کی دل جوئی کرنے لگی۔ پھر پلٹ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی دوائیں نکال کر اس کے سامنے رکھیں۔

''آپ یہ دوائیں کھا لیں۔ انہیں کھانے سے آپ کے زخم بھی ٹھیک ہوں گے اور نیند بھی اچھی آ جائے گی۔'' مشابرم خان نے دیکھا کہ ان دواؤں میں نیند کی وہ گولی بھی شامل ہے جس کے بارے میں پچھلی شفٹ کی نرس نے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔ اس نے کشمالہ سے دوائیں لے کر اپنے منہ میں رکھے ہوئے پانی

سے وہ گولی نیچے گرا دی۔ باقی دواؤں کی تو بہرحال اسے ضرورت تھی اس لیے انہیں کھانا ضروری تھا۔

''بس اب آپ لیٹ جائیں۔ تھوڑی دیر میں آپ کو نیند آ جائے گی۔'' اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لے کر ٹیبل پر واپس رکھنے کے بعد کشمالہ نے اس کا تکیہ ٹھیک کیا اور اسے آرام سے لٹانے کے بعد اس کے اوپر اس کا کمبل پھیلا دیا۔ مشابرم خان نے بھی خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اس کے آنکھیں بند کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کشمالہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشابرم خان نے آنکھیں کھول کر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی صرف ساڑھے آٹھ ہوئے تھے اور اسے جو کارروائی کرنی تھی، اس کے لیے آدھی رات کا وقت زیادہ مناسب رہتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت کا جاگ کر انتظار کرنے کے بجائے ڈھائی تین گھنٹے کی نیند لے لینا زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ بہرطور وہ زخمی تو تھا اور اسے آرام کی ضرورت بھی تھی۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی کی وجہ سے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بغیر کسی الارم کے بھی مقررہ وقت پر ضرور جاگ جائے گا چنانچہ اطمینان سے سو گیا۔ ٹھیک ڈھائی گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ لیٹا باہر کی سن گن لیتا رہا۔ یہاں اسے ان کے اوقات میں بھی زیادہ آوازیں اور چہل پہل محسوس نہیں ہوئی تھی اور اب تو بالکل ہی سناٹے کا راج تھا۔

اس سناٹے میں اس کے کانوں نے قدموں کی مدھم چاپ واضح طور پر سن لی۔ آنے والا اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے اندر جھانکا۔ اس نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کرتے ہوئے آنے والے کو دیکھا۔ وہ نرس کشمالہ تھی جس نے اس کے گہری نیند میں ہونے کا اندازہ لگایا اور پھر دروازہ دوبارہ احتیاط سے بند کر کے واپس پلٹ گئی۔ اس کے واپس جانے کے بعد وہ آہستگی سے بستر سے نیچے اُترا اور تکیے رکھ کر کمبل کو اس انداز میں بستر پر پھیلایا کہ دور سے دیکھنے والے کو یہی گمان گزرے کہ کمبل تلے کوئی سویا ہوا ہے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے میں موجود اکلوتی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ دن بھر میں وہ جائزہ لے کر پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اس کھڑکی کا استعمال کرے گا۔ کیونکہ دروازے سے نکلنے میں یہ خطرہ تھا کہ کوریڈور میں اسٹاف کے کسی شخص سے سامنا نہ ہو جائے۔ سلائیڈنگ ونڈو نے اس کا کام ویسے بھی آسان کر دیا تھا۔ اسے بس ایک شیشہ ہی کھسکانا تھا، اس کے بعد اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے نہایت احتیاط اور خاموشی سے یہ مرحلہ طے کیا اور باہر کود نے کے بعد کھڑکی کو دوبارہ بند کر دیا۔ باہر کا موسم اندر کے مقابلے میں قدرے سرد تھا اور لمحہ بھر کے لیے اسے جھرجھری سی آ گئی لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ سردی کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے ابھی اتنی ٹھنڈک نہیں تھی کہ گرم کپڑوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پریشانی ہو۔

کھڑکی سے کود کر نکلنے کے بعد بھی ابھی وہ ہسپتال کی چاردیواری سے باہر نہیں نکلا تھا اور ابھی اسے احاطے کی دیوار پھلانگنی تھی لیکن اس سے قبل وہ کسی ایسی شے کا متلاشی تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ وہ جس طریقے سے یہاں پہنچا تھا، اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لا سکے۔ اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرتا تو اس کا ہتھیار فوراً ہی ڈاکٹر وغیرہ کی نظر میں آ جاتا اور وہ مشکوک سمجھا جاتا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ تو اس کے پاس ہو۔ اس سلسلے میں اس کے ذہن نے ڈاکٹروں کے استعمال میں رہنے والے سرجیکل آلات کے حصول کی راہ دکھائی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کی جس کمرے میں مرہم پٹی کی گئی تھی، وہاں اُس نے اس قسم کی چیزیں دیکھی تھیں۔ بالکل خالی ہاتھ جانے کے بجائے اگر وہ ذرا سی کوشش سے کوئی آلہ بطور ہتھیار حاصل کر لیتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے اندازے سے اس کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کی جس میں اس کے خیال کے مطابق اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ احتیاط کی وجہ سے اس نے کھڑکی کو بہت معمولی سا کھسکایا تھا۔ اس معمولی سی درز میں سے فوراً ہی روشنی اور آوازوں نے باہر کی طرف رخ کیا۔ آوازیں سن کر اس نے شکر کیا کہ اس نے بے دھڑک کھڑکی کھولنے کے بجائے احتیاط سے کام لیا تھا۔ پیدا ہونے والی جھری سے آنکھ لگا کر اس نے اندر جھانکا۔ اندر ڈاکٹر، نرس کشمالہ اور ایک عورت موجود تھی۔ عورت بیڈ پر نیم دراز تھی اور ڈاکٹر اور نرس اس کے سر پر کھڑے تھے۔ ان تینوں کے درمیان کسی بات پر بڑے شد و مد سے بحث ہو رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے کسی کو کھڑکی کا پٹ کھسکائے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ میں کسی مستند لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کے بغیر اپنا ابارشن نہیں کرواؤں گی۔'' اس نے خوبصورت خدوخال والی عورت کو بلند لہجے میں کہتے ہوئے سنا۔

''ہم یہاں کسی لیڈی ڈاکٹر کو نہیں بلا سکتے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بڑے صاحب کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔'' ڈاکٹر نے انکار کیا۔

''لیکن میں بھی لیڈی ڈاکٹر کے بغیر اتنا بڑا رِسک نہیں لے سکتی۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بڑے صاحب اگر دل بھر کر مجھ سے کھیل لینے کے بعد میری طرف سے بے پروا ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی جان گنوا دوں۔ میرا شوہر ہے، بچے ہیں، گھر ہے۔ نذر محمد کے واپس آنے کے بعد میں دوبارہ اس کے ساتھ اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہ سکتی ہوں۔ میرے بچوں کو میری ضرورت ہے۔ میں مر گئی تو کون اُن کو پالے گا؟''

بلند لہجے میں بولتی عورت کا لہجہ آخر میں آ کر یاس زدہ ہو گیا تھا جبکہ کھڑکی کے باہر کھڑا یہ سب سنتا مشابرم خان دم بخود تھا۔ عورت کے جملوں نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ یقیناً عورت کا شوہر طویل عرصے سے علاقے سے باہر کہیں گیا ہوا تھا اور اس عرصے میں بشیر اکبر نے عورت کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔ اس عیاشی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہ نکل چکا تھا اور اب بشیر کے ہم راز ڈاکٹر اور نرس اس کوشش میں تھے کہ عورت کے خاوند کے واپس آنے سے پہلے پہلے اس کی کوکھ میں پلتے بشیر کے گناہ کی نشانی کو مٹا ڈالیں۔ لیکن عورت خوف زدہ تھی کہ تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی عدم موجودگی سے کہیں وہ اپنی جان ہی نہ کھو بیٹھے۔ اسی لیے ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی۔

ان تینوں کے درمیان اچھی خاصی گرما گرمی ہو رہی تھی۔ مشابرم خان اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا..... لہٰذا ان کو بحث میں اُلجھا دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کمرے کی کھڑکی سے ہٹ کر اس نے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی پر طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ یہ تو وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اس کا اندازہ غلط تھا اور یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں اس کی مرہم پٹی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے کی کھڑکی کھولنے پر اسے اپنا گوہرِ مقصود حاصل ہو گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کر بندر کی پھرتی سے کمرے کے اندر کودا اور اپنی مطلوبہ چیزیں سمیٹ کر ایک بار پھر کھڑکی کے راستے واپس باہر آ گیا۔

اب اس کا رخ ہسپتال کی چار دیواری کی طرف تھا۔ چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے پوری

طاقت سے جمپ لگائی تو ہاتھ دیوار کی منڈیر کو تھامنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ زور لگا کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا اور فوراً ہی دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ یہاں زمین نرم تھی اور ہسپتال کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے پودے لگائے گئے تھے جن کی وجہ سے دن کی روشنی میں منظر خاصا خوب صورت لگتا تھا لیکن اس وقت اندھیرے میں جس پودے پر جا کر گرا، اس کے کئی کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا۔ کانٹے چبھنے سے بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر اُس نے اس تکلیف پر قابو پا لیا اور کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

اب اس کا رخ اس حصے کی طرف تھا جہاں بشیر اکبر کی رہائش گاہ تھی۔ مین گیٹ سے لے کر اس کی رہائش گاہ تک ایک پختہ سڑک بنی ہوئی تھی۔ یہ سڑک ہسپتال کے سامنے سے بھی گزر رہی تھی لیکن مشابرم خان اس سڑک پر چلنے کے بجائے کچی زمین پر ہی چلتا رہا۔ کیونکہ سڑک پر چلنے کی صورت میں وہ فوراً ہی نظر میں آ جاتا، اس لیے وہ احتیاطاً کچی زمین پر ہی چلتا رہا جہاں جابجا موجود پودے اور درخت بوقتِ ضرورت اسے چھپنے کے لیے آڑ فراہم کر سکتے تھے۔

خیریت گزری کہ وہ کسی بھی قسم کی دشواری میں پڑے بغیر بشیر کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ پہلی بار یہاں آنے کے باوجود وہ جدید سائنس کے کارنامے کے باعث اس عمارت کے پورے محلِ وقوع سے واقف تھا۔ میجر اسفند نے اسے کمپیوٹر کی اسکرین پر پوری عمارت دکھائی تھی۔ اس تصویر میں دو متحرک سائے بھی نظر آئے تھے جو یقینی طور پر وہاں پہرہ دے رہے تھے۔ رہائشی عمارت میں محض ان دو پہرے داروں کی موجودگی شاید اس لیے اکتفا کیا گیا تھا کہ پوری عمارت کے گرد حفاظت کا زبردست انتظام موجود تھا اور پہرے داروں کی بڑی تعداد کے علاوہ دیواروں پر برقی تار بھی بچھائے گئے تھے اور کسی فردِ واحد تو کیا، چھوٹی موٹی مسلح پلٹن کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آسانی سے اس دفاعی حصار کو توڑ سکے۔ اس لیے اندر مختلف یونٹ کی شکل میں بنی عمارتوں کی حفاظت کے لیے زیادہ تردد نہیں کیا گیا تھا۔

مشابرم خان جس ترکیب سے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا، اگر وہ ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی ہوتی تو وہ کبھی یہاں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

رہائش گاہ کے عقبی حصے میں پہنچ کر وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اندر کی آہٹ لیتا رہا۔ اندر خاموشی تھی لیکن اندازہ ملتا تھا کہ اندر کم از کم دو پہرے دار موجود تھے۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چار دیواری کا جائزہ لیا۔ اس چار دیواری کی بلندی ہسپتال کی دیواروں سے زیادہ تھی۔ اس نے پہلے کی طرح اُچھل کر اس پر چڑھنا چاہا لیکن انگلیاں محض منڈیر کو چھو کر ہی رہ گئیں اور وہ اوپر چڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اُس نے اپنے وجود کی تمام تر توانائیاں مجتمع کرتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹ کر دوڑ لگاتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔ اس بار وہ کامیاب رہا اور انگلیاں منڈیر پر جم گئیں لیکن ساتھ ہی اسے شدید اذیت سے بھی گزرنا پڑا۔ دیوار پر شیشے کے ٹکڑے لگائے گئے تھے جو اس کی انگلیوں میں کھب گئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنی چیخوں کو حلق سے خارج ہونے سے روکا اور بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے زخمی ہاتھوں پر زور دیتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔ اس کوشش میں اسے جس تکلیف سے گزرنا پڑا، وہ ناقابلِ بیان تھی لیکن پہاڑوں کے بیٹے کا عزم بھی پہاڑوں جیسا تھا۔ وہ اس تکلیف سے گزر کر بے حد مدھم آواز کے ساتھ نیچے کود گیا۔

اندر دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سے پودے اور چھوٹی قامت کے درخت لگائے گئے تھے۔ ان کم قامت درختوں کو لگانے کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ کوئی جوان درختوں کے سہارے عمارت کے اندر یا باہر آ جانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکے۔ اس نے ایسے ہی ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ کر اپنی قمیض کا دامن پھاڑا اور دونوں زخمی ہاتھوں پر مٹی لیپ کر کے ہاتھوں پر بمشکل پٹیاں باندھ لیں۔ کانچ کے ٹکڑے اندر پیوست ہونے سے ہاتھوں میں بڑے گہرے زخم آئے تھے جن سے تیزی سے خون کا اخراج ہو رہا تھا۔ خون کے اس اخراج کو روکنے کے لیے وہ فی الحال یہی ترکیب استعمال کر سکتا تھا۔

اس کام کے دوران وہ اپنے اردگرد سے غافل نہیں ہوا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس دوران وہاں کوئی پہرے دار نمودار نہیں ہوا تھا جبکہ اصولاً مستقل گشت کرنے والے پہرے داروں میں سے کسی ایک کو تو اب تک وہاں سے گزرنا چاہئے تھا۔

اس نے چند لمحے مزید پہرے دار کے نمودار ہونے کا انتظار کیا پھر خود انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ باہر موجود ان دو پہرے داروں سے نمٹے بغیر وہ اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا ورنہ بعد میں یہ دونوں اس کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیتے۔

نہایت محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہ بائیں طرف سے نکل کر عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد اسے دونوں پہرے دار گیٹ کے قریب بیٹھے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں جبکہ ایک سگریٹ بھی سلگا ہوا تھا جس سے دونوں باری باری کش لے رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں کسی کی دخل اندازی کے خطرے سے بالکل بے نیاز تھے اور نہایت بے پروائی سے اپنی معمول کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی بے پروائی سے ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ اگر مشابرم خان کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ بہت آسانی سے انہیں قابو کر سکتا تھا لیکن اس وقت دونوں کو ایک ساتھ قابو کرنے کی کوشش کرنا اس اعتبار سے خطرناک تھا کہ اگر وہ آڑ سے نکل کر ان کی طرف بڑھتا تو دونوں میں سے کسی کی بھی اس پر نظر پڑ سکتی تھی اور پھر ان کے لیے اپنی رائفلیں اٹھا کر اسے قابو کر لینا یا ٹھکانے لگا دینا ذرا مشکل نہ ہوتا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس پر عمل کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا۔

''اچھا بھائی! چائے کا شکریہ۔ تُو آرام سے بیٹھ۔ میں ذرا راؤنڈ مار کر آتا ہوں۔'' ابھی اسے کوئی تدبیر سوجھی بھی نہیں تھی کہ ہوا کے دوش پر لہراتی آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا سا سر نکال کر جھانکا۔ دونوں پہرے داروں میں سے ایک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور رائفل اٹھا کر شانے سے لٹکا لی تھی۔ اس نے قدموں کی حرکت دی تو مشابرم خان نے دیکھا کہ وہ اسی سمت آ رہا ہے جہاں وہ خود چھپا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے کچے صحن میں پودوں کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں ہی راؤنڈ لگانے کے لیے آنے والا پہرے دار اس کی نظر میں آ گیا۔ وہ نہایت اطمینان سے چل رہا تھا اور اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سر پر کتنا بڑا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس کی یہ بے خبری اور اطمینان، مشابرم خان کے لیے مفید ثابت ہوا اور جیسے ہی وہ اس کی کمین گاہ سے چند قدم آگے بڑھا، اس نے کسی چیتے کی سی پھرتی اور خاموشی سے جست لگا کر اسے پیچھے سے اس طرح جکڑا کہ اس کا ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ پر جما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ کے بازو نے اس کی گردن کے گرد اس طرح حلقہ تنگ کر دیا تھا کہ وہ بے بس سا ہو گیا تھا۔ اس بے چارے کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ شانے پر لٹکی اپنی رائفل اُتارنے کے لیے ہی ہاتھ پیر چلا سکتا۔ مشابرم خان نے اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اسے کچی زمین پر گھسیٹ لیا اور اسے پشت کے بل زمین پر گرا کر خود اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ ایک ہاتھ پہرے دار کے منہ اور ناک کو ڈھانپے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے زور لگا کر وہ اس کا گلا

دبا رہا تھا۔

ذرا دیر کی محنت کے بعد ہی گارڈ نے ہاتھ پیر پٹخنا چھوڑ کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کا سر بھی ایک طرف ڈھلک گیا۔ مشابرم خان نے اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کر کے اسے چیک کیا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کا کافی دیر تک ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اس کے سینے سے اُتر گیا اور اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لیا۔ پہرے دار سے نمٹنے کی کوشش میں اس کے زخمی ہاتھوں سے ایک بار پھر خون رِسنا شروع ہو گیا تھا۔ تکلیف بھی شدید تھی لیکن اس وقت اس کے پاس اپنے زخموں پر دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ راؤنڈ پر نکلنے والا پہرے دار جب اپنے ساتھی کے پاس واپس نہیں پہنچے گا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو کر اسے دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہو گا۔

یہ عمارت اتنی وسیع و عریض نہیں تھی کہ اس کے گرد ایک چکر لگانے میں کسی کو چند منٹ سے زیادہ وقت درکار ہوتا۔ اس لیے ضروری نہیں تھا کہ اس سے قبل کہ دوسرا پہرے دار اپنے ساتھی کی تلاش میں نکلے، وہ اس کے استقبال کے لیے تیار ہو۔ وہ ایک بار پھر اسی مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے جھانک کر اس نے گیٹ کے قریب بیٹھے پہرے داروں کو چائے اور سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسرا پہرے دار ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اور اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ ختم ہونے تک اس کا اطمینان باقی رہا، اس کے بعد وہ کچھ بے چین نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور وہ بے چین نظر آنے لگا۔ پھر شاید اس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ کسی خطرے کی بُو پا کر رائفل شانے سے اتار کر محتاط انداز میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا لیکن اپنے ساتھی کے برعکس اُس نے اس جانب سے عمارت کا راؤنڈ لگانے کے بجائے جہاں مشابرم خان موجود تھا، دوسری جانب کا رخ کیا تھا۔ چنانچہ مشابرم خان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے پہلے والے کی طرح دبوچ سکے۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے پہرے دار کے مڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ موڑ مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو پھر وہ حرکت میں آیا۔ اب وہ خود فرنٹ کی طرف سے گزر کر پہرے دار کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ محتاط ہونے کے باوجود اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ ہاتھوں میں موجود رائفل نے اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس فکر میں مبتلا نہیں تھا کہ مسلح دشمن کے مقابلے میں خود نہتا ہے۔ ویسے وہ جو منصوبہ اپنے ذہن میں لے کر آیا تھا، اس میں آتشیں ہتھیار چلانے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ان ہتھیاروں کی دہشت ہی مہلک ہوتی ہے اور سامنے والا مقابلے پر ڈٹنے سے پہلے خود دس بار سوچتا ہے۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے تیزی سے عمارت کے سامنے کا حصہ پار کر لیا اور احتیاط سے اس جانب مڑا جہاں پہرے دار گیا تھا۔ مشابرم خان نے نظروں سے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کا اندازہ لگایا اور پنجوں کے بل بے آواز قدموں سے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ پہرے دار چونکہ کچھ دیر قبل ہی اس جگہ سے گزرا تھا اس لیے اسے اندازہ نہیں تھا کہ خطرہ اس کی پشت کی طرف سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی ساری توجہ آگے کی جانب مرکوز تھی۔ اپنی پشت پر مشابرم خان کی موجودگی کا اسے اسی وقت پتہ چلا جب مشابرم خان کے ہاتھوں میں موجود رائفل کی نال اس کی گردن سے جا لگی۔

''بغیر کوئی آواز نکالے اپنی رائفل پھینک دو ورنہ اپنے ساتھی کی طرح تم بھی جان سے چلے جاؤ گے۔'' اس نے سرد لہجے میں اس نے پہرے دار کو حکم دیا اور جان بوجھ کر اسے اس کے ساتھی کے مرنے کی غلط اطلاع دی تاکہ وہ اس دہشت میں مبتلا ہو جائے کہ جو شخص ایک آدمی کو قتل کر سکتا ہے، اس کے لیے دوسرا قتل کرنا کون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سا مشکل ہوگا۔

''تت.....تم کون ہو؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میں جو بھی ہوں، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ ہاں اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے تعاون کرو۔'' وہ دھیمی آواز میں غرایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود غراہٹ میں ایسی دہشت تھی کہ پہرے دار نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس کی۔ اس کی کیفیت کا اندازہ لگا کر مشابرم خان اسے رائفل کے بل پر دھکیلتا ہوا عمارت کے عقب میں لے گیا۔

''تم دونوں کے علاوہ اس عمارت کی حفاظت کے لیے اور کتنے لوگ ہیں؟'' اس نے پہرے دار سے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔ ایک وقت میں بس دو ہی آدمی ڈیوٹی دیتے ہیں۔ صبح ہماری ڈیوٹی ختم ہوگی تو ہماری جگہ دوسرے دو آدمی آجائیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کے علاوہ یہاں حفاظت کا کیا انتظام ہے؟..... میرا مطلب ہے کہ کوئی الیکٹرانک الارم سسٹم وغیرہ تو موجود نہیں ہے؟''

''نہیں۔ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بڑے صاحب کی حفاظت پر مامور ہر آدمی نے اپنی جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کرنے کا عہد کر رکھا ہے''

اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کی اب تک کی کیفیت کے باعث مشابرم خان کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ بہت تیزی سے پیچھے ہٹنے کے باوجود اس کے ہاتھ پر ایک ہلکا سا چرکا لگ ہی گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پہرے دار کے ایک ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر ہے جس سے وہ دوسرا وار کرنے کے لیے پَر تول رہا ہے۔ مشابرم خان اس لڑائی کو طول نہیں دے سکتا تھا کیونکہ شور شرابے کی صورت میں اندر موجود بشیر اکبر ہوشیار ہو سکتا تھا۔

اس نے پہرے دار کے دوسرا حملہ کرنے سے قبل تیزی سے حرکت کی اور ہاتھ میں موجود رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے بھرپور وار کیا۔ اس کا نشانہ پہرے دار کا سر تھا لیکن چونکہ پہرے دار خود حرکت میں تھا اس لیے اس کا نشانہ خطا گیا اور رائفل کا بٹ اس کے شانے پر لگا۔ شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور جھٹکا لگنے کے باعث اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور چھلانگ لگا کر خنجر تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اب مشابرم خان اسے مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر رائفل کو گھمایا اور اس بار اس کا نشانہ بالکل درست تھا۔ پہلی ہی ضرب سے پہرے دار کی کھوپڑی تڑخ گئی اور وہ لہراتا ہوا نیچے آگرا۔ مشابرم خان نے احتیاطاً اسے ایک ضرب اور لگا دی لیکن حقیقتاً اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلی ضرب پر ہی بغیر آواز نکالے جہانِ فانی سے کوچ کر چکا تھا۔

مشابرم خان اس کی رائفل کو پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا، اس اضافی وزن کو ایک طرف پھینک کر اس کا خنجر اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ عجیب وضع کا خنجر تھا جس کی شکل کچھ ہلال نما تھی اور وہ بے طرح جھلملا رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ خنجر کی دھار بہت تیز ہے اور وہ انسانی گوشت تو کیا ہڈیوں اور اور چیزوں کو بھی با آسانی کاٹ سکتا ہے۔ خنجر کی ان خصوصیات کے پیشِ نظر مشابرم خان نے اسے اپنے ہاتھ ہی پکڑ لیا اور رائفل شانے سے لٹکا لی۔ اب اس کا رخ مرکزی عمارت کے دروازے کی طرف تھا جہاں اس کے یقین کے مطابق بشیر اکبر چین کی نیند سو رہا تھا اور اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے عیش کدے کے

ان سی قیامت آکھڑی ہوئی ہے۔

مرکزی دروازے پر آٹومیٹک لاک لگا ہوا تھا۔ اس قسم کے لاک کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اسے اندر سے چابی لگائے صرف لٹو گھما کر کھولا جا سکتا ہے لیکن باہر سے کھولنے کے لیے ہر صورت چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی مشکلات سے نمٹنے اور ہتھیار کے طور پر ہسپتال سے کچھ سرجیکل آلات چرا لایا تھا۔ لیکن اتفاق سے اسے ان چیزوں کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ یہاں آکر ہتھیاروں کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور دروازے کا لاک کھولنے کے لیے بھی ہاتھ میں موجود خنجر بہت موزوں تھا۔ اس نے خنجر کی نوک کو اپنے مقصد کے لیے آزمایا تو ذرا سی کوشش سے ہی لاک کھل گیا۔

لاک کھلنے کے بعد اسے اندر داخل ہونے سے کون روک سکتا تھا؟ وہ آرام سے اندر گھستا چلا گیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ کچن کے برابر والے کمرے میں اسے ایک ادھیڑ عمر عورت سوئی ہوئی نظر آئی۔ عورت صورت سے ہی ملازمہ لگ رہی تھی جو یقینی طور پر بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر کھانا پکانے اور صفائی ستھرائی جیسے کاموں کے لیے رکھی گئی تھی۔

مشابرم خان دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور عورت کی کنپٹی پر ہلکی سی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ ملازمہ کو بے ہوش کرنے کے بعد اس نے باہر نکل کر احتیاطاً اس کے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے کمروں کو چیک کرتا چلا گیا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال، لیونگ روم سب ہی اعلیٰ درجے کی اشیا سے مزین تھے اور یہ سارا اہتمام صرف ایک شخص کے لیے تھا۔

خالی کمروں میں جھانکتا ہوا وہ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کے وجدان نے اسے بتایا، یہ کمرہ خالی نہیں ہے اور کمرہ خالی نہ ہونے کا مطلب تھا کہ وہاں بشیر موجود ہے۔ اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے اس نے دروازے پر کان لگا کر دوسری طرف سے کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل سکوت تھا لیکن اس سکوت سے اس کا یہ یقین متزلزل نہیں ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ وہ عمارت کے سارے کمرے دیکھ چکا تھا۔ وہاں اسے ایک بیڈ روم بھی ملا تھا لیکن اس کی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ وہ مہمانوں کے لیے مختص ہے۔ شاید کبھی کبھار بشیر کا کوئی خاص مہمان آتا ہوگا تو اسے اس بیڈ روم میں ٹھہرانے کا اعزاز عطا کیا جاتا ہوگا۔ ورنہ یہاں اس رہائش گاہ سے ہٹ کر ایک عمارت ایسی بھی تھی جسے مہمان خانے کا نام دیا گیا تھا اور دور دراز علاقوں سے آنے والے مخصوص افراد کو وہاں ٹھہرایا جاتا تھا۔

اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ رات کے اس پہر بشیر کے سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے بھی کمرے میں داخلہ ممکن محسوس ہو سکتا ہے، دروازے کی ناب کو گھمایا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا اس لیے کھولا نہیں جا سکا۔ اب اس کے پاس خنجر کو ایک بار پھر آزمانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بار اس نے پہلے سے کئی گنا زیادہ احتیاط برتتے ہوئے کارروائی کی کہ اگر بشیر نیند کا کچا ہوا تو معمولی سے کھٹکے پر بھی جاگ سکتا ہے۔ ایک منٹ سے کم وقت میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور ناب گھما کر دروازے کو بس اتنا دھکا دیا کہ اس میں معمولی سی درز پیدا ہو جائے اور اندر داخل ہونے سے پہلے وہ کمرے کا باہر ہی سے جائزہ لے سکے۔ لیکن آنکھ لگانے سے قبل ہی اسے اندر سے بلند مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ یک دم ہی اُس پر منکشف ہوا کہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے جو پرائیویسی اور آرام کے تقاضے بھرپور طریقے سے ادا کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا ایک بڑا نقصان یہ تھا کہ ایسی بھی قسم کی بیرونی آواز اندر نہ جانے کی وجہ سے اندر موجود شخص کو بیرونی خطرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بشیر کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں مانتی سالی تو اسے ایک زہر کا انجکشن لگا دو لیکن بار بار فون کر کے مجھے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا شوہر آئے تو بول دینا، سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اُس کی یا اُس کے خاندان میں سے کسی کی کیا مجال ہے کہ ہماری کہی بات کو جھٹلا سکے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، بے فکری سے کرو۔ آگے کے حالات میں خود سنبھال لوں گا۔ اور ہاں، کل تک میرے لیے کسی نوجوان ملازمہ کا بندوبست کر دو۔ وہ جو بڈھی گھوڑی تم نے بھیجی ہے، اس کی شکل دیکھ کر تو میرا کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس بڑھیا کی وجہ سے میرا مزا اور رات دونوں برباد ہو کر رہ گئے۔''

بشیر کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ ریسیور کان سے لگائے مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو سن کر ہی مشابرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈاکٹر کو زرینہ نامی عورت کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔

''اور ہاں سنو۔ اب کی بار جس کسی کو بھی بھیجو اسے پہلے ہی ٹیکے شیکے لگا کر بھیجنا۔ میں بار بار ایسی مصیبتوں کو نہیں بھگت سکتا۔ تمہاری غفلت کی وجہ سے ہی آج وہ عورت سر پر چڑھی چلی آ رہی ہے۔''

اُس کی نان اسٹاپ ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔ اب صورتِ حال اور بھی زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ بشیر اگرچہ بظاہر دین اور عوام کا خدمت گار بنا تجرد کی زندگی گزار رہا تھا اور اس نے ہر طرف یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ امور میں مصروف رہتا ہے کہ اس نے شادی سے بھی گریز کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ یہاں اپنے اس عیش کدے میں گھریلو ملازماؤں کو مقصد برآری کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ ان عورتوں کی زبانیں عقیدت، خوف لالچ یا کسی بھی دوسری وجہ سے بند رہتی ہوں گی لیکن زرینہ ان کے گلے میں اٹک گئی تھی۔ مشابرم خان خود اپنے کانوں سے اس ضدی عورت کی بحث سن کر آیا تھا اور اب بشیر اکبر کی زبان سے اس کی موت کے احکامات جاری ہوتے ہوئے بھی سن لیے تھے۔

''کم بخت اتنی بڑی بڑی رقمیں لیتے ہیں مجھ سے لیکن کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔'' بشیر نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور بڑبڑاتا ہوا ڈگمگاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ نے بتایا کہ وہ نشے میں ہے۔ شاید نشے ہی کی وجہ سے وہ اتنے خراب لہجے اور بلند آواز میں بات کر رہا تھا ورنہ عام حالات میں اس کی جو تقریریں وغیرہ مشابرم خان نے سنی تھیں، ان میں اس کا لہجہ نہایت دھیما اور نرم ہوتا تھا یا پھر یہ تھا کہ خلوت میں وہ اپنی اصلیت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا۔ اب مزید انتظار بے کار تھا اس لیے مشابرم خان نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور یک دم ہی پورا دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی وہ بجلی کے کوندے کی طرح اندر داخل ہوا اور پھر فوراً ہی اپنی پشت پر دروازے کو بند کر دیا۔ یہ صورتِ حال بشیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بری طرح ہڑبڑا کر کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ میں موجود جام چھوٹ گیا اور دبیز قالین پر بے آواز گرا۔ اس میں موجود ام الخبائث بہہ کر قالین میں جذب ہو گئی۔

''کک..... کون ہو تم؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں کیا جانے والا اپنا سوال مکمل کرتا، اس سے قبل مشابرم خان اس کے سر پر پہنچ کر خنجر کی دھار اس کے گلے پر رکھ چکا تھا۔

''کوئی آواز نکالے بغیر صرف اور صرف میری ہدایات پر عمل کرو ورنہ میں تمہاری شہ رگ کاٹ دوں گا۔'' مشابرم خان نے خوف ناک لہجے میں دھمکی دی۔

''یہ خنجر دور ہٹاؤ۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔'' بشیر کی نظریں خنجر پر گڑی ہوئی تھیں اور مشابرم خان کی موجودگی سے زیادہ اس کے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے خائف نظر آ رہا تھا۔

''میں نے یہ خنجر تمہارے ایک چاہنے والے سے چھینا ہے۔ وہ اس خنجر سے میری جان تو نہیں لے سکا لیکن میں تمہاری جان بہت آرام سے لے سکتا ہوں۔ اس لیے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔'' خنجر اس کی شہ رگ سے ہٹائے بغیر اس نے مزید دھمکی دی۔

''میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ تم یہ خنجر دور ہٹا لو اور بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس بار مشابرم خان کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ خنجر سے بے پناہ خوف زدہ ہے۔

''تمہیں میرے ساتھ یہاں سے اس طرح چلنا ہو گا کہ کسی کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف زبردستی یہاں سے لے جایا جا رہا ہے۔'' اس نے خنجر ہٹانے کے بجائے اس کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا اور اب بس اتنی ہی کسر باقی تھی کہ خنجر کی دھار اس کی جلد میں اُتر جاتی۔

''میں راضی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا لیکن تم یہ خنجر دُور ہٹاؤ۔'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا تو مشابرم خان نے اس کا بے پناہ خوف دیکھتے ہوئے خنجر کا دباؤ ذرا کم کر دیا۔

''ہم ابھی اور اسی وقت چلیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ باہر جانے کے لیے تمہاری گاڑی کون ڈرائیو کرتا ہے؟''

''میرے پہرے داروں میں ہر ایک ڈرائیونگ جانتا ہے اور میں کہیں جاتے وقت ان میں سے کسی نہ کسی کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اس وقت ان دونوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں ہے کہ گاڑی چلا سکے۔ ویسے بھی تمہیں اکیلے ہی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ تو پہلے اپنے نائب کو یہ اطلاع دو کہ تمہیں ابھی اور اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے دنیا سے کٹ جانے کا حکم ملا ہے اس لیے تم یہاں سے جا رہے ہو۔''

بشیر کا جو ریکارڈ ان کے پاس موجود تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی کم از کم دو بار اس طریقے سے غائب ہو چکا ہے اسی لیے اُس نے اس وقت بھی اسے یہی بہانہ بنانے کا حکم دیا۔

''میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم اب ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے فون کرنے دو۔'' بشیر بہت آسانی سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مشابرم خان کو اس سے ایسے بودے پن کی اُمید نہیں تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے اپنی بات منوانے کے لیے اچھے خاصے تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن یہاں تو بہت آسانی سے بات بن گئی اور وہ اس آسانی کو غیبی امداد سمجھ رہا تھا کیونکہ ظاہری طور پر بہت مضبوطی دکھانے کے باوجود وہ لحہ بہ لحہ کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس کے خیال میں ایسا خون کے مستقل رساؤ کی وجہ سے تھا۔

''میں تمہیں ذرا بھی چھوٹ نہیں دے سکتا۔ میرا خنجر تمہاری شہ رگ پر ہی رکھا رہے گا۔ تم فون کرو۔ اگر ذرا بھی گڑبڑ محسوس ہوئی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔'' وہ بشیر کے ساتھ ذرا بھی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ اسے ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اس کا یہ متعاون رویہ کہیں کوئی چال ہی نہ ہو۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ یہ نہ ہو کہ خنجر انجانے میں میرے گلے میں گھس جائے۔'' اسے راضی نہ ہوتے دیکھ کر اس نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن ساتھ ہی ایک خوف زدہ سی التجا کرنا نہ بھولا۔

''میں بے احتیاطی صرف اسی صورت میں کروں گا جب تم احتیاط نہیں کرو گے۔'' مشابرم خان نے سادگی سے جواب دیا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے فون کی طرف متوجہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے نائب کو جانے کی اطلاع دینے لگا۔ اس نے مشابرم خان کے اشارے پر بات کو زیادہ طول نہیں دیا تھا اور مختصراً بتا کر کال منقطع کر دی تھی۔

''اب یہ بتاؤ کہ گاڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟'' وہ فون کال سے فارغ ہوا تو مشابرم خان نے اس سے استفسار کیا۔

''چابیاں اس میز کی دراز میں ہیں۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔

''نکالو۔'' مشابرم خان اسے خنجر کی زد میں لیے ہوئے دراز تک گیا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے دراز کھولی۔ چابیوں کے ساتھ ہی سیاہ رنگ کا ولایتی پسٹل بھی رکھا تھا۔ پسٹل دیکھ کر مشابرم خان کی گرفت خنجر پر کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ بشیر نے اس کے جسم میں پیدا ہونے والا واضح طور پر محسوس کیا اور پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کیے بغیر صرف چابیاں نکال لیں۔

وہ چابیاں نکال چکا تو مشابرم خان نے اسے پیچھے سے ٹھوکا دے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ وہ دونوں بیڈ روم سے لے کر پورٹیکو تک اس طرح آئے کہ بشیر کی گردن پر ہنوز خنجر رکھا ہوا تھا۔

''تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔'' مشابرم خان نے اسے حکم دیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا خنجر بشیر کی گردن سے دور ہٹا تھا۔ لیکن اس موقع پر بھی اس نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور بشیر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے تک خود بھی عقبی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ لمحہ بھر میں ہی اس کا خنجر ایک بار پھر بشیر کی گردن پر تھا۔

''گلوو کمپارٹمنٹ کھولو۔'' بشیر اگنیشن میں چابی لگا رہا تھا کہ اسے پیچھے سے یہ حکم ملا۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں کمپارٹمنٹ کھول دیا۔ اس میں جدید ساخت کا ایک چھوٹا سا پسٹل رکھا ہوا تھا۔ مشابرم خان نے لپک کر پسٹل اپنے قبضے میں کر لیا۔

''میں ایک بار پھر تمہیں یاد دلا رہا ہوں کہ کوئی گڑبڑ نہیں کرنا۔ ورنہ میں تمہارے دیوانوں سے بھی زیادہ پاگل آدمی ہوں۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر میں تمہیں کسی صورت نہیں بخشوں گا۔ ہاں اگر تم مجھ سے تعاون کرتے رہے تو میری حد تک تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔''

اس نے پھنکارنے والے انداز میں بشیر کو یاد دہانی کروائی تو وہ بس اپنے خشک لبوں پر زبان ہی پھیر کر رہ گیا اور اس کی اجازت سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ بے آواز انجن والی قیمتی گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھی۔

مشابرم خان نے خود کو عقبی نشست کے پائیدان میں اس طرح چھپا لیا کہ باہر سے ایک نظر دیکھنے پر کسی کو دکھائی نہ دے۔ گاڑی کی چیکنگ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر خود اکبر موجود تھا۔ البتہ اس موقع پر اسے اپنی ایک کوتاہی کا احساس ضرور ہوا۔ وہ بشیر کو اسی حلیے میں اٹھا کر لے آیا تھا جس میں وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا شراب نوشی کر رہا تھا۔

عبادت گاہ کے محافظ جو ہمیشہ اسے نفیس نقش و نگار سے مزین ٹوپی اور چغے میں دیکھنے کے عادی تھے اسے اس رف حلیے میں دیکھ کر ضرور چونکتے لیکن اب اس کے پاس اپنی غلطی کو درست کرنے کا موقع نہ تھا۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بہت مشکل سے بار بار دماغ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی دھند کو جھٹک کر دور کر رہا تھا۔ آخر کار گاڑی عمارت کے مین گیٹ کو پار کر ہی گئی اور اس نے اپنے دل میں شدت سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''لیفٹ پر لے لو۔ اور پھر جہاں سڑک ختم ہو، وہاں گاڑی روک لینا۔'' اس نے ایک اور حکم صادر کیا اور کال سے سر کو جھٹکا۔ بس اب ذرا ہی دیر کا راستہ بچا تھا۔ اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق آرمی کی گاڑیاں ان کی منتظر ہوتیں۔ میجر اسفندیار سے یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ رات گیارہ سے صبح فجر تک آرمی کی دو گاڑیاں مسلسل مقررہ جگہ پر موجود رہیں گی اور اس کے بعد سارے معاملات وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔ اس نے بہت کوشش سے مقررہ جگہ پر پہنچنے تک اپنے حواس کو قائم رکھا۔ شکر کا ایک مقام یہ بھی تھا کہ شک میں مبتلا ہو کر بشیر کے محافظوں کی کوئی گاڑی تعاقب میں نہیں آئی تھی یا شاید ان میں سے کسی کی جرأت ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت اس کی گاڑی کے پیچھے آ سکے۔ سچ جو بھی تھا، اس کے لیے یہ غنیمت سب سے بڑی تھی کہ اس نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا ہے۔ اس کے حسب ہدایت بشیر نے مقررہ جگہ پر گاڑی روکی تو اس نے گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں اور ایک بار پھر سر جھٹک کر دماغ کو گرفت میں لے لینے والی دھند سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار اسے اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور آنکھیں خود بخود ہی بند ہوتی چلی گئیں۔

''اسٹریچر لاؤ اور اسے ایمبولینس میں شفٹ کرو۔ ہری اپ۔'' بند آنکھوں سے اس نے جو آخری چند آوازیں سنیں، ان میں گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ کسی کی چیختی ہوئی آواز میں کہا جانے والا یہ جملہ بھی شامل تھا۔ پھر اس کے بعد وہاں کیا کچھ ہوا، اسے خبر نہ ہو سکی۔

⊛----✪----⊛

''اتنے چپ چپ کیوں رہتے ہو بادشاہو! کچھ گل شل کیا کرو۔ ایسے زبان سی کر بیٹھے رہو گے تو جیل میں وقت گزارنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔''

جیل میں اس وقت تفریح کا وقت تھا اور قیدی کھلے میدان میں مختلف کھیل، کھیل کر اپنا دل بہلا رہے تھے۔ سلو کا شمار خطرناک مجرموں میں ہوتا تھا، اس لیے اسے سب سے الگ تھلگ کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا اور ابتدائی ایام میں اسے اس کی کوٹھڑی سے بالکل بھی باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ اندھیری اور سیلن زدہ کال کوٹھڑی نے چند دنوں نے ہی اس کے دماغ کے بہت سے کیڑے جھڑا دیئے تھے اور وہ ایک نفرت میں ڈوبے ہوئے انسان کی حیثیت کے بجائے مختلف انداز میں سوچنے لگا تھا۔

سوچ کی اس تبدیلی کے بہت سے محرکات تھے جن میں سب سے پہلا محرک تو یہ سوال تھا کہ اسے وزیر اعظم کے بیٹے کے ولیمے میں اس کے مخالف سیاسی لیڈر کے قتل کے لیے کیوں چنا گیا تھا؟..... اس بھری ہوئی محفل میں متعدد سیکورٹی اہلکاروں کی موجودگی میں وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد کیسے بچ کر نکل سکتا تھا؟ اور اگر یہ ممکن ہی تھا تو وہ بیک ڈور اور مددگار جنہیں اس واردات کے بعد اسے جائے وقوعہ سے فرار کروانا تھا، اس موقع پر کدھر غائب ہو گئے تھے؟ اور وہ آدمی کون تھا جو اس کی ناکامی کے بعد اسے شوٹ کر دینا چاہتا تھا؟

اس نے خود دیکھا تھا کہ وزیر اعظم کے سیکورٹی انچارج نے اس کی ناکامی کے بعد اسے گولی مارنے کی کوشش کی تھی اور عین وقت پر ایک دوسرا آدمی اسے چھاپ نہ لیتا تو اس کی جان جانا یقینی تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے اس کی فرد جرم سنانے والوں نے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا تھا کہ بھارت میں اس کی پرورش خاص مقاصد کے تحت کی گئی تھی۔ اس لیے وہ خود اپنے وطن ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس کی شخصیت کے نظروں میں آ جانے کے بعد اسے اپنا کہنے والوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ ادھر وہ وزیر اعلیٰ کے مخالف سیاسی لیڈر کو گولی مار کر ہلاک کرتا، ادھر چیف سکیورٹی آفیسر کے ذریعے اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔ بھارتیوں کے اس سفاکانہ رویے نے اسے ذہنی طور پر بُری طرح اُلجھا دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ دونوں ملکوں میں سے کسے صحیح سمجھے اور کسے غلط۔

اس نے انٹیلی جنس والوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور مسلسل خاموش رہا تھا۔ اس خاموشی کے باوجود اسے جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کیونکہ جاننے والے جانتے تھے کہ اس نے کوئی اور جرم چاہے نہ کیا ہو لیکن بھارت کا ایجنٹ تو وہ بہر حال ہے۔ سیلن زدہ تاریک کوٹھڑی میں اس کے دن بہت تکلیف میں گزر رہے تھے اور ابتدائی دو چار دن تو وہ انسانی شکل کیا، آواز کے لیے بھی ترس کر رہ گیا تھا۔ بس کوئی شخص چپکے سے کوٹھڑی کے دروازے کے نیچے سے کھانا اندر سرکا دیتا تھا جسے وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کسی نہ کسی طور تھوڑا بہت کھا لیتا تھا۔

اسے اس اذیت سے جزوی طور پر کئی دن بعد نجات ملی اور اتنی اجازت دے دی گئی کہ وہ تفریح کے وقفے میں گھنٹہ بھر کے لیے اپنی کوٹھڑی سے باہر کھلے میدان میں آ سکتا ہے۔ گھنٹے بھر کی یہ چھوٹ اسے غنیمت معلوم ہوئی تھی لیکن اس ایک گھنٹے میں اس نے کبھی کسی کھیل میں حصہ لینے یا کسی دوسرے قیدی سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چند ایک قیدیوں نے خود اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی بھی لیکن اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن یہ ایک شخص تھا جو کسی جونک کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور ہر روز تفریح کے اس وقفے میں اس سے بات چیت اور چھیڑ چھاڑ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اپنی اُلجھی ہوئی سوچوں میں گم رہنے والے سلّو نے کبھی اس کی باتوں پر ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ باز نہیں آتا تھا۔

''سنا ہے تُو دہشت گردی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ لیکن تیری بھولی شکل دیکھ کر دل نہیں مانتا۔ سچ بتا، کچھ کیا بھی تھا یا ان سالے پولیس والوں نے تجھے ایسے ہی بھرتی کے لیے پکڑ لیا۔ یہ سالے بڑے ..... ہیں۔'' اس نے ایک بڑی سی گالی دی۔ ''اصل مجرموں کے تو قریب جاتے ہوئے ان کی پتلونیں گیلی ہو جاتی ہیں لیکن نوکری بچانے کے چکر میں بے گناہوں کو پکڑ کر گنتی پوری کر دیتے ہیں۔ ان..... کو اپنی کارکردگی بھی تو ظاہر کرنی ہوتی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ایک موٹی سی گالی جملہ پولیس اہلکاروں کو دی۔

سلّو نے اس کی کسی بات کی تردید یا تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی اور یونہی ٹھس بیٹھا رہا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس شخص کی باتیں نہ سن رہا ہو یا پھر اسے اس کی باتوں سے اُلجھن ہو رہی ہو لیکن پھر بھی وہ اس سے گریزاں تھا۔ اس لیے کہ اسے شک تھا کہ کہیں یہ شخص کسی خفیہ ادارے کے لیے جاسوسی نہ کر رہا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ جیلوں میں بعض قیدی ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیل انتظامیہ یا پھر کسی اور ادارے کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ قیدی اس اعتبار سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں کہ دوسرے قیدی انہیں اپنا ساتھی تصور کرتے ہوئے ان کے سامنے بہت سے راز اُگل ڈالتے ہیں اور بعد میں یہ چیز ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ سلّو کا سینہ بہت سے رازوں سے بھرا ہوا تھا جنہیں کوئی نہیں اُگلوا سکا تھا اس لیے اسے بجا طور پر شک تھا کہ اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے کے باوجود اگر یہ شخص زبردستی اس کے گلے پڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے تو یقیناً کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

''دیکھ بھائی! بات سن۔ تجھ پر جو الزام لگا ہے نا، وہ ایسا نہیں ہے کہ تُو دو چار سال کی جیل کاٹ کر آزاد ہو جائے۔ تیری تو ساری زندگی جیل میں سڑتے ہوئے گزر جائے گی یا اگر باہر نکلا بھی تو ایسی عمر میں نکلے گا کہ

میرے لیے اپنی روٹی کمانا بھی مشکل ہو جائے گا اور تُو سڑکوں پر آوارہ کتوں کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہوا پھرے گا۔''

وہ غیر محسوس طور پر سلّو کے بالکل قریب کھسک آیا تھا اور دھیمی آواز میں بڑی ہمدردی سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

''تمہیں کیا غرض ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں؟'' سلّو نے پہلی بار اُس کی کسی بات کا جواب دیا لیکن لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

''مجھے تیری بھری جوانی پر رحم آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ بہت ہوا تو بیس اکیس کا ہو گا۔ سچ کہوں تو ابھی تیرے کھیلنے کودنے اور عیش کرنے کے دن تھے اور تُو آ کر بیٹھ گیا ہے اس جیل میں، وہ بھی دہشت گردی کے الزام میں۔ چچ چچ چچ..... بڑا دُکھ ہوتا ہے تجھے دیکھ کر۔ دل چاہتا ہے کہ تیرے لیے کچھ کروں۔'' اس کا لہجہ ہمدردی سے بھرا ہوا تھا۔

''تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟'' اس نے سوچ لیا کہ آج اس شخص سے بات کر کے اس کی اصلیت جاننے کی کوشش کرنی چاہئے، چنانچہ گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''کرنے کو تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور کرنا بھی چاہتا ہوں لیکن پتہ نہیں تم اعتماد کے لائق ہو بھی یا نہیں؟''

اس کا انداز سلّو کو بڑا معنی خیز محسوس ہوا لیکن یہ بات اپنے کسی انداز سے ظاہر نہ ہونے دی اور بے پروائی سے بولا۔

''یہ فیصلہ تو تمہیں خود کرنا ہو گا۔ میں بھلا تمہیں اپنے بارے میں کیا گارنٹی دے سکتا ہوں؟ میں تمہارے پاس مدد کی درخواست لے کر بھی نہیں آیا ہوں اس لیے تمہاری اپنی مرضی ہے کہ مجھ پر اعتماد کرو یا نہیں۔ میری طرف سے بہر حال کوئی اصرار نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اپنا دل بولتا ہے کہ تم پر اعتبار کر لوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس بار سلّو خاموش رہا۔ ''یہ دیکھو، میرے پاس کیا ہے؟'' اس نے سلّو کا ہاتھ پکڑ کر بڑی رازداری سے اپنی جیب پر لگایا۔ سلّو ہاتھ لگتے ہی بری طرح چونک گیا۔ اس کے تربیت یافتہ مشاق ہاتھوں نے فوراً ہی بھانپ لیا تھا کہ اس کے ہاتھوں نے جس سخت چیز کو چھوا ہے، وہ کوئی ریوالور ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے اپنے ہمدرد کو دیکھنے لگا۔

''میں نے اور میرے کچھ ساتھیوں نے مل کر جیل سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں کھیل شروع ہو جائے گا۔ اگر تم چاہو تو موقع کا فائدہ اٹھا کر ہمارے ساتھ بھاگ سکتے ہو۔'' اس کی پیشکش ایسی تھی کہ سلّو ہکا بکا رہ گیا۔ اسے قطعی اُمید نہیں تھی کہ صورت سے خطرناک لگنے والا یہ قیدی اسے ایسی پیشکش کرے گا۔

''تمہارے پاس زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں ہے۔ تمہیں ابھی فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہمارے ساتھ یہاں سے بھاگو گے یا ساری زندگی اس جیل میں سڑتے ہوئے برباد کرو گے؟..... وہ دیکھو، وہاں کھیل شروع ہو گیا ہے۔'' اس نے فٹ بال کھیلنے والے قیدیوں کی سمت اشارہ کیا۔

ان کے درمیان کھیلتے کھیلتے اچانک ہی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لڑائی اتنی بڑھی کہ آپس میں گتھم گتھا کئی قیدی لہولہان ہو گئے۔ کسی کا سر پھٹا تو کسی کا ہونٹ۔ کسی کی ناک سے خون بہہ نکلا تو کوئی اپنے ہاتھ پیر سہلانے لگا۔

پہرے پر موجود سپاہیوں نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی تو کچھ قیدیوں نے ان کی بندوقیں چھین لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ قیدی اِدھر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُدھر بھاگنے لگے۔ سپاہیوں کی سیٹیاں اور چیختی ہوئی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان سب آوازوں پر سب سے بھاری آواز اس ایمرجنسی الارم کی تھی جو جیل میں بجا دیا گیا تھا۔ سلّو دم بخود سا کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ لمحوں میں جیسے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔ یہ یہاں سے بھاگنے کا سب سے سنہری موقع ہے۔'' اس کے ساتھ کھڑے قیدی نے اس کا ہاتھ تھام کر تیز سرگوشی کی اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔

انگشت بدنداں سلّو کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ذہن میں اس وقت ساتھی قیدی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو وہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اس پر جو الزامات ہیں، ان کے باعث وہ جیتے جی جیل کی زندگی سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اگر اتفاق سے تیس چالیس سال بعد آزاد بھی گیا تو اس حال میں نہیں ہوگا کہ زندگی سے کوئی لطف کشید کر سکے۔

اس کی ان باتوں میں حقیقت تھی اور خود وہ بھی قید کے ان چند دنوں میں اس نہج پر سوچتا رہا تھا۔ اور اگر اب قسمت سے اسے زندگی کی طرف جانے کا ایک موقع مل رہا تھا تو وہ اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے لالچ نے اس کے قدموں میں پھرتی پیدا کر دی اور وہ اپنے نجات دہندہ کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔

ان کا رخ جیل کی اس دیوار کی طرف تھا جہاں ان سے پہلے ہی کئی قیدیوں نے پہنچ کر کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ان قیدیوں کے ہاتھوں میں بیلچے، پھاوڑے اور کدالیں وغیرہ موجود تھیں جن سے پے در پے ضربیں لگا کر وہ دیوار میں شگاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قیدیوں کے پاس اتنی بروقت ان چیزوں کی موجودگی سے ظاہر تھا کہ منصوبہ بہت پہلے سے تیار تھا اور ابھی صرف موقع پیدا کیا گیا تھا۔ منصوبہ سازوں نے اتنی چالاکی سے کام لیا تھا کہ کئی سپاہیوں کی رائفلیں چھین کر انہیں بے بس کر دیا تھا اور وہ دھواں دھار فائرنگ کرتے ہوئے دیوار توڑنے والوں کو کور دے رہے تھے۔ انہیں کوئی پروا نہیں تھی کہ اس فائرنگ سے پولیس والوں کے ساتھ ان کے ساتھی قیدی بھی زد میں آ سکتے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا اور موقع کا فائدہ اٹھا کر وہ بھی فرار کی کوشش میں تھے جو اس سازش میں شامل نہیں تھے۔

''ہم ادھر سے کمند ڈال کر باہر نکلیں گے ورنہ اگر اس دیوار تک جانے کی کوشش کی تو مارے بھی جا سکتے ہیں۔ دیوار مضبوط ہے۔ جانے ٹوٹ بھی سکے یا نہیں۔ اوپر سے وہ لوگ دھواں دھار فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہمیں کوئی گولی بھی لگ سکتی ہے۔'' بھاگتے بھاگتے سلّو کے ساتھی قیدی نے اس سے کہا اور پہلو کی دیوار کی طرف رخ موڑ لیا۔ سلّو کیا کہتا، وہ تو اس کے رحم و کرم پر تھا اور آزادی کے لیے صرف اور صرف ایک چانس لے رہا تھا ورنہ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ منصوبہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ اسے تو بس اس شخص پر ہی انحصار کرنا تھا۔ دونوں بھاگتے ہوئے کئی دوسرے قیدیوں سے ٹکراتے پہلو کی دیوار کے قریب پہنچے تو اس شخص نے اپنی کمر سے اٹھا کر کمر سے بندھی ایک مضبوط رسّی پھرتی سے کھول کر ہاتھ میں پکڑی۔ رسّی کے سرے پر بڑا سا آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے رسّی گھما کر پوری قوت سے اس دیوار کی طرف اُچھالی تو آنکڑا دیوار میں پھنس گیا۔

''چلو پہلے تم اوپر چڑھو۔'' اس نے سلّو کو اشارہ کیا تو وہ پھرتی سے حرکت میں آ گیا۔ رسّی کی مدد سے بلند دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا اس کے لیے بہت معمولی سی بات تھی اور اتنی آسانی سے آزادی حاصل ہونے کے خیال نے اس کے اندر جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔ رسّی کا سرا تھام کر وہ بندر کی سی پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اسی وقت اسے رائفل چلنے کی زوردار آواز سنائی دی اور گولیوں کی آواز سے اس کے بہت قریب

گزری۔

اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دو قیدی ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موجود رائفل سے دھواں نکل رہا تھا۔ دوسرے کی پوری کوشش تھی کہ اس سے رائفل چھین لے۔ اس کشمکش کے دوران ہی وہ بلند آواز سے چیخا۔

''سلیم! واپس اُتر جاؤ۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

سلّو تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ چند فٹ کی دُوری پر آزاد فضا تھی لیکن نیچے سے کوئی اُسے پکار رہا تھا کہ اگر نیچے نہ اُترا تو مارا جائے گا۔

لمحہ بھر قبل ہی اس نے موت کو اپنے سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتے دیکھا تھا، اس لیے ٹھٹک گیا تھا۔ اُس کا یہ رکنا محض چند سیکنڈ کا ہی تھا۔ لیکن اس کی تیز نظروں نے فوراً ہی دیکھ لیا کہ اسے بھاگنے کی ترغیب دینے والے قیدی نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا ہے اور اس ریوالور کا رخ اسی کی طرف ہے۔ اب بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ نہ ہی وہ گولی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے باقی ماندہ فاصلہ طے کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہیں سے ریوالور بردار پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اسے چھلانگ لگاتا دیکھ چکا تھا، اس لیے فوراً ہی فائر داغ دیا۔ فائر کی بلند آواز کے ساتھ ہی فضا میں ایک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی اور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

⊛----✪----⊛

ہر طرف ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے باوجود سلّو نے ریوالور سے کیے گئے فائر کی آواز بہت اچھی طرح سن لی تھی۔ شاید اس لیے کہ ریوالور چلانے والے نے اس گولی پر اس کا نام لکھ کر چلایا تھا۔ مگر بالکل آخری لمحات میں ایک معجزہ سا رونما ہو گیا۔ اس کے اور گولی کے درمیان ایک انسانی جسم آتا ہوا آ کر حائل ہو گیا اور فضا اس کی دردناک چیخ سے گونج اُٹھی۔

سلّو کے قدم زمین پر ٹکے تو اُس نے اس انسانی جسم کو اپنے قدموں میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ بے حد تکلیف میں ہے اور شاید ہی بچ سکے۔

''ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ ورنہ تمہارا انجام تمہارے ساتھی سے بھی زیادہ برا ہوگا۔'' یہ آواز ابھرتی ہوئی آواز اس دوسرے قیدی کی تھی جو کچھ لمحوں قبل رائفل بردار قیدی سے برسرِ پیکار تھا مگر اب اس نے بازی کا کھیل ہی اُلٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہ صرف رائفل اپنے قبضے میں لے چکا تھا بلکہ اس کی طرف بڑھتی موت کی راہ میں اپنے مدِمقابل کو اُچھال کر حائل کر دیا تھا اور اب اس شخص کو رائفل کی زد میں لیے کھڑا تھا جو سلّو کے لیے اس کا ہمدرد اور نجات دہندہ بن کر ملا تھا۔ لیکن لمحہ بھر قبل ہی اس نجات دہندہ نے موت کے ہرکارے کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تم کون ہو؟'' ریوالور بردار نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ پریشان بھی نظر آ رہا تھا جیسے جو کچھ ہوا ہو، اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ کسی قسم کی مداخلت کی امید نہیں رکھتا تھا۔

''تمہارے لیے میں جہنم کا فرشتہ ہوں۔ اگر تم نے ریوالور پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو میں تمہیں تمہارے ساتھی کے پیچھے جہنم روانہ کر دوں گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کے لہجے میں ایسا قطعی پن تھا کہ ریوالور بردار نے مزید پس و پیش سے کام نہیں لیا اور ریوا
پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لئے۔

اس کا پھینکا ہوا ریوالور اس کے ساتھی کے قریب جا کر گرا جس کا جسم اب تڑپنا چھوڑ کر ساکت ہو چکا
اور یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

سلّو سکتہ زدہ سا کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن فی الحال تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ سب
ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس اُلجھن نے تو اسے اس ساری افراتفری اور ہنگامے سے بھی بے نیاز کر دیا تھا
اس کے اردگرد جاری تھا۔

''اب واپس چلو۔'' رائفل بردار نے حکم جاری کیا تو ہاتھ اٹھائے شخص کو ناچار پلٹنا پڑا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے سلیم!'' دوسرا حکم سلّو کے نام جاری ہوا تو اُس نے دزدیدہ نظروں
مُردہ قیدی کے قریب پڑے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔

کتنی عجیب بات تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ جیل سے نکل کر آزاد فضاؤں میں جانے کے خیال سے
اندر عجیب سی توانائی محسوس کر رہا تھا اور اب وہ شخص اسے واپس انہی اندھیروں کی طرف لے جا رہا تھا
اس کا دم گھٹتا تھا۔

لیکن کمال یہ تھا کہ اس کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے نے یقینی طور پر دو مرتبہ اسے موت
منہ میں جانے سے بچایا تھا۔ ایک بار اس وقت جب وہ رسّی سے لٹکا دیوار کی بلندی کو سر کرنے کی کوشش
تھا اور رائفل کی گولی اس سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی تھی۔ اور دوسری بار بھی اس نے عین اس
اس کی جان بچائی تھی، جب وہ ریوالور کی گولی کا نشانہ بننے والا تھا۔ اسے لگا کہ یہ بہت مشکل ہو گا کہ وہ
اپنی جان بچانے والے شخص کے ساتھ کچھ برا کر سکے۔ لیکن یہ بھی تو آسان نہیں تھا کہ وہ آزادی کے
قریب آ کر ایک بار پھر زنداں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو جائے۔

نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ریوالور اپنے قبضے میں کر کے کسی طرح رائفل بردار کو زیر کر لے اور
بار پھر اس رسّی سے لٹک کر اوپر چڑھ جائے جو اسے جیل کی چار دیواری کے دوسری طرف لے جا سکے
کے اندر چھڑی جنگ شاید اسے آزادی کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کرنے کی راہ دکھاتی۔
فیصلہ ہونے سے قبل ہی اس نے ایک ہاتھ کو آگے بڑھ کر ریوالور اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ ریوالور اُٹھانے
نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

''چلو یار!..... کیا سوچ رہے ہو؟''

سلّو کے پاس آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے
جھکائے آگے بڑھنے لگا۔ چار افراد پر مشتمل اس قافلے کا ہر شخص اردگرد پھیلی افراتفری سے مکمل بے نیاز
البتہ ان میں سے ہر ایک کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ جیل انتظامیہ اس وقت پوری طرح متحرک ہو چکی
مشکل ہی ہے کہ قیدیوں کے فرار کا منصوبہ کامیاب ہو سکے۔

قیدیوں ہی کے حلیے میں موجود ان دو افراد کے زیر ہدایت چلتے ہوئے وہ لوگ جیل کی عمارت کے
حصے میں پہنچے، وہ دفاتر پر مشتمل تھا اور وہ دونوں جس بے دھڑک انداز میں انہیں وہاں لائے تھے، اس
صاف ظاہر تھا کہ ان کے جسم پر لباس تو بے شک قیدیوں والا ہے لیکن وہ انتظامیہ سے بہت قریبی تعلق
ہیں۔ ایک باوردی اہلکار والے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہونے پر اس اندازے کی تصدیق

گئی۔ سامنے ہی کرسی پر جو شخص براجمان تھا، اس کے بیج پر ڈی آئی جی کے الفاظ کندہ تھے۔ جبکہ ایس پی اور
ای ایس پی بھی اسی کمرے میں پائے جاتے تھے اور ان کی نظریں اس اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جس پر
جیل کے مختلف حصوں کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں حضرات نے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا رکھے تھے
اور وقتاً فوقتاً احکامات جاری کر رہے تھے۔

''کامیاب واپسی مبارک ہو۔'' ڈی آئی جی نے مسکرا کر ان دونوں کا استقبال کیا۔

''آپ کو بھی مبارک ہو سر!..... آپ کا مجرم آپ کے حوالے ہے اور ہم انعام میں اپنے ساتھ اسے لے
جا رہے ہیں جس کی ہمیں ضرورت ہے۔'' رائفل بردار نے جواب دیا تو ڈی آئی جی ایک گہری سانس لے کر
رہ گیا اور کچھ افسوس سے بولا۔

''یہ شخص اصل مجرم کہاں ہے؟ اصل مجرم تو ریاض انور ہے جس نے اس جیسے غنڈے کو اپنی ضرورت کے
لیے پالا، اپنے کام نکلوائے اور اب اسے یہاں سے نکال لے جانے کے چکر میں تھا۔ اگر کرنل صاحب کی
طرف سے اس سازش کا انکشاف نہ کیا جاتا تو آج غضب ہی ہو جاتا۔ لیکن اب مجھے امید ہے کہ اس جیل
سے ایک بھی قیدی فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اور ہم اپنی صفوں میں شامل کالی بھیڑوں تک پہنچنے
میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

ڈی آئی جی کی زبان سے ریاض انور کا نام سن کر خطرناک صورت قیدی اور سلّو دونوں ہی چونک
پڑے۔ دونوں ہی کے لیے یہ نام شناسا تھا اور فرق صرف اتنا تھا کہ سلّو کو علم نہیں تھا کہ اس سب کے پیچھے
ریاض انور موجود ہے جبکہ دوسرا جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، ریاض انور کی سرپرستی میں کر رہا تھا۔

''کیوں بھئی شہباز! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟..... تمہیں جیل سے فرار کروانے کا یہ منصوبہ تمہارے
اس ریاض انور نے ہی بنایا تھا نا اور اس نے ہی تمہیں حکم دیا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرتے ہوئے
نہایت چالاکی کے ساتھ سلّو کو بھی ٹھکانے لگا دینا۔''

ڈی آئی جی نے بالکل اچانک ہی سلّو کے ساتھ موجود قیدی کی طرف رخ کرتے ہوئے اس سے کہا
تو وہ جواباً خاموش رہا۔ لیکن اس کی جھکی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا، وہ غلط
نہیں تھا۔

سلّو اس انکشاف کو سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ریاض انور لوہے اور اس
کی ڈوریاں کن ہاتھوں میں ہیں۔ اگر ریاض انور نے اس کے قتل کے احکامات جاری کیے تھے تو اس کا مطلب
تھا کہ یہ حکم وہاں سے صادر ہوا ہے جنہوں نے برسوں اسے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے ہمدرد اور
بہی خواہ ہیں۔

''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتے شہباز!..... سچ بولو، یہ ریاض انور ہی کا کارنامہ ہے نا؟'' ڈی آئی جی،
سلّو کی کیفیت سے بے خبر فرار کی کوشش کرنے والے قیدی سے مخاطب تھا۔

''اب میں کیا بولوں سر! آپ کو تو لگتا ہے سب بات کی پکی انفارمیشن ہے۔ ابھی ہم یہاں سے نکل
جانے میں کامیاب ہو جاتے تو سیدھے ریاض صاحب کی خدمت میں پہنچتے۔ ان سے اچھا خدمت کا صلہ کوئی
نہیں دیتا۔ اور ابھی تو اگر بیچ میں یہ لوگ نہیں کُودتے تو ہم انعام کے بھی حق دار ہو جاتے۔ ریاض صاحب نے
سمجھایا تھا کہ اس سالے کو اپنے ساتھ بھاگنے کے لیے تیار کرو اور جب یہ راضی ہو کر ساتھ چل پڑے تو عین
موقع پر اسے کسی پولیس والے کی رائفل سے اُڑا دینا تاکہ ہر طرف یہی خبر پھیلے کہ سلیم عرف سلّو جیل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاگنے کی کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔"

اس نے نہایت بے خوفی سے اعتراف کرتے ہوئے ایک ایسا انکشاف کیا جس نے سلو کو ہلا کر رکھ دیا اور مارے طیش کے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ممکن تھا کہ وہ طیش کے عالم میں شہباز پر ہی حملہ کر دیتا لیکن فوراً ہی ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی۔

"کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ اس شخص نے جو کچھ کیا، اس کی سزا اسے مل جائے گی۔ البتہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ کہیں اور ہوگا۔" اس کے عقب میں کھڑا ہوا کریہہ سا کہنے والا وہ شخص تھا جس نے کچھ دیر قبل اس کے ریوالور ہتھیانے کے ارادے کو ناکام بنایا تھا۔ سلو دوسری بار اس کے اپنے ارادے کی راہ میں رکاوٹ حائل کرنے پر اندر سے جھنجلا کر رہ گیا لیکن فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا، اس لیے خاموشی ہی بہتر تھی۔

"اوکے سر! ہمارا کام مکمل ہوا، ہم چلتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ اپنے معاملات خود بہتر طور پر نمٹا لیں گے۔" رائفل بردار نے ڈی آئی جی سے اجازت چاہی۔

"شیور۔" ڈی آئی جی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ "کرنل صاحب! ایک بار پھر میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ آئی جی صاحب کی غیر موجودگی میں مجھے آنے والی یہ بلا ٹل گئی۔"

وہ بہت ممنون دکھائی دے رہا تھا اور اُسے ہونا بھی چاہیے تھا کہ آئی جی صاحب ہفتے بھر کے لیے مجھے لے کر اپنا چیک اپ کروانے بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں جو کچھ بھی ہوتا، اس کی ذمے داری اس کے شانوں پر ہی آ جاتی۔

ڈی آئی جی سے الوداعی کلمات ادا کر کے وہ دونوں سلو اور شہباز کو لے کر باہر نکلے تو باہر بہت سے پولیس والے ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر شہباز کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالیں اور پھر وہ تین چار افراد کے ٹھڈوں اور لاتوں کی برسات میں وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ ان تینوں کے ساتھ صرف دو پولیس والے باقی رہ گئے تھے۔

"اسے بھی ہتھکڑی لگانی ہے سر؟" ایک پولیس والے نے سلو کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، اسے ہم اپنا مہمان بنا کر لے جا رہے ہیں۔ اور مہمانوں کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی۔" رائفل بردار نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر! جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کے لیے گاڑی تیار ہے۔" اُس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ پھر ان تینوں کو اپنی راہنمائی میں لے کر آگے بڑھا۔

سلو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ البتہ اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو سے اس نے یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ اب اس کا واسطہ فوج سے پڑنے والا ہے لیکن وہ لوگ اس پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے تھے؟ یہ اپنی جگہ ایک اُلجھن تھی۔

جدید ماڈل کی اس گاڑی کے شیشے بلٹ پروف اور مینٹڈ تھے چنانچہ باہر سے کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ گاڑی میں تین ایسے افراد سوار ہیں جن کے جسموں پر قیدیوں والا لباس ہے۔

گاڑی انہیں لے کر وہاں سے روانہ ہوئی تو جیل میں بچی کھچی بھگدڑ میں خاطر خواہ کمی ہو چکی تھی اور گنتی کے جیل حکام حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

سلو نے گیٹ سے باہر گاڑی نکلنے پر حیرت زدہ نظروں سے ان راستوں پر نظر دوڑائی جن پر لوگ آزادانہ چلتے پھرتے تھے لیکن وہ اس آزادی سے محروم تھا اور کچھ دیر قبل دو بار مرنے سے بچنے کے بعد ایک بند گاڑی میں، انجان لوگوں کے ساتھ نہ جانے کس انجان منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

"نئی زندگی مبارک ہو۔" ہسپتال کے خنک اور اُجلے ماحول میں آنکھ کھلنے پر مشابرم خان نے میجر اسد بارکو اپنے سامنے پایا۔ اس کے چہرے پر بڑی جاندار اور پُرخلوص مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اپنائیت کا احساس تھا۔

"شکریہ میجر صاحب!" مشابرم خان جواب میں محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟" میجر اسفند کرسی سرکا کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بہت زیادہ نقاہت محسوس کر رہا تھا لیکن اظہار ضروری نہیں سمجھا۔

"تم قابلِ فخر ہو مشابرم خان! تم نے جس طرح اپنی جان کی بازی لگا کر اس بھیڑیے کو ہم تک پہنچایا اس کے لیے ہم سب تمہارے احسان مند ہیں۔" میجر کے لہجے میں عقیدت تھی۔

"میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے اور اگر فرض کی ادائیگی میں میری جان بھی چلی جاتی تو مجھے غم نہیں تھا۔ بے کار جینے سے کچھ کر کے مر جانا بہتر ہوتا ہے۔" اس نے مضبوط لہجے میں پہلا طویل جملہ بولا۔

"جان دینا اور لینا ہمارے ہاں اب کوئی بڑی بات نہیں رہی ہے۔ لوگ معمولی رقم سے لے کر مذہب، ملک، زبان، غیرت اور جانے کن کن بنیادوں پر اس مشکل مرحلے سے گزر جاتے ہیں۔ لیکن ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جنہیں اس بات کا ادراک ہو کہ وہ جان جیسی قیمتی شے کی بازی ناحق نہیں لگا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم اس حال کو کس وجہ سے پہنچے تھے؟ تمہیں اس خنجر سے زخم لگا تھا جس کی زد میں لے کر تم بشیر اکبر کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر ہم تک لائے تھے۔ وہ خنجر زہر آلود تھا اور اس کا زہر تمہارے سارے جسم میں پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو تمہاری جان بچانے کے لیے سر توڑ کوششیں کرنی پڑی ہیں، تب جا کر تم کو آنکھیں کھولی ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ خنجر زہر آلود ہے۔ اسے میں نے بشیر اکبر کے ملازم سے چھینا تھا اور اس سے آپ کے دوران ہی مجھے زخم آیا تھا۔"

اسے سمجھ آنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں وہ خنجر دیکھ کر بشیر اکبر اتنا خوف زدہ کیوں ہو گیا تھا کہ بے چون و چرا اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا چلا گیا۔ خود اپنی کیفیت بھی اسے سمجھ آنے لگی تھی۔ وہ جسم میں سرایت کرتے زہر کا اثر تھا کہ وہ نڈھال سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت تو اس نے اپنی کمزوری کے بارے میں یہی گمان کیا تھا کہ اس وطن بدر جانے کی وجہ سے ایسی کیفیت ہو رہی ہے لیکن اب حقیقت کھلی تو دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے اُس پر احسان کیا اور قوتِ ارادی کو اتنی مضبوطی بخشی کہ وہ حالات سے بخیر و خوبی نمٹنے میں کامیاب ہو گیا۔

"ہم بھی خنجر کے بارے میں نہیں جانتے تھے لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے تمہیں دیکھتے ہی کیفیت سے اندازہ لگا لیا کہ تم پر زہر کا اثر ہوا ہے۔ بعد میں بشیر اکبر سے تفتیش کی تو اس نے خنجر کی حقیقت بتائی۔ اس قسم کے خنجر اس کے چند مخصوص محافظوں وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حلف اٹھا رکھا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ بشیر اکبر کے حکم پر اور اس کی حفاظت کی خاطر وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے لوگوں کو وہ اپنے خاص کاموں کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ ان لوگوں کی اُس نے اس طرح برین واش رکھی تھی کہ اگر ان کے لیے اپنے مشن سے صحیح سلامت واپس لوٹنا ممکن نہ ہو اور پکڑے جانے کا خطرہ جائے تو وہ بلا جھجک خودسوزی کر ڈالتے تھے۔ اسی لیے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ آج کل لوگوں کے لیے لینا اور دینا دونوں ہی بڑی بات نہیں ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں اللہ کا شکرگزار ہوں کہ میرا شمار ان خوش قسمتوں میں ہوتا کمزوری اور خون کی کمی سے زرد پڑتے مشابرم خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہوگئی میجر اسفند کے ہونٹوں پر اُبھرنے والی مسکراہٹ بڑی جان دار اور بھرپور تھی۔

"تم خوش قسمت بھی ہو اور دلیر بھی۔ ورنہ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی کہ بشیر اکبر کو اس کی کچھار سے نکال لایا جائے کہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔" میجر نے ایک بار پھر کھل کر اسے سراہا۔

"لیکن بعد میں تو ہنگامہ کھڑا ہوا ہوگا۔ اس کے محافظوں کے انجام اور میرے فرار نے بہت سے اٹھائے ہوں گے۔ کیا اس صورتِ حال پر اس کے عقیدت مند مشتعل نہیں ہوئے؟" وہ جسمانی طور پر تھا لیکن دماغ نے تیزی سے کام شروع کر دیا تھا اس لیے اس قابل تھا کہ سوالات اٹھا سکے۔

"اس سلسلے میں ہماری بشیر اکبر کے نائب سے ڈیل ہوگئی ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو یقین دلائے گا کہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔ بشیر کے بعد اسے وہاں اتنا اثر و رسوخ حاصل ہے کہ اگر کچھ لوگوں کو شک ہوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اگر کسی نے اس کی مخالفت کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کا نام و نشان مٹا دے گا۔"

"لیکن وہ اس بات پر راضی کیسے ہوا؟" مشابرم خان کو حیرت ہوئی۔

"اقتدار کے لالچ میں۔" میجر مسکرایا۔ "تاریخ گواہ ہے کہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لوگوں نے اپنے خون کے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ ایسے میں اگر بشیر اکبر کے نائب نے ہمارے ساز باز کر لی تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

"میں پھر بھی حیران ہوں کہ یہ ڈیل ہوئی کیسے؟" مشابرم خان کی اُلجھن و حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔

"اس کے لیے مجھے تمہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ہوگا۔ تم نے جو عرصہ ہسپتال میں زندگی اور کی جنگ کرتے ہوئے گزارا ہے، اس عرصے میں ہم نے بشیر کے سارے کس بل نکال کر اس سے نہ بہت سی معلومات حاصل کی ہیں بلکہ معاملات کو بھی تیزی سے نمٹایا ہے۔ بشیر نے اعتراف کیا ہے کہ یہودی ہے اور بچپن سے اسے ایسی تربیت دی گئی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہر بات رکھنے کے ساتھ ساتھ ان سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ نوعمری میں ہی اپنے بزرگوں اور مذہبی پیشوا سے اس بات کا عہد کر چکا تھا کہ عظیم اسرائیل کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دے گا اور یہود کے سب سے دشمن مسلمین کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہر وہ کام کرے گا جو اس کے لیے ممکن ہو۔ اپنی مخصوص تر ارادوں کے ساتھ اس نے بہت نوعمری میں یہاں ڈیرا جما لیا اور اپنی چالاکی اور ذہانت سے کام لے کر آہستہ ایسا مقام حاصل کر لیا کہ بے شمار لوگ اس کے سحر میں گرفتار ہوگئے۔

وہ ان سحر زدہ لوگوں کو اسلام کے نام پر ایسی تعلیمات دیتا رہا جن سے اسلام کا دور تک تعلق نہیں اس نے اتنی ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیا کہ معصوم لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ کوئی ان واشنگ کر کے انہیں اسلام کی حقیقی روح سے دور کرتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں سے مخالفت کی آواز اُٹھی بھی

اسے مشتعل قرار دے کر اس کے خلاف نام نہاد جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ غرضیکہ بشیر ایک بڑے طبقے کو اپنے پر لانے میں کامیاب ہو کر ایک طرف تو اسلام دشمنی نبھاتا رہا اور دوسری طرف اس نے پاکستان میں کھلی کھلی کرنے کے لیے "را" والوں سے بھی ساز باز کر لی اور نہایت کامیابی سے ڈبل ایجنٹ کے ساتھ ساتھ مذہبی راہنما کا رول بھی ادا کرتا رہا۔

یہاں گزرنے والے طویل عرصے میں اس نے پاکستان اور پاکستانیوں کا بڑا نقصان کیا۔ پہاڑوں میں گروں کی تربیت کے لیے جو کیمپ قائم کیا گیا تھا، اس کیمپ کے قیام میں بھی بشیر نے خاصی مدد کی تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم اس کیمپ کی تباہی کے براہِ راست ذمے دار ہونے کے باوجود کسی کی نظر میں آئے تھے ورنہ شاید بلتستان میں قدم رکھتے ہی دھر لیے جاتے اور بشیر پر قابو پانا تو دور کی بات، خود اپنا بھی نہ کر پاتے۔"

میجر اسفند کی بات نے اسے اپنا بلتستان کا پچھلا دورہ یاد دلایا۔ زندگی کا وہ حصہ اس کے دل پر ایسے زخم لگا گیا جو شاید کبھی نہ بھر پاتے۔ اس نے پناہ کی تلاش میں بھٹکتی ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن قسمت ماہ بانو وہاں بھی محفوظ نہ رہ سکی اور اسے اغوا ہونے سے بچانے کے لیے اس کے بھائی اکرم خان نے جان قربان کر دی۔

جوان بیٹے کی موت نے ماں کو غم سے ایسا نڈھال کیا کہ وہ ہوش و حواس کھو کر کومے میں چلی گئی اور اپنی جان کی بازی بھی ہار گئی۔ غصے اور غم میں مبتلا مشابرم خان نے اس وقت ایک عالمِ جنون میں پہاڑوں میں واقع اس تربیتی کیمپ تک رسائی حاصل کی تھی اور اتفاقاً اور خوش قسمتی کے باعث تن تنہا کیمپ کی تباہی کا سبب بن گیا تھا۔ آج اُسے بتایا جا رہا تھا کہ اس کیمپ کو قائم کرنے میں مدد دینے والوں میں ایک بشیر بھی تھا اور اسے خوشی تھی کہ اپنی جان کی بازی لگا کر وہ برسوں سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر گھولنے اس شاطر سانپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"بشیر جو کچھ کر رہا تھا، وہ مکمل طور پر ون مین شو تھا۔ اس نے اپنے قرب و جوار میں موجود کسی شخص، یہاں تک کہ اپنے نائب کو بھی اپنی حقیقت کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ یہاں جو لوگ اس کے معتمد تھے، وہ بھی اس حد تک اسے جانتے تھے کہ بشیر اکبر ایک ایسا فراڈیا ہے جو مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا رہا اور اپنے جھوٹے زہد و تقویٰ کا جال بچھا کر لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما کر خوب عیاشی کر رہا تھا اور دوسری طرف اعلیٰ طبقے اور حکومتی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر رہا تھا اس کے کردار سے واقف ہونے کے باوجود اس کے معتمدین و مقربین کو اس پر اس لیے کوئی شک نہیں تھا کہ وہ انہیں بھی خوب عیاشی کرواتا تھا اور دل کھول کر نوازتا تھا۔ اس بات کا تو کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اسرائیلی و بھارتی ایجنٹ ہے۔

حقیقتاً وہ اتنا شاطر تھا کہ لوگوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنی اُنگلیوں کے اشاروں پر نچانے کے باوجود انہیں اصل عزائم اور مقاصد کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے اتنے بہت سے سال اسرائیل خدمت میں صرف کر کے اپنے آقاؤں کو بے تحاشا خوش کر رکھا تھا، چنانچہ ان کی طرف سے بھی اسے خوب نوازا جاتا تھا۔ اسرائیل میں اس کے خاندان کو بھی خصوصی رعایات و مراعات حاصل تھیں۔ اس کے اہلِ خانہ کو اصلی پاسپورٹ اور دستاویز کے ذریعے پاکستان آ کر اس سے ملاقات کر چکے تھے جبکہ وہ صرف دو بار اسرائیل گیا تھا۔ ایک بار اپنی شادی کے لیے اور دوسری بار اپنے باپ کی آخری رسومات میں شرکت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لئے۔ ظاہر ہے دونوں جانب سے ہونے والی یہ آمد و رفت براہِ راست اسرائیل اور پاکستان کے درمیان
تھی بلکہ وہ لوگ ہمیشہ کسی دوسرے ملک کے شہری کی حیثیت سے سفر کرتے تھے۔ بشیر کی بیوی نے اس
اہلِ خانہ میں سے سب سے زیادہ پاکستان کا سفر کیا اور ہمیشہ کسی نہ کسی مذہبی جماعت کے ساتھ باپردہ
مسلمان عورت کے روپ میں یہاں آئی۔

یہاں اس نے طویل وقفوں کے لیے قیام کیا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں تین اولادیں بھی
ہوئیں۔ ان بچوں کو بھی بشیر اکبر کی طرح ہی اسرائیل میں خصوصی تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے۔ بشیر کی
بھی اسی کی طرح کٹر یہودی ہے اور اسے شوہر کی بہت کم رفاقت میسر آنے کے باوجود اس بات پر فخر
اس کا شوہر اپنے مذہب اور وطن کی خاطر بے شمار قربانیاں دے رہا ہے۔ ہم نے نہ صرف یہ ساری معلو
بشیر سے اُگلوائیں بلکہ اس کی ویڈیو بھی تیار کی۔ اس ویڈیو نے ہمارا کام بہت آسان کر دیا اور ہم اس
نائب کو اپنا ہم نوا اور رازدار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ تم بے ہوش تھے ورنہ بہت سارے حالات
میرے بتائے بغیر بھی واقف ہو جاتے۔ بشیر کے غیاب پر بہت سی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ کسی
تھا کہ جیسے وہ ماضی میں پہلے بھی دو بار غائب ہو کر واپس آ گیا تھا، ویسا ہی اس بار بھی ہو گا۔ کچھ لوگ
کے حالات سے واقف تھے، اسے بشیر کا اغوا قرار دے رہے تھے اور اس اغوا کا ذمے دار تمہیں ہی ٹھہرا
تھا۔ کیونکہ تم پراسرار طور پر ہسپتال سے غائب تھے۔ البتہ اس کے نائب نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ اس
کو عوامی حلقوں تک نہیں جانے دیا اور کسی بڑے ہنگامے سے بچنے کے لیے خود ہی انتظامیہ سے مذاکرات
مصروف تھا۔

شروع میں اس نے بہت شور مچا رکھا تھا کہ کسی بھی طرح بشیر کو بازیاب کروایا جائے ورنہ وہ اپنے
کے ساتھ مل کر پورے علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ لیکن آہستہ آہستہ ہم نے محسوس کر لیا کہ وہ
کا اتنا وفادار نہیں جتنا ظاہر کر رہا ہے بلکہ ایک طرح سے اس کی خواہش ہے کہ بشیر غائب ہی رہے تو بہتر
کیونکہ اس طرح تمام اختیارات اسے حاصل ہو جاتے۔ ہم نے اس کے دل کے اس چور کا فائدہ اٹھا
ہوئے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے جب بشیر کی حقیقت کا علم ہوا تو سناٹے میں رہ گیا اور
اعتراف کیا کہ اس کے ساتھ مل کر عوام کو دھوکا دینے کے باوجود وہ قطعی واقف نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے
کا آلۂ کار بنا ہوا ہے جو بیک وقت اسرائیل اور بھارت کا ایجنٹ ہے۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس معا
اتنی خوبی سے سنبھال لے گا کہ کسی کو شک بھی ہوا تو اظہار نہیں کر سکے گا۔ ہم نے کچھ شرائط اور ضوا
ساتھ اس سے معاملات طے کر لئے۔ اب وہ بشیر کی جگہ سنبھالے گا اور عبادت گاہ کے تمام معاملات اس
ہاتھ میں رہیں گے۔''

میجر اسفند نے اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ایک بار
تشویش کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

''یہودی بڑی منصوبہ ساز قوم ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انہوں نے یہاں اپنا اتنا بڑا سیٹ اپ قائم
اسے اس حال میں چھوڑ دیں کہ بشیر کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے۔ اصولاً تو یہاں اس کے بعد اس کی
سنبھالنے کے لیے کسی اور کو موجود ہونا چاہئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا نائب ہی اس کا جانشین ہو اور
سے معاہدہ کر کے اسرائیل سے وفاداری نبھا رہا ہے؟''

''تمہاری تشویش درست ہے۔ لیکن غلطی کی گنجائش ہر جگہ ہوتی ہے۔ بشیر کا نائب بھی تیار کیا جا

ان یہاں نہیں، تل ابیب میں۔ بشیر کی خواہش تھی کہ اس کے بعد اس کی جگہ اس کا بیٹا لے۔ اگلے سال وہ
بیٹے بلکہ پوری فیملی کو یہاں بلانے والا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسے فلسطینی خاندان کی صورت میں یہاں آ کر
ہوتے جس کا سربراہ اسرائیلی جارحیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس طرح بشیر کو اپنے خاندان سے قریب رہنے کا
بھی مل جاتا اور وہ اپنے بیٹے کو اپنی جگہ دینے کی راہ بھی ہموار کر لیتا۔ لیکن یہ ہماری خوش قسمتی رہی کہ یہ
معاملہ آنے سے قبل ہی اس کی حقیقت ہمارے سامنے آ گئی اور اب وہ اپنے انجام تک پہنچنے کے لیے ہماری
تحویل میں ہے۔''

''اور اگر اسرائیل نے اس کے نائب کو لالچ اور دباؤ کے ذریعے اپنے دام میں پھنسا لیا تو؟'' اس کے
ایک اور اندیشہ تھا۔ میجر اسفند ہنس پڑا۔

''تم تو حد سے زیادہ محتاط اور دور اندیش آدمی ہو یار!..... لیکن فکر نہ کرو، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ اب چونکہ یہ
معاملہ ہمارے سامنے آ گیا ہے اس لیے ہم کڑی نگاہ رکھیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ اب عبادت گاہ اور اس سے
متعلق ہر اہم شخص چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں رہے گا۔'' اس نے مشابرم خان کو تسلی دی۔ ''اب اگر تمہاری
کل ہو گئی ہو تو مجھے اجازت دو۔ کوئی اور بھی ہے جو میرے بعد تم سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔''

''بہت بہت شکریہ میجر صاحب! میں نے واقعی آپ کا بہت وقت لے لیا۔'' اس بار مشابرم خان جھینپ
گیا۔

''اٹس او کے مین! تم نے جو کچھ کیا، وہ اتنا قابلِ قدر ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں کسی
فوجی اعزاز سے نوازنے کی سفارش کرتا۔ لیکن یہ بھی ہماری قسمت کا کھیل ہے کہ قوم و وطن کی خاطر
بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والوں کی ایک بڑی تعداد کو منظر پر نہیں لایا جا سکتا۔'' میجر اسفند نے ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ اس کے شانے پر تھپکی دی اور باہر نکل گئے۔

ان کے باہر جانے کے لمحہ بھر بعد ہی دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس کھلے دروازے سے گل مینا بہار کے
جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مشابرم خان کے ہونٹوں پر خود بخود ہی مسکراہٹ پھیل گئی جبکہ
گل مینا اس کے قریب آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''اِدھر آؤ میرے پاس۔ رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے محبت سے گل مینا کو پکارا تو وہ اس کے کچھ اور
قریب چلی آئی لیکن ساتھ ہی آنسوؤں کی روانی میں بھی مزید اضافہ ہو گیا۔ مشابرم خان نے نرمی سے اس کا
ہاتھ تھام لیا۔

''اس بار تو میں تمہیں بتا کر گیا تھا۔ پھر کیوں رو رہی ہو؟ کیا میرے بتا کر جانے کے باوجود تمہیں یہ ڈر
تھا کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں؟'' اس نے پوچھا تو گل مینا شدت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔'' اس کے تسلسل سے
آنسوؤں کو روکنے کے لیے اس نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا جو کارگر رہا اور گل مینا نے بڑی جدوجہد
اپنے جذبات کو قابو میں کر کے آنسوؤں کو مزید اُمڈنے سے روک لیا۔ آنسو پُر کے تو وہ زبان سے کچھ کہنے
لائق ہوئی۔

''آپ مجھے یہ تو بتا کر نہیں گئے تھے کہ اس حال میں واپس آئیں گے۔'' رُندھی ہوئی آواز میں اس کے
پر شکوہ مچلا جسے سن کر مشابرم خان کے ہونٹوں سے ایک گہرا سانس خارج ہوا اور اسے سمجھ میں آنے لگا
مینا کیوں رو رہی ہے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ اور ہراساں ہو گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''دیکھو گل! یہ سب میری زندگی کا حصہ ہے۔ میں لوگوں کو اس حال تک پہنچاتا بھی ہوں اور خود بھی اس حال کو پہنچ جاتا ہوں۔ تم یوں سمجھ لو کہ میں جس کھیل میں ملوث ہوں، اس میں انسان کو اپنی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے اور جان کی بازی لگانا ہمارے لیے کوئی انوکھی بات تو نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کے کتنے مرد ہیں، دیامیر (نانگا پربت) سر کرنے والوں کے جنون کا ساتھ دینے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس جنون میں میرے باپ، بھائیوں سمیت ہمارے کتنے پیارے اپنی جان گنوا چکے ہیں۔ ماں نے مجھے ان خطروں سے بچانے کے لیے ہی یہاں سے دور بھیج دیا تھا لیکن میری رگوں میں جو خون ہے، وہ کیسے مجھے سکون سے بیٹھنے دیتا۔ میں بے جان پہاڑوں سے گریز کر کے نکلا تو ایسے انسانوں سے ٹکرانے پر مجبور ہو گیا جو سینے میں دل کی جگہ پتھر لے کر گھومتے ہیں اور انسان ہونے کے باوجود انسانیت کی تذلیل کرتے ہیں۔ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں اور میری کوئی حیثیت بھی نہیں، اس کے باوجود میرا خود سے یہ عہد ہے کہ زندگی میں جب جب ان انسان دشمنوں سے سامنا ہوگا، میں پیٹھ دکھا کر بھاگنے کے بجائے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میں کچھ غلط نہیں کر رہا ہوں بلکہ جب میں مروں گا تو میرے پاس یہ فخر ہوگا کہ میں نے اپنے وطن اور انسانیت کی بہبود کے لیے اپنی جان دی ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم مجھ جیسے سرپھرے کا ساتھ دینا چاہتی ہو یا نہیں۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میرے ساتھ رہنے کی صورت میں تمہیں بار بار ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اور آج کے بعد میں یہ قطعی پسند نہیں کروں گا کہ کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھوں۔ عورت کے آنسو مرد کو کمزور کر دیتے ہیں اور میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔''

اس نے گفتگو کا آغاز تو بہت نرمی سے کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا لہجہ خود بخود ہی سخت ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ہر لفظ کے ساتھ گل مینا اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ مشابرم خان خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں کی سطح بالکل خشک ہو چکی تھی اور گلے میں پھنسا آنسوؤں کا پھندا بھی کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت صاف اور واضح تھا۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گی خان! اور یہ میرا وعدہ ہے کہ آج کے بعد تم کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھو گے۔ کیونکہ میری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمہاری رگوں میں ہے۔ وقت تم پر ثابت کر دے گا کہ صرف پہاڑوں کے بیٹوں کے حوصلے ہی بلند نہیں ہوتے بلکہ بیٹیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں۔'' وہ اپنے عزم اور حوصلے سے بول رہی تھی کہ مشابرم خان بھی چند لمحوں کے لیے اس کا منہ تکتا رہ گیا اور اس کے دل میں خیال آیا کہ وطن عزیز کے خلاف سازش کرنے والے یہود و ہنود اگر اس کم عمر لیکن بلند ہمت عورت کو دیکھ لیں تو جان لیں گے کہ بشیر اکبر جیسے پٹھوؤں کے سہارے وہ سازشوں کے کتنے بھی جال بچھائیں، کامیاب بہرحال نہیں ہو سکیں گے کہ بشیر اکبر جیسے تو برسوں کی عیش و عشرت کی زندگی کے نتیجے میں اتنے کمزور اور بودے ہو چکے ہوتے ہیں کہ چار ہاتھ کھا کر اگلا پچھلا سب اُگل ڈالتے ہیں اور یہاں ایک عورت کا عزم بھی ایسی مضبوط چٹان کے مانند تھا کہ اس سے ٹکرانے والے لہولہو ہو جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

''مجھے تم پر فخر ہے گل مینا! اللہ کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے تم جیسی باہمت عورت کا ساتھ دیا۔ اپنے اس وعدے کو زندگی بھر یاد رکھنا۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی کسی دوسری عورت کو تمہاری جگہ نہیں دوں گا۔''

اس نے گل مینا کے ہاتھ کو زور سے دبا کر کھینچا لیکن پھر خود ہی کراہ اُٹھا کہ زخم زخم وجود کسی بے احتیاطی

کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر گل مینا کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی اور چہرے پر وہ سارے رنگ سمٹے ہوئے تھے جو سورج نکلتے سمے دیامیر کی چوٹیوں پر بکھرتے ہیں۔

⊛----✪----⊛

''تم کب تک میرے سر پر مسلط رہو گے؟'' ریاض انور نے اپنے ساتھ چلتے نوجوان سے برہم لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ چلنے والا یہ نوجوان سی ایف پی کا اہلکار تھا جو منصوبے کے مطابق ریاض انور کے ساتھ اس لانچ میں اس طرح نازل ہوا تھا کہ ریاض انور کو سب پر یہ ظاہر کرنا پڑا تھا کہ اسے ویران سڑک پر بے ہوش حالت میں پا کر اس نوجوان نے اس کی مدد کی اور وہیں مرنے کے لیے پڑا چھوڑنے کے بجائے ہوش میں لا کر یہاں تک لایا۔ راستے میں نوجوان سے گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوا کہ وہ پڑھا لکھا لیکن بے روزگار ہے تو اس کا احسان چکانے کے لیے فوراً اپنے مشیر کی حیثیت سے اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ جسے ظاہر ہے نوجوان نے قبول کر لیا اور اب وہ مشیر ہر وقت اس کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔

ریاض کی معلومات کے مطابق اس کا نام سہیل تھا اور وہ دل میں اُس سے ازحد چڑنے کے باوجود سب پر یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا کہ اپنے کیے گئے احسان کے بدلے وہ نوجوان اسے دل و جان سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ سہیل مستقل اس کے قریب دیکھا جا رہا تھا۔ کسی شدید ضرورت کے تحت چند منٹوں کے لیے وہ اسے تنہا چھوڑتا بھی تھا تو ایسے وقت میں بھی وہ مکمل آزاد نہیں ہوتا تھا بلکہ جانتا تھا کہ ایک ڈیوائس کے ذریعے اس کی حرکات و سکنات کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے حالات کے بارے میں آگاہ کر پاتا۔

ایسے بھی سی ایف پی والوں نے اس کے ہاتھ پیر مکمل طور پر باندھ دیئے تھے۔ ایک طرف اسے اپنی گل مینا کی طرف سے خطرات لاحق تھے تو دوسری طرف اپنے اس اعترافی بیان کے سامنے آنے کا خدشہ تھا جو اس نے سی ایف پی کی تحویل میں رہ کر دیا تھا۔

یہ سب خطرات نہ بھی ہوتے تو وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا؟ اس کے خیال کے مطابق خفیہ ملکی ادارے اس علاقوں میں آنے کے بعد اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی۔ فی الحال وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس لیے مجبور تھا کہ اس سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر بے چون و چرا عمل کرتا جائے۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آدمیوں کو جیل سے فرار اور سلو کے قتل کے احکامات جاری کر دیئے تھے لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کرنے سے اس کے سر پر سوار لوگوں کو کیا حاصل ہوگا؟ اس کے لوگوں کی ہدایت پر اس نے اپنی ساری سرگرمیاں موقوف کر دی تھیں اور صرف ایک بار میڈیا کو اپنے اغوا اور تاوان کی کہانی سنانے کے بعد شدید اعصابی دباؤ میں ہونے کا بہانہ کر کے زیادہ تر وقت اپنی خواب گاہ میں گزار رہا تھا۔

سہیل اُس کا چہیتا بنا یہاں بھی اُس کے آس پاس موجود رہتا تھا۔ مزاج پرسی کے لیے آنے والے ملاقاتیوں اور فون کالز کے سلسلے میں بھی وہ ہی فیصلہ کرتا تھا کہ کس کو ریاض انور تک رسائی حاصل کرنے دی جائے اور کس کو نہیں۔

اس جکڑ بندی نے ریاض انور کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی اپنے قریب نہیں رہنے دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خواب گاہ میں آنے پر چند منٹوں میں ہی واپس بھیج دیتا تھا۔ ا
کی بیوی بے چاری کو عادت تھی کئی کئی راتیں شوہر کے بغیر گزارنے کی۔ وہ ایسا مصروف رہتا تھا کہ اسے مشکل
سے ہی اپنی خواب گاہ کا رخ کرنے کی مہلت ملتی تھی لیکن اس بار عجب تماشا ہوا تھا کہ وہ خود تو مستقل خواب
میں مقیم تھا لیکن بیوی کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وسیع و عریض کوٹھی میں کمروں کی کوئی کمی
تھی۔ بیوی کسی بھی دوسرے پُرتعیش کمرے میں مزے سے سو سکتی تھی لیکن اندر ہی اندر تلملائی ہوئی تھی کہ ا
طرح خواب گاہ سے باہر کیے جانے پر اس نے ملازمین کے سامنے سبکی محسوس کی تھی۔

ریاض انور کو اُس کے احساسات کی فی الحال کوئی فکر نہیں تھی بلکہ وہ تو اس چکر میں تھا کہ کسی طرح سر
مسلط مصیبت سے جان چھڑائی جائے۔ طبیعت بہت اُلجھی تو اُس نے سہیل سے لان میں چہل قدمی
فرمائش کر دی جسے اس نے قطعی رد نہیں کیا اور اب وہ دونوں کچھ اس طرح لان میں ٹہل رہے تھے
دونوں کے درمیان بڑی خوشگوار گفت و شنید ہو رہی ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریاض انور اُس پر اپنی جھلا
نکال رہا تھا۔

''آپ تو بڑے کمزور اعصاب کے نکلے ریاض صاحب! میرا خیال تھا کہ ''را'' والوں نے آپ
انتخاب کیا ہے تو کچھ دیکھ بھال کر ہی کیا ہوگا۔ لیکن آپ تو ذرا سی مشکل پڑنے پر ہی ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔'' ا
نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ ریاض انور کو جواب دیا۔

''بار بار مجھے ''را'' کا طعنہ مت دیا کرو۔ تم ان کا ذکر کیے بغیر بھی بات کر سکتے ہو۔'' وہ بگڑا۔

''عجیب آدمی ہو۔ دوستوں کا ذکر سن کر چڑتے ہو یا پھر اس لیے ناراض ہو کہ تمہارے بہ خیر و عا
واپس آنے پر ان میں سے کسی نے اب تک تمہیں ایک فون تک نہیں کیا۔'' اس نے مزید اسے سلگایا۔

''وہ میرے باپ کے سگے نہیں ہیں جو خیر خیریت پوچھنے کے لیے مجھے فون کریں۔ انہیں کام ہوتا
رابطہ کرتے ہیں۔'' ریاض نے منہ پھلا کر جواب دیا۔

''تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہاری ''را'' والوں کے کسی ٹھکانے سے واقفیت نہیں ہے
میں تمہارے ذریعے ان تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''یہ بات میں پہلے ہی تمہارے بھائی بندوں کو سمجھا چکا ہوں۔ اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو وہ دیگر باتوں
طرح یہ بات بھی مجھ سے اُگلوا لیتے۔''

اس نے منہ بنا کر جواب دیا جس پر سہیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اچھی طرح ریاض ا
کی وہ حالت یاد تھی جب وہ سی ایف پی کے جوانوں کے ہاتھوں بھیگی بلی بنا سب کچھ فرفر بتا رہا تھا۔ مگ
خیر وہ اب بھی تھا کہ اپنے گھر میں ہوتے ہوئے اپنی مرضی کرنے سے قاصر تھا لیکن یہاں پھر بھی شاید
امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لے گا اس لیے پہلے کے مقابلے میں کم دباؤ میں
ہو رہا تھا۔

''میں اپنی بیوی اور بیٹی کو یہاں سے کسی دوسری جگہ شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' کچھ دیر خاموشی سے
رہنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''کر دینا۔ کل تک رُک جاؤ۔'' خلافِ توقع سہیل نے کوئی اعتراض کرنے کے بجائے فوراً آمادگی
کر دی۔ ریاض کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ اتنی آسانی سے راضی ہو گیا، ساتھ ہی اسے خوشی بھی
بیوی اور بیٹی کو یہاں سے محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کے بعد اس کے لیے تنہا یہاں سے بھاگ نکلنا

آسان ہوتا۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر اپنی فیملی سمیت بیرونِ
ملک منتقل ہو جاتا۔ روپے پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو دنیا کے کسی بھی
حصے میں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا۔

یہ بات تو اسے ویسے بھی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ پاکستان میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی
اور وہ یہاں رہ کر مزید لوٹ مار نہیں کر سکتا۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ آٹھ دس سال کے لیے منظر سے ہٹ جاتا
کسی مضبوط کہانی کے ساتھ واپس آتا تو اپنے خلاف موجود ثبوتوں کو رد کر کے دوبارہ سیاست کے میدان
میں اپنے قدم جما سکتا تھا۔

''میرے خیال میں پاکستان کو چھوڑ کر کہیں اور رہنے کے لیے کون سا ملک سب سے بہتر ہے؟''
سہیل نے اچانک یہ سوال کر کے اسے حواس باختہ کر دیا اور اسے یوں لگا کہ وہ اس کی حرکات و سکنات کے
ساتھ سوچوں پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔

''تم مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دنیا کے اتنے ملک دیکھ چکے ہو۔ اس لیے میں نے پوچھ لیا۔'' اس کی
بوکھلاہٹ سے بے نیاز سہیل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کا انداز واقعی ایسا تھا جیسے بنا کسی سبب
محض تذکرہ یہ سوال کر بیٹھا ہو۔

ریاض انور کچھ دیر تو اسے مشکوک نظروں سے گھورتا رہا، پھر سر جھٹک کر بولا۔

''اگر آدمی کے پاس دولت ہو تو پاکستان سمیت تمام پسماندہ ممالک کو چھوڑ کر دنیا میں کہیں بھی مزے
سے رہا جا سکتا ہے۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا تنفر تھا جسے سہیل نے شدت سے
محسوس کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں تو تم جیسے لوگ صرف دولت لوٹنے کے لیے رہتے ہیں۔'' اس نے بھی
ریاض انور کے لیے اپنے دل میں موجود نفرت کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر کلائی پلٹ کر رسٹ واچ پر ٹائم
دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اب تک کھیل شروع ہو چکا ہوگا۔ آؤ تمہارے بیڈ روم میں چل کر ٹی وی پر
دیکھتے ہیں کہ کیا خبریں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریاض انور کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے لان سے واپسی
کے لیے پلٹ گئے۔

''اپنے پی اے کو بتا دو کہ آدھ گھنٹے بعد میں اپنے گھر والوں سے ملنے جاؤں گا۔ میرے لیے ایک گاڑی
ارینج کی جائے۔'' اُس نے دُور کھڑے پی اے کو دیکھ کر آہستہ سے ریاض سے کہا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا،
اسے بے چارہ کچھ لاوارث سا نظر آنے لگا تھا۔ اسے پہلے کی طرح ریاض انور کے قریب رہنے کا موقع ہی
نہیں مل رہا تھا۔ وہ اسے بس چند لمحوں کے لیے بلاتا تھا اور ضروری احکامات دے کر فارغ کر دیتا تھا۔ چنانچہ
اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ریاض انور جہاں ہو، آس پاس ہی منڈلاتا رہے جیسا کہ اس وقت وہ لان کے
گیٹ میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے کہہ رہا ہو..... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔

سہیل نے آدھ گھنٹے بعد یہاں سے اپنی روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تو جہاں ریاض انور کو جھٹکا لگا اور اس نے
وجود میں خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی، وہیں پی اے بھی صاحب کی زبانی یہ سن کر کھِل اُٹھا کہ سہیل
گھر جا رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنے مالک کو یہ احساس دلا سکتا تھا کہ وہ ایک اجنبی نوجوان کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو بے شک اس کا محسن ہے، ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر اچھا نہیں کر رہا ہے۔ ایسا پچھلے وقتوں میں تھا کہ بادشاہ احسان کے بدلے میں محسن کو سر پر بٹھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بادشاہ نے نظام سقہ شخص کو ایک دن کی حکمرانی دینے جیسی حماقت بھی کر ڈالی تھی۔ لیکن آج کے دور میں اس قسم کی احسان شناسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں دشمن تو دشمن، دوست سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ریاض انور اور سہیل حکم جاری کرنے کے بعد اندر کی طرف بڑھ گئے اور پی اے آدھ گھنٹے بعد جانے والے لیکچر کے لیے نکات تلاش کرتا رہا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر سہیل نے خود ٹی وی کھول دیا۔ توقع مطابق نیوز چینلز سے سینٹرل جیل میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کی خبریں نشر کی جا رہی تھیں اور صاف بتایا تھا کہ چند قیدیوں کے جھگڑے سے شروع ہونے والا یہ ہنگامہ اصل میں جیل سے فرار کی ایک سوچی سازش ہے۔

ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آیا کوئی قیدی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔ انتظامیہ نے فی الحال اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ حالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صحافیوں نے البتہ کے باہر مورچے جما لیے تھے اور وقفے وقفے سے جاری فائرنگ کی خبریں دینے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور چہار دیواری کے مختلف اطراف کے مناظر بھی دکھا رہے تھے۔ ان مناظر میں ایک منظر جیل کے مرکزی دروازے سے برآمد ہونے والی تاریک شیشوں والی گاڑی کے تیزی سے وہاں سے نکل جانے کا بھی تھا دیکھ کر صحافیوں نے گھیرنے کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہے۔ اس گاڑی کو دیکھ کر سہیل نے اطمینان کا سا لیا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اس کے ساتھی سلو کو وہاں سے لے کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

''دو کپ چائے تو منگوا لیں ریاض صاحب!'' اس نے سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹی وی اسکرین طرف دیکھتے ریاض انور سے فرمائش کی۔

''تمہارے لیے منگوا دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت چائے سے زیادہ ڈرنک کی طلب ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ چائے منگوائیں، تب تک میں آپ کے لیے ڈرنک دیتا ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شیلف کی طرف بڑھ گیا جہاں انواع و اقسام کی شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ نے ریاض انور سے اس کی پسند دریافت کر کے ایک بوتل نکالی اور جام، سوڈے اور برف سمیت جملہ لوازمات کے ساتھ میز پر لا کر رکھ دی۔ ریاض انور اس دوران انٹرکام پر چائے کا آرڈر دے رہا تھا اس لیے یہ نہیں سکا کہ سہیل نے برف کے کیوبز پر سفید رنگ کا ایک سفوف سا چھڑک دیا ہے جو کہ برف کے ساتھ اس گھل مل گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔

وہ انٹرکام پر آرڈر دے کر فارغ ہوا تو سیدھا شراب نوشی کے لوازمات سے سجی میز کی طرف آیا سہیل کو اشارے سے جام تیار کرنے سے روک کر خود ہی ایک جام میں تھوڑی سی انڈیل کر منہ پیچھے سہیل ہونٹ بھینچے اسے دیکھنے لگا۔ عادی شرابی کو نیٹ پینے سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑ رہا تھا، ماسوائے اس کہ آنکھوں کے گوشوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔

اُسے اُلجھن سی ہونے لگی۔ اُس یہاں سے روانہ ہونے سے قبل ریاض کا قصہ تمام کرنے کا حکم اس نے کوشش کی تھی کہ خاموشی سے یہ کام ہو جائے۔ لیکن اب لگتا تھا کہ تھوڑا طاقت کا استعمال کرنا پڑے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچتا ہوا وہ ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے ملازم کے چائے لانے کا انتظار

اس کے چائے لانے کے بعد ہی وہ کچھ کر سکتا تھا۔

ملازم چائے لے آیا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ریاض انور نے پہلا جام نیٹ پینے کے بعد دوسرا اہتمام سے تیار کیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ ریاض کو شراب نوشی کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا شراب نے اس کے اعصاب کو سہارا دینا شروع کر دیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ اب اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ جو سفوف اس نے ریاض انور کے معدے میں پہنچانے کا اہتمام کیا تھا، اس کی یہ خاصیت تھی کہ وہ آدھ گھنٹے بعد اپنا اثر شروع کر کے استعمال کرنے والے کی حرکتِ قلب کو بند کر دیتا تھا اور پوسٹ مارٹم میں اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔ اپنی پیالی خالی کرنے کے بعد اس نے ملازم کو انٹرکام پر برتن لے جانے کا حکم دیا۔

''آپ اتنی ٹینشن مت لیں سر! ٹینشن میں آپ حد سے زیادہ ڈرنک کریں گے تو یہ آپ کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔'' ملازم میز پر سے چائے کے برتن سمیٹ رہا تھا تو اس نے جان بوجھ کر ریاض انور سے یہ جملہ کہا تاکہ ملازم گواہ رہے کہ ریاض انور کسی وجہ سے پریشانی کا شکار تھا۔

''تم اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔ میری مرضی، میں جتنی چاہے پیوں۔'' ملازم تھا کہ ریاض انور کو اُس کی مداخلت بری لگی اس لیے اس نے بگڑ کر جواب دیا۔

''میں تو آپ کی صحت کے خیال سے کہہ رہا تھا سر!'' اس نے ملازم کے سامنے جھینپ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے منمناتی آواز میں کہا۔ چند جملوں کی گفتگو کا گواہ ملازم اپنی تربیت کے مطابق بظاہر انجان بنا برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے ریاض صاحب! میں چلتا ہوں۔ آپ دل بھر کر پیتے رہیے۔ کیا پتہ پھر کبھی ملے یا نہیں۔'' اس نے وہی سلگتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ریاض سے کہا اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کی پروا کیے بغیر باہر نکل گیا۔

حسبِ ہدایت گاڑی تیار تھی۔ کوٹھی سے روانہ ہو کر وہ لوگ مین روڈ پر پہنچے تو اس نے ڈرائیور کو ایک ایسے علاقے کا پتہ بتایا جہاں گنجان آبادی تھی اور پتلی پتلی گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پتلی سی گلی کے سامنے گاڑی رُکوائی۔ یہ گلی اتنی تنگ تھی کہ اس میں گاڑی کا جانا ممکن نہیں تھا۔

''بس یار! یہیں روک دو۔ اندر مجھے پیدل ہی جانا ہو گا۔ تم ایسا کرو کہ اب واپس چلے جاؤ۔ مجھے جب واپس آنا ہو گا تو خود آ جاؤں گا یا فون کر کے تمہیں کہہ دوں گا۔'' اس نے ڈرائیور سے دوستانہ انداز میں کہا اور گاڑی سے نکل کر گلی میں داخل ہو گیا۔

ذرا ہی دیر میں وہ پُر پیچ گلیوں سے گزرتا ایک ایسی جگہ پر پہنچ گیا جہاں راستہ ذرا کشادہ تھا اور رکشہ وغیرہ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ گیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ریاض انور کی موت کے بعد اس کے بارے میں بہت سے سوال اُٹھائے جائیں گے اور اس کی موت کو طبعی نظر آنے کے باوجود پُراسرار قرار دیا جائے گا۔ کچھ لوگ شاید ممکنہ قاتل کی حیثیت سے اس کی تلاش کا کام بھی شروع کر دیتے لیکن اسے ان سب باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ وہ اس کام کو کامیابی سے انجام دے کر آ رہا ہے جو اسے سونپا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ریاض انور جیسے ناسور سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی تھی۔

⊛----●----⊛

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے نظریں گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ایک سادہ سی نشست گاہ تھی جہاں وہ بالکل آزاد کے ساتھ مہمان کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے لیے یہ تبدیلی خاصی حیرت انگیز تھی۔

کراچی کی جیل سے فرار کی ناکام کوشش کے بعد وہ جن لوگوں کی حراست میں چلا آیا تھا، انہوں اگرچہ اس سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اور کھانے پینے سمیت آرام وغیرہ کا بھی پورا خیال رکھتے رہے تھے اس کے باوجود اسے اس بات کا بھرپور احساس رہا تھا کہ وہ ان کی قید میں ہے۔ اسے کراچی سے لاہور لا ہوئے بے شک اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئی تھیں لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کے اردگرد لوگ اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا ہیں اور جیسے ہی وہ ان کی مرضی سے ہٹ کر حرکت کرنے کی کو کرے گا، وہ حرکت میں آجائیں گے۔ ویسے وہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا بھی نہیں تھا اور بلی کے تھیلے سے باہر آ تک خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اتنا اندازہ البتہ اس نے لگا لیا تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہے، ان کا تعلق پاکستان کے کسی نہ کسی خفیہ ادارے سے ہے۔ جب ہی تو وہ آسانی سے اسے جیل حکام کی رضامندی کے ساتھ وہاں سے نکال کر لے آئے تھے۔ اب وہ منتظر تھا کہ اُن اس مہربانی کا مقصد سامنے آجائے۔

اُسے کراچی سے سڑک کے راستے لاہور لایا گیا تھا اور یہ سفر ایک ایسے بند ٹرک میں طے ہوا تھا جس کے اندر کھانے پینے، آرام کرنے سے لے کر ہر طرح کی سہولت میسر تھی اور انہیں راستے میں کسی ہوٹل وغیرہ میں نہیں رُکنا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ ٹرک کے بند کیبن میں باتھ روم کی سہولت بھی موجود تھی۔

اس سفر کے اختتام پر اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اب لاہور میں ہے۔ پھر اسے چند گھنٹے آرام کا موقع دے کے بعد اس جگہ پہنچا دیا گیا تھا جہاں وہ ایک نشست گاہ میں بیٹھا ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے پہلے سے طے شدہ کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے آیا ہے۔

''السلام علیکم دوست!..... اُمید ہے تمہیں میرے انتظار میں زیادہ دیر بور نہیں ہونا پڑا ہوگا۔'' نشست گاہ میں بیٹھے اُسے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک شخص دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اس سے بڑے دوستانہ لہجے میں بولتا ہوا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے آنے والے کا جائزہ لیا۔ وہ دراز قامت کا خوش شکل اور جوان آدمی تھا جس کے نقوش میں نرمی کا تاثر پایا جاتا تھا۔

''ایک قیدی کے لیے یہ بات قطعی غیر اہم ہوتی ہے کہ وہ بور ہو رہا ہے یا نہیں۔'' مختصر سے جائزے کے بعد اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''قیدی..... کس نے کہا کہ تم یہاں قیدی ہو؟'' نو وارد نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''یعنی میں یہاں سے باہر نکل کر کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں؟'' اس نے جانچتی ہوئی نظریں اپنے مقابل کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''شیور! تمہیں یہاں ایک معاملے پر بات چیت کے لیے بلایا گیا ہے۔ اگر تم نہ چاہو تو گفتگو کیے بغیر بھی یہاں سے جا سکتے ہو۔ اس کمرے سے لے کر باہر مین گیٹ تک کوئی تمہارا راستہ نہیں روکے گا۔'' اس نے بھرپور اعتماد سے جواب دیا جس پر وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

اس نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اور وہ واقعی یہاں سے نکل کر باہر جانے کے لیے آزاد ہوگا۔ لیکن اس پر یہ واضح نہیں تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا؟ وہ بالکل خالی جیب تھا اور لاہور میں اُس کا ایسا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا جس

کے گھر وہ پناہ لے سکے۔ ہاں، اپنی تربیت کے بل بوتے پر اس کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ کسی کی جیب کاٹ کر یا اور طاقت رقم حاصل کر لے اور آگے کے لیے بھی اپنی راہیں بناتا چلا جائے۔ لیکن فی الوقت اس کے لیے ایسا کرنا بھی دشوار تھا کہ وہ جن کے اشارے پر سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالنے کے لیے پاکستان آیا تھا، انہوں نے اس سے اپنا رابطہ ہی توڑ دیا تھا۔ دوسرے اُسے یہ تجسس بھی ہو چلا تھا کہ اتنی جدوجہد سے خود کو یہاں لانے والوں کا مقصد جان سکے۔ چنانچہ راستہ کھلا ملنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔

''مجھے کس معاملے پر بات کرنے کے لیے بلایا گیا ہے؟'' خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

''میں تم سے جو بات کرنا چاہتا ہوں، اس سے پہلے یہ ویڈیو دیکھ لو تاکہ تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔'' اس نے ریموٹ کی مدد سے ایک طرف رکھا ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی اسکرین پر ریاض انور کا چہرہ نظر آنے لگا۔ چہرے کے پس منظر میں کمرے کا جو ماحول تھا، اسے دیکھ کر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی انٹروگیشن سیل ہے اور ریاض انور کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔

ابھی وہ مشاہدے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ ریاض انور کا اعترافی بیان شروع ہو گیا۔ یہ بیان حقیقتاً ان سوالوں کے جوابات پر مشتمل تھا جو کوئی ناپسندیدہ شخص اس سے کر رہا تھا اور وہ صرف اس کی آواز ہی سن رہا تھا۔

اس بیان میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ اُس کے ''را'' سے روابط ہیں اور وہ خطیر رقوم کے عوض ''را'' کی خواہش پر پاکستان کے مفادات کے خلاف کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے شہر میں ہونے والے حالیہ فسادات میں اپنے کردار کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ دہشت گردی کی اس کارروائی میں بھارت سے تربیت حاصل کر کے آئے ہوئے ایک نوجوان سلّو نے منصوبہ بازی میں اس کی خاطر خواہ مدد کی تھی۔ سوالات پوچھنے والے نے تاریخ اور وقت کا حوالہ دے کر تصدیق چاہی تو ریاض انور نے اس کا بھی اعتراف کر لیا۔

دم بخود سے بیٹھے سلّو پر اس اعتراف سے انکشاف ہوا کہ وہ پاکستان آمد کے فوراً بعد سے ہی نگرانی میں رہا ہے۔ بہرحال، وہ خاموشی سے ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ رہا۔ ویڈیو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ریاض انور سے مختلف اوقات میں حاصل کی گئی معلومات کو ایک ساتھ یکجا کر لیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں ریاض انور نے اعتراف کیا کہ ''را'' کی خواہش پر ہی اس نے سلّو کو وزیراعلیٰ کے سیکیورٹی اسٹاف میں ملازمت دلوائی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ سلّو کے ہاتھوں وزیراعلیٰ کے مخالف سیاست دان کو قتل کروانے کے بعد اسے بھی موقع پر ہی ہلاک کر دیا جائے گا۔ البتہ سلّو کو یہ جھانسہ دیا گیا تھا کہ جب وہ اپنا کام مکمل کر لے گا تو اُسے محفوظ راستے سے فرار کروا دیا جائے گا۔ ''را'' کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تو سلّو سے جان چھڑانے کے لیے متبادل منصوبہ اس طرح تیار کیا گیا کہ ریاض انور اپنے جن غنڈوں کو جیل سے فرار کروانے کی کوشش کر رہا تھا، انہی کے ذمے سلّو کا قتل بھی لگا دیا گیا۔ لیکن یہ کام اس طرح ہونا تھا کہ سمجھا جاتا، سلّو فرار کی کوشش میں کسی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔

سلّو نے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ یہ سب سنا اور اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ ویڈیو لگانے والے نے ''آف'' کا بٹن دبا کر اسکرین کو تاریک کر دیا اور اسے متوجہ کرنے کے لیے آہستہ سے کھنکھارا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ریاض انور کی زبانی اس منصوبے کا علم ہونے پر ہم نے جیل حکام کو اعتماد میں لے کر خود ایک متبادل منصوبہ تیار کیا اور اپنے کچھ آدمی قیدیوں کی روپ میں تمہارے آس پاس پھیلا دیئے۔ ان آدمیوں کی وجہ سے ایک طرف ہم تمہاری جان بچانے میں کامیاب ہوئے تو دوسری طرف جیل انتظامیہ نے بھی خطرناک مجرموں کے فرار کی سازش کو ناکام بنا دیا۔" وہ متوجہ ہوا تو مقابل نے اسے آگاہ کیا۔

"بڑی مہربانی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم کون ہو؟ اور مجھ پر تمہاری مہربانی کا کیا مقصد ہے؟" وہ شاک کی کیفیت سے نکلا تو اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مخصوص بے باک انداز میں سوال کیا۔

"میں تمہاری یہ اُلجھن دُور کر سکتا ہوں۔ میرا نام عادل خان ہے اور میں پاکستان کے ایک خفیہ ادارے کے لیے خدمات انجام دیتا ہوں۔ اپنے ادارے کی کوششوں کے ذریعے ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہوا تھا اور ہم نے پاکستان میں قدم رکھتے ہی تمہیں اپنی خفیہ نگرانی میں لے لیا تھا۔ میرے پاس تمہارے پاکستان میں گزرے ایک ایک دن کی تفصیل موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان آنے کے بعد تم کب ریاض انور سے ملے۔ کس طرح تم نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے بم بلاسٹ کی کوشش کی۔ کیسے وزیراعلیٰ کی سکیورٹی فورس میں شامل ہوئے اور کس طرح جیل سے فرار کی اسکیم کا حصہ بنائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی مجھے تمہارے بارے میں چھوٹی بڑی بہت سی تفصیلات کا علم ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ تمہارے پاکستان آنے سے قبل ہی تمہارا کیس مجھے سونپ دیا گیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ "را" کے سورماؤں نے ایک معصوم پاکستانی بچے کی برین واشنگ کر کے اسے دہشت گرد میں تبدیل کر دیا ہے اور ہمارے شہری کو ہمارے ہی خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اس کیس کے انچارج کی حیثیت سے مجھے تمہارے سلسلے میں مکمل اختیار حاصل تھا۔ میں چاہتا تو تمہیں پاکستان کی زمین پر قدم رکھتے ہی شوٹ کر دیتا، ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بم رکھنے کے الزام میں گرفتار کروا دیتا یا وزیراعلیٰ کے ہاں تقریب میں دہشت گردی کے الزام میں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیتا۔ کچھ نہیں ریاض انور کے منصوبے کے مطابق جیل سے فرار کے موقع پر تمہارا قتل ہو جانے دیتا۔ لیکن میں نے ہر جگہ ہر موقع پر نہ صرف تمہیں ڈھیل دی بلکہ پوری پوری کوشش کی کہ تمہاری زندگی کی حفاظت ہو سکے۔"

"لیکن کیوں.....؟" اس نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے تسلسل سے بولتے عادل خان سے پوچھا۔

"میرے پاس اس کی بہت سیدھی اور صاف وجہ تھی۔ ایک مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے میں قدرتی طور پر تمہارے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہوں۔ میرے لیے پل بھر میں تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دینا مشکل نہیں تھا لیکن میں ان والدین کی آنکھوں میں جلتے خوشی کے دیپ نہیں بجھانا چاہتا جو برسوں سے اپنے بیٹے کی جدائی کا غم سہتے وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو چکے تھے اور اب اس بیٹے کو اپنے سامنے دیکھ کر پھر سے جی اُٹھے تھے۔ دوسرے یہ کہ میرے نزدیک اصل مجرم تم نہیں بلکہ وہ ہیں جنہوں نے ایک معصوم بچے کے کورے کاغذ جیسے ذہن پر نفرت کی تحریر نقش کی۔ تم تو خود مظلوم تھے کہ تم سے تمہارا اصل چھین کر تمہارے ہاتھوں میں ہتھیار تھما دیئے گئے تھے۔ میری خواہش تھی بلکہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ پر نفرت کی اس تحریر کو مٹا کر تمہیں تمہارا اصل لوٹا سکوں تاکہ آنے والے کل میں تمہیں دہشت گرد سلو کے بجائے محبِ وطن سلیم کے نام سے یاد رکھا جائے۔" عادل خان جو دراصل شہریار تھا، بولتے بولتے تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔

"اور اگر آپ مجھے وہ نہ بنا سکے جو چاہتے ہیں، پھر؟" سلو نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ

لیتے ہوئے پوچھا۔

"پھر مجبوری ہو گی۔ ناسور بن جانے پر بعض اوقات انسان اپنے جسم کا ہی کوئی عضو کاٹ ڈالنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسے اس عضو سے بہت محبت بھی ہوتی ہے اور اس کی ضرورت بھی۔ لیکن باقی جسم کو بچانے کے لیے اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے باقی ساری زندگی ادھورے پن کا دُکھ دل میں کسکتا رہے۔"

اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو سلو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اُس نے ایک بار پھر لب کھولے اور اعتراف کیا۔

"آپ نے اس ویڈیو میں جو کچھ دکھایا اور سنوایا، وہ میرے لیے زیادہ انوکھا نہیں ہے۔ مجھے وزیراعلیٰ ہاؤس میں پکڑے جانے پر ہی شک ہو گیا تھا کہ اگر ادھر میرا کوئی ہمدرد ہوتا تو میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ بعد میں جیل میں جو کچھ ہوا، اس پر بھی میں نے یہاں لائے جانے تک بہت سوچا اور یہی سمجھ میں آیا کہ 'را' والوں نے مجھے چونا لگا دیا ہے۔ میرے دل میں ان کے لیے بڑا غصہ بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایک دم سے محبِ وطن پاکستانی بن جاؤں گا اور باقی کی زندگی پاکستان کی خدمت کرتے ہوئے گزاروں گا۔ سوری صاحب! چاہے آپ کو بُرا لگے، لیکن سچ یہ ہے کہ میرے دل میں بڑے شکوے ہیں۔ اگر وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ ہم غریب عوام کے لیے کچھ کرنے والے ہوتے تو مجھے اپنی زندگی کے اتنے سارے سال وہاں بھارت میں نہیں گزارنا پڑتے۔ اور پھر نہ وہ لوگ مجھے دہشت گردی کی ٹریننگ دیتے، نہ ادھر میرے ماں باپ رو رو کر خوار ہوتے۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں صاحب! کہ میں آپ کی خواہش کے مطابق کبھی اچھا پاکستانی نہیں بن سکتا۔ اب یہ آگے آپ کی مرضی ہے کہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، کیا کریں۔ گولی مارنے کا ارادہ ہے تو ماریں۔ ایسی چیزوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور میں وہی بولتا ہوں جو سچ ہے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں شہریار سے بھی بڑھ کر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ اُس کے اس انداز پر شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی سلیم! میں انسانی نفسیات کو سمجھتا ہوں اور مجھے اندازہ ہے کہ تمہارے مزاج میں اتنی آسانی سے ایک دم تبدیلی نہیں ہو سکتا۔ اگر اس وقت تم مجھ سے سچ کہنے کے بجائے یہ کہتے کہ تمہارے دل میں اچانک اپنے وطن کی محبت جاگ گئی ہے اور تم وطن کی خاطر تبدیل ہونے کو تیار ہو تو میں کبھی یقین نہیں کرتا بلکہ یہی سوچتا کہ تم اپنی جان بچانے کی خاطر مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ نے میرے دل میں تمہاری قدر و قیمت کو مزید بڑھا دیا ہے۔"

"شکریہ! اب آگے بولیں میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

"میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بغیر مطلب آیا۔

"کیسی ڈیل؟" سلو نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"مجھے بھارت میں ایک مشن پر جانا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس مشن میں تم میرے معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ چلو۔ مجھے اپنے مشن کے لیے بہادر اور جرأت مند شخص کے ساتھ کی ضرورت ہے جو کہ تم ہو۔ لیکن یہ تمہیں ساتھ لے جانے کی واحد وجہ نہیں ہے۔ بہادروں کی میرے اپنے ساتھیوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں تمہیں ان پر فوقیت صرف دو وجوہات کی بنا پر دے رہا ہوں۔ اوّل یہ کہ میں بھارتیوں کا تیار کیا ہوا ہتھیار انہی پر استعمال کر کے انہیں سبق سکھانا چاہتا ہوں، دوسرے یہ کہ تم کئی برس بھارت میں رہنے کی وجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے وہاں سے کافی حد تک واقف ہو اس لیے زیادہ بہتر معاون ثابت ہو گے۔'' وہاں گویا صاف گوئی کا مقا
ہو رہا تھا جس میں وہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گیا آپ کا فائدہ۔ پر مجھے کیا فائدہ ہو گا کہ میں آپ کا ساتھ دوں اور اپنی
مشکل میں ڈالوں؟'' ٹانگ پر ٹانگ جمائے ہوئے سلّو نے اس سے پوچھا۔

''جان تو تم اپنی مشکل میں ڈال ہی چکے ہو۔ یہاں سے باہر نکل کر دیکھو پھر تمہیں پتہ چل جائے گا
کتنے محفوظ ہو۔ تم ایک ایسے شخص ہو جو ریکارڈ کے مطابق جیل سے مفرور ہے اور جس کی قانون نافذ کر
والے اداروں کو شدت سے تلاش ہے۔ اگر تم ملکی پولیس اور ایجنسیوں سے بچ نکلے تو تمہارے نام نہاد
تمہیں نہیں بخشیں گے۔ وہ تو پہلے ہی تمہارے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں اور تمہارے منظر پر آتے
تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا دینے میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔ کیونکہ تم ان کے لیے ایسا خطرہ ہو جو کبھی بھی
کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میرا ساتھ دینے میں تمہارا سب سے
فائدہ تو یہ ہے کہ تمہیں ایک پناہ گاہ میسر آ جائے گی جہاں تم قانون نافذ کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ''را''
گرگوں سے بھی محفوظ رہو گے۔ یہاں رہ کر تمہیں اپنے حلیے میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کرنے کا موقع
جس کے بعد تمہارے لیے آزادانہ نقل و حمل آسان ہو جائے گی۔ ہم تمہاری مالی معاونت بھی کریں گے
اگر تم میرے ساتھ میرے مشن میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے تو تمہیں تمہارے کام کا باقاعدہ معاو
جائے گا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے، تمہارے لیے موجودہ حالات میں یہ پیشکش بہت مناسب ہے۔
تم جن عزائم کے ساتھ اور جن لوگوں کی پشت پناہی میں یہاں آئے تھے، وہ تو اب تمہارے لیے اپنی
کھو بیٹھے ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم پر یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ بھارتیوں نے تمہیں
اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ تو وہ تمہارے ہمدرد ہیں اور نہ ہی انہیں اس بات
کوئی مطلب ہے کہ تمہارے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔'' وہ جو کچھ بولتا رہا، سلّو سر جھکائے اسے سنتا رہا کہ اس
کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''تمہارے لیے میرے پاس ایک اہم اطلاع یہ بھی ہے کہ تمہارے والدین کو ان کی جھگی سے
ایک محفوظ مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے تاکہ وہ کسی اندھے انتقام کی بھینٹ نہ چڑھ سکیں اور نہ ہی کوئی
پہنچنے کے لیے انہیں استعمال کر سکے۔ تم جب چاہو گے، ان سے تمہاری ملاقات کا انتظام کر دیا جائے گا
کے علاوہ تم جب تک میرے ساتھ رہو گے، یہاں ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال اور کفالت ہوتی رہے گی
''تھینک یو سر! یہ آپ نے مجھ پر سچ مچ بڑا احسان کیا۔'' سلّو جواب تک کسی بات سے متاثر نظر
تھا، اس کی زبانی اپنے والدین کی بابت سن کر چونک گیا اور اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں تھینک یو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دونوں پاکستانی شہری ہیں اور ان کا تحفظ
ذمے داری سمجھتے ہیں۔''

''کاش کہ کھلے سمندر سے گرفتار ہونے والے غریب مچھیروں کو بھی آپ لوگ اپنی ذمے داری
میرے ساتھ یہ سب نہیں ہوتا۔ اب میں چاہوں بھی تو نارمل لائف نہیں گزار سکتا۔'' اس کے لہجے
دکھ دونوں ہی تھے۔

''تم سمجھو گے نہیں لیکن یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ کھلے سمندروں سے گرفتار ہونے والے ما
کے سلسلے میں ہم بالکل بے بس ہیں۔ ان ماہی گیروں کو ہمیشہ اس الزام کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے

سمندری حدود کی خلاف ورزی کی تھی۔ حالانکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور وہ لوگ جان بوجھ کر بھی بے گناہ
ماہی گیروں کو کھلے سمندر سے گھیر کر لے جاتے ہیں۔ اب یہ ماہی گیروں کی قسمت پر منحصر ہوتا ہے کہ اردگرد
ہماری کوئی گشتی بوٹ وغیرہ موجود ہو تو اُنہیں مدد مل جاتی ہے ورنہ وہ بے چارے پھنس جاتے ہیں اور ہمارے
پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ اُنہیں بے گناہ ثابت کر سکیں۔ تم اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی
ہوا۔ تمہارے کیس میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے تمہاری کم عمری کو دیکھتے ہوئے تمہیں اپنے مذموم
مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہ تمہاری اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ تمہاری یہاں آمد سے قبل
ہی ہمیں تمہارے بارے میں علم ہو گیا اور وہ لوگ تم پر بہت سا وقت اور پیسہ خرچ کرنے کے باوجود تم سے اپنا
کوئی ایک بھی کام نہیں نکلوا سکے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور کام لینا چاہتا ہے اور اگر
اس کی یہی مرضی ہے تو میں کون ہوتا ہوں منع کرنے والا۔ ٹھیک ہے، میں چلوں گا آپ کے ساتھ انڈیا اور اُن
لوگوں کو بتاؤں گا کہ سلّو کی زندگی چھیننا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ جوش میں آ گیا۔ پھر خیال آنے پر
پوچھنے لگا۔ ''آپ کس مشن پر اُدھر جا رہے ہیں؟..... تاج محل کو اُڑانا ہے یا ممبئی کی دو چار مارکیٹوں میں بم
دھماکے کرنا ہے؟''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں یا میرے ساتھی کوئی دہشت گرد نہیں ہیں جو بلاوجہ کسی کی املاک کو نقصان
پہنچائیں یا بے گناہ انسانوں کا خون بہانے کا سوچیں۔ فی الحال میں تمہیں اپنے مشن کی تفصیلات سے آگاہ
نہیں کر سکتا۔ لیکن تم اتنا سمجھ لو کہ بھارتیوں نے ہماری ایک بہت ہی قیمتی شے پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے اس شے
کو واپس اپنے وطن لانا ہے۔'' اس نے بہت سبھاؤ سے سلّو کے سوال کا جواب دیا جس پر وہ دھیرے سے
سر ہلا دیا۔

''مجھ پر اعتماد نہیں ہے نا۔ اس لیے اصل بات گول کر دی آپ نے۔''

''اعتماد انسان اپنے رویے سے وقت کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔ ابھی تو تمہاری حیثیت ایک ایسے شخص
کی ہے جو اپنے مفادات کی خاطر اُجرت پر میرا ساتھ دے گا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تم پر مکمل
اعتماد کر سکوں۔ ویسے بھی ہماری فیلڈ میں بلا ضرورت معلومات کو منتقل نہیں کیا جاتا، چاہے وہ شخص کتنا ہی
مخلص اور مخلص کیوں نہ ہو۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی مرضی۔ آج سے میں آپ کا ملازم ہوں اور جو حکم آپ دیں گے، اس پر عمل
کروں گا۔'' سلّو نے بھی بحث نہیں کی اور فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

''ویش گڈ۔ تمہارا یہی رویہ رہا تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔
فی الحال تم آرام کرو اور ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرو جو تمہارا حلیہ وغیرہ تبدیل کرنے میں تمہاری مدد کریں
گے۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سلّو بھی خودکار انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مدِمقابل میں کوئی ایسی
بات تھی کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''میرے خیال میں تمہیں یہ بتانے کی تو قطعی ضرورت نہیں ہے کہ اس عمارت سے باہر تمہارے لیے
خطرہ ہے اس لیے بلا اجازت یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔'' اُس نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے
ہوئے نرم لہجے میں سلّو سے یہ الفاظ کہے۔

لہجے کی نرمی کے باوجود سلّو تک یہ پیغام پہنچ گیا کہ عملاً وہ ایک قیدی ہے جسے یہاں سے باہر جانے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آزادی نہیں ہے۔ ناگواری کے احساس سے اس کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔

''آپ تو مجھے میرے ماں باپ سے ملوانے والے تھے؟'' اس نے ذرا تلخی سے دریافت کیا۔

''مجھے اپنی ہر بات یاد ہے۔ تم فکر نہ کرو، ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔'' اس نے جواب دیا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ سلو جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اُسے روک سکتا یا کوئی اور سوال کر پاتا۔

⊛----✪----⊛

''بڑے دُکھ کی بات ہے لنڈا ڈارلنگ! میں نے تم سے اتنا چھوٹا سا کام کہا اور تم نے ابھی تک نہیں کیا۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے دُبئی سے اچانک واپس پاکستان پہنچنا پڑا ورنہ میں وہیں بیٹھے بیٹھے خود ہی اپنا کام حل کر لیتا۔'' چودھری کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ناراض نہ ہوں چودھری صاحب! میری بھی خواہش تھی کہ آپ کے کام آتی۔ لیکن مجبوری نے میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔'' لنڈا نے اپنی لوچ دار آواز میں معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری کا رونا رویا۔

''تمہاری کیا مجبوری ہو سکتی ہے؟ تم نیویارک میں بیٹھی ہو اور تمہاری کتنی پہنچ ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔ کشور اور آفتاب تو کیا، اگر میں تم سے امریکہ کے صدر کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی خواہش کرتا تو تم معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم ایسا کرنا چاہو۔''

وہ سچ مچ خفا تھا۔ نیویارک والے اپارٹمنٹ میں کشور اور آفتاب کی ہلاکت کا منصوبہ ناکام ہونے سے شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا اور اس کے امریکہ میں داخلے کا راستہ بھی ایک طرح سے بند ہو گیا تھا۔ نیویارک پولیس کی مستعدی کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اگر اس نے مستقبل قریب میں نیویارک کا رُخ کیا تو دھر لیا جائے گا۔ الفا نے بھی فی الحال اُس کے اُدھر کا رخ کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ مقامی معاملات سنبھالنے پر زور دیا تھا اس لیے وہ بالکل ہندھ کر رہ گیا تھا۔ البتہ لنڈا کے توسط سے اسے ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ آفتاب اور کشور اب نیویارک کے اس اپارٹمنٹ میں نہیں رہتے جہاں انہیں مار کروانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُس کے دل میں بھڑکتی آتش انتقام اس اطلاع پر مزید بھڑک اٹھی تھی اور اس نے لنڈا سے درخواست کی تھی کہ وہ ان دونوں کا پتہ چلانے کے لیے کسی دوسرے گینگ سے معاملہ طے کروانے میں اس کی مدد کرے۔

لنڈا نے اس وقت تو اس کی بات خاموشی سے سن لی تھی لیکن کئی دن گزر جانے کے بعد بھی اُس کا کام سامنے نہیں آیا تھا چنانچہ چودھری نے خود اس سے رابطہ کر کے شکوہ شروع کر دیا۔

''آپ نے تو مجھے بہت اونچی چیز بنا دیا چودھری صاحب! اب میری اتنی بھی زیادہ پہنچ نہیں ہے۔ اگر میں تھوڑی بہت کوئی حیثیت رکھتی بھی ہوں تو وہ اپنے ان بڑوں کی وجہ سے جنہوں نے سختی سے مجھے کے ذاتی معاملات سے الگ رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ میرے لیے حکم ہے کہ میں تنظیمی معاملات کے آپ سے کسی اور معاملے میں ڈیلنگ نہ کروں، ورنہ تنظیم میں میری اپنی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ اب ہی بتائیں کہ اتنے سخت احکامات کے بعد میں کیسے آپ کی خواہش پوری کر سکتی ہوں؟ اوپر والوں کی نظر معتوب ہونے کے بعد تو میرا کہیں کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہے گا۔'' چودھری کے شکوے کے جواب میں لنڈا اپنی صفائیاں پیش کرنا شروع کر دیں جسے سن کر چودھری بل کھا کر رہ گیا۔

''تم بڑوں کا رونا کیوں رو رہی ہو؟ صاف کہو کہ الفا نے تمہیں منع کیا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں تو میری زبان سے کہلوانا کیا ضروری ہے؟''

''وہ شخص ضرورت سے زیادہ مجھے اپنے دباؤ میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم سمجھا دو۔ میں اتنا بھی بے اختیار اور مجبور نہیں ہوں کہ اس سے دبتا ہی چلا جاؤں۔ یہاں کے معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ اگر میں چاہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''مثلاً.....؟'' اُس کی دھمکی کے جواب میں لنڈا نے سرد مہری سے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے علاقے میں کتنا با اختیار ہوں۔ اگر میں ضد میں آ گیا تو تم میں اور کسی کی جنگل میں موجود افیون کے کھیتوں تک رسائی نہیں رہے گی۔ میں خود ہر شے پر قبضہ کر لوں گا۔ اس کے بعد میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ میں اس افیون کو ڈائریکٹ کسی دوسری پارٹی کو بیچ دوں۔ تمہارے علاوہ بھی مارکیٹ میں دوسرے لوگ ہیں جو اس دھندے کو چلا رہے ہیں۔ جو مجھے تم سے مل رہا ہے، وہ میں ہر غلامی کے آزادی سے دوسروں سے حاصل کر لوں گا۔'' اپنے تئیں اس نے بہت زوردار دھمکی دی تھی جس کے اس کے خیال کے مطابق تنظیم کے کرتا دھرتا ہل کر رہ جاتے۔

''یہ آپ کی خام خیالی ہے چودھری صاحب! یہاں لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ کسی شخص کو اپنے اوپر اتنا حاوی ہونے کا موقع دے دیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے اور وہاں کی نگرانی کے فرائض انجام دینے والے بے شک آپ کے لوگ ہیں لیکن وہاں ٹیکنالوجی ہماری کام کر رہی ہے۔ ہم اگر چاہیں تو محض ایک بٹن دبا کر سب کچھ تباہ کر سکتے ہیں۔ اور اس تباہی کے نتیجے میں آپ کے کئی قیمتی کارندوں کے ساتھ ساتھ اتنا بڑا جنگل بھی جل کر بھسم ہو جائے گا۔ اس صورت میں آپ اپنے نقصان کا حساب لگا لیجئے گا۔ آپ ہماری طرف سے ملنے والے خطیر معاوضے کے علاوہ بھی بہت کچھ کھو بیٹھیں گے۔ جبکہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کہ ہم یہیں اور اپنا سیٹ اپ دوبارہ قائم کر لیں۔ دوسرے آپ کبھی خواب میں بھی یہ مت سوچئے گا کہ آپ ہم سے اعلیٰ ہماری افیون کا کسی دوسری پارٹی سے سودا کر سکتے ہیں۔ پہلے نمبر پر تو آپ شمالی علاقہ جات اور افغانستان کے بیوپاریوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے جو اپنے مقابل آنے والے کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ ہماری بات اور ہے، ہم اس بزنس پر چھائے ہوئے ہیں اور ہم نے طلب و رسد میں کبھی کمی نہیں آنے دی ہے۔ اس لیے ہم پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو کوئی نہیں چھوڑے گا۔ دوسرے جو افیون آپ کے ہاں کاشت کی جا رہی ہے، اس سے ہیروئن تیار کرنے کی ٹیکنالوجی بھی ہمارے پاس ہے۔ ہماری ٹیکنالوجی کے بغیر کوئی اور اس افیون سے اس کوالٹی کی ہیروئن تیار نہیں کر سکتا جس کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ اس لیے اگر آپ ایک بار سودا کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو اگلی بار کوئی آپ سے سودا نہیں کرے گا۔ میں سب حقائق کو اپنے سامنے رکھ کر آپ ذرا عقل کے ساتھ فیصلہ کیجئے گا کہ آپ ہم سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں ہیں بھی یا نہیں۔''

چودھری کو سارا نفع نقصان بتاتے ہوئے لنڈا کے لہجے میں جو اجنبیت اور سرد مہری تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی اصل ہمدردیاں اور وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں۔ اور اگر وہ اس سے محبت اور لگاوٹ سے پیش آتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی تنظیم کے مفادات پر اسے کسی بھی طرح ترجیح یا چھوٹ دے سکتی ہے۔ اس کے لب و لہجے نے چودھری کے جوش کے غبارے میں سُوئی چبھو دی اور وہ گھبرا کر بولا۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو ڈارلنگ! میں تو بس غصے میں ایک بات کہہ گیا تھا۔ ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہے۔ نہ ہی میں تنظیم سے بغاوت کا سوچ سکتا ہوں۔ لیکن تنظیم کے بڑوں کا بھی تو فرض ہے کہ وہ ا
لیے خدمات انجام دینے والوں کے مفادات کا خیال رکھیں۔ اگر ہم اپنے ذاتی مسائل کی طرف سے پُرسکو
ہوں گے تو تنظیم کے لیے زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکیں گے۔'' لِنڈا کا موڈ خراب ہوتا دیکھ کر اس نے ب
تیزی سے پینترا بدل لیا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تنظیم اپنے لیے کام کرنے والے ہر شخص کو اس کی خدمت کے بدلے میں نہا
معقول معاوضہ دیتی ہے جس کے بعد اس پر کسی طرح کی ذمے داری نہیں رہتی۔ دوسرے یہ کہ تنظیم کے
ہزاروں لوگ کام کرتے ہیں۔ اگر ہم ہر شخص کے ذاتی مسائل کے حل کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں اپنا و
ضائع کرتے رہیں تو تنظیمی کام کب اور کیسے انجام پائیں گے؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اس حقیقت کو سمجھ
کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک کاروباری تعلق ہے اور یہ تعلق اسی صورت قائم رہ سکتا ہے کہ آپ ہمار
شرائط کے مطابق کام کرتے رہیں اور جواب میں اپنی شرائط پیش کرنے کی زحمت نہ کریں۔''

لِنڈا اس سے جس لب و لہجے میں بات کر رہی تھی، اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس نرم و گداز حسینہ کے بجا
ایوڈ یا الفا سے بات چیت کر رہا ہے۔ آج پہلا موقع تھا کہ لِنڈا سے بات کرتے ہوئے وہ رعبِ حُسن م
جائے دہشت سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

''کول ڈاؤن ہنی! میں نے مان لیا ہے نا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں غصے میں کچھ زیادہ ہی غلط
بول گیا ہوں۔ تم اس بات کو اب یہیں ختم کر دو۔'' وہ اب باقاعدہ گھگیا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ سے دوستی کے ناتے میں بات ختم کر دوں گی لیکن اب آئندہ کبھی آپ ایسا کچھ
کہیے گا جس سے بغاوت کی بُو آئے۔ آپ نے سنا ہے نا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور ہماری
جتنی طاقتور اور جدید ہے، کچھ بعید نہیں کہ ہماری لاعلمی میں ہی ہماری گفتگو کا ریکارڈ ان تک پہنچ جائے۔ آ
نئے ہیں، یہاں کے لوگوں کا مزاج نہیں سمجھتے۔ لیکن میں آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ آپ اپنی نادانی میں کسی
بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ آپ کا جوان بیٹا یہیں نیویارک میں رہتا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو آ
کیا کریں گے؟ سنا ہے آپ کے ہاں تو جاگیر کے وارث کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وارث نہ رہا تو آپ
بعد آپ کی جاگیر تو بے کار ہی چلی جائے گی۔''

وہ اُسے میٹھی چھری سے ذبح کر رہی تھی۔ ہمدرد اور دوست بن کر وہ سب کہتی جا رہی تھی جو کوئی دشمن ا
کہہ سکتا ہے۔

''میں نے کہا ہے نا کہ اس بات کو جانے دو۔ اب تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس
بہت زور دے کر لِنڈا کو یقین دلایا۔

''اوکے، ایز یُو وِش۔ اب مجھے اجازت دیں۔ پھر کبھی اچھے ماحول میں بات یا ملاقات ہوگی۔'' لِنڈا
لہجے کی نرمی اور لوچ واپس لوٹ آئے اور اس نے بڑے خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

فون بند ہونے کے بعد بھی چودھری بہت دیر تک ساکت سا بیٹھا رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے ٹکرانے
خواہش میں اسے ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی تھی اور یہ تسلیم کرنا پڑا تھا کہ ان لوگوں کے اختیارات کے سامنے
کی کوئی حیثیت نہیں ہے پھر بھی جانے کیوں وہ اپنے خون کی تاثیر سے مجبور ہو کر ایسی غلطی کر بیٹھتا تھا۔ اور
دفعہ تو لِنڈا نے اسے بہت ہی زیادہ خطرناک دھمکی دی تھی۔ چودھری مراد عالم شاہ اُس کا وہ اکلوتا بیٹا تھا، م
سے بہت خفا رہنے کے باوجود وہ بڑی محبت کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اولادوں میں واحد وہی ہے جو اس کے

ں جاگیر کا وارث قرار پا سکتا ہے۔ دوسرا بہزاد شاہ تو اپنی ذہنی پسماندگی کی وجہ سے کسی لائق ہی نہیں تھا۔
ملوں کو وارث بنانے کا ان کے ہاں رواج نہیں تھا۔ اس کے حوالے سے دھمکی ملی تو اس کا دل اتنا بے قرار
ا کہ فوراً ہی اس کا نمبر ملا بیٹھا۔

دوسری طرف سے فون مراد ہی نے اٹھایا اور یہ جاننے کے بعد کہ دوسری طرف اس کا باپ موجود ہے،
ادب سے سلام کرنے کے بعد اس کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگا۔

''میں ٹھیک ہوں پُتر! بس تیری فکر ہو رہی تھی اس لیے تجھے فون لگا لیا۔''

''وہ کیوں ابا جی! میں یہاں اچھا بھلا ہوں۔ پھر آپ کو میری فکر کس لیے ہو رہی تھی؟'' یہ پہلا موقع تھا
اپ نے ایسی بات کہی تھی۔ اس لیے وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔ اس کے پوچھنے پر چودھری کو اپنی غلطی کا
اس ہوا چنانچہ بات بنانے کے لیے بولا۔

''بس پُتر! تیری ماں کے بعد دل ایسا ہی کملا ہو گیا ہے۔ وہ تھی تو آپ ہی تجھے فون شون کرتی رہتی تھی
ھے بھی تیری خیریت بتاتی رہتی تھی۔ اب اتنے دنوں سے کسی نے مجھے تیرے بارے میں نہیں بتایا تو ویسے
ل پھر اول گھبرا گیا۔''

''اماں کی کمی تو مجھے بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ ان جیسی رعب داب والی اور دبنگ
اں اتنی خاموشی سے دنیا چھوڑ گئی ہیں۔'' وہ بیٹا تھا، ماں کے ذکر پر قدرتی طور پر آزردہ ہو گیا۔

''بس پُتر! جیسی رب کی مرضی۔ ہمارے تمہارے پاس صبر کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔'' وہ فوراً بیٹے کو
ل دینے لگا۔ پھر بات بدلنے کے لیے بولا۔ ''تُو سنا تیری زنانی اور دِھی کا کیا حال ہے؟''

دل میں چور ہونے کی وجہ سے وہ وڈی چودھرائن کے موضوع پر بیٹے سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ یہ
ال کہ کہیں مراد شاہ کو اپنی ماں کی موت کی حقیقت کا علم نہ ہو جائے، اسے اندر ہی اندر سہمائے رکھتا تھا اور
ل کی ایک بڑی وجہ الفا بھی تھا جس نے واضح طور پر دھمکی دے رکھی تھی کہ اس کی سرکشی کا ایک نتیجہ مراد
افشائے راز کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔''

''وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ شاہدہ آپ کو سلام کہہ رہی ہے۔'' مراد نے جواب دیا۔

''اور کشور کی کیا اطلاع ہے؟''

''کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اس سے میرا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں
.'' مراد شاہ کے لہجے میں خود بخود ہی سختی در آئی۔

''تُو جھوٹ بول رہا ہے مراد شاہ! تجھے سب معلوم ہے پر تُو جان بوجھ کر مجھے نہیں بتا رہا۔ پر تُو فکر نہ کر.....
ود اُس کی کھوج لگا لوں گا۔'' چودھری دھاڑا۔

''تاکہ اُس پر ایک اور قاتلانہ حملہ کروا سکیں؟..... آپ نے تو مجھے کشور سے نظر ملانے کے لائق نہیں
ا ابا جی! وہ سوچتی ہوگی کہ میں بھی آپ کے ساتھ ملا ہوا ہوں اور ہمدردی کی آڑ میں اُس سے دشمنی کرتا رہا
اسی لیے تو اُس نے مجھ سے ہر رابطہ توڑ دیا۔ اور اب اگر اتفاق سے کہیں مل بھی گئی تو مجھے یقین ہے کہ مجھ
منہ پھیر کر چلی جائے گی۔ آپ نے تو بہن بھائی کے رشتے کا اعتبار ہی توڑ دیا ابا جی! بھائی تو بہنوں کی
الت کیا کرتے ہیں۔ اور میری بہن سمجھتی ہوگی کہ میں اس کے لیے خطرہ ہوں۔'' وہ بیک وقت تلخ اور
اس محسوس ہو رہا تھا۔

''اوئے رہنے دے یہ تقریریں۔ بھائی، بہنوں کے رکھوالے ہوتے ہیں، پر ایسی بہنوں کے جو گھر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چار دیواری میں بیٹھتی ہیں۔ کشور کی طرح چوری چھپے گھر کی دہلیز پار کرنے والیوں کے لیے غیرت مند کندھے پر بندوق ڈال کر گھومتے ہیں تاکہ موقع ملتے ہی عزت کا جنازہ نکالنے والی کا جنازہ نکال سکیں۔ یہ گل نہیں سمجھے گا مراد شاہ! تُو رہتا ہے امریکہ میں، ہو رخود بھی امریکی بن گیا ہے۔ تجھے کہاں یاد رہے عزت و غیرت کے اصول۔'' اس نے بیٹے کو لتاڑا۔

''اچھا ہی ہے کہ مجھے ایسے غیر انسانی اصول یاد نہیں ہیں جو صرف اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان اس کے بنیادی حقوق چھین کر اپنی حکمرانی کا نشہ پورا کیا جا سکے۔'' اس نے ترنت جواب دیا۔

''تجھ سے گل کرنا تو اپنا منھ خراب کرنا ہے۔ تُو نہ میری گل سمجھا ہے نہ سمجھے گا۔ پر میری مجبوری ہے میرا اکلا وارث ہے۔ ہیر پھیر کر مجھے تجھے منہ لگانا ہی پڑتا ہے۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تُو میرے بعد کا انتظام کیسے چلائے گا؟ تجھے تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ تیرے دادا کا عرس کس تاریخ کو ہوتا ہے۔ پر میں تک زندہ ہوں مجھے تو سب دیکھنا ہے اور اپنے پرکھوں کی روایات کی حفاظت کرنی ہے۔ جا تُو اُدھر فرنگیوں ہی خوش رہ، میں پتر والا ہو کر بھی سب کلا ہی دیکھتا رہوں گا۔'' اُس نے مراد شاہ کو باتیں سنا کر فون بند اور بلند آواز میں منشی کو پکارا۔

''حاضر سرکار!'' منشی چراغ کے جن کی طرح فوراً خدمت میں آموجود ہوا۔

''عرس کی تیاریوں کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟'' اس نے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ دریافت کیا۔

''تیاریاں جاری ہیں سرکار! آپ دیکھیے گا کہ پچھلے سال سے زیادہ شاندار انتظامات ہوں گے اس میں نے درگاہ کی سجاوٹ اور حویلی کی تزئین کا کام شروع کروا دیا ہے۔ دعوت نامے بھی ایک دو دن میں کر آ جائیں گے۔ آپ دیکھیے گا محفل کے کیسے شاندار دعوت نامے تیار کروائے ہیں میں نے۔ باقی انتظام بھی بہت شاندار ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' منشی نے فوراً رپورٹ شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے تیرے انتظامات کو بھی۔ یہ بتا کہ اُدھر ڈاک بنگلے کی کیا خبر پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی اُدھر؟''

''نہیں چودھری صاحب! سب ٹھیک ہے۔ بہرام اور دوسروں کو میں نے آپ کے حکم پر ڈاک بنگلے ہٹا لیا تھا۔ اب وہاں صرف سرکاری چوکیدار ہے اور اسے کسی معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اے سی عمیر بھی اپنی جگہ موجود ہے اور ہمارے خدشات کے مطابق اس نے دوبارہ جنگل کا رخ کرنے کی کوشش کی۔'' اس حوالے سے بھی منشی کے پاس اس کے لیے تسلی بخش رپورٹ موجود تھی۔ اظفر اور اس کے ساتھی جنگل میں قتل کرنے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اظفر کے بارے میں انہیں شک تھا کہ کسی خفیہ ادارے کا آدمی ہے اس لیے اسے قتل کرنے کے بعد بھی یہ خیال رکھا تھا کہ اگر اس کے قتل کی تفتیش شروع ہو تو کوئی گرفت میں نہ آ سکے۔ کیونکہ اس سارے معاملے میں بہرام ہی سامنے تھا، اس لیے انہیں خدشہ تھا کہ تفتیش کرنے والے اسے ہی گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے اسے پوری ٹیم سمیت منظر سے ہٹا دیا تھا اور ڈاک بنگلے سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے جیسے وہاں ان کا عمل دخل ہی نہ رہا ہو۔ وہاں ابھی تک فاریسٹ آفیسر نہیں آیا تھا اس لیے فی الحال وہاں قبضہ رکھنا ضروری بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا خطرہ انہیں اس طرف سے تھا کہ وہ اظفر کا کزن ہونے کی وجہ سے اس معاملے میں دلچسپی لے سکتا ہے لیکن اس کی طرف

[illegible] ذکر ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا تھا، اس لیے اُنہیں اطمینان ہو چلا تھا۔

''اس نئے اے سی سے عرس سے پہلے میری ملاقات کا انتظام تو کروا دو۔ بلاؤ کسی دن اُسے کھانے پر۔ تم اس کی طرف سے سب اچھا کی رپورٹ دے رہے ہو۔ میں بھی مل کر دیکھوں کہ کیسا بندہ ہے۔''

''چنگا سرکار! میں آپ کا پیغام اے سی کو پہنچا دوں گا۔ دیکھیے گا، سر کے بل دوڑا چلا آئے گا۔ پہلے ہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ چودھری صاحب امریکہ سے آ جائیں تو ان سے ملاقات کروں گا۔ ہمارے دیئے تحفے تحفے اس نے بہت خوش ہو کر لیے تھے۔''

''یہ چنگی گل ہے کہ وہ تحفے لے کر خوش ہونے والا آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو مٹھی میں لینا آسان ہوتا ہے۔ وہ تحفے لے کر خوش باش ایک طرف بیٹھا رہے گا، ہو رہم اپنے کام کرتے رہیں گے۔'' چودھری کو عمیر کے بارے میں جان کر خاصا اطمینان ہوا ورنہ جب تک شہریار یہاں تھا، اس نے ان لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اسمگلنگ اور کھالوں کی اسمگلنگ تو عرصہ ہوا بند ہو چکی تھی۔ دوسرے معاملات میں بھی اس کا عمل دخل تھا۔ اس وجہ سے حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ وہ ملک سے باہر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب شہریار تو نہیں تھا لیکن اس نے خفیہ اداروں کی جو تلوار اس کے سر پر لٹکا دی تھی، اس کی وجہ سے اسے بہت محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ عمیر کی طرف سے سہارا مل جاتا تو اسے اپنے کالے دھندوں میں آسانی ہو جاتی۔

''یہ کام تو آپ سمجھیں ہو گیا سرکار! اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو تو حکم فرمائیں۔'' منشی بلا کا چرب زبان اور عادی تھا۔ کام بھی خوب کرتا تھا اس لیے برسوں سے اس کی چودھری کے ساتھ اچھی نبھ رہی تھی۔ کبھی کبھار ناہی ہو بھی جاتی تو اس کی پچھلی خدمات کی وجہ سے چودھری زیادہ سختی سے گریز کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے موڈ کی خرابی کا منشی پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا اور اس کی خلاصی کر کے خود اٹھ کر زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عرس کے سلسلے میں چھوٹی چودھرائن کو ضروری ہدایات دینا لازمی تھا۔ وڈی چودھرائن ایک تو میکے سے بھی خاصی تربیت لے کر آئی تھی، دوسرے برسوں سے حویلی کا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھوں میں تھا اس لیے خاص مواقع پر اسے سرسری ہدایت کرنا کافی ہوتا تھا، باقی وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتی تھی۔ لیکن چھوٹی چودھرائن کی طرف سے وہ زیادہ مطمئن نہیں تھا کہ اتنے بڑے موقع پر اس کی کارکردگی اچھی ہو گی۔

''سلام چودھری صاحب!'' وہ جیسے ہی چھوٹی چودھرائن کی خواب گاہ میں داخل ہوا، وہ ہڑبڑا کر بستر سے اتری اور ادب سے اسے سلام کیا۔ چودھری نے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''بیٹھو۔'' اُس نے اجازت دی تو چودھرائن بھی مسہری پر ٹِک گئی لیکن انداز مؤدبانہ تھا اور چہرے پر تفکر [illegible] رہا تھا کہ چودھری نے آخر یہاں کا رُخ کیسے کیا ہے؟ عام طور پر تو وہ اسے ملازماؤں کی زبانی ہی پیغام [illegible] کرتا تھا اور ملاقات کا شرف بخشنے کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی بہت ضروری کام ہے۔

وہ ایک ایسی ماں کی بیٹی تھی جس نے حویلی کی روایات سے بغاوت کر کے اپنے لیے زندگی کی خوشیاں [illegible] کرنے کی جسارت کی تھی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی کے اتنے برسوں میں کئی باغیوں کا انجام دیکھ چکی [illegible] حویلی کی کرتا دھرتا وڈی چودھرائن کا انجام بھی اس کے سامنے تھا جس کی ساری خدمات اور حیثیت کو بھلا [illegible] چودھری نے فوری طور پر اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرتی رہتی تھی کہ جانے کب اُسے کشور [illegible] کوئی بری خبر سننے کو مل جائے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''حویلی کا سب انتظام سنبھال لیا ہے نا تُو نے؟..... کہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟'' اُس کے تفکر سے بے نیاز چودھری نے اس سے پوچھا۔

''کوئی پریشانی نہیں چودھری صاحب! ملازم سارے پرانے اور وفادار ہیں۔ سارے کام جیسے وڈی کی زندگی میں چلتے تھے، اب بھی ویسے ہی چل رہے ہیں۔ میں چنگی طرح سب کاموں کی دیکھ بھال ہوں۔'' اس نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

''تجھے ملوم ہے نا کہ سالانہ عرس ہونے والا ہے ہور اس موقع پر حویلی میں بھی وڈی مہمان داری ہے۔ اس کے لیے بھی تُو کوئی تیاری شیاری کر رہی ہے یا نہیں؟'' اس کی رپورٹ سے متاثر ہوئے چودھری نے سختی سے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں چودھری صاحب! منشی نے پہلے ہی مجھے پیغام بھجوا دیا تھا۔ رنگ و روغن ہور مرمت ش کے کام اس کے بندے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ساری صفائیاں ستھرائیاں اپنی نگرانی میں کروانی ہیں۔ نئے پردے اور چادریں وغیرہ بھی شہر سے منگوا کر رکھ لی ہیں۔ پنڈ کی عورتیں چاول ہور دو اناج کی صفائی کے لیے بھی روزانہ پابندی سے آ رہی ہیں۔ آپ ذرا فکر نہ کریں۔ عرس کے وقت سب رہے گا۔'' اس نے مؤدبانہ تسلی دی۔

''مجھے اطمینان تو دلا رہی ہے پر یہ گل کھوپڑی میں بٹھا لے کہ اگر مجھے کوئی شکایت ہوئی تو وڈی کی تیری بھی حویلی سے چھٹی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔'' چودھری نے ایسے سرد لہجے میں دھمکی دی کہ وہ کر رہ گئی اور بے ساختہ ہی اس کو مزید تسلیاں دینے لگی جنہیں سننے کے بعد چودھری نے اپنی طرف اسے خاصی ہدایات دیں۔ وہ اُس کی ہر بات کو گرہ میں باندھتی رہی۔

''سب چنگی طرح سمجھ گئی ہے یا نہیں؟'' آخر میں چودھری نے اس سے سوال کیا۔

''بالکل سمجھ گئی ہوں سرکار!'' اس نے فوراً جواب دیا۔ لیکن پھر بچے کے رونے کی آواز سن کر بری اُچھل گئی۔ آواز سن کر چودھری بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ ایک چھوٹا سا شیر خوار بچہ چودھرائن کے بستر کی جانب لیٹا رو رہا تھا۔ بچے نے بیڈ شیٹ کا ہم رنگ کمفرٹ اوڑھ رکھا تھا اس لیے کمرے میں موجود ہو باوجود وہ اس کی موجودگی کے بارے میں نہیں جان سکا تھا۔ اگر بچہ روتا نہیں تو وہ اب بھی بے خبری واپس لوٹ جاتا۔

''یہ کس کا بچہ ہے؟'' اس نے چونک کر چودھرائن سے سوال کیا۔

''اپنے بہزاد شاہ کا پُتر ہے۔ میرا اکیلے میں جی گھبراتا ہے تو کبھی کبھار اسے نیچے بلوا لیتی ہوں۔'' نے جواب ضرور دیا لیکن اتنی ہمت نہیں کر سکی کہ چودھری کی اجازت کے بغیر خود روتے ہوئے بچے بڑھ کر اٹھا لے۔

''اس کو اوپر ہی رکھا کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' بچے کے بارے میں جان کر اس کے احساسات ہو گئے اور یاد آیا کہ کچھ دیر قبل وہ مراد شاہ کو اپنا اکلوتا وارث قرار دے رہا تھا لیکن یہ حقیقت نہیں تھی ایک وارث یہ بچہ بھی تھا جو بظاہر تو بہزاد شاہ کا بیٹا کہلاتا تھا لیکن وہ یہ حقیقت جانتا تھا کہ بہزاد شاہ کارنامہ انجام دینے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اور خود اُس نے اپنے سفلی جذبات کی تکمیل کے لیے باپ رشتے کی دھجیاں اُڑائی ہیں اور اپنے ذہنی معذور بیٹے کی منکوحہ سے شرم ناک تعلق قائم کر کے دنیا ترین حرکت کی ہے۔

بہزاد شاہ کی منکوحہ فریدہ کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ اس کے حریف وڈیرے کی بہن تھی اور قسمت کی اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک طرف تو ذہنی معذور بہزاد شاہ سے فریدہ کا نکاح پڑھوا کر اپنے کو نیچا دکھایا، دوسرے فریدہ کو پامال کر کے اپنی کامیابی کا جشن مناتا رہا۔ یہ بچہ اس کے اسی ظلم اور کی نشانی تھا جس سے صرف وہی واقف تھا۔

''میں ابھی اسے اوپر بھجوا دیتی ہوں۔'' اس کے احساسات سے بے خبر چھوٹی چودھرائن نے بوکھلا کر جواب دیا۔

''اماں! بچہ کیوں اتنی بری طرح رو رہا ہے؟'' ابھی چودھرائن کے الفاظ اُس کے منہ میں ہی تھے کہ زوردار آواز سے کھلا اور فریدہ اندر داخل ہوئی۔ اندر آنے کے بعد وہ چودھری کو مکمل طور پر نظر انداز کی ہوئی بچے کی طرف بڑھ گئی اور اسے بانہوں میں اُٹھا لیا۔

چھوٹی چودھرائن اُس کی جرأت پر آنکھیں پھاڑے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر ملازماؤں فریدہ کو چودھری کی اندر موجودگی کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا اور اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں تھا کہ کوئی بنا اجازت اندر آ جاتا۔ لیکن فریدہ نہ صرف اندر آ گئی تھی بلکہ چودھری کی موجودگی کو نظر انداز کر بچے کو بھی گود میں اٹھا لیا تھا..... جبکہ چودھرائن خود اندر موجود ہوتے ہوئے یہ جرأت نہیں کر سکی تھی۔

''فریدہ! چودھری صاحب کو سلام کر۔'' اس نے فریدہ کو اس کی گستاخی کا احساس دلانا چاہا۔ بچے کو فریدہ نے نظر اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا۔

اس کی اس ایک نظر میں طنز، حقارت، نفرت..... کیا کیا نہیں تھا۔ بے حد و حساب بے ضمیر ہونے کے چودھری کو اس کی نظر نے اندر سے کپکپا کر رکھ دیا۔ ضمیر کی ملامت پر یا شاید دل بھر جانے پر اس نے سے اپنا گھناؤنا تعلق تو ختم کر لیا تھا لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ بات ختم ہو جاتی۔ کی نفرت بھری نگاہیں اس جیسے آدمی کو بھی اندر سے جھلسا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ وہاں کھڑا نہیں رہ فوراً ہی مُڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے چھوٹی چودھرائن، فریدہ کو اُس کی حرکت پر سرزنش کرتی رہی بے نیازی سے یوں سنتی رہی جیسے اس کے بجائے کسی اور کو یہ سب کہا جا رہا ہے۔

⊛----✪----⊛

ایک گاہک کی فرمائش پر اسے مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی ٹائیاں نکال کر دکھا رہی تھی کہ اچانک ہی کے آگے دائرے سے ناچنے لگے اور اسٹور میں موجود ہر شے گھومنے لگی۔

اس نے کوشش کی کہ کاؤنٹر کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچا لے لیکن خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی اس کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ نیچے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ نیچے بیٹھ کر اُسے بہت زور کی اُبکائی آئی اور ایسا الٹیاں اُلٹ کر باہر آنے لگی ہوں۔

''آر یو اوکے مہرین؟'' اس کے برابر والے کاؤنٹر پر موجود لڑکی کی نظر اس پر پڑی تو وہ تشویش سے لیکن اس میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ طبیعت اچانک ہی اتنی بری طرح بگڑی تھی کہ پسینے تھے اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

ساتھی لڑکی نے اُس کی حالت دیکھی تو لپک کر اس کے قریب آئی اور سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا گلاس میں پانی لے آئی۔ اس نے ایک گھونٹ پانی پیا تو طبیعت سنبھل گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس اثنا میں لڑکی انٹرکام پر کیش کاؤنٹر پر بیٹھے اسلم کو اس کے بارے میں اطلاع دے چکی تھی اور
حیران پریشان کھڑے گاہک کو ٹائیاں دکھانے لگی۔ اتفاق سے یہ ایسا وقت تھا کہ اسٹور میں زیادہ رش نہیں
اس لیے لڑکی کو اپنی جگہ چھوڑنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

''کیا ہوا ماہ!.....طبیعت کیسے خراب ہوگئی؟'' افتاں و خیزاں اسلم اطلاع ملتے ہی کاؤنٹر چھوڑ کر دوڑا
آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''بس ایسے ہی ذرا سا چکر آ گیا تھا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''ذرا سا چکر آنے میں رنگت ایسی زرد ہو جاتی ہے کیا؟.....تم اُٹھو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے
چلتا ہوں۔ تمہیں خود تو ذرا اپنا خیال نہیں ہے۔ ڈھنگ سے کھاتی پیتی تک نہیں ہو، ایسے میں کمزوری تو ہونی
ہے۔'' اس کے تسلی دینے کے باوجود اسلم کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ یہاں سے آف کرنے کے بعد چلیں گے۔'' وہ اپنے لیے اس کی محبت سے واقف
تھی، اس لیے زیادہ بحث نہیں کی۔

''آف ہونے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔ میں فون پر مصطفیٰ صاحب سے بات کر کے دو گھنٹے کی
لے لیتا ہوں۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور فوراً ہی مصطفیٰ خان سے موبائل پر رابطہ کر کے اجازت طلب کر
لگا۔ اس نے بلا تردّد اجازت دے دی۔ اجازت کا مسئلہ حل ہونے پر اس نے اپنی جگہ کسی اور کو ذمے
سونپی اور ماہ بانو کو لے کر روانہ ہوگیا۔

ہسپتال پہنچ کر اس نے لیڈی ڈاکٹر کو خود ماہ بانو کے بارے میں نہایت تشویش سے آگاہ کیا اور
ڈاکٹر اسے معائنے کے لیے کمرے میں لے گئی تو خود مضطرب سا باہر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے
دوبارہ بلایا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جبکہ ماہ بانو کچھ جھینپی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو مبارک ہو مسٹر اسلم! آپ کی مسز کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس پر آپ
ہوں..... بلکہ آپ کے لیے خوشخبری ہے کہ آپ کے ہاں نئے مہمان کی آمد آمد ہے۔'' وہ ایک ادھ
کی ایشیائی نقش و نگار رکھنے والی عورت تھی جس نے بہت جوش سے اسے یہ خوشخبری سنائی تھی۔ خبر سن کر
کھِل اُٹھا۔

''تھینک یو سو مچ ڈاکٹر! آپ نے واقعی مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ اب آپ میری مسز
سمجھائیں کہ بچے کی خاطر انہیں اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ اور اب یہ مکمل طور پر آرام کریں گی۔''
نے ماہ بانو پر محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

''صحت کا خیال رکھنے والی بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں انہیں مکمل ڈائٹ شیڈول بنا کر دے
جس پر سختی سے عمل کروانا آپ کا کام ہے۔ اس کے علاوہ آپ انہیں پابندی سے چیک اپ کے لیے بھی
لاتے رہیے گا۔ لیکن مکمل آرام والی بات غلط ہے۔ پریگنینسی کوئی مرض نہیں ہے جو عورت کو مکمل بستر
جائے۔ کسی پیچیدگی کی صورت میں بیڈ ریسٹ کا مشورہ دینے کے علاوہ ہم ماں بننے والی عورتوں سے
ہیں کہ صحت مند زندگی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے بالکل نارمل لائف گزاریں۔ کیونکہ ماں جتنی
رہتی ہے، اس کے اور بچے کی صحت کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ گھریلو کام کاج کے علاوہ اپنی
آسانی سے جاری رکھ سکتی ہیں۔ بس اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ زیادہ وزن نہ اُٹھائیں اور چلتے پھرتے
دھیان رکھیں کہ کہیں گرنے نہ پائیں۔'' ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اسے اچھی طرح سمجھایا پھر ڈائٹ پلان

ساتھ فولاد اور وٹامنز پر مشتمل دوائیں بھی تجویز کر کے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

''میں بہت خوش ہوں ماہ!.....سچ پوچھو تو میں خوشی سے ساتویں آسمان پر اُڑ رہا ہوں۔ میرے لیے یہ
بڑا خوشی کا مقام ہے کہ میری محبت کی نشانی تمہارے وجود میں سانس لے رہی ہے۔''

باہر نکل کر اس نے ماہ بانو کو اپنے ایک بازو کے حصار میں لے کر خود سے قریب کرتے ہوئے اپنی خوشی
اظہار کیا۔

جواب میں وہ کچھ نہیں بولی اور صرف خاموشی سے مسکراتی رہی۔ فی الحال وہ اسلم کی طرح خوش یا پُر جوش
ہونے کے بجائے عجیب سے احساسات کا شکار تھی اور قدرت کی کاریگری دیکھ رہی تھی جس نے عجیب طرح
پہلے اسے اسلم کے ساتھ نکاح کے بندھن میں باندھا تھا اور اب اولاد کی زنجیر بھی پیروں میں پڑنے جا
تھی۔ اس زنجیر کے بعد کہاں ممکن تھا کہ وہ پلٹ کر ماضی کی کسی یاد کو آواز دے سکتی یا اس محبت کے بارے
سوچ سکتی جس نے بارش کی پہلی بوند کی طرح اس کے دل کی سرزمین کو مہکایا تھا۔

⊛----✪----⊛

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس قافلے میں کُل سات افراد شامل تھے جن میں سے دو شہریار اور سلّو تھے۔ یہ اسمگلروں کا قافلہ جن کے لیے انڈیا اور پاکستان کی درمیانی سرحد عبور کرنا ایک معمول کی بات تھی۔

وہ دونوں اس قافلے کا حصہ اس لیے بنے تھے کہ بھارت میں رازدارانہ داخلے کا یہی سب سے مناسب اور کسی حد تک محفوظ طریقہ تھا۔

قافلے میں ان کی شمولیت کا انتظام کسی کیپٹن اظہر نے کروایا تھا۔ لیکن وہ بھی اس طرح کہ درمیان میں ایک دوسری پارٹی موجود تھی اور قافلے کو لیڈ کرنے والا اسمگلر قاسم یہی جانتا تھا کہ اسے جن دو لوگوں کو اپنے ساتھ بھارت لے جانا ہے، وہ بھیرو دادا کے بندے ہیں۔ اس کام کے لیے بھیرو دادا نے اسے بھاری رقم دی تھی اور ساتھ ہی یہ تنبیہہ کر دی تھی کہ اس کا کام صرف ان دونوں کو سرحد پار کروانا ہے۔ وہ کیوں اور کس لیے وہاں جا رہے ہیں؟ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قاسم نے اب تک اس بات کا خیال رکھا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی دورانِ سفر ان دونوں کے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھ رہے تھے۔ ان دونوں کی بھی پوری کوشش تھی کہ ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہ آئے کہ قافلے میں شامل دیگر افراد سے کسی قسم کی کبیدگی پیدا ہو۔ لیکن وہ باقی لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے گریزاں تھے۔ اور ضرورت کے علاوہ بات نہیں کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے پاس موجود سامان کے بیگز بھی کسی اور کو اٹھانے کی اجازت نہیں دی تھی اور خود اٹھاتے تھے۔ ان کا ابتدائی سفر جیپ میں طے ہوا تھا اور اس کے بعد وہ پیدل چلنے لگے تھے۔ قاسم نے انہیں بتایا تھا کہ پیدل صرف چند گھنٹوں کی مسافت ہے، اس کے بعد انہیں سواری کے لیے اونٹ مل جائیں گے۔ آبادی میں پہنچنے کے بعد یہ شہریار اور سلّو کی اپنی صوابدید پر تھا کہ کہاں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کر لیتے۔ فی الحال تو ان کا سفر جاری تھا اور ابھی انہوں نے سرحد پار نہیں کی تھی۔

پیدل چلتے ہوئے ان کے بیگز ان کے شانوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ موجود اسمگلر بھی اپنے شانوں سے بڑے بڑے تھیلے لٹکا رکھے تھے جن میں اسمگلنگ کا وہ عمومی سامان تھا جو بھارت اور پاکستان کے درمیان اسمگل ہوتا رہتا تھا۔ لیکن بھیرو دادا کے توسط سے شہریار کو پتہ چلا تھا کہ اس سامان کے ساتھ ساتھ قاسم کچھ نایاب ہیرے اور مورتیاں بھی خفیہ طور پر لے کر جا رہا ہے۔ عام حالات میں وہ قطعی یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی پاکستان کی نادر و نایاب اشیا کو یوں بھارت اسمگل کر ڈالے۔ لیکن فی الحال وہ جس اہم مشن پر تھا، اس کی خاطر ان اسمگلروں سے مفاہمت پر مجبور تھا۔

''فائق خان.....!'' قافلہ کچھ اس ترتیب سے چل رہا تھا کہ شہریار، سلّو اور ایک اسمگلر سب سے آگے تھے۔ پھر باقی چار افراد دو دو کی ٹولیوں میں اس طرح چل رہے تھے کہ قاسم سب سے پیچھے تھا اور اس نے

اس نے ہی شہریار کو جو کہ فائق خان کے نام سے سفر کر رہا تھا، پکارا تھا۔ اس کی پکار پر وہ اور اس کے ساتھی سلّو رک گیا۔ سلّو کا موجودہ نام پاشا تھا اور شہریار کی طرح اس کا حلیہ بھی کافی بدلا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے قاسم؟'' شہریار نے قاسم کے قریب آنے پر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''سرحد پار سے میرے ساتھیوں نے خبر پہنچائی ہے کہ آج رات سرحد پار کرنا خطرناک ہوگا اس لیے آج ہمیں اسی طرف ہی کہیں پڑاؤ ڈال لینا چاہیے۔ آج رات سرحد پر انڈین آرمی کی معمول سے زیادہ نفری اور نقل و حمل دیکھنے میں آ رہی ہے۔'' اُس نے پُرتشویش لہجے میں اطلاع دی جسے سن کر شہریار کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں اُبھر آئیں۔

''پریشان نہ ہو خان! یہ ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے اور ہم تھوڑا ٹھہر کر اپنا دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔'' اسے پریشان پا کر قاسم اسے تسلی دینے لگا۔

''اوکے، تم ان معاملات کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا ہوگا؟ رات تو اب ہو ہی گئی ہے۔'' شہریار نے فوراً ہی مطمئن ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی ہمیں کچھ دیر اور چلنا ہوگا۔ پھر ہم محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔'' قاسم نے اسے بتایا اور ان کا قافلہ ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ اس بار قاسم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جبکہ سلّو اور اس کا ساتھی پیچھے ہو گئے تھے۔

''لگتا ہے تم بھیرو دادا کے پاس نئے آئے ہو۔ میں نے پہلے کبھی اس کے آدمیوں میں تم دونوں کو نہیں دیکھا۔'' ساتھ چلتے چلتے قاسم نے اس کے ساتھ گفتگو چھیڑ دی۔

''ہم اس کے آدمی نہیں ہیں۔ ہم اپنی کسی ضرورت کے تحت بھارت جا رہے ہیں جس کے لیے ہم نے اس سے سرحد پار کروانے کی درخواست کی تھی۔ لیکن اس نے بتایا کہ اس کا قافلہ جانے میں ابھی ایک ہفتہ لگے گا۔ ہمیں جلدی تھی اس لیے اس نے تمہارے ساتھ ہمارا معاملہ کروا دیا۔'' شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور اندر ہی اندر ہوشیار ہو گیا کہ یہ شخص اپنی ابتدائی خاموشی کے بعد اب تجسس کے باعث مجبور ہو کر اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ تم دونوں اس فیلڈ میں نئے ہو اور اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہاں اگر تم چاہو تو اپنا مال مجھے دکھا کر مجھ سے یہیں سودا کر سکتے ہو۔ مال اچھا ہوا تو میں تمہیں اس کی بہت اچھی قیمت دوں گا اور تم بے کار میں سرحد پار کرنے کے خطرے سے بچ جاؤ گے۔'' قاسم نے نہایت مکاری سے اپنی دانست میں اسے خاصی پُرکشش پیشکش کی۔

''تمہارا شکریہ۔ لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا، اپنے طور پر خود کر لیں گے۔ تم سے ہماری بس ڈیلنگ ہوئی ہے کہ ہمیں سرحد پار کروا دو۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم کسی دوسرے معاملے میں دلچسپی لینے کے بجائے خود کو وہیں تک محدود رکھو جس کا تمہیں معاوضہ دیا گیا ہے۔'' شہریار نے اسے سخت لہجے میں تنبیہہ کی جس پر اس نے فوراً ہی اپنا رویہ بدل لیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

''برا کیوں مانتے ہو یار؟ میں نے تو ایسے ہی ایک آفر کی تھی۔ اگر تمہیں قبول نہیں تو کوئی بات نہیں۔''

اس کے بعد ان کا باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر وہ لوگ رک گئے۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا اور کسی ذی روح کی موجودگی کا گمان تک نہیں ہوتا تھا۔ قاسم کے ساتھیوں نے فٹافٹ سامان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں موجود خیمے نصب کیے۔ خیمے چھوٹے تھے جن میں دو آدمی ہی سما سکتے تھے۔ شہریار اور سلّو کو ایک ہی ملا، باقی میں قاسم کے ساتھی کسی نہ کسی طرح فٹ ہو گئے۔

خیموں کی تنصیب کے بعد انہوں نے ڈبوں میں بند خوراک سے اپنی بھوک مٹائی۔ اس تاریک وہ میں آگ جلانا خطرناک ہوتا اس لیے انہوں نے ٹھنڈے کھانے پر ہی اکتفا کیا اور کھانے کے بعد چائے کا تکلف بھی نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ قاسم اور اس کے ساتھیوں نے شراب نوشی ضرور شروع کر دی تھی دونوں کو بھی انہوں نے اس شغل میں شامل کرنا چاہا تھا لیکن دونوں ہی نے انکار کر دیا تھا۔ جس کے سے مزید اصرار نہیں کیا گیا اور مائع دودھ کے بند ڈبے پینے کے لیے دے دیئے گئے۔

قاسم اور اس کے ساتھی شراب نوشی کے دوران خوب فحش گوئی کر رہے تھے۔ شہریار نے سلّو کو اشا اور وہ دونوں اپنے ہاتھ میں پکڑے دودھ کے ڈبے لے کر اپنے خیمے میں چلے گئے۔ آگے انہیں نہ جانے تکلیفیں اُٹھانی تھیں اور کتنے دن رات جاگ کر گزارنے تھے، اس لیے بہتر تھا کہ آرام کا جو موقع مل اس سے فائدہ اٹھالیں۔ جلد ہی وہ دونوں سو گئے۔

سوئے ہوئے انہیں مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ خیمے میں تھرکتی ٹارچ کی روشنی نے فوراً ہی اسے احساس دلایا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ دم سادھے پڑا رہا۔ وہ شخص سلّو کے بیگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ قاسم کا ساتھی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ قاسم کے لالچ نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ ان کی لاعلمی میں ان کے سامان کی کروائے۔ اُس نے اُسے سبق سکھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص پر جا شاید ان کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھا اس لیے پوری طرح گرفت میں آ گیا اور اس کے بعد شہریار اسے سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اتنی بری طرح مارتا چلا گیا کہ اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اس کی سن کر دوسرے لوگ دوڑے آئے۔ انہوں نے گاما کو اس کی گرفت سے چھڑوایا۔

''چھوڑو فائق خان!..... کیا اُس کی جان لو گے؟'' قاسم نے اسے جھنجوڑا۔

''میں اپنے سامان پر بُری نظر ڈالنے والے کی جان نکال لوں گا۔ یہ رات کی تاریکی میں یہاں کرنے آیا تھا۔'' شہریار نے جان بوجھ کر غصے سے کف اُڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اسے اس کی غلطی پر کڑی سزا دوں گا۔ فی الحال ہم سفر میں ہیں اس لیے تم جانے دو۔ میں پر اس کا فیصلہ کروں گا۔''

قاسم نے اسے سمجھایا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ قاسم اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا کے باہر نکلنے کے بعد شہریار نے بے خبر سوئے ہوئے سلّو کی طرف دیکھا۔ اتنے ہنگامے میں اس کا سو حیرت انگیز تھا۔ فوراً ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ سونے سے پہلے انہیں جو دودھ کے ڈبے دیئے گئے ان میں یقیناً نیند کی کوئی دوا انجیکٹ کی گئی تھی۔ اتفاق سے اس نے وہ دودھ نہیں پیا تھا جبکہ سلّو پینے کی سے غفلت میں چلا گیا۔ وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ جو ہوا، اس میں قاسم کا ہاتھ تھا، یہ معاملہ سامنے آنے پر تصدیق ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی کے سفر میں قاسم اور اس کے ساتھیوں سے خود بھی ہوشیار اور سلّو کو بھی ہوشیار رہنے کی ہدایت کرے گا۔

باقی رات آرام سے گزر گئی۔ شاید قاسم اور اس کے ساتھیوں نے سمجھ لیا تھا کہ اندر موجود شخص ٹیڑھی ہے، وہ اتنی آسانی سے اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔

صبح سلّو بھی جاگ گیا لیکن کسلمندی اور سستی کی شکایت کرتا رہا۔ قاسم اور اس کے ساتھی چور بنے ہوئے رہے۔ البتہ شہریار نے سب کے سامنے سفر کی تھکن اور بے آرامی کو الزام دیتے ہوئے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دن کی روشنی میں آگ جلانے میں حرج نہیں تھا اس لیے قاسم کے دو ساتھیوں نے مل کر تازہ ناشتہ تیار کیا۔ ناشتے کے بعد وہ لوگ اپنی اپنی مرضی کے شغل میں مصروف ہو گئے۔ سرحد پار کرنے کے لیے رات کا اندھیرا ضروری تھا اس لیے انہیں سفر کا آغاز ابھی نہیں کرنا تھا۔ ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شہریار نے سلّو کو قاسم کی حرکت سے آگاہ کر دیا۔ وہ بیک وقت شرمندگی اور غصے کا شکار ہو گیا۔ معمولی اسمگلرز کے ہاتھوں بے بس ہو جانا اس کے لیے باعثِ شرمندگی تھا اس لیے بس نہیں چل رہا تھا کہ قاسم کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے۔ شہریار نے اسے ٹھنڈا کیا اور سمجھایا کہ مصلحت یہی ہے کہ فی الحال خاموشی اختیار کر لی جائے اور غیر اہم لوگوں سے اُلجھ کر اپنی توانائی ضائع نہیں کی جائے۔ سلّو نے اس کی بات سمجھ لی۔

سرِ شام اُن کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد قاسم نے انہیں بتایا کہ وہ اس زون میں داخل ہو گئے ہیں اور اب انہیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اُس کی ہدایت کے بعد ان لوگوں کے اعصاب خاصے تنے رہے لیکن خیر گزری اور وہ اس جگہ سے بھی گزر گئے۔

آگے ان لوگوں کا ٹھکانہ تھا جنہوں نے اُنہیں اونٹ مہیا کرنے تھے۔ وہاں انہوں نے کچھ دیر ٹھہر کر خود کو تازہ دم کیا اور پھر اونٹوں پر سوار ہو کر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔

شہریار کے لیے یہ سفر کا ایک نیا تجربہ تھا۔ اگر وہ اتنے دن عمر فاروق کی سخت تربیت میں نہ رہا ہوتا تو یہ سفر اُس کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا۔ سلّو البتہ اطمینان سے تھا۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی سختیاں دیکھی تھیں۔ پھر ''را'' والوں کی تربیت سے گزرا تھا اس لیے اسے کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ان کا سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ دُور بہت دُور معمولی سی روشنیاں نظر آنے لگیں۔

''یہ سرحد سے قریب ترین آبادی ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں بھی ہمیں کم از کم ایک گھنٹہ اور لگے گا۔'' قاسم نے اس کے قریب ہی اونٹ کو دوڑاتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

مزید پانچ منٹ گزر گئے۔

اچانک ہی وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور اچانک ہی سرچ لائٹیں جلا کر اُنہیں للکارنے لگے تھے۔

''بھاگو.....!''

شور وغل کے درمیان قاسم کی بلند دھاڑ سنائی دی اور پھر ہاں عجیب افراتفری مچ گئی۔ شہریار کا اونٹ بھی دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے اسے اونٹ پر جم کر بیٹھے رہنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی اور ہر لمحے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی پل نیچے گر جائے گا۔ اُس کا یہ اندیشہ اس صورت پورا ہوا کہ ایک فائر کی آواز گونجی اور ایک انگارہ سا اُس کے بازو میں گھس گیا۔ پھر اُسے مزید بھی فائر سنائی دیئے اور اُس کا بھاگتا ہوا اونٹ بھیانک آواز میں چیخا۔ انسانوں کی ہوس نے اُس معصوم جانور کو بھی جنگ کا ایندھن بنا دیا تھا۔ زخمی اونٹ نے بلبلا کر اُسے نیچے پٹخ دیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

اُن کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی اور عجب خوف کا عالم تھا۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس مشن پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکلنے سے قبل ہی اُسے باور کروا دیا گیا تھا کہ قدم قدم پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے اگر وہ حو
نہ رکھتا ہو تو پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس نے بہت دلیری سے اس پیشکش کو ٹھکرا کر آگے بڑ
فیصلہ سنا دیا تھا۔ اپنے اس فیصلے پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا لیکن وہ ایسے مرحلے پر نہیں مرنا چاہتا تھا کہ اس
اپنے مشن کے سلسلے میں کچھ کیا ہی نہیں تھا اور ابھی صرف بھارت کی سرزمین پر قدم رکھنے کی کوشش کر رہا
اُسے ان زخموں کی بھی پروا نہیں تھی جو ایک بارودی گولی کے بازو کو چوم جانے اور اونٹ کے خود کو پٹخ
کے باعث لگے تھے۔ زخموں کو تو وہ ہر مجاہد کی طرح اپنے لیے حقیقی میڈل سمجھتا تھا لیکن اس وقت اس
نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہی تھا کہ کسی طرح اس ناگہانی صورتِ حال سے بچ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جا
تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر سکے۔

بچنے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح وہ یہاں سے نکل کر دور دکھائی دینے والی آبادی تک
جائیں۔ سفر سے پہلے اس نے جو ضروری معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق نظر آنے والی قریب
آبادی ایک ایسا گاؤں تھا جس میں سکھوں اور ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی اور مسلمانوں کے چند ہی
پائے جاتے تھے۔ اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ لوگ اس آبادی میں پہنچ کر کسی مسلمان کے گھر میں داخل ہو
وہاں اُنہیں پناہ مل جائے گی۔ لیکن مسئلہ اُس آبادی تک پہنچنے کا ہی تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اسے
کے لیے مہیا کیا گیا اونٹ یہاں پٹخ گیا تھا۔

''سر! آپ میرے ساتھ آئیں۔'' اُسے گرے چند سیکنڈز ہی گزرے ہوں گے کہ اس نے اپنے
سلّو کی آواز سنی۔ وہ اپنے اونٹ پر سوار تھا اور اسے پکار رہا تھا۔ اس نے اونٹ کی طرف دیکھا اور بے بسی
سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ کوئی مشکی گھوڑا نہیں تھا کہ وہ جھپٹ کر اس پر سوار ہو جاتا۔ وہ اونٹ تھا جس پر اسی
سوار ہوا جا سکتا تھا کہ وہ نیچے بیٹھ جاتا۔

سلّو کو بھی یہ بات سمجھ آ گئی اور اس نے شدید خطرے میں ہونے کے باوجود اونٹ کو مہارت کے
نیچے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سلّو کو اونٹ کو بٹھاتے دیکھ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا تھا، اس لیے بنا وقت ضائع
سلّو کے پیچھے اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ سلّو نے فوراً ہی اونٹ کو کھڑا کر دیا۔ یہ عمل معمول کے مقابلے
دس گنا تیزی سے ہوا تھا اس لیے شہریار کو بہت زور کا جھٹکا لگا اور ابھی وہ اس پہلے جھٹکے سے سنبھلے نہیں پا
کہ اونٹ تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی رفتار حیرت انگیز تھی۔

''خود کو سنبھال کر بیٹھنا سر! اگر گر گئے تو میں دوبارہ آپ کو اٹھانے کے لیے نہیں رُکوں گا۔'' سلّو نے
مہارت سے اونٹ کو دوڑاتے ہوئے اسے وارننگ دی تو اس نے اپنے ہاتھوں کو مزید مضبوطی سے اونٹ
کوہان پر جما دیا اور کوشش کرنے لگا کہ خود کو ہر صورت اس صحرائی جہاز پر سوار رکھ سکے ورنہ یقیناً اسے
چانس ملنا مشکل تھا۔

''اپنا سر نیچے رکھنا سر! گولی اِدھر اُدھر لگے تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے اگر بھیجے میں گھسے تو پھر دوسری
کا ٹکٹ کٹ کر ہی رہتا ہے۔'' ان کے اردگرد فائرنگ کا سلسلہ اسی تواتر سے جاری تھا چنانچہ سلّو نے اونٹ
دوڑاتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی اور ان کے ساتھ قافلے میں شامل افراد خود کو بچانے کی کوشش میں مصروف
تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کوشش میں کتنے کامیاب ہیں اور کتنے گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔ وہ تو
سلّو جیسے پائلٹ کے پیچھے بیٹھا صحرائی جہاز کہلانے والے جانور کی پشت پر خود کو قائم رکھنے کی کوشش

مصروف تھا۔

یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ بے شک فائرنگ اور میگافون پر دی جانے والی وارننگ کی آوازیں اب
سنائی دے رہی ہیں لیکن ان کی شدت پہلے جیسی نہیں رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب ان کے قریب
گولیاں شوں کر کے گزرنے والی گولیاں لاپتہ ہو چکی تھیں۔ جس کا ایک واضح مطلب یہ تھا کہ وہ خطرے کی
سے دور نکل آئے ہیں۔ اس احساس کی تصدیق کے لیے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔

''خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے، پر اتنا موقع مل گیا ہے کہ ہم زندگی بچانے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔'' سلّو کی
بات بلا کی تیز تھیں۔ اس نے اپنا منہ آگے رکھنے کے باوجود اس کی حرکت کو محسوس کر لیا اور نہایت سنجیدگی
سے بولا۔ اس کی بات کی تائید کے لیے یہ امر کافی تھا کہ اس نے ابھی تک اونٹ کی رفتار کو کم نہیں کیا تھا۔ یہ
اس کی تیز رفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے بہت دور محسوس ہونے والی آبادی اب کافی قریب محسوس ہونے لگی
تھی۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ دس منٹ کے اندر اندر آبادی میں پہنچ جائیں گے لیکن اس کی توقع کے
برعکس دو چار منٹ مزید سفر کرنے کے بعد سلّو نے اونٹ کو روک دیا اور اسے نیچے بٹھانے لگا۔

''یہاں سے ہم پیدل چل کر گاؤں میں داخل ہوں گے۔ اونٹ پر گئے تو پہرے دار وغیرہ کی نظر میں آ
جائیں گے۔'' نیچے اُترنے سے قبل اس نے شہریار کو وضاحت دی جسے سن کر وہ سر ہلاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ نیچے
اترتے ہوئے اس کے زخموں نے شدید احتجاج کیا لیکن یہ وقت ایسی باتوں پر کان دھرنے کا نہیں تھا چنانچہ وہ
تکلیف کو نظر انداز کرتا ہوا سلّو کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

رات خاصی اندھیری تھی اور انہیں ایک دوسرے کے وجود بھی سایوں کی طرح ہی نظر آ رہے تھے۔
سلّو نے پہلے بیٹھے ہوئے اونٹ کو کھڑا کر کے ایک طرف ہنکایا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی پشت پر بندھا ہوا
بیگ اُتار لیا۔

''تم زخمی ہو اس لیے بوجھ میں اٹھا لیتا ہوں۔'' اس نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں کہا اور تیز تیز قدموں
سے چلنے لگا۔ شہریار بھی زخمی ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دینے کی پوری پوری کوشش کرنے لگا۔

''معاف کرنا، ساتھ کام کرنے میں آپ جناب کا تکلف کرنا مشکل لگتا ہے اس لیے میں نے تمہیں ''تم''
کہہ کر پکارا ہے۔'' تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے کہا تو انتہائی مخدوش حالات کے باوجود شہریار مسکرا دیا
اور بولا۔

''مجھے خود کو آپ جناب کہلوانے کا کوئی شوق بھی نہیں ہے۔ اس لیے تم اپنی سہولت کے حساب سے جو
چاہے کہہ کر بلا سکتے ہو۔''

''تھینک یو۔'' اُس نے اپنے اکھڑ انداز میں شکریہ ادا کیا لیکن لہجے میں انکساری کا نام و نشان تک
نہیں تھا۔

باقی کا راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔ گاؤں کی حدود شروع ہوئیں تو وہ دونوں زیادہ محتاط ہو
گئے۔ کچھ دیر قبل زوردار فائرنگ ہوئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود رات کے سناٹے
میں آواز گاؤں میں بھی سنی گئی ہو۔ ایسی صورت میں گاؤں والوں کے جاگتے ہوئے ملنے کا امکان تھا۔ چنانچہ
ان کی کوشش تھی کہ وہ فوراً ہی اندر داخل نہ ہو جائیں بلکہ پہلے دُور سے حالات کا جائزہ لیں۔ اس مقصد کے
لیے انہوں نے باہر سے ہی گاؤں کے گرد چکر لگایا۔ یہ بہت زیادہ آبادی والا گاؤں نہیں تھا اور اندازے
کے مطابق یہاں مشکل سے پچاس سے ساٹھ گھر موجود تھے۔ ان گھروں میں زیادہ تر نیم پختہ اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچے تھے جیسا کہ عموماً گاؤں دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔

ابھی وہ اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ یہاں ایک آدھ گھر ایسا بھی ہوگا جو گھروں کے مقابلے میں مضبوط اور پکا ہوگا اور وہاں گاؤں کا سردار اور اہلِ خانہ مقیم ہوں گے۔ انہیں سے تو خیر کیا لینا دینا تھا، بس اپنے لیے ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی جہاں وہ محفوظ رہ پاتے۔

شہریار کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی مسلمان کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ انہیں زیادہ سے پناہ دے دے گا۔ لیکن باہر سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس گھر میں مسلمان مقیم ہیں، سکھ یا ہندو۔ دُور دُور سے لیے گئے جائزے کے دوران البتہ وہ یہ اندازہ ضرور لگا چکے تھے کہ فائرنگ کے نتیجے میں کوئی شخص بیدار نہیں ہوا ہے۔ یا اگر ہوا بھی ہے تو اس نے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید سرحد سے قریبی گاؤں ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح کی فائرنگ وغیرہ سننے کے عادی تھے۔

اطمینان کر لینے کے بعد وہ دونوں آبادی کے اندر داخل ہو گئے۔ اب مسئلہ اس انتخاب کا تھا کہ کس میں داخل ہوا جائے۔ عام گھروں کی چند فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو جانا تو کوئی بڑی بات نہ تھی اور شہریار جائزہ لے رہا تھا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔

''ہمیں ان دو تین پکے مکانوں میں سے کسی میں پناہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' اس کے خیال کے بالکل برعکس سلّو نے سرگوشی میں اپنی رائے دی۔

''یہ تو سرداروں وغیرہ کے مکان ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے مکان میں گھسنا اور مکینوں کو قابو کرنا تھوڑا مشکل ہوگا۔ ان گھروں میں افرادِ خانہ کے علاوہ ملازمین اور اسلحے کی موجودگی کا بھی پورا پورا امکان ہے۔'' اس نے سلّو کی رائے کے جواب میں درپیش خطرات کا اظہار کیا۔

''یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہم اندر گھس کر پجیشن اپنے کنٹرول میں کر لیں تو کامیاب ہو گئے تو آگے کی ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔ ان سرداروں کی بڑی پہنچ ہوتی ہے۔ اگر ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آیا تو سردار کے گھر کی تلاشی لینے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔'' سلّو نے نہایت اطمینان سے بیان کیا جس کے بعد اسے اس کی تجویز قبول کرنی ہی تھی۔ ویسے بھی اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ جانتا تھا کہ سردار کے گھر میں اگر مسلح ملازمین موجود بھی ہوئے تو ان کے لیے انہیں سنبھالنا بڑی بات نہیں ہوگی۔ وہ جس تربیت کے بل بوتے پر ''را'' اور دیگر بھارتی ایجنسیوں سے نبرد آزما ہونے کا عزم دل میں لیے یہاں آیا تھا، اس کے سامنے بھلا کسی چھوٹے سے گاؤں کے سردار کے ملازمین اور اسلحہ کیا حیثیت رکھتے۔

شہریار کھلے دل سے اس کی تجویز قبول کرتے ہوئے اس پختہ مکان کی طرف پیش قدمی کر گیا۔ پورے گاؤں میں سب سے بڑا اور شاندار تھا۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اندازہ یہی تھا کہ مکین اس پہر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پہل سلّو نے کی اور پلک جھپکتے میں احاطے کی پانچ فٹ اونچی دیوار پار کر کے اندر کود گیا۔ شہریار نے بھی اس کی پیروی کی۔ لیکن ابھی وہ دیوار پر پہنچ کر دوسری طرف نہیں تھا کہ اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر تاریکی میں اُس کا ہیولا نظر آنے لگا۔ وہ کتا تھا اور جس دلیری سے سامنے آیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ مقابل کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے میں کمال رکھتا ہوگا۔ اگر اس وقت اس کے پاس سائلنسر لگا ہوا پسٹل موجود ہوتا تو وہ ایک فائر کر کے کتے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتا۔ لیکن اتفاق سے اس کا بیگ سلّو نے تھام رکھا تھا اور وہ فی الوقت غیر مسلح تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اُس کے پاس پنڈلی سے بندھا ایک خطرناک خنجر بھی تو تھا۔

اس نے فوراً اس خنجر کو کھینچ کر پنڈلی پر سے اُتارا اور کتے کی طرف اچھال دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ خنجر ہدف تک پہنچتا، کتا بری طرح پھڑکا اور پھر بے آواز زمین پر گر گیا۔ کتے کے گرتے ہی اس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔

سلّو اس دوران مُردہ کتے تک پہنچ چکا تھا اور اس کے بھیجے میں اُترا ہوا اپنا خنجر باہر نکال رہا تھا۔

''تم بھارتی کتوں سے نمٹنے کے لیے یہاں آئے ہو نا؟ تو سمجھو اس کام کا آغاز ہو گیا۔'' خون آلود خنجر کو کتے کے لمبے بالوں سے صاف کرتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف دیکھے بغیر مسخرے پن سے کہا۔

شہریار اُس کے ریمارکس پر کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر آگے بڑھا اور زمین پر جھک کر اپنا خنجر تلاش کرنے لگا اور اسے واپس اس کی جگہ پر باندھ لیا۔ کتے کے بھونکنے کا کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا اس لیے انہوں نے مزید پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ بے چارے کتے کی لاش وہیں ایک ڈھیر کی شکل میں پڑی رہی۔

اب وہ گھوم پھر کر احاطے میں موجود مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ مکان صرف ایک منزلہ ہی تھا لیکن اس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بہت مضبوط تھے اور سب کے سب اندر سے بند بھی، اس لیے ان دونوں کے لیے وہ اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اب دوسرا طریقہ یہی رہ جاتا تھا کہ وہ مکان کی چھت پر پہنچ جائیں اور وہاں سے اندر داخل ہونے کے امکانات کا جائزہ لیں۔

ایک منزلہ مکان کی چھت پر چڑھ جانا ان دونوں کے لیے ہی مشکل نہیں تھا۔ چنانچہ لمحہ بھر میں وہ اوپر تھے۔ شہریار کو البتہ اپنے زخمی بازو کی وجہ سے ذرا تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد اس نے بازو کو ہلا جُلا کر اپنی تسلی کر لی تھی۔ بازو کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا اور گولی ذرا سا گوشت پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم سے خون کا رساؤ بہرحال جاری تھا جس نے اس کی آستین کو رنگ ڈالا تھا۔ یہ اور بات کہ تاریکی کی وجہ سے فی الحال اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

''جی آیاں نوں۔ میں ادھر کھڑی تہاڈا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' ابھی وہ دونوں چھت پر پہنچے ہی تھے کہ نسوانی آواز سنائی دی۔

دونوں ہی نے بری طرح بھڑک کر آواز کی سمت دیکھا۔ اندھیرے کے باعث منظر زیادہ واضح نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑی عورت کا ہیولا دیکھ سکتے تھے۔ وہ جس طرح تن کر کھڑی تھی، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اچھے قد کاٹھ کی جوان العمر عورت ہے۔ آواز سے بھی وہ جوان ہی محسوس ہوئی تھی۔ سلّو نے پھرتی دکھاتے ہوئے اپنی گن نکال کر اس کا رخ عورت کی طرف کر دیا۔

''یہ بغیر آواز کے چلتی ہے۔ اگر تُو نے ذرا بھی شور مچایا تو تیرے بھیجے میں گولی اُتار دیں گے اور تُو کسی کو سلام ہونے سے پہلے اوپر پہنچ جائے گی۔'' اس نے دھیمی آواز میں غرّاتے ہوئے عورت کو دھمکی دی۔

''یہ تو کوئی گل نہ ہوئی جی۔ میں تہاڈا سواگت کر رہی ہوں اور تم مینوں مارنے دی دھمکی دے رہے ہو۔'' اس نے بڑے معصومانہ انداز میں شکوہ کیا اور پھر مزید بولی۔ ''اگر مینوں شور ہی کرنا تھا تو اس ویلے کرتی جب تم نے میرے کتے کو مارا تھا۔ کتنا سوہنا جناور (جانور) تھا۔ پر چھڈو، اساں تینوں معاف کیتا۔''

وہ عجیب و غریب کردار کی صورت میں اچانک ان کے سامنے آئی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس سے کس طرح نمٹا جائے۔ اگر وہ ان کے مقابلے پر کھڑی اُنہیں نقصان پہنچا رہی ہوتی تو اسے آرام سے زیر کر لیا جاتا۔ لیکن وہ تو ایسے باتیں بگھار رہی تھی جیسے ان کے استقبال کے لیے ہی وہاں کھڑی ہو۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں ہے اور وہ دونوں ہاتھ سامنے کیے بالکل نہتی کھڑی ہے۔ انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نڈر ہونے کے باوجود لہجہ دھیما تھا جیسے وہ خود بھی نہ چاہتی ہو کہ کوئی اس کی آواز سن سکے۔

''اب کیا کھڑے کھڑے میرا منہ ہی تکتے رہو گے؟ یہاں تک آئے ہو تو میرے ساتھ نیچے بھی چلو ذرا دھیان سے۔ نیچے گھر میں بہت لوگ ہیں۔ کوئی آواز سن کر جاگ بھی سکدا ہے۔'' وہ اس انداز سے جیسے پورا یقین ہو کہ وہ دونوں ضرور اس کے پیچھے آئیں گے۔

ہوا بھی یہی لیکن کچھ اس طرح کہ سلّو نے عورت کے عین پیچھے پوزیشن لے کر گن کی نال اس کی گ سے لگا دی اور دھمکی دی۔

''اگر تم نے ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے تم اپنی جان سے جاؤ گی۔'' ا اندیشہ تھا کہ عورت کے ذریعے انہیں ٹریپ کرنے کی کوشش نہ کی جا رہی ہو اور جب وہ نیچے پہنچیں تو مسلح ا ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں۔

''فکر نہ کرو بھائیاں جی! میں تہاڈے ساتھ کوئی چال نئیں چل رہی ہوں۔ میں تو بس تہاڈی مدد کر رہا ہوں۔ تم بس بالکل چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔''

اب عورت کی آواز پہلے کے مقابلے میں مزید دبی ہوئی تھی اور وہ اتنی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی واقعی لگتا تھا کہ وہ شدت سے اس بات کی متمنی ہو کہ اہلِ خانہ میں سے کوئی آہٹ سن کر جاگنے نہ پائے۔

سیڑھیاں اُترنے کے بعد وہ اُنہیں لیے دائیں ہاتھ کی طرف مڑ گئی۔ یہاں ایک قطار میں تین دروا نظر آ رہے تھے۔ تینوں ہی دروازے بند تھے۔ عورت پہلے دروازے پر رُکی اور اسے ہاتھ سے ہلکا سا دے کر کھولا۔ عورت کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ دونوں ذرا سا جھجکے کہ کہیں اس کمرے صورت چوہے دان میں نہ پھنس جائیں۔ لیکن اہم بات یہ تھی کہ عورت ان سے پہلے کمرے میں داخل ہوئی ا اگر وہ کمرہ ان کے لیے چوہے دان ہوتا تو وہ خود بھی ان کے ساتھ اندر پھنس جاتی۔ جبکہ اس کے انداز ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ کسی ۔ کہے پر انہیں پھنسانے کی کوشش کر بھی رہی تھی تو ا یہ خوف تو ہونا چاہئے تھا کہ اس کی جان مشکل میں پھنس جائے گی۔ لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ نظر نہ رہا تھا۔

عورت کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر پلنگ پر سوئے ہوئے مرد پر پڑی۔ سلّو تو ہی عورت کو کور کیے ہوئے تھا، شہریار جھپٹ کر مرد کے قریب پہنچا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر باہر نکال لیا۔

''اس کی چنتا نہ کرو۔ یہ بہت گہری نیند سو رہا ہے، ہور اگر اس کے سر پر ڈھول بھی بجاؤ گے تو جاگے گا۔'' عوت نے نہایت اطمینان سے انہیں مطلع کیا۔ اب تک وہ اندھیرے میں اس کا ہیولا ہی رہے تھے لیکن کمرے میں جلتی لالٹین کی روشنی میں اسے واضح طور پر دیکھنے کا موقع ملا تو دم بخود رہ گئے۔ مشکل سے بیس سال کی انتہائی خوب صورت لڑکی تھی جس کے کٹیلے نین اور رس بھری جیسے ہونٹ سادگی بھی دیکھنے والوں کو متوجہ کرتے ہوں گے۔ لیکن اس وقت تو وہ سولہ سنگھار کیے غضب ڈھا رہی تھی۔ ریشمی کام دار کُرتہ، ہم رنگ دھوتی، چنا ہوا چمک دار دوپٹہ، ناک، کان، گلے اور ماتھے پر سجا زیور، آنکھوں پڑے کاجل کے بڑے بڑے ڈورے اور ہونٹوں پر لگی سرخی کے ساتھ بانہوں میں چھنکتی چوڑیاں..... سب کر اعلان کر رہی تھیں کہ وہ نئی نویلی دُلہن ہے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اتنی طرح دار عورت کا شوہر پلنگ پر مدہوشی کی نیند سو رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' سلّو نے جو اپنے پیچھے دروازے کو پہلے ہی بند کر چکا تھا، اپنے اندازے کی تصدیق

ا ورت سے پوچھا۔

''یہ میرا پتی سربجیت سنگھ ہے۔ میں امرت کور ہوں۔ ہمارا ابھی چار روز پہلے ہی ویاہ ہوا ہے۔'' اس نے اب دیا تو اس کی آنکھیں اندرونی تپش کے تحت دہک رہی تھیں اور لہجے میں شدید تلخی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم ہمیں کھل کر اپنے بارے میں کچھ بتا دو اور یہ بھی کہ تم ہمیں اپنے ساتھ یہاں کیوں ا ہو؟'' یہ احساس ہو جانے کے بعد کہ یہاں فی الحال ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہ دونوں ہی ذرا اس ہو گئے تھے اور ایک موڑھے پر ٹکتے ہوئے شہریار نے اس سے یہ سوال کیا۔

''اپنا نام تو میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے، باقی بھی بتا دیتی ہوں۔'' وہ پلنگ پر اپنے پتی کی پائینتی سے ا گئی اور کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں بتانے لگی۔

''میرے ماتا پتا کا میرے بچپن میں ہی دیہانت (انتقال) ہو گیا تھا اور میں یہیں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوں۔ یہ میرے تاؤ جگجیت سنگھ کا گھر ہے۔ میرے تاؤ کی دو وہٹیاں ہیں جن میں سے وڈی سے تین ہور چھوٹی چار اولادیں ہیں۔ وڈی تائی کی اولادیں عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں اس لیے میری ان سے زیادہ ا تائی کے بچوں سے بنتی تھی۔ خاص طور پر دلجیت سنگھ اور آشا کور میرے پکے سنگی تھے۔ بچپن ہنستے کھیلتے اور ا کب بیتا کچھ پتہ ہی نہیں لگا۔ تاؤ اور چھوٹی تائی کا سلوک میرے ساتھ چنگا تھا، پر وڈی تائی نک چڑھی ا اور آنے بہانے سب بچوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھی۔ میں نے تو کئی واری اپنی چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر اس ا ہاتھوں بری طرح مار بھی کھائی۔ تاؤ کو میرے پٹنے کا دکھ بھی ہوتا تھا پر وہ وڈی تائی کو زیادہ کچھ اس لیے ا کہہ سکتے تھے کہ اس کا میکہ وڈا مضبوط تھا، ہور اس کے پیو اور بھرا ذرا ذرا سی گل پر لڑنے مرنے کے لیے ا جاتے تھے۔ وڈی تائی جیسی تھی، ویسے ہی اس کے بچے بھی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ گھلتا ا نہیں تھا لیکن رعب سب جماتے تھے۔ خاص طور پر یہ سربجیت تو بہت ہی لڑاکو اور غصیلا تھا۔ بلاوجہ ہی کبھی ا چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا تو کبھی بانہہ مروڑ دیتا۔ میں تکلیف سے روتی تو یہ ہنسنے لگتا۔ دلجیت سے میرا رونا نہ ا جاتا ہور وہ میری خاطر اس سے لڑنے کھڑا ہو جاتا۔ لیکن وہ وچارہ عمر ہور قد کاٹھ میں سربجیت سے بہت م تھا اس لیے ہر واری بری طرح مار کھاتا اور ہار جاتا۔

میں نے یہ حال دیکھا تو دلجیت کو بچانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو چپ چاپ سہنا شروع کر دیا۔ ا اپنے من میں پلتے دو جذبوں کو بڑھنے سے نہ روک سکی۔ ان میں ایک جذبہ سربجیت سے سخت نفرت کا تھا ا دوسرا دلجیت سے گہری محبت کا۔ دلجیت بھی میری ہی طرح مجھ سے بڑا پریم کرتا تھا اور ہم سوچتے تھے کہ ب بڑوں کے بعد ہمارے ویاہ کی باری آئے گی تو ہم ایک ہو جائیں گے۔ آشا ہمارے پریم کی رازدار تھی اور ا ہوتی تھی کہ میں اُس کی بھابو بن کر ہمیشہ اسی گھر میں رہوں گی۔ وہ چپکے چپکے مجھ سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتی ا تھی۔ مجھے دلجیت کا پریم ہور آشا کی چھیڑ چھاڑ دونوں ہی سے بڑا سرور آتا تھا ہور میں دن گنتی رہتی تھی ا کب وہ دن آئے گا جب ہمارے سپنے سچ ہوں گے۔ لیکن قسمت کی مار کہ وہ دن کبھی نہیں آیا ہور مجھے ا اچانک یہ خبر سننے کو ملی کہ وڈی تائی نے سربجیت کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا ہے ہور اب میرا ویاہ اس ہو گا۔

میں بڑا روئی تڑپی۔ دلجیت ہور آشا بھی پریشان ہو گئے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آشا نے چھوٹی تائی ا اپنی ماتا سے گل کر کے انہیں یہ راز بتایا کہ میں ہور دلجیت ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں ہور میں ا کے سوا کسی کی استری (بیوی) بننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ سن کر وہ گھبرا گئی ہور ایک دن اکیلے میں مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے کمرے میں بلا کر اپنی چنری میرے قدموں میں ڈال کر بولی۔ دیکھ امرت! دلجیت میرا ایک ہی پتر ہے اور اپنی تین بہنوں کا اکیلا سہارا ہے۔ اگر یہ گل کسی کو ملوم ہو گئی کہ تُو ہور دلجیت ایک دوجے سے پریم کرتے ہیں تو سربجیت میرے پتر کی جان کے پیچھے پڑ جائے گا۔ تُو جانتی ہے کہ وہ مزاج کا کتنا ہٹیلا اور خودسر ہے اس سے ذرا برداشت نہیں ہو گا کہ تُو اس کا رشتہ ٹھکرا کر دلجیت کا نام لے۔ وہ تجھے ہور دلجیت دونوں کو زمین میں گاڑ دے گا۔ اب تُو خود سوچ کر فیصلہ کر لے کہ چپ چاپ سربجیت سے ویاہ کر کے اس طوفان کو ٹال دیتی ہے یا فیر اپنی ہور دلجیت کی جان گنواتی ہے؟

مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن دلجیت کو کانٹا بھی چبھے، یہ گوارا نہیں تھا اس لیے بچپن میں دلجیت کو بھانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو خاموشی سے برداشت کر لیتی تھی، ویسے میں اس بار بھی چپ ہو گئی۔ دلجیت نے بہت کوشش کی کہ مجھ سے گل کر سکے۔ آشا کی زبانی اس نے مجھے کوئی پیغام بھیجے لیکن میں نے جواب دیا کہ میں بڑوں کے فیصلے پر خوش ہوں۔ یوں میں نے پریمی کو بچانے کے لیے اپنے پریم کو بھلا چڑھا دیا اور سربجیت کی دھرم پتنی بننا منظور کر لیا۔ ویاہ کے ویلے میرے من میں یہی تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح من پر جبر کر کے یہ رشتہ نبھا لوں گی لیکن سربجیت نے پہلی ہی رات یہ واضح کر دیا کہ وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس سے وفا کی جا سکے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ چنگی طرح جانتا ہے کہ میں ہور دلجیت ایک دوجے سے پریم کرتے ہیں اسی لیے اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تاؤ نے دُوجا ویاہ کر کے اس کی ماں کو تکلیف دی تھی اس لیے اس نے مجھ سے ویاہ کر کے چھوٹی تائی ہور اس کی اولاد کو تکلیف دی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں چونکہ بچپن سے ہی چھوٹی تائی کے بچوں سے قریب تھی اور ہر وقت ان میں کھیلتی کودتی رہتی تھی اس لیے وہ ان لوگوں کی طرح مجھ سے بھی سخت نفرت کرتا تھا ہور اسی نفرت کے کارن اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی نفرت ثابت بھی کر دی ہور میرے سارے پنڈے بھنبھوڑ ڈالا۔ ایہہ دیکھو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی دونوں آستینیں اوپر کیں تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے بھرے بھرے گورے بازوؤں پر جابجا زخم کے نشان ہیں۔ یہ نشان ایسے تھے جیسے کسی نے اسے دانتوں سے کاٹا اور نا ملوم سے نوچا ہو۔

"ایسے بہت سارے نشان میرے پورے پنڈے وِچ موجود ہیں ہور میں ان نشانوں کو ریشمی خوب صورت کپڑوں کے نیچے چھپا کر پھر رہی ہوں کہ کہیں دلجیت کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ اگر اسے ملوم ہو گیا کہ سربجیت نے مینوں اس بری طرح مارا ہے تو فیر کسی گل دی پروا کیے بغیر اس سے اُلجھ جائے گا۔ ہور میں ایسا نئیں چاہتی۔ ایہہ سربجیت ہے نا، ایہہ موقع دی تلاش میں ہے۔ دلجیت اگر ذرا بھی اُلجھا تو ایہہ اس دا جان لے لے گا۔"

اس نے ایک نفرت بھری نظر پلنگ پر بے خبر سوئے اپنے پتی پر ڈالی اور سسکنے لگی۔ ان دونوں ہی نے امرت کور کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ وہ اتنی پیاری اور نرم و گداز سی دوشیزہ حقیقتاً اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس کے شوہر نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ وہ یقیناً نہایت جاہل اور وحشی آدمی تھا جس نے ایک معصوم لڑکی کو ایک ایسی بات کے لیے نفرت کا نشانہ بنا رکھا تھا جس میں اس کا سرے سے کوئی قصور نہیں تھا۔

جگجیت سنگھ کی دو شادیوں میں امرت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ تو گاؤں، دیہاتوں کا ایک عمومی رواج

صاحبِ حیثیت و صاحبِ اختیار لوگ ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے تھے۔ امرت کور کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ سربجیت کے ننھیال والے بڑے ڈاہڈے لوگ تھے اور بہن کی حمایت میں بہنوئی کے سامنے کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگاتے تھے لیکن انہوں نے بھی یقیناً اس رواج کو سمجھتے ہوئے بہنوئی کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں کھڑی کی تھی ورنہ جگجیت سنگھ جو گھریلو معاملات میں بیوی سے دبتا تھا، دوسرا بیاہ کیونکر کر پاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی دوسری شادی کچھ خاص حالات میں ہوئی ہو اس لیے بھی اس کے سسرالیوں کو بولنے کا موقع نہ ملا ہو۔ بہرحال وجہ جو بھی تھی، انہیں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ امرت کور نے اُنہیں اپنے کمرے میں کیوں پناہ دی ہے اور وہ یہ ساری کہانی سنا کر ان سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے؟

"ایہہ سربجیت ہے نا، ایہہ کتنا کمینہ ہے..... تساں اس گل دا اندازہ کر سکدے ہو کہ اس نے جان بوجھ کے ویاہ سے پہلے ایہہ کمرہ اپنے لیے لیا کہ اس دے برابر والا کمرہ دلجیت دا ہے ہور یہ چاہندا ہے کہ دلجیت نوں تصور نال راتاں تڑپ تڑپ کے گزارے کہ اس دی محبوبہ برابر والے کمرے وِچ کسی ہور دی بانہاں میں ہے۔ اس نے مینوں یہ بھی بتایا ہے کہ دو چار سال بعد مجھ پر سوت لے آئے گا تے فیر اس دا انتقام پورا ہو جائے گا۔" اس نے ان پر مزید حقائق عیاں کیے۔

"ہمیں تمہارے حالات جان کر بہت افسوس ہوا بی بی! لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم یہ سب ہمیں کیوں بتا رہی ہو اور ہم سے کیا چاہتی ہو؟" اس رات کی صبح بھی ہونی تھی اور یقیناً صبح ہونے کے بعد ان کی امرت کور کے کمرے میں موجودگی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے بارے میں سوچے بغیر ساری رات اس کی داستانِ غم سنتے ہوئے گزار دیں۔ اسی لیے شہریار نے اس کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اسے قتل کر دو۔" اس نے اپنے پتی پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اپنی بات مکمل بیان کی۔ اس پل اُس کے خوب صورت نقوش والے معصوم چہرے پر بڑی سفاکی چھا گئی تھی۔ اس کی بات مکمل جان کر شہریار تو بالکل بھونچکا ہی رہ گیا البتہ سلّو نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اس کام کے بدلے ہمیں تم سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"تہانوں پہلے ہی مجھ سے فیدہ ہو رہا ہے۔ جب تساں نے چار دیواری پھلانگی تھی ہور کتا بھونکا تھا تو میں نے اپنی اکھاں نال سب دیکھیا سی پر شور نہ کیتا۔ ورنہ اس ویلے تم اتنے آرام نال نہ بیٹھے ہوتے۔ جس ویلے تساں نے گولی ماری ہے نا، وہ میرا پالتو کتا تھا۔ مینوں اس نال بڑا پریم تھا۔ پر مینوں مجبوری ہے۔ اس بدمعاش آدمی توں پیچھا چھڑان لئی مینوں اِک موقع ملیا ہے، جسے میں ضائع نئیں کر سکدی۔ تسی دسّو..... سودا منظور ہے؟ تسی اینوں ٹھکانے لگا دو، میں تہانوں گاؤں توں باہر نکال دوں گی۔" اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔

"تم بتاؤ کہ یہ اتنی گہری نیند کیسے سو رہا ہے کہ ہم اس کے سر پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں پھر بھی اس کی آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔" وہ لڑکی جو اب تک انہیں مظلوم لگ رہی تھی، اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کرتے دیکھ کر چالاک لگنے لگی اس لیے وہ ہرزاویے سے اس پر شک کرنے میں حق بجانب تھے۔

"اینوں شراب دی عادت ہے۔ تن راتاں سے ایہہ شراب پی کر مجھ پر ظلم کر رہا تھا۔ آج میں نے اس شراب نال افیم ملا کر پلا دی ہے اس لیے یہ مُردوں کی طرح پڑا سو رہا ہے۔ مینوں اس نال اتنی نفرت ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس دی جان بھی لے سکدی ہوں۔ پر فیدہ کی ہوگا؟ اس دے قتل دے الزام میں پھنس کر میری زندگی
خراب ہو جائے گی۔ پر اگر تسی اس کو قتل کر دو تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ودھوا (بیوہ) ہونے کے بعد یا تو
دلجیت سے ویاہ ہو جائے گا یا میں ساری حیاتی ایسے ہی ادھر پڑی رہوں گی۔ مینوں دونوں ہی گلاں منظور
پر اس دے سنگ رہنا وڈا مشکل ہے۔''

وہ سربجیت سے واقعی بڑی شدت سے نفرت کرتی تھی اس لیے اسے یہ بھی منظور تھا کہ چاہے وہ بعد
اپنے محبوب کو نہ پا سکے لیکن کسی طرح اس آدمی سے جان چھوٹ جائے۔ اُس کی پُرکشش پیشکش کے
شہریار تذبذب کا شکار تھا۔ سربجیت کتنا ہی ظالم اور کمینہ صفت سہی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس نے انہیں
نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی ان کے مقابل آیا تھا اس لیے ایک غیر متعلقہ آدمی کو قتل کر دینا اس کے بس
بات نہیں تھی۔ وطن دشمنوں کو انجام تک پہنچانا دوسری بات تھی لیکن اس کے پاس کسی کو باقاعدہ سازش کر
قتل کر دینے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی ایسے شخص کو جو ان کے سامنے ہوش و حواس سے بے گانہ
بے دست و پا پڑا تھا۔

''ہم تمہارا یہ کام کر دیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم ہمیں گاؤں سے باہر کیسے نکالو گی؟ کیا اس کام کے
دلجیت ہمارے ساتھ جائے گا؟'' شہریار کے برعکس سلّو مفادات کو ترجیح دینے والا تھا کیونکہ اس کی تربیت
انہی خطوط پر ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی امرت کور کی پیشکش قبول کر لی اور اپنے اندازے کی بنیاد پر اس
ایک اہم سوال کیا۔

''اونہوں۔'' امرت کور نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ ''دلجیت دا اس معاملے وچ کوئی تعلق نئیں ہے۔
خود تمہیں ادھر سے نکالوں گی۔ تم دونوں اس کو اٹھا کر اوپر چھت تے لے جاؤ ہور کتے کی طرح اس دے
وچ بھی گولی مار دو۔ میں تیار ہو کر ابھی آتی ہوں۔'' اس نے اپنا پورا پروگرام بنایا۔

''تم نے ہمیں پاگل سمجھا ہوا ہے کہ ہم اس طرح تمہاری بات مان لیں گے؟ تم جیسی عورت کا
بھروسہ ہے؟ جو عورت اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کر سکتی ہے وہ ہمارے ساتھ کیا رعایت کرے گی
چلا کہ ادھر ہم نے اوپر چھت پر تمہارے پتی کا کام تمام کیا اور ادھر تم نے شور مچا کر پورے گھر کو جگا ڈالا
طرح تم خود تو بچ جاؤ گی لیکن ہم پھنس جائیں گے۔''

''فیر تسی خود دسّو کہ کیا چاہتے ہو؟ ویسے میرا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نئیں ہے۔ تم چاہے
سمجھو پر جو آگ میرے تن من کو لگی ہے، اسے میں ہی جاندی ہوں، ورنہ میں کوئی بری عورت نہیں ہوں
سلّو کی سخت بات کا جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے لیکن وہ ذرا متاثر نہیں
اور اسی لہجے میں بولا۔

''تمہارے پتی کو چھت پر لے جا کر ٹھکانے لگانے کا کام میں اکیلا کروں گا اور میرا ساتھی تمہارے
ساتھ اسی کمرے میں رہے گا تاکہ اگر تم کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرو تو یہ تم سے نمٹ سکے۔''

''مینوں منظور ہے۔'' وہ فوراً راضی ہو گئی۔

اس کی رضامندی ملتے ہی سلّو نے لمبے چوڑے سربجیت کو پلنگ سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا
کمرے سے باہر نکل گیا۔ سربجیت کے قد و قامت کو دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ خاصا
رہا ہوگا جبکہ سلّو اس کے مقابلے میں ذرا کمتر نظر آتا تھا لیکن اس نے جتنے آرام سے سربجیت کو اٹھا رکھا
اسے دیکھتے ہوئے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ سے کہیں زیادہ وزنی بندے کو اٹھائے ہوئے

''تسی زخمی ہو۔ لاؤ میں مرہم پٹی کر دیتی ہوں۔'' سلّو کے باہر نکلنے کے بعد وہ شہریار کی طرف متوجہ ہوئی
اس کے زخمی بازو کو دیکھتے ہوئے پیشکش کی

شہریار کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن پھر بھی خاصا خون بہہ گیا تھا اس لیے بہتر تھا کہ اگر مرہم پٹی کا موقع
رہا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لے۔ اُس نے امرت کور کی پیشکش قبول کر لی۔

اس کی طرف سے رضامندی ظاہر ہوتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گئی اور اس کی آستین ہٹا کر جگ میں
سادے پانی میں کپڑا بھگو کر پہلے اس کے زخم اور اردگرد کے حصے سے خون صاف کیا۔

''ابھی میں پانی گرم کرنے رسوئی میں نئیں جا سکدی ہوں اس لیے اسی پانی سے کام چلانا ہوگا۔'' اپنا
کام جاری رکھتے ہوئے اس نے شہریار سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ اتنا بھی کافی ہے۔'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

''چنگی گل یہ ہے کہ گولی اندر نہیں گھسی ہے۔ بس گوشت کو تھوڑا نقصان پہنچا کر نکل گئی ہے ورنہ وڈی
مشکل ہو جاتی۔'' اب وہ اس کے زخم کو ڈیٹول سے صاف کرنے کے بعد اس پر کوئی مرہم لگا رہی تھی۔ شہریار کو
حیرت ہوئی کہ اس نے زخم دیکھ کر کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ زخم گولی لگنے کا نتیجہ ہے ورنہ عموماً گھریلو عورتوں کو
زخم کی شدبد نہیں ہوتی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ گولی کا زخم ہے؟'' اس نے اپنی حیرت کو سوال کا روپ دے ڈالا جس پر
امرت کور بہت دھیمی آواز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ایک ردھم تھا اور بالکل یوں لگتا تھا کہ کہیں دُور گھنٹیاں بج
رہی ہوں۔

''اس گھر دے جو مرد ہیں نا، ہتھیار ان کے لیے کھلونوں کی طرح ہیں ہور کھیل میں چوٹیں تو لگدی
ہیں۔ میں ایسی چوٹاں نوں دیکھ دیکھ کر ہی جوان ہوئی ہوں اس لیے چنگی طرح پہچانتی ہوں کہ یہ گولی کا ہی زخم
ہے بلکہ میں تو یہ بھی جاندی ہوں کہ تم سرحد پار سے آئے ہو، ہور سرحد پار کرتے ویلے ہی یہ زخم لگا ہے۔'' وہ
کی یہ یقین تھی کہ شہریار اسے جھٹلا نہیں سکا اور خاموش بیٹھا رہا۔

امرت کور نے بھی اسے نہیں چھیڑا اور خاموشی سے پٹی باندھنے کا کام مکمل کرنے لگی۔

''اب تسی منہ دوسری طرف پھیر لو۔ مینوں کپڑے وی بدلنے ہیں۔'' پٹی باندھنے کے کام سے فارغ ہو
اس نے شہریار سے کہا تو اسے اس کی بات پر عمل کرنا پڑا۔ لیکن منہ دوسری طرف پھیر لینے کے باوجود وہ
سے پوری طرح ہوشیار تھا کہ مبادا وہ اس پر پیچھے سے وار نہ کر دے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور صرف
کی سرسراہٹیں سنائی دیتی رہیں۔

''میں نے کپڑے بدل لیے ہیں۔'' ایک آدھ منٹ میں ہی اس نے اطلاع دی تو شہریار نے پلٹ کر
کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ریشمی سرخ جوڑا اتار کر اس کی جگہ مردانہ کپڑے پہن چکی تھی جو یقیناً اس کے پتی
کے تھے۔ اچھے قد کاٹھ کی ہونے کے باوجود یہ کپڑے اس کے جسم پر ڈھیلے ہو رہے تھے۔ کپڑوں کے
ساتھ اس نے اپنے سارے زیور، گہنے وغیرہ بھی اُتار دیئے تھے اور اب رگڑ رگڑ کر ہونٹوں پر موجود سرخی
اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لمبے بالوں کی چوٹی کو بل دے کر جُوڑے کی شکل میں تبدیل کرنا
شروع کر دیا۔ اسی لمحے سلّو بھی واپس آ گیا۔ اس کی آمد سے بے نیاز امرت کور نے جُوڑا بنانے کا کام مکمل کیا
اور پھرتی سے اپنے سر پر پگڑی باندھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حلیے کی اتنی تبدیلی سے وہ کچھ کچھ مرد لگنے لگی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی شخص اُسے دیکھتا
یہی سمجھتا کہ کوئی نوعمر لڑکا ہے۔ سلّو نے اس کا یہ حلیہ دیکھ کر سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے لیکن زبان
سے کچھ نہ بولا۔

''تم دونوں بھی اگر اس شہری لباس کی جگہ دھوتی باندھ لو تو چنگا ہوگا۔'' اس نے ایک اچھا مشورہ دیا۔
ان کی طرف سے رضامندی ملتے ہی انہیں بھی دھوتی کُرتے پر مشتمل ایک جوڑا فراہم کر دیا۔ سلّو اور شہریار
دونوں نے ہی اپنے کپڑے اُتارے بغیر اوپر سے دھوتی کُرتہ پہن لیا۔ اب وہ روانگی کے لیے تیار تھے۔ ان
اپنے پاس موجود بیگ شانوں پر لٹکا لیے تھے۔ اس موقع پر شہریار نے بھی اپنی گن اوپر نکال لی تھی کہ اگر
ضرورت پڑے تو فوری طور پر اسے استعمال کیا جا سکے۔

''تم چاہو تو اوپر چھت پر جا کر اپنے پتی کی لاش دیکھ سکتی ہو۔'' نکلنے سے قبل سلّو نے امرت کور
مایوسی کی۔

''اس دی لوڑ نئیں ہے۔ میں نے جو جوا کھیلنا تھا، کھیل چکی۔ اگے میری قسمت۔'' اس نے جواب دیا۔
انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بہت سنبھل کر چل رہی تھی اور اس کے چلنے
سے معمولی سی بھی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ یہ احتیاط وقت کا تقاضا تھی۔ ذرا بھی بداحتیاطی کی صورت میں
گھر کا کوئی فرد جاگ سکتا تھا۔ نتیجے میں ان دونوں کے ساتھ وہ بھی پھنس جاتی۔

دروازے کی کنڈی بے آواز کھول کر وہ تینوں باہر احاطے میں نکل آئے۔ امرت نے اپنے پیچھے
دروازے کو آہستہ سے بھیڑ دیا اور آگے بڑھی۔ پھاٹک کے قریب تین چار گھوڑے کھڑے تھے اور امرت کا
رخ اُنہی کی طرف تھا۔ جب وہ دونوں دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے اور گھر کے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈ
رہے تھے تو انہوں نے بھی ان گھوڑوں کو دیکھا تھا لیکن زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت ان کے ذہنوں میں
یہاں سے فرار کے بجائے پناہ لینے کا خیال بسا ہوا تھا اس لیے گھوڑے ناقابل توجہ ٹھہرے تھے۔ ایک حقیقت
یہ بھی تھی کہ گھوڑے جیسے پالتو اور وفادار جانور پر اپنی مرضی سے سواری کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اڑیل گھوڑے
تو ماہر سے ماہر سوار کو بھی مرضی نہ ہونے کی صورت میں لمحہ بھر کے اندر اپنی پشت سے پٹخ ڈالتے ہیں۔ لیکن اس
صورتِ حال مختلف تھی۔ ان کے خدشات کے برخلاف سرحدی محافظوں نے گاؤں میں داخل ہو کر انہیں تلاش
کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ وہ ان کے فرار ہو کر اس طرف آنے سے باخبر نہیں ہوئے
تھے یا پھر جتنوں کو پکڑ لیا تھا، اُنہیں ہی کارکردگی دکھانے کے لیے کافی سمجھا تھا۔ آخر اتنے تواتر سے غیر قانونی
طور پر سرحد کے آر پار آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا تو کہیں تو کوئی سقم یا غفلت کا عنصر کارفرما تھا کہ دونوں
طرف کے اسمگلرز اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔

گھوڑوں کے قریب پہنچ کر امرت کور نے ان میں سے ایک مشکی گھوڑے کے جسم پر ہاتھ رکھ کر اسے
سہلایا تو وہ یوں ہنہنایا جیسے اسے پہچان لیا ہو۔

''رکھو! تجھے ان دونوں پرونہوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ لے جائے گا نا؟..... دیکھ کوئی شرارت نہ
کرنا ورنہ دلجیت تیرے سے ناراض ہو جائے گا۔'' وہ گھوڑے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں
اس سے سرگوشیاں بھی کر رہی تھی۔ اس کی سرگوشیوں کو سن کر گھوڑے نے یوں سر ہلایا جیسے اس کی ساری بات
سمجھ گیا ہو۔

''اب تسی اس دے اوپر سواری کر سکدے ہو۔ یہ دلجیت دا گھوڑا ہے۔ ہور میری ہر گل سنتا ہے۔''

اس نے عجیب سے فخر کے ساتھ بتایا۔ یقیناً محبوب کے گھوڑے کا اپنا وفادار ہونا اس کے لیے باعثِ خوشی تھا۔

ان دونوں نے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً گھوڑے پر سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ان حالات
میں پیدل بھٹکنے کے بجائے ایک سواری کا میسر آ جانا نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ پہلے امرت کور سوار ہوئی۔ اس کے
بعد وہ دونوں بھی گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑی اچھی نسل کا طاقتور گھوڑا تھا جس نے آسانی سے
ان تینوں کا وزن سہار لیا اور امرت کے اشارے پر سبک رفتاری سے آگے بڑھا۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے
قبل امرت نے احاطے کا پھاٹک کھول دیا تھا چنانچہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ گھوڑے کی
باگیں فی الحال امرت کے ہاتھوں میں ہی تھیں اور وہ بڑی مہارت اور تیزی سے اسے آگے بڑھا رہی تھی جس کا
مطلب تھا کہ گھوڑا اس سے یونہی مانوس نہیں ہے بلکہ وہ باقاعدگی سے اس کی پشت پر سواری کرتی رہی ہے۔

گھوڑے پر شہریار عین اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا چنانچہ اس کے گداز جسم کی گرمی اسے اچھی طرح محسوس
ہو رہی تھی۔ امرت کور بڑی بھرپور عورت تھی۔ اسے سربجیت کی عقل پر افسوس ہوا کہ اگر وہ زور زبردستی سے اس
کو اپنا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اسے اپنی نفرت کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ سوتیلی ماں اور بھائی
سے انتقام لینے کے لیے تو اتنا بھی کافی تھا کہ امرت کور ان کی نظروں کے سامنے اس کی بیوی بن کر رہتی لیکن
اس فعل کا اندھا کم از کم اپنی اتنی حسین بیوی کے ساتھ تو انسان کا بچہ بن کر رہتا۔ اس نے بڑی حماقت کی کہ وہ
انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس بے قصور کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ پاؤں تلے دبائے جانے پر تو چیونٹی
بھی احتجاج کرتی ہے، امرت کور جیسی نڈر لڑکی کیسے یہ ظلم سہہ لیتی؟ اُس نے موقع دیکھتے ہی اپنی جان چھڑانے
کا جرأت مندانہ فیصلہ کر لیا اور یہ سربجیت کی بدقسمتی تھی کہ شادی کے صرف چار دن بعد ہی اسے یہ موقع مل
گیا تھا اور وہ دل بھر کر امرت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بھی نہیں بنا سکا تھا۔

''یہاں سے تسی سیدھے چلے جانا فیر موڑ آنے پر اُلٹے ہاتھ مڑ جانا فیر اس دے اگے.....'' اپنی سوچوں
میں گم اُسے پتہ بھی نہیں چلا اور امرت گھوڑے کو گاؤں سے باہر جانے والے راستے تک لے آئی۔ اس جگہ
گھوڑا روک کر وہ ان دونوں کو راستہ سمجھانے لگی۔

''اب مینوں ادھر سے واپس جانا ہوگا۔ تہاڈے سنگ زیادہ دور گئی تو پیدل واپس گھر جانے میں مشکل ہو
گی۔ بہت سمے بیت گیا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب لوگ جاگنا شروع ہو جائیں گے۔''

اپنی مجبوری بتاتے ہوئے وہ گھوڑے سے نیچے اُتر گئی۔ اس بار انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔
اس کا کہنا صحیح تھا کہ مزید اُن کے ساتھ آگے جانے کی صورت میں وہ مشکل میں پڑ سکتی تھی۔ اسے کسی کے
جاگنے سے پہلے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ صبح جب سب جاگ جاتے تو اسے ان کے سامنے ایک ایسی پریشان
بیوی کا کردار بھی ادا کرنا تھا جس کا شوہر آدھی رات کو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

جب گھر کی چھت پر سربجیت کی لاش دریافت ہوتی تو وہ بڑی آسانی سے رو دھو کر سب کو یہ یقین دلا سکتی
تھی کہ سربجیت اپنی شراب نوشی کی لت پوری کرنے اوپر چھت پر گیا تھا اور پھر جانے کیسے اور کس کی گولی کا
نشانہ بن گیا۔ گھر کے کھلے دروازے اور مشکی گھوڑے کا غیاب یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوتا کہ کوئی نامعلوم
افراد چھت کے راستے گھر میں داخل ہوئے تھے اور سربجیت کو ٹھکانے لگا کر اپنی راہ پر ہو لئے۔ رات
سرحد پر ہونے والی فائرنگ اور گرفتاریوں کی خبریں اُنہیں یہ بھی سمجھا دیتیں کہ یہ ساری کارروائی کرنے والے
لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں امرت کور پر کسی کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد
میں اس گھرانے کے لوگ سربجیت کے قاتل سے انتقام لینے کے لیے کیا کیا کر سکتے تھے اور کیا نہیں، یہ بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الگ معاملہ تھا۔ لیکن یہ بات تو طے تھی کہ امرت نے نہایت کامیابی سے اپنے ظالم شوہر سے پیچھا چھڑا لیا اور بہت ممکن تھا کہ وہ اپنے محبوب کو پانے میں بھی کامیابی حاصل کر لیتی۔

''اب تسی جاؤ، واہ گرو خیر کرے گا۔'' گھوڑے سے اُتر کر اس نے پہلے اسے دو چار تسلی آمیز تھپکیاں دیں پھر ان دونوں سے کہتی ہوئی خود واپس پلٹ گئی۔

اس کے قدم تیز اور مضبوط تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر وہیں کھڑے اس نڈر عورت کو دیکھتے رہے۔ اندھیرے اور تنہائی سے بے نیاز بڑی بے خوفی سے واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔ اس کی مضبوطی کو دیکھتے ہوئے اس بات پر یقین کیا جا سکتا تھا کہ قسمت نے اگر اسے اپنے محبوب دلجیت کا ساتھ عطا نہیں کیا تو دعوے کے مطابق وہ تنہا بھی زندگی کا سفر طے کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

بہرحال، ان کے لیے تو وہ راستے میں ملنے والی ایک ایسی داستان تھی جسے وہ زیادہ عرصہ اپنی یادداشت میں محفوظ بھی نہ رکھ پاتے۔ چنانچہ اس کے لیے مزید ٹھہرنا بے کار تھا۔ شہریار نے اس کی نظروں سے اوجھل ہونے سے قبل ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کی ٹاپوں سے اُٹھنے والی دھول میں کہیں گم ہو جانے والی امرت کور کو فراموش کر کے وہ دونوں ہوا ہو گئے۔ کامیابی تک پہنچنے کے لیے ابھی انہیں بہت منزلیں طے کرنی تھیں۔

⊛----✪----⊛

''صورتِ حال بہت خراب ہے سنتھیا!''

''میں جانتی ہوں سر! ہمیں ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ ایک طرف ریاض انور جیسا اہم مہرہ ہاتھ سے نکل گیا ہے تو دوسری طرف سلّو کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ پولیس نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ اپنے گھر سے غائب ہیں اور ہم کسی طور یہ تصدیق نہیں کر سکتے کہ آیا واقعی سلّو کی لاش ان کے حوالے کی گئی تھی یا نہیں۔ البتہ اس کے غائب ہونے سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پولیس والے غلط کہہ رہے ہیں۔ سلّو مرا نہیں بلکہ اب بھی اُنہی کی تحویل میں ہے۔ اور شاید پولیس اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے والدین کو استعمال کر رہی ہو۔ دوسری طرف ریاض انور کی موت بھی مشکوک ہے۔ اُس کے جس ملازم نے اسے آخری بار زندہ دیکھا تھا اس کا بیان ہے کہ ریاض صاحب اسے بہت پریشان نظر آ رہے تھے اور اس پریشانی میں کثرت سے شراب پی رہے تھے۔ اُن کے نئے لیکن سب سے قریبی ملازم نے انہیں شراب نوشی سے پرہیز کرنے کی نصیحت بھی کی تھی لیکن انہوں نے اسے بری طرح جھڑک کر رکھ دیا تھا۔

ملازم کے اس بیان کو سامنے رکھا جائے تو بظاہر یہی لگتا ہے کہ ذہنی دباؤ اور کثرتِ شراب نوشی کا باعث اچانک اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ ریاض کے معدے میں کثیر مقدار میں شراب کی موجودگی کا بھی پتہ چلا ہے لیکن پھر بھی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ ہے اور ریاض کی بیوی اور بیٹی نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ وہ بہت مضبوط اعصاب کا آدمی تھا اور اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ کسی پریشانی کی وجہ سے وہ اس حد تک ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا ہوگا کہ اس کی حرکتِ قلب ہی بند ہو گئی۔ میں اس معاملے کو ایک

ایسا سمجھتی ہوں تو مجھے ریاض انور کی موت بڑی مشکوک اور پُراسرار لگتی ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ جس روز انور جب اپنے اغوا کے بعد واپس آیا تھا تو ایک نوجوان محسن کی حیثیت سے اس کے ساتھ چپک کر آیا تھا۔ اُس وقت تک وہ اس کے ساتھ ایسے چپکا رہا تھا کہ ریاض نے ایک پل بھی اس کے بغیر نہیں گزارا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ نوجوان ریاض کی موت سے تھوڑی دیر قبل اپنے گھر والوں سے ملاقات کے بہانے وہاں سے چلا گیا تھا اور پھر نہ تو وہ واپس لوٹ کر آیا اور نہ ہی اس کا کوئی اتا پتہ ملا۔ جو ڈرائیور اسے چھوڑنے گیا تھا، اس کا کہنا ہے کہ وہ کئی گھنٹوں تک اس کی واپسی کے انتظار میں اس تنگ گلی کے کونے پر کھڑا رہا جس میں اس کو لے جانا ممکن نہیں تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور نوجوان واپس نہیں آیا تو ڈرائیور نے بیزار ہو کر سوچا کہ اس سے مل کر معلوم کر لے کہ اسے اور کتنی دیر لگے گی۔ نوجوان کس گھر میں گیا ہے، یہ تو وہ نہیں دیکھ سکا تھا البتہ اس کے نام اور حلیے کی بنیاد پر گلی میں آتے جاتے لوگوں سے پوچھتا رہا لیکن کسی نے بھی اس کے بتائے ہوئے نام اور حلیے کے شخص سے واقفیت کا اظہار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد ڈرائیور مایوس ہو کر واپس لوٹ گیا اور واپس کوٹھی پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ اس کا مالک اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

حالات و واقعات جس طرح ہمارے سامنے آئے ہیں، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نوجوان کسی خفیہ ادارے کا ایجنٹ تھا اور ریاض کے اغوا کے پیچھے بھی کسی خفیہ ادارے کا ہاتھ تھا جس نے اپنے ایجنٹ کو ریاض کے ساتھ نتھی کر کے اس کی رہائش گاہ پہنچا دیا۔ اس نوجوان نے اپنے قیام کے دوران کیا معلومات حاصل کیں، یہ تو کہنا مشکل ہے البتہ میں یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ریاض کی موت کا ذمے دار وہی ہے۔ میں جانتی ہیں کہ ایسے کیمیکلز اور ادویات کا وجود ہے جنہیں کسی مشروب یا غذا میں ملا دیا جائے تو انہیں استعمال کرنے والے کو علم ہی نہیں ہو پاتا اور وہ دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کیمیکلز میڈیکل سائنس کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں اور پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر کبھی یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ موت طبعی نہیں ہے۔ جیسا کہ ریاض انور کے کیس میں ہوا ہے اور اس کی موت کی وجہ ہارٹ فیل بیان کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کی وجہ سے پولیس نے اس مشکوک نوجوان کی تلاش میں بھی زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی ہے اور ریاض انور کی موت کو طبعی قرار دے کر اس کی فائل بند کر دی گئی ہے۔'' سنتھیا تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ ایک جملے کے جواب میں بولنا شروع ہوئی تو بولتی چلی گئی۔

''اٹس اوکے ڈیئر! ریاض انور کی موت یا سلّو کا غیاب ہمارے مسائل نہیں ہیں۔ ان مہروں کو ''را'' نے بساط پر کھڑا کیا تھا اس لیے ان کے پٹ جانے پر تشویش میں بھی انہی کو مبتلا ہونا چاہیے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ ان کی جگہ دوسرے افراد کو لے آئیں گے اور ہمارا کام چلتا رہے گا۔ تم ہمیشہ کی طرح بس اپنی اجتماعی سے اپنے حصے کا کام کرتی رہو۔ رہی حالات کی خرابی کی بات تو میں کچھ دوسرے معاملات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بلتستان میں ہمارا قائم کردہ سیٹ اپ تقریباً تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور بہت کم مدت میں ہم نے وہاں دوسرا بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ وہاں کے پہاڑوں میں موجود ہمارے خفیہ تربیتی کیمپ کی تباہی تو ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھی ہی لیکن اب ایک اور بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ گلگت میں ہمارا ایک بندہ بشیر اکبر کے نام سے برسوں سے اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مقاصد میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی مٹھی میں کر چکا تھا۔ اس کے بعض ساتھی تو اس پر یوں اپنی جان چھڑکتے تھے کہ اس کے حکم پر بلا تامل اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا سکتے تھے۔ لیکن اچانک ہی بشیر اکبر غائب ہو گیا اور ہم یہ بتاتے ہیں کہ اب اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ پاکستان کی کسی خفیہ ایجنسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہاتھ لگ گیا ہے۔'' وہ سنتھیا کو تفصیل سے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

''ویری بیڈ۔ یہ تو واقعی بہت بڑا نقصان ہو گیا۔ لیکن اس میں تھوڑی غلطی ہمارے پلاننگ کرنے والوں کی بھی ہے۔ اتنا بڑا سیٹ اپ صرف ایک شخص کیوں چلا رہا تھا؟ اور اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس شخص کے ہونے سے سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔'' سنتھیا کے لہجے میں افسوس کے ساتھ ساتھ ملامت بھی تھی۔

''ہمیں اس کمزوری کا احساس تھا لیکن ہم اس شخص کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا یہ ساری کامیابی اس نے تن تنہا حاصل کی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور تدابیر کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچا کہ اب سب کچھ اس کی مٹھی میں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ تنہا ایک سیٹ اَپ بنا سکتا ہے تو اسے بھی سکتا ہے اور واقعی وہ چلا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد کوئی اور نہیں بلکہ اس کا بیٹا اس کی جگہ لے۔ ہم اس کی ہر خواہش ماننے پر مجبور تھے کیونکہ اوّل تو اس کا خاندان بہت اثر و رسوخ والا ہے اور اس خاندان کی عظیم اسرائیل کے لیے بے پناہ قربانیاں اور خدمات ہیں۔ دوسرے وہ خود بھی اپنا آپ منوا چکا اور اس کی بات سے انحراف کرنا اس پر بداعتمادی تصور کی جاتی۔ لیکن اب ہم بہت بڑی مشکل میں ہیں کہ کس طرح اس کا کھوج لگائیں۔ کیونکہ اس کی تمام تر من مانیوں کے باوجود اس کے خاندان کا اصرار ہے کہ اس کے اس طرح غائب ہونے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔'' اس نے سنتھیا کو اپنا مسئلہ بتایا۔

''میرے خیال میں تو اس سلسلے میں اس کے نائب سے ہی کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہی تو ہے جو اس کے بعد سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے اور جس نے لوگوں کو باور کروایا ہے کہ بشیر اکبر اپنی مرضی سے ترک کر کے کہیں روپوش ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں کسی کی طرف سے شہ ملے بغیر اس نائب کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ بشیر کی جگہ لے سکتا۔ اسے کہیں نہ کہیں سے حوصلہ ضرور ملا ہے۔ شاید ان خفیہ اداروں کی طرف سے جنہوں نے کسی طرح بشیر اکبر تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنے میں کر رکھا ہے۔''

سنتھیا بہت تجربہ کار ایجنٹ تھی۔ اسرائیل کے مفادات کی خاطر اس نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس کی دی ہوئی قربانیوں میں ترکِ وطن، بھارتی شہری سے شادی، ''را'' میں شمولیت کے علاوہ اکلوتی بیٹی کلارا عرف ماریہ سے محرومی سرفہرست تھی۔ کلارا نے ڈاکٹر ماریہ کے روپ میں شہریار جیسے شخص کو عرصے تک خوب بے وقوف بنایا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سازش کے نتیجے میں اس کی بیوی تک بننے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن پھر شہریار کی خوش قسمتی سے اس کا راز فاش ہو گیا اور وہ کرنل توحید کو شیشے میں اتارنے کے چکر میں خود ماری گئی۔

سنتھیا کو اپنی اکلوتی بیٹی کے مرنے کا بہت دکھ تھا اور وہ تنظیم کے بڑوں کی طرف سے تل ابیب چلے جانے کی پُرکشش پیشکش کے باوجود صرف بیٹی کی موت کا انتقام لینے کے لیے یہاں رُکی ہوئی تھی۔ جیسی منجھی ہوئی ایجنٹ نے اگر حالات جان کر چند درست اندازے لگا لیے تھے تو یہ اتنے زیادہ تعجب کی نہیں تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم بھی انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ لیکن فی الحال اپنے کسی بندے کو اس کے پیچھے نہیں لگا سکتے۔ ہمیں شک بلکہ یقین ہے کہ اس بندے کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہو گی اس لیے ہم اپنے آدمی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔'' ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

''اس کے لیے میری خدمات حاصل ہیں نا۔ جو زہر سے نہ مارا جا سکے، اُسے گُڑ سے مارنے کا انتظام میرے پاس ہوتا ہے۔ عورت..... خوب صورت عورت دنیا کا ایسا خطرناک ہتھیار ہے، جسے جہاں چاہو چلا لو۔ میرے پاس چند بڑی اچھی تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کو میں اس باپ کے بچے کے پیچھے لگا دوں گی۔ پھر دیکھنا کمال کہ کیسے ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔'' اس نے بڑے یقین سے دعویٰ کیا۔

''تھینک یو سو مچ سنتھیا! اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو یہ بڑا کام ہو گا۔'' جذبات میں ڈیوڈ نے فون پر ہی اسے داد دی۔ وہ اس حرکت پر زور سے ہنسی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''یہاں حالات میں جو خرابی ہو رہی ہے، اس کے پیچھے کسی ایسی خفیہ ایجنسی کا ہاتھ لگتا ہے جس کے وجود سے ہم واقف نہیں ہیں۔ البتہ مجھے شک ہے کہ کرنل توحید کا اس ایجنسی سے گہرا تعلق ہے۔ پہلے تو میں انتقام کے چکر میں اس شخص کو بھسم کر دینا چاہتی تھی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اسے زندہ پکڑ کر اس سے اہم معلومات کا حصول ضروری ہے۔ تم کسی طرح یہ پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ وہ کہاں ہے؟ پھر میں اس کا بھی کوئی علاج سوچتی ہوں۔''

''اوکے، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جب تک اپنی پلاننگ پر توجہ دو۔'' ڈیوڈ نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو اس نے بھی ریسیور واپس رکھ دیا لیکن کچھ ایسے انداز میں کہ اس کے ہاتھ بھینچے ہوئے تھے اور وہ چشمِ تصور سے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچتا دیکھ رہی تھی۔ ●

⊛----✪----⊛

''عرس کی تیاریاں کیسی چل رہی ہیں اللہ کھا؟'' اپنے پسندیدہ گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھے چودھری نے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے ہوئے منشی سے پوچھا۔

''سب کام تسلی بخش طریقے سے ہو رہے ہیں سرکار! مزار میں جو چند چھوٹے موٹے مرمت کے کام تھے، وہ ہو چکے ہیں۔ صفائی ستھرائی بھی خوب ہو رہی ہے اور سجاوٹ کا سارا سامان بھی آ گیا ہے۔ اس بار میں نے شہر سے خصوصی لائٹیں بھی منگوائی ہیں۔ ان لائٹوں کو مرکزی ہال میں لگایا جائے گا۔ آپ دیکھئے گا کہ ان لائٹوں کو لگانے سے ہال کا ماحول کتنا پُر اثر اور نورانی سا لگنے لگے گا۔ باقی عطر اور دیگر خوشبویات عرس سے ایک دن پہلے ہی سارے مزار پر چھڑکی جائیں گی تاکہ عرس والے دن ان کا اثر باقی رہے۔ میں نے اس بار ایک خصوصی انتظام یہ بھی کیا ہے کہ جس پانی سے پیر صاحب کی قبر مبارک کو غسل دیا جائے گا، اس میں بھی کچھ خوشبوئیں ملا دی جائیں گی تاکہ جب بعد میں عقیدت مندوں میں اس پانی کو تبرک کے طور پر بانٹا جائے تو ان کا دھاک بیٹھ سکے۔ قبر پر چڑھائی جانے والی چادر کے سلسلے میں تو پہلے ہی اللہ آباد کے چودھری سے معاملہ طے ہو گیا تھا۔ چڑھاوے کی چادر اس کی طرف طے آئے گی۔''

منشی نے فوراً اسے تفصیلی رپورٹ دی جس میں چودھری کے لیے سب سے اطمینان بخش اطلاع چڑھاوے کی چادر کے حوالے سے تھی۔ قبر پر ہر سال چڑھائی جانے والی یہ چادر بہت خاص ہوتی تھی۔ اس کے لیے سبز رنگ کا نہایت قیمتی کپڑا استعمال کیا جاتا تھا اور اس کپڑے پر سونے کے تاروں سے مختلف آیات اور کلمات کاڑھے جاتے تھے۔ جب سے عرس کا سلسلہ شروع ہوا تھا، یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ چڑھاوے کی یہ چادر مختلف علاقوں دیہاتوں سے بطور تحفہ لائی جاتی تھی۔ بعض جگہ سے اسے واقعی عقیدتاً لایا جاتا تھا اور بعض کو چودھری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اثر و رسوخ سے مجبور ہو کر لانا پڑتا تھا۔

بظاہر یہ چادر کسی بھی گاؤں کے چودھری یا سردار کی طرف سے تحفے میں آتی تھی لیکن ایک سچ یہ بھی کہ عموماً کوئی بھی چودھری یا سردار اسے اپنے ذاتی خرچ پر تیار نہیں کرواتا تھا بلکہ اس کے لیے اپنی رعایا پر ڈال کر ان سے زبردستی کے چندے وصول کرتا تھا۔ چودھری افتخار اس حقیقت سے آگاہ تھا لیکن اس کے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے بس چڑھاوے کی چادر سے غرض تھی، چاہے کوئی سردار اسے اپنے خرچ پر بنواتا یا اس کے لیے اپنے مزاروں اور کمیوں کا خون چوستا۔ ہر سال موصول ہونے والی اس چادر کی وجہ سے ایک طرف عرس کی شان بڑھ جاتی تو دوسری طرف بھاری مالی منفعت بھی ہوتی۔ عرس پر عقیدت مندوں کی طرف سے نذرانے کے طور پر دی جانے والی رقوم اور سونے چاندی کے زیورات کا چڑھاوا الگ تھا۔ عرس پر ہونے والے بھاری اخراجات نکال کر بھی ان چڑھاووں سے اسے ٹھیک ٹھاک مالی فائدہ ہوتا تھا۔

اس موقع پر مختلف علاقوں سے بلائے گئے اعلیٰ عہدے داروں کی بہ حیثیت مہمان موجودگی ایک اور فائدہ تھا۔ وہ لوگ جہاں چودھری کی شان دیکھ کر اس سے متاثر ہوتے تھے، وہیں چودھری کو اعلیٰ حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں مدد ملتی تھی۔ یعنی عرس ہر طرح سے اس کے لیے ایک اہم موقع ہوتا تھا اس لیے اپنی تمام تر اُلجھنوں اور مصروفیات کی باوجود اس پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ اور سب سے زیادہ شامت منشی کی آتی تھی جسے وقتاً فوقتاً اس طرح کی رپورٹس پیش کرنی پڑتی تھیں جیسی اس نے ابھی پیش کی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ تُو جو مناسب سمجھ، کرتا رہ۔ میں نے تجھے سب سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے، پر کہیں کمی رہ گئی تو جان لے کہ میں کھال بھی تیری ہی کھینچوں گا۔'' منشی کے انتظامات کو سن کر خاصا اطمینان محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کو دھمکانا نہیں بھولا تھا۔

''کوئی کوتاہی ہوگی تو میں سزا پانے میں اُف بھی نہیں کروں گا۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔'' منشی نے فوراً ہاتھ جوڑ کر عاجزی و انکساری کا اظہار کیا۔ اس کا چودھری سے برسوں کا ساتھ تھا اس لیے وہ اس کے مزاج کو خوب جانتا تھا کہ اسے کس موقع پر کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔

''چل ٹھیک ہے، اب تُو ایسا کر کہ ڈرائیور سے کہہ جیپ تیار کر دے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آج میں جنگل کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ بہت دن ہوئے اُدھر کا چکر لگا کر کام کا جائزہ نہیں لیا۔'' اس نے ایک اور حکم جاری کیا اور دوبارہ کش لگانے لگا۔ دنیا کی بیش قیمت شرابیں، سگار اور پائپ وغیرہ استعمال کرنے کے باوجود اس کے لیے حقے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی تھی اور وہ جب بھی حویلی میں موجود ہوتا تھا، صبح نہار منہ حقے کے چند کش ضرور لیتا تھا۔

''جو حکم سرکار! میں ابھی جیپ اور بندے تیار کروا دیتا ہوں۔ پر اتنا یاد دلا دوں کہ آج آپ کے حکم پر میں نے نئے اے سی عمیر آفندی کو رات کے کھانے کی دعوت دے رکھی ہے۔'' تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے منشی نے دھیرے سے اسے یاد دلایا۔

''وہ ٹھیک ہے یار! میں نے کون سا باورچی خانے میں کھڑے ہو کر اپنی نگرانی میں اس کے لیے کھانا بنوانے ہیں۔ شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا تو فیر رات میں اس کے ساتھ کھانا بھی کھا لوں گا۔ بلکہ اگر راستے میں کوئی ہرن شرن ہاتھ لگ گیا تو وہ بھی اے سی کی دعوت میں اس کے سامنے رکھ دیں گے۔'' چودھری نے بے پروائی سے جواب دیا تو منشی اس کی تائید کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

چودھری ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب تیار ہو کر باہر نکلا تو حسب توقع جیپ تیار تھی۔ جیپ کے

ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح بندے مزید تیار تھے جو فی الحال اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دیتے۔ اگر اس کا شکار کا موڈ بن جاتا تو یہ دونوں اس میں بھی اس کا بھرپور ساتھ دے سکتے تھے۔

بہرحال، اس وقت وہ چونکہ باقاعدہ شکار کے لیے نہیں جا رہا تھا اس لیے اس کے ساتھ زیادہ ساز و سامان اور بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر بس افیون کے کھیتوں کا ایک جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ خود بھی حالات سے باخبر رہے اور اگر اوپر والوں میں سے کوئی رپورٹ طلب کرے تو اسے بھی قابل اطمینان جواب دے سکے۔

ڈرائیور اس کی منزل سے واقف تھا۔ چنانچہ جنگل میں داخل ہونے کے بعد اسے چودھری سے سوال کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی وہ خود اِدھر اُدھر بھٹکا اور سیدھا جنگل کے اس حصے کی طرف جیپ بڑھاتا گیا جس طرف افیون کے کھیت تھے۔

یہ کھیت جنگل کے ایسے حصے میں بنائے گئے تھے جہاں جنگل بہت گھنا اور تاریک ہو جاتا تھا اور عام لوگ اس طرف کا رخ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ گھنے درختوں اور پودوں کے بیچ سے گزرنے کے بعد انہیں کیسی انہونی دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ افیون کے یہ کھیت اتنی ہوشیاری سے تیار کیے گئے تھے کہ فضائی جائزہ لینے پر بھی نظر نہیں آ سکتے تھے۔ یہاں کام کرنے والے لوگ بھی مخصوص تھے اور ان میں سے کسی کو بھی اب تک چھٹی نہیں دی گئی تھی۔ خود اپنی مرضی سے کسی کے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کڑی نگرانی کا انتظام تھا اور چھپ کر وہاں سے نکلنے کی خواہش کرنے والا دوسری دنیا تو جا سکتا تھا، اپنے گھر نہیں۔

''اپنی جیپ وہیں روک لو ورنہ اسے تباہ کر دیا جائے گا۔''

مخصوص راستے پر بڑی احتیاط سے چلتی جیپ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کسی نے بلند آواز میں اس تنبیہ کی۔

اس آواز کو سن کر وہ سب چونک گئے اور ڈرائیور نے غیر ارادی طور پر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ کے رکتے ہی چودھری کے دونوں مسلح نمک خوار اُچھل کر جیپ سے اُترے اور اپنی رائفلز سنبھال کر ایسے اردگرد کا جائزہ لینے لگے جیسے بولنے والے کے نظر میں آتے ہی اسے گولی سے اُڑا دیں گے۔ لیکن وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ وہ بس اِدھر اُدھر نظر گھما کر ہی رہ گئے۔

''تم لوگ اور تمہاری جیپ ہمارے نشانے پر ہے۔ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہیں کی تو نتائج کی ذمے داری تمہارے اپنے اوپر ہوگی۔'' وہی نامعلوم سمت سے سنائی دیتی آواز ایک بار پھر گونجی۔

چودھری اور اس کے نمک خوار حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ جنگل کے اس حصے میں وہ ہمیشہ آزادانہ آتے جاتے رہے تھے۔ یہاں درختوں میں چھپے ہوئے پہرے دار ضرور موجود تھے لیکن وہ سب چودھری کے ہی آدمی تھے اور اس کی جیپ اور آدمیوں کو بخوبی پہچانتے تھے۔ پھر یہ کون پیدا ہو گیا تھا جو ان کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہا تھا؟

حیرانی اور غصے میں مبتلا چودھری کو یکایک یاد آیا کہ لنڈا نے اس سے جنگل کے اس حصے میں خصوصی حفاظتی انتظامات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں کوئی جدید تکنیک استعمال کی گئی ہے اور یقیناً یہ اس تکنیک کی نگرانی کرنے والا بندہ تھا جو اسکرین پر ان لوگوں کو دیکھ کر احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس شخص کے لیے چودھری، اس کی جیپ اور آدمی سب اجنبی ہی ہوں گے اسی لیے اس نے انہیں روکنے کی جسارت کی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس کو بتاؤ کہ تم چودھری افتخار عالم شاہ کے کارندے ہو۔ ہور چودھری صاحب خود جیپ میں ہیں۔'' خیال ذہن میں آتے ہی چودھری نے ڈرائیور سے کہا تو وہ لپک کر جیپ سے اُترا اور بلند آواز چودھری کے الفاظ دہرائے۔

''اس کے باوجود میں تمہیں آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو نئے رولز بنائے گئے ہیں کے مطابق چودھری صاحب کو بھی یہاں آنے سے پہلے اوپر سے اجازت لینی ہوگی۔ اگر اوپر والے چودھری صاحب کے آنے کی اطلاع دیں گے تو میں انہیں آنے کی اجازت دوں گا، ورنہ انہیں مایوس ہونا پڑے گا۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں ڈرائیور کی بات کا جواب دیا تو چودھری کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور آواز میں اپنے آدمیوں سے بولا۔

''تم تینوں جیپ میں آ کر بیٹھو اور آگے چلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کون مائی کا لعل میرا راستہ روکتا ہے۔'' اس کا حکم ملتے ہی ڈرائیور سمیت اس کے دونوں کارندے جھپٹ کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ جیپ کا انجن فراٹے کے ساتھ اسٹارٹ ہوا لیکن اس سے قبل کہ جیپ آگے بڑھتی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے اُٹھی۔ چند گولیاں جیپ کی باڈی پر بھی آ کر لگیں۔ چودھری کے کارندوں نے فوراً اپنی رائفلیں سیدھی کیں لیکن وہ فائر کرتے تو کس پر؟ وہاں نہ بولنے والا نظر آتا تھا اور نہ ہی فائر کرنے والا۔ جواباً بس وہ فائرنگ ہی کر سکے۔

''فضول میں اپنی گولیاں ضائع نہ کرو۔ تم ہواؤں میں فائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ جبکہ تم سے ہر ایک میرے نشانے پر ہے۔ میں چاہوں تو اپنی انگلی کی معمولی سی جنبش سے جیپ میں موجود ہر شخص کو پڑی اُڑا سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ چودھری صاحب میرے دشمن نہیں بلکہ ہمارے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک ساتھی کی حیثیت سے وہ تنظیم کے اصول و قواعد کی پابندی کریں گے۔ اسی طرح میں بھی تنظیم کا ایک رُکن ہوں اور جو ذمے داریاں مجھے سونپی گئی ہیں، ان پر عمل کرنے کا پابند بھی ہوں۔ آپ لوگ اجازت کے بغیر آئے ہیں اس لیے میں آپ کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔ اگلی بار اجازت لے کر آئیں تو دیکھئے گا، آپ کا یہاں کیسے استقبال ہوتا ہے۔ میں خود آپ سے اپنے آج کے رویے کے لیے معافی مانگوں گا۔ اُمید ہے کہ میری مجبوری آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی اور اب آپ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔''

فائرنگ کی آواز بند ہوئی تو فضا میں ایک بار پھر اس نادیدہ شخص کی آواز گونج اُٹھی۔ ابتدا میں اس کا لہجہ جارحانہ تھا لیکن پھر بتدریج اس کے انداز میں نرمی آتی چلی گئی۔ چودھری جو غصے سے کھول رہا تھا، اس کی بات سن کر سمجھ گیا کہ وہ کسی صورت اسے اپنی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا اور اگر اس نے اپنی ضد کی تو نتیجے میں ناکامی اور رُسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اندر ہی اندر شدید ذلت محسوس کرتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو جیپ واپس موڑ لینے کا حکم دیا۔ یہاں آنے سے قبل اس کا موڈ تھا کہ واپسی میں کچھ شکار میں بھی گزارے گا لیکن موجودہ صورتِ حال نے اس کے موڈ کا بیڑا غرق کر دیا تھا اس لیے وہ لوگ رُکے جنگل سے نکل گئے۔

واپسی کے سفر میں وہ بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ تعاون اختیار کرنے کے بعد اُسے بے تحاشا مالی فائدہ حاصل ہو رہا تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ شروع سے

اس کے ساتھ زور زبردستی سے کام لے رہے تھے۔ وہ جو منوانا چاہتے تھے، کسی نہ کسی طور منوا لیتے تھے اور چودھری کمنڈی کو اس کے بے اختیار ہونے کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، وہ اس گفتگو کا ردِعمل ہے جو اس نے فون پر کی تھی۔ لنڈا نے اسے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ یہ اس کی غلط فہمی ہے کہ جنگل میں موجود افیون کھیتوں پر اس کے آدمیوں کے کام کرنے کی وجہ سے اُسے وہاں کُل اختیارات حاصل ہیں اور وہ جب چاہے تنظیم کو مال کی سپلائی روک سکتا ہے۔ آج اُسے اس کی بے اختیاری کا عملی تجربہ بھی کروا دیا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ سارے انتظامات اس عرصے میں کیے گئے ہیں جب وہ پیر آباد سے دُور نیویارک میں موجیں کرتا پھر رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ الفا کی ایما پر کیا گیا ہوگا کیونکہ اس کی الفا سے براہِ راست بھی ایک دو جھڑپیں ہو چکی تھیں۔

الفا تنظیم کا با اختیار عہدے دار تھا۔ اس نے یہ بھانپ لیا ہوگا کہ چودھری بغاوت پر اُتر آیا تو ان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہی کھڑی کرے گا کہ ان کے کثیر سرمائے سے تیار کردہ افیون کے کھیتوں تک ان کی رسائی نہ ہونے دے۔ چنانچہ اس نے ایسے انتظامات کر دیئے کہ کھیتوں میں کام اور پہرے داری بے شک اس کے کارندے کرتے رہیں کنٹرول اس کے اپنے بھروسے کے آدمیوں کا ہو۔ وہ جدید ٹیکنالوجی سے تنظیم کا کرتا دھرتا تھا چنانچہ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا ہوگا کہ نگرانی کے لیے آلات اور کمپیوٹرائزڈ سسٹم کھیتوں کے اردگرد کے علاقے میں نصب کر دے۔

اس کام کے لیے زیادہ افرادی قوت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بس دو آدمی کافی ہوتے جو وقت کی تقسیم کر کے باری باری ڈیوٹی دے سکتے تھے۔ ان آدمیوں کو کچھ خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی ہوگی۔ بس مانیٹر پر نظر رکھنا جنگل کے مختلف ویوز دیکھتے رہتے ہوں گے جیسا کہ آج اُنہیں دیکھ لیا گیا تھا اور پھر حساس علاقے کی حدود میں داخل ہونے سے قبل ہی رک جانے کی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی۔ ان پر جس گن سے گولیاں برسائی گئی تھیں، وہ یقیناً کسی مناسب مقام پر پوشیدہ تھی جسے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھتا شخص ایک آدھ بٹن دبا کر اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر قادر ہوگا۔ عملی مظاہرہ اس نے چودھری اور اس کے کارندوں کو کر کے دکھا دیا تھا۔

اسی سبکی کے بڑے شدید احساس کے ساتھ حویلی پہنچا اور پہنچتے ہی منشی اللہ رکھا کو طلب کر لیا۔

''تجھے معلوم ہے منشی! کہ جنگل میں ہمارے پہرے دار کارندوں کے علاوہ کوئی اور بھی سکیورٹی سسٹم کام کر رہا ہے؟'' اس کا لہجہ غضب ناک تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''معلوم ہے سرکار! آپ کے حکم سے میں نے ہی تو سسٹم لگانے والوں کی پوری پوری مدد کی تھی۔'' منشی اس کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا تاہم بے حد احتیاط اور احترام سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں نے کب تجھے ایسا کوئی حکم دیا تھا؟'' چودھری دھاڑا۔

''میرے پاس ثبوت ہے سرکار! جو لوگ کام کے لیے آئے تھے، اُنہوں نے مجھے آپ کا لکھا خط دیا تھا۔'' منشی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔

''میں نے تجھے ایسا کوئی خط نہیں لکھا۔ جا مجھے وہ خط لا کر دکھا۔'' اب چودھری خود بھی اُلجھ گیا تھا اس لیے اسے ذرا کم والیوم میں دھاڑ کر حکم دیا۔

منشی تعمیل حکم کے لیے فوراً دوڑا اور چند منٹوں میں ہی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ خط اسے لا تھمایا۔ چودھری نے لفافہ کھول کر اندر موجود تہ شدہ کاغذ نکالا اور لمحہ بھر کے لیے خود بھی حق دق رہ گیا۔ کاغذ پر جو تحریر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود تھی، وہ سو فیصد اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی اور آخر میں اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ ہینڈ رائٹنگ اور د
اتنی کامل نقل کی گئی تھی کہ کچھ دیر کے لیے اسے بھی یہی شک گزرا کہ شاید خود اسی نے منشی کو یہ خط لکھا
حیرت اور بے یقینی کے عالم میں وہ اس خط کو پڑھنے لگا۔ اس خط میں واقعی منشی کو یہ احکامات دیئے گئے
وہ آنے والی ٹیم سے بھرپور تعاون کرے اور انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دے۔ آخر میں اسے
تنبیہہ کی گئی تھی کہ اس سارے معاملے کو فون پر ڈسکس نہ کرے کیونکہ فون کال ٹریس ہونے کا خطرہ رہتا
اس خط کو پڑھنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ منشی بے چارہ واقعی بے قصور تھا اور اس نے جو کچھ کیا تھا،
کا حکم سمجھ کر کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تیرا معاملہ تو مجھے سمجھ آ گیا۔ پر یہ بتا کہ ضلعی انتظامیہ کیسے بے خبر رہی؟ سسٹم لگانے
لیے اچھے خاصے بندے اور آلات یہاں تک لائے گئے ہوں گے تو کیا کسی نے ان سے کچھ نہیں پوچھا؟''

''پوچھتے کیسے سرکار؟..... سارا مال اور بندے اس کنٹینر میں آئے تھے جو پھل لے کر لاہور گیا تھا۔
جانتے ہی ہیں کہ واپس آنے والے ٹرکوں اور کنٹینروں کی اس طرح چیکنگ نہیں ہوتی جیسی یہاں سے
وقت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اے سی شہریار کے حادثے کا شکار ہونے
بعد کئی دنوں تک ضلع کا کوئی پُرسانِ حال ہی نہیں تھا۔ شہریار کی سختی کی وجہ سے اس کا عملہ اور پولیس
چوکس رہتے تھے۔ وہ نہیں تھا تو سب کو چھوٹ ملی ہوئی تھی اس لیے بھی کام بہت آرام سے ہو گیا۔'' منشی
اسے جواب دیا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے سرکار؟..... آپ کے انداز سے
لگ رہا ہے کہ جیسے آپ اس سارے معاملے سے لاعلم ہوں۔''

''تم ٹھیک سمجھے منشی!'' منشی کے سامنے اس نے اعتراف کیا۔ ''یہ سارا گیم بہت اوپر سے کھیلا گیا
میں نے جن لوگوں کے ساتھ یہ نیا بزنس شروع کیا ہے، وہ بلا کے خطرناک اور چالاک لوگ ہیں۔ انہوں
کب میری تحریر کا نمونہ حاصل کیا اور کیسے میرے دستخط ان تک پہنچے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم
کی ہوشیاری کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ انہوں نے وقت سے بہت پہلے ہی اپنا سارا ہوم ورک مکمل کر
تھا اور جیسے ہی انہیں لگا کہ یہ کام کر گزرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا ہے، وہ اپنا کام دکھا گئے۔ شہریار
اپنی کرسی پر موجود ہونے کی صورت میں وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی شریکِ راز بنانا
نہیں کیا کہ کہیں علاقے کے حکمراں کی حیثیت سے میں ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا نہ شروع کر دوں
بہت بڑا دھوکا دیا ہے ان خبیثوں نے مجھے..... لیکن تم دیکھنا، ایک دن میں انہیں اس بات کا جواب دے
رہوں گا۔''

وہ غصے کا اظہار کر رہا تھا لیکن چہرے پر ایسی بے بسی تھی جو پہلے کبھی منشی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس
کیفیت دیکھتے ہوئے وہ یہ پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکا تھا کہ آخر ماجرا کیا پیش آیا تھا۔

''آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں سرکار! آپ کا ساتھ دینے کے لیے ہم موجود ہیں نا۔ وقت پڑنے پر آپ
سا اشارہ کر کے دیکھئے گا۔ آپ کے جاں نثار آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔'' جو کچھ پیش آیا، اس کی سن
وہ ان آدمیوں سے بھی لے سکتا تھا جو چودھری کے ساتھ جنگل گئے تھے۔ فی الحال اسے سمجھانا اور سنبھالنا
ضروری تھا۔

''مجھے میری بلڈ پریشر کی دوا دو۔ میں دوا کھا کر کچھ دیر آرام کروں گا۔''

چودھری نے مزید اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بجائے دھیمی آواز میں منشی کو حکم دیا جس کی اس نے

کی اور دوا کے ساتھ پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یاددہانی کروانے والے
میں بولا۔

''یہ بہت اچھا ہو گا کہ ابھی آپ آرام کر لیں۔ رات کے کھانے پر میں نے آپ کی طرف سے نئے
میر آفندی کو مدعو کر رکھا ہے۔ آپ آرام کر کے شام تک اس کے آنے سے پہلے تازہ دم ہو جائیں
'' چودھری نے اس کی بات سنی اور خاموشی سے گولی منہ میں رکھ کر پانی کی مدد سے نگل لی۔ منشی کا مشورہ
تھا۔ نئے اے سی سے ملاقات اہم تھی اس لیے اس کا دماغی طور پر فٹ ہونا ضروری تھا۔

دوا کھا کر وہ جو سویا تو پھر شام کی ہی خبر لایا۔ منشی اللہ رکھا اس دوران اس کے ساتھ جنگل جانے
والے ملازمین سے معلومات حاصل کر چکا تھا چنانچہ پوری احتیاط رکھی کہ اس کی نیند میں ذرا بھی خلل پیدا
ہو۔ اس کے بگڑے ہوئے مزاج کے پیشِ نظر وہ پورا دن ایک ٹانگ پر کھڑا رہا اور عرس کے انتظامات
ساتھ رات ہونے والی عمیر آفندی کی دعوت کے اہتمام پر بھی بذاتِ خود نظر رکھی کہ کہیں کوئی کمی
اس سے برہم چودھری کو مزید برافروختہ نہ کر دے۔ یہاں تک کہ اس نے اتنی احتیاط رکھی کہ جب عمیر
پہنچا تو اس پر بہت زیادہ اپنائیت جتاتے ہوئے چپکے سے اس کے کان میں بھی یہ بات پھونک دی کہ
چودھری صاحب کا مزاج کسی وجہ سے معمول پر نہیں ہے اس لیے ان سے گفتگو کرتے ہوئے ذرا احتیاط
جائے۔

عمیر اس مشورے کو سن کر اندر ہی اندر تلملایا ضرور لیکن تاثرات سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے یہ مشورہ
گزرا ہے۔ اصل میں تو اس کے لیے چودھری سے ملاقات ہی ایک ناخوشگوار عمل تھا لیکن وہ چونکہ شروع
اس حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا کہ بے شک چلے گا اپنی راہ پر لیکن چودھری اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے
نہ لے گا۔ جنگل میں اپنے کزن اظفر اور اس کے ساتھیوں کی مشکوک موت کے بعد اس کے لیے
اس بات پر عمل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے بہترین نتائج کے حصول کے لیے صبر کا
ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اُسے اس ضلع میں تعینات کروانے والوں کا بھی یہی مشورہ تھا کہ کوئی واضح بات
آنے سے پہلے جذبات میں آ کر کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرے۔

اظفر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہلاک ہونے والے فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ملازم خالقو نے اپنے
لمحات میں جو چند الفاظ ادا کیے تھے، ان میں چودھری اور افیون کے الفاظ بہت واضح تھے جس سے اس
اور اس کے ساتھ دوسروں نے یہ نتیجہ تو ضرور اخذ کر لیا تھا کہ اظفر اور اس کی ٹیم کی ہلاکت میں چودھری کی
سازش کا عمل دخل ہے اور شاید منشیات کے مکروہ دھندے میں ملوث چودھری نے جنگل میں افیون کی کوئی
گاہ وغیرہ بنا رکھی ہے کہ وہ پہلے بھی جنگل کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ لیکن
حال وہ کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکے تھے۔ کرنل توحید کے جس نمائندے سے اُس کی اس سلسلے میں بات
ہوئی تھی اس نے اسے بتایا تھا کہ آج کل وہ لوگ دیگر معاملات میں بہت زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں اس
طور پر اس معاملے پر توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اس معاملے کو فراموش کر
ہیں کیونکہ عمیر کی اظفر سے رشتے داری اپنی جگہ لیکن اظفر اور اس کے ساتھی انہیں اس سے کہیں بڑھ کر
تھے اور وہ اپنے ساتھیوں کا قتل کسی صورت معاف نہیں کر سکتے تھے۔ بے شک کچھ تاخیر ہو جائے لیکن
اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچانا تھا۔

اُس سے یہ سب کہنے والے کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ وہ اس کے بیان کو قطعی طور پر سیاسی بیان قرار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دے سکا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ اس سے جو کہا گیا ہے، اس پر عمل بھی کیا جائے گا۔ دوسرے مشابرم خان کے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے بھی بے دست و پا تھا۔ بطورِ اے سی تو اُسے اپنی ذمے داریاں نبھانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا کہ دفتری معاملات میں عبدالمنان جیسا مخلص اور تجربہ کار پی اے راہنمائی اور معاونت دونوں فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا لیکن وہ جو اپنی ملازمت کے ساتھ ایک سائیڈ مشن دیکھ رہا تھا، اس کے لیے مشابرم خان کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ اسے علم تھا کہ شہریار کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے مشابرم خان بہت سے حالات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف ہے بلکہ مشکل حالات میں ساتھ دینے کے لیے ایک بہترین ساتھی بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے اسے اس کا شدت سے انتظار تھا لیکن وہ بھی آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں البتہ اسے اتنی اطلاع ضرور فراہم کر دی گئی تھی کہ ایک اہم معاملے میں اُلجھنے کی وجہ سے مشابرم خان مضروب ہے اور مکمل صحت یابی تک نامعلوم مدت کے لیے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہے گا۔

اتنے سارے اُلجھے ہوئے معاملات کے ساتھ اس نے چودھری کی دعوت بہت بے دلی سے اور صرف مصلحتاً قبول کی تھی اور یہاں آتے ہی اسے بتایا جا رہا تھا کہ قبلہ چودھری صاحب کا مزاج ذرا برہم ہے اس لیے گفتگو میں احتیاط برتی جائے۔ اس مشورے پر اسے غصہ تو بہت آیا لیکن پھر ضبط کر گیا۔

ادھر چودھری نے منشی کے اندازے کے برخلاف خود کو کافی سنبھال لیا تھا۔ بھرپور نیند لے کر اُٹھنے کے بعد اس نے سارے معاملے پر بہت ٹھنڈے دماغ سے غور کیا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ لِنڈا کو فون کر کے اپنی اس بے عزتی کے لیے اس سے شکوہ کرے لیکن پھر خود ہی ارادہ تبدیل کر لیا۔ حالات نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ لِنڈا اس سے محبت کے کتنے ہی دعوے کرے لیکن حقیقت میں وہ تنظیم کی وفادار تھی اور تنظیم کے مفادات کے برخلاف اسے کوئی فیور نہیں دے سکتی تھی اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس بے عزتی کو خاموشی سے پی لیا جائے اور ہوشیاری سے حالات پر نظر رکھی جائے۔

یہ صحیح تھا کہ وسیع اختیارات و وسائل رکھنے والی منشیات فروشوں کی اس تنظیم نے اسے وقتی طور پر زیر کیا تھا لیکن کوئی لمحہ ایسا بھی آ سکتا تھا جب اس کا داؤ چل جائے۔ خصوصاً الفا نامی بلا کو تو وہ موقع ملتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دینے کا ارادہ رکھتا تھا، البتہ اس موقع کی تلاش میں اسے ذرا صبر کرنا پڑتا۔ صبر اور انتظار کا دوانیہ اس حساب سے اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ مالی فوائد تو اسے اب بھی حاصل تھے اور کوئی خاص کام کیے بغیر اس کے فارن اکاؤنٹس میں کثیر سرمائے کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے دل و دماغ کو اس نکتے پر متفق کر لینے کے بعد اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا کہ وہ نئے اے سی عمیر آفندی سے خوشگوار موڈ میں ملاقات کرے چنانچہ حسبِ معمول کرّ و فر کی تیاری کے ساتھ اس نے عمیر سے بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔ عمیر بھی جواباً اس سے گرم جوشی سے ملا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''کیسے مزاج ہیں چودھری صاحب!..... منشی نے بتایا کہ آج آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اگر ایسا ہے تو آپ آج کا ڈنر کینسل کر سکتے تھے۔ ہم کسی اور دن اکٹھے ہو جاتے۔ ویسے بھی اب عرس کے موقع پر تو ہمیں یہاں آنا ہی تھا۔''

''ارے نہیں اے سی صاحب! ایسا بھلا کیسے ہوسکتا تھا کہ ہم خود دعوت دے کر اسے کینسل کر دیں۔ ویسے بھی میری طبیعت زیادہ خراب نہیں تھی، بس ذرا بی پی ہائی ہو گیا تھا۔ دوا کھا کر آرام کیا تو سیٹ ہو گیا۔ منشی نے آپ سے ایویں اس بات کا ذکر کیا۔ اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور کھلے دل سے آپ کا

اہلاً میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ رہی عرس کے موقع پر آنے کی گل تو وہ تو خیر نال آپ کو آنا ہی ہے۔ پر اُس دا اور اِس دعوت میں فرق ہے۔ عرس پر بہت مہمان آئیں گے لیکن آج کی دعوت تو خاص الخاص آپ کے لیے ہے۔''

مصافحے کے بعد عمیر کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے وہ بڑی اپنائیت سے اسے تھامے ہوئے حویلی کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرس میں شرکت کے لیے آنے والے عام لوگ ہوں گے۔'' عمیر کا خوامخواہ ہی دل چاہا کہ اس سے چھیڑ خانی کرے چنانچہ ایک ایسی بات کہہ دی کہ چودھری بوکھلا گیا۔

''نہ نہ اے سی صاحب! ایسی کوئی گل نہیں ہے۔ عرس میں جنہیں دعوت دے کر بلایا جاتا ہے، وہ سب میرے خاص دوست ہور عزیز ہی ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی گل الگ ہے۔ آپ اس ضلع کے کرتا دھرتا ہو۔ ہور ہم اس کے خدمت گار۔ اس لیے ہمارا آپ کا واسطہ پڑتا رہے گا۔ یہی سوچ کر میں نے مناسب سمجھا کہ تنہائی میں آپ سے ایک ملاقات کر لی جائے تاکہ ہم ایک دوسرے کو چنگی طرح سمجھ سکیں۔ عرس پر رش اور مصروفیات کی کل کر ملاقات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔''

''یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں چودھری صاحب! بس ایسے ہی ازراہِ مذاق ایک بات کہہ دی تھی۔'' اس کی بات سن کر عمیر نے اسے تسلی دی اور چودھری کو کھولنے کی خاطر بڑے دوستانہ انداز میں بولا۔

''آپ نے ہمارے اور اپنے تعلق کے حوالے سے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہمارا ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ بس اتنا یاد رکھیے گا کہ خدمت گار آپ نہیں، ہم ہیں۔ حکومت نے ہمیں آپ کی خدمت کے لیے ہی تو تعینات کیا ہے۔ اس لیے پلیز اگر آپ کو کہیں بھی کوئی مسئلہ ہو، مجھے ضرور بتایئے گا۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔'' چودھری کو بانس پر چڑھانے کے لیے وہ بھرپور انکساری اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کے روّیے کے باعث چودھری کی باچھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہمارے لیے کچھ کیا تو جواب میں آپ کو بھی ہماری طرف سے مایوسی نہیں ہو گی۔'' وہ اتنا پُرجوش ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر یقین دلانے لگا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ کے اس دعوے کو بھی آزما کر دیکھیں گے۔ لیکن فی الحال تو ایک ایسا سا مسئلہ ہے، آپ اس سلسلے میں کرم فرما دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں آپ کو اس سلسلے میں تکلیف تو نہیں دینا چاہتا لیکن مجبوری ہے کہ مجھے بھی اوپر والوں کو رپورٹ دینی ہوتی ہے۔''

''آپ مسئلہ بتائیں کہ کیا ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ چنگی بجاتے میں حل کر دوں گا۔'' اس کے روّیے کا چودھری پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اس سے ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار نظر آنے لگا۔

''مسئلہ گاؤں کے اسکول اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کا ہے۔ اسکول میں ٹیچرز نہیں ہیں اور وہاں خاک اُڑ رہی ہے اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کی صحت کے مسائل بڑی تعداد میں سامنے آ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ہی دو خواتین کو الیفائیڈ لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کے باعث زچگی کے دوران موت کا شکار ہوئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی طرف سے کچھ رکاوٹیں ہیں اس لیے اسٹاف نہیں آ رہا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ میڈیا کا دور ہے۔ اب بھی اے اے منشا نامی جرنلسٹ نے ان دونوں ایشوز کو لے کر مجھ پر خاصی لعن طعن کی ہے کہ بطور اے سی میرا فرض بنتا ہے کہ ان دونوں مسائل کو فوری طور پر حل کر دوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بڑی خوب صورتی سے چودھری کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر چودھری ظاہری پراشتعال میں آ گیا اور بولا۔

''یہ خوامخواہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ میں بھلا کیوں نہ چاہوں گا کہ میرے پنڈ میں تعلیم صحت کے مسائل حل ہوں؟ لیکن کوئی ڈھنگ سے کام کرنے والا تو ہو۔ آپ سے پہلے والے اے سی کہیں سے فنڈز حاصل کر کے اسکول اور مرکزِ صحت کے لیے عمارتیں تو بے شک بنوا دی تھیں لیکن افسوس کہ ڈھنگ کا اسٹاف نہیں رکھ سکا اسکول میں پڑھانے کے لیے وہ جانے کن اوباش لونڈے لپاڑوں کو لے آیا سننے میں آیا تھا کہ وہ لڑکے پڑھانے سے زیادہ گاؤں کی عورتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اپنی بہو، بیٹیوں پر نظر کون برداشت کرتا ہے بھلا؟ مجھے صحیح سے نہیں معلوم پر سننے میں آیا تھا کہ ان چھڑے چھانٹ ٹیچروں نے کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اس کے گھر والوں نے انتقاماً چپکے سے اس گھر میں آگ لگا دی جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ دونوں ہی جرائم چونکہ ثابت شدہ نہیں ہیں، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ البتہ پچھلے اے سی نے اس کیس میں خوامخواہ میری گردن پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی کوشش میں خیر وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور بعد میں اس نے مجھ سے مصالحت کر لی تھی۔ میں بھی چپ ہو گیا کہ چلو دو۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بعد میں اے سی صاحب کی اپنی ساس صاحبہ اسکول میں پڑھاتی رہیں اور ان کی بیگم مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر رہی۔ بعد میں جانے کیا ہوا کہ اے سی کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی یہاں سے غائب ہو گئیں۔ ان کے غائب ہونے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ عیسائی ماں بیٹی میرے پنڈ کی عورتوں اور بچوں کو خراب کر رہی تھیں۔ ماں استانی بن کر مسلمان بچوں کو نہ جانے کون کون سی تعلیمات دے رہی تھی اور بیٹی ڈاکٹرنی کے روپ میں عورتوں کو اُلٹے سیدھے مشورے دے کر انہیں بچے پیدا کرنے سے روک رہی تھی۔ میں اس گاؤں کا جاگیردار بھی ہوں اور روحانی پیشوا بھی۔ یہاں کچھ ہوتا ہے تو لوگ میرے پاس فریاد لے کر آتے ہیں۔ گاؤں کے مردوں نے یہ معاملات میرے سامنے رکھے تو میں نے ان کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کر دیا کہ اب اسکول اور مرکزِ صحت میں بغیر چھان پھٹک کیے اسٹاف نہیں رکھا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری طرف سے شدید مزاحمت ہو گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس میں غلط کیا ہے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو تعلیم کے نتیجے میں لامذہب ہوتے اور اپنی عورتوں کو مسلمانوں کی نسل کشی میں حصہ دار بنتے دیکھتے رہیں؟ اس گاؤں کا کوئی بھی فرد اس قیمت پر تعلیم اور صحت نہیں چاہتا اور میں صرف ان کی ترجمانی کرتا رہا ہوں۔''

وہ بولنے پر آیا تو جھوٹ کے انبار پر انبار لگاتے ہوئے اپنے حق میں کہانی بناتا چلا گیا جس سے وہ متاثر تو خیر کیا ہوتا لیکن مصلحت کے تحت نرمی سے بولا۔

''آپ کا مؤقف بالکل ٹھیک ہے چودھری صاحب! اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے علاقے کے لیے ٹیچنگ اسٹاف اور لیڈی ڈاکٹر کا تقرر کرتے ہوئے پوری احتیاط برتوں گا۔ بلکہ آپ چاہیں تو خود بھی ان لوگوں سے مل کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔ بس میری اتنی گزارش ہے کہ یہ دونوں کام ہو جانے چاہئیں۔ کیونکہ نہ ہونے کی صورت میں میرے کیریئر پر بہت برا اثر پڑے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں خوشامد کا عنصر بھی پیدا کر لیا جس نے چودھری کو خوش کر دیا۔

''ٹھیک ہے اے سی صاحب! ہم نے آپ کی یہ فرمائش پوری کی۔ اب ہم آپ کا کیریئر تو خراب نہیں کر سکتے نا۔ پر یاد رکھیے گا کہ ہماری طرح آپ کا بھی ضرورت کے وقت ہمارے کام آنے کا وعدہ ہے۔''

اس پر منظوری دیتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی دے دی۔

''اپنی ٹائم چودھری صاحب! مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔'' عمیر نے خوش دلی سے جواب دیا۔

پھر ان کے درمیان دوسرے عمومی معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ اس دوران کھانا لگنے کی اطلاع دے دی گئی۔ بے شمار لوازمات سے سجی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ دوستانہ فضا مزید رنگ جمانے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ ان کی پہلی ملاقات نہیں۔ بلکہ وہ عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

''پرانے اے سی کے ساتھ اس کا ایک بہت چہیتا ڈرائیور ہوا کرتا تھا..... کیا نام تھا اُس کا.....؟'' گفتگو کے دوران چودھری نے اپنی مرضی کا ایک موضوع چھیڑا اور یوں بات کو ادھورا چھوڑ دیا جیسے کوشش کے باوجود یاد نہ آ رہا ہو۔

''مشابرم خان۔'' عمیر نے اس کی یادداشت کی بحالی کے لیے خود نام بتایا۔

''ہاں ہاں، بالکل یہی۔ مشابرم خان۔ کیا وہ اب بھی موجود ہے؟'' چودھری بہترین اداکاری کر رہا تھا۔

''جی ہاں، ظاہر ہے۔ پرانے اے سی کے نہ ہونے سے وہ اپنی گورنمنٹ جاب چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا۔ کام کر رہا ہے وہ محکمے میں۔ البتہ آج کل چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کی والدہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے اس سلسلے میں۔ آپ فرمائیں، آپ کو اُس کی یاد کیسے آ گئی؟''

بظاہر کھانے میں مگن بے نیازی سے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عمیر کن انکھیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بس بڑا ہی بدتمیز قسم کا آدمی تھا۔ شہریار عادل نے اسے ضرورت سے زیادہ سر چڑھا رکھا تھا، اس لیے وہ خود کو اے سی کے ڈرائیور کے بجائے اے سی سمجھنے لگا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے میرے ملازمین سے بھی الجھنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، میرا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بس آپ کو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ ایسے اکھڑ آدمی کو زیادہ سر نہ چڑھائیں۔ سننے میں آیا تھا کہ آپ نے بھی اسے اپنا ذاتی ڈرائیور برقرار رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں ہو گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے لیے کوئی دوسرا ڈرائیور منتخب کر کے اسے محکمے میں لگا دیں اور کھپا دیں ورنہ کل کلاں کو وہ آپ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ آپ تو سمجھ ہی سکتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کو ایک بار اختیار کا نشہ ہو جائے تو پھر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ شہریار عادل کے دور میں وہ خاصا بااختیار ہو گیا تھا۔ اب بھی اس کا یہ رویہ برقرار رہ سکتا ہے۔''

وہ بڑے مناسب انداز میں عمیر کو مشابرم خان کی طرف سے بھڑکانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ عمیر نے بھی اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ میں نے بھی ایک دو مواقع پر محسوس کیا تھا کہ وہ کسی معاملے میں میری اجازت لینے سے قبل خود ہی عملی اقدامات اٹھا لیتا ہے لیکن میں نظرانداز کر گیا۔ اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو اس کی طرف سے ہوشیار رہوں گا اور جہاں کہیں اسے اس کی حدود سے تجاوز کرتے دیکھا، گوشمالی ضرور کروں گا۔''

عمیر نے اپنے جواب سے یہ عندیہ تو نہیں دیا تھا کہ وہ مشابرم خان کو اس کی جگہ سے ہٹا دے گا لیکن اس نے جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا، وہ بھی تسلی بخش تھے۔ چودھری نے فی الحال اس پر اکتفا کرنا ہی مناسب سمجھا اور عمیر سے دوستانہ تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے مزید گرم جوشی سے اس کی خاطر مدارات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگا۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی بہت اُداس تھا۔ پچھلے دنوں اس نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ اس کے کریڈٹ پر ایک نہیں کارنامے تھے۔ پہلا کارنامہ اس نے یہ انجام دیا تھا کہ خواجہ سراؤں کے دلدادہ اخلاقی کج روی کے شکار نواب نوازش علی کی کوٹھی میں پنجے گاڑے بیٹھے ''را'' کے کئی ایجنٹوں کو نہایت کامیابی سے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اُس اس کارنامے کی وجہ سے ''را'' والے اپنے کئی ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو گئے جہاں وہ بڑی مقدار میں اسلحہ ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ یہیں جاوید علی اپنی زندگی کے سب سے انوکھے خوبصورت جذبے سے بھی روشناس ہوا تھا۔ اس کے مشن کی انجام دہی میں مدد دینے والی نواب نوازش علی بیٹی شازمین اور وہ محبت کے رشتے میں بندھ گئے تھے اور مختصر مدت میں ہی اس جذبے نے انہیں بڑی شدت سے گرفت میں لے لیا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کہ اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کی مہلت نہیں اور اس سے قبل ہی جاوید علی کو تلاش کرتے ''را'' کے غنڈوں کے ہاتھ شازمین لگ گئی۔ انہوں نے اس جاوید علی کے بارے میں حقائق اُگلوانے کے لیے اتنا برا سلوک کیا کہ وہ نازک کلی سی لڑکی مسل کر رہ شازمین کی موت جاوید علی کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا اور اس صدمے کے زیر اثر وہ انتقاماً ''را'' کے ایک فرد کو کچل ڈالنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ شاید اس کے جذبے کی گہرائی تھی کہ اس کے کئی مواقع بھی میسر آ پہلے اُسے لاہور سے آنے والے اسپیشل ایجنٹ عادل خان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا اور انہوں بھارت کے تیار کردہ دہشت گرد سلیم عرف سلّو سے بڑی خوبی سے دو دو ہاتھ کیے۔ سلّو کا قصہ ختم ہونے بعد عادل خان تو واپس چلا گیا لیکن وہ ریاض انور کی راہ پر لگ گیا۔ نیک نام سمجھا جانے والا یہ سیاسی درحقیقت ''را'' کا نمک خوار تھا۔ جاوید علی نے اپنے تدبر اور حکمتِ عملی سے اسے بھی انجام تک پہنچا دیا کوشش کے باوجود وہ ریاض انور سے ''را'' کے مزید ایجنٹوں یا ٹھکانوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر تھا اور اس طرح آگے کوئی راہ نظر نہ آنے کی وجہ سے آج کل بے دست و پا بیٹھا تھا۔

یہ بے کاری اور بے عملی ہی تھی جس نے بیک وقت اسے جھنجلاہٹ اور اُداسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ تک وہ حرکت میں تھا، اُسے لگتا تھا، شازمین کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا رہا ہے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں تو اس کی جدائی کا غم اور اذیت ناک موت کا خیال زیادہ ستانے لگا تھا۔ اگرچہ اسے اس کے محکمے کی سے بہت سراہا گیا تھا اور کراچی سے لاہور واپس بلا کر کچھ دن کی چھٹیاں بھی دے دی گئی تھیں کہ وہ اپنا کے ساتھ کچھ وقت گزار لے۔

ماں سے وہ سنگل پیرنٹ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہی بہت قریب رہا تھا اور اگر عام حالات میں چھٹیاں ملی ہوتیں تو وہ انہیں ماں کے ساتھ بہت انجوائے کرتا لیکن اب تو دل و دماغ کی یہ حالت تھی کہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی ماں کو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں معلوم تھا۔ اس اُنہیں سب کچھ بتایا تھا اور بچوں کی طرح ان کے سینے سے لگ کر رویا بھی تھا۔ وہ خود جوانی میں تھیں، اس لیے اس دُکھ سے واقف تھیں جو اُن کا بیٹا جھیل رہا تھا۔

انہوں نے اس سے اس کے کسی رویّے کا شکوہ نہیں کیا تھا اور اپنے طور پر اس کا دل بہلانے اور بنانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ کیا کرتا کہ اس کے دل و دماغ ایسی کسی کوشش سے بہلتے ہی نہیں

شازمین کی موت کے بعد اگر کبھی سکون محسوس ہوا تھا تو صرف ان لمحوں میں جب وہ ملک دشمنوں کے برسرِ پیکار رہا تھا۔ اب بھی اسے احساس ہو گیا کہ اگر وہ آرام کے نام پر ملنے والی چھٹیوں میں اس طرح گھر بیٹھا رہا تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گا۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے اس نے سامان پیک کیا اور ماں کو حافظ کہہ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جلد وہ لاہور میں قائم سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں ذیشان کے سامنے تھا۔

''اتنی جلدی کیوں آ گئے جوان!.....تم نے بہت کام کیا تھا اور ان چھٹیوں پر تمہارا حق تھا۔'' ذیشان اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے جتنا آرام کرنا تھا، میں نے کر لیا سر!.....میں نہیں سمجھتا کہ مجھے مزید آرام کی ضرورت ہے، اس لیے میں واپس آ گیا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں ذیشان کی بات کا جواب دیا۔

''گڈ..... یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم کام سے دل چرانے والوں میں سے نہیں ہو۔ ٹھیک ہے، ڈیوٹی کر لو۔ پھر جہاں کام نکلا، تمہیں اس طرف لگا دیں گے۔''

ذیشان کو بھی اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات سے واقفیت تھی، اس لیے زیادہ بحث میں پڑے اسے جوائننگ کی اجازت دے دی۔

''کام میں خود سوچ کر آیا ہوں سر! بس آغاز کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔'' اس نے جھکی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیسا کام؟'' ذیشان چونکا اور اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''پچھلے دنوں ایک ہندو دکاندار، رائے چند ہماری نظروں میں آیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ہسپتال شہریار عادل کے فنگر پرنٹس اور خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے اس شخص کی نگرانی بھی کروائی تھی لیکن یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے کہ اس سے وہ نمونے کس نے حاصل کیے۔ اس وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ رائے چند کی نگرانی جاری رکھی جائے گی۔ میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ اس نگرانی کے کیا نتائج نکلے۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اس بندے پر مزید کام کر کے ''را'' کے مزید ایجنٹوں کا پتہ لگا سکتا ہوں۔'' اس نے ذیشان کے سامنے وہ بات رکھی جو گھر سے ہی سوچ کر یہاں آیا تھا۔

''رائے چند کی نگرانی اب بھی جاری ہے لیکن یہ کام ہمارا کوئی منجھا ہوا ساتھی نہیں کر رہا بلکہ سیکورٹی ایجنسی کے مختلف اہلکاروں کو یہ ڈیوٹی سونپی جاتی ہے۔ اصل میں ابتدائی نگرانی سے کوئی خاص نتائج حاصل نہیں ہوئے تھے، اس لیے بہتر یہی سمجھا گیا کہ کسی خاص بندے کو اس کام میں اُلجھانے کے بجائے عمومی نظر رکھی جائے جس کے لیے سیکورٹی گارڈز سے کام چلایا جا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ افرادی نہیں ہے اس لیے ہمیں کبھی کبھی ثانوی نوعیت کے معاملات میں اس طرح بھی کام چلانا پڑتا ہے۔ ہمارے سیکورٹی گارڈز بظاہر رائے چند کے اسٹور کے سامنے والے ریستوران پر فرائض انجام دے رہے ہیں ان انہیں ہدایت ہے کہ اگر رائے چند کی دکان پر کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو اطلاع دیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ فی الحال رائے چند کی اس حد تک نگرانی ہو رہی ہے کہ کہیں وہ منظر سے غائب تو نہیں ہو رہا۔ باقی فی الحال وہ آزاد ہی ہے۔''

ذیشان نے اسے تفصیل سے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اصل میں اب تک یہی سمجھا گیا تھا کہ رائے کوئی خاص ایجنٹ نہیں ہے بلکہ اسے چھوٹے موٹے کاموں میں درمیانی آدمی کے طور پر استعمال کیا جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔

''ٹھیک ہے تو بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ فی الحال ہم بالکل اندھیرے میں ہیں اس لیے کہیں کہیں سے کام شروع کرنے کے لیے رائے چند بری چوائس نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کس حد تک نچوڑا جا سکتا ہے۔'' جاوید علی کا لہجہ حتمی تھا۔ ذیشان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اجازت دے دی۔

''اوکے ینگ مین! تم جو چاہو۔ لیکن خیال رکھنا کہ جوش میں ہوش نہ کھونے پائیں۔'' جاوید علی کے اندر جو لاوا اُبل رہا تھا، اسے بہنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ملنا ہی چاہئے تھا اس لیے اسے اجازت دینے میں ہی بہتری تھی۔ البتہ وہ ایک افسر کے طور پر اسے تنبیہہ کرنا نہیں بھولا تھا۔

''ڈونٹ یو وری سر! میں خیال رکھوں گا۔'' جاوید علی نے اسے یقین دلایا۔ البتہ اس کی آنکھیں اس شکاری کی طرح چمک رہی تھیں، جسے شکار کا پرمٹ مل گیا ہو۔

⊛----✪----⊛

امرت کور کے دیئے گھوڑے نے ان کے لیے سفر کو آسان بنا دیا تھا۔ گھوڑا صحت مند اور پھرتیلا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے بغیر رُکے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس سفر کے لیے امرت کور کے دیئے مشوروں پر صرف اس حد تک عمل کیا تھا کہ اس گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چلے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنی مرضی سے سفر کے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ راستے کی تفصیلات اور اردگرد کے نقشے کے بارے میں بہت سی باتیں ان کے اپنے ذہن میں بھی موجود تھیں۔ کیونکہ یہاں آنے سے قبل انہوں نے اس سلسلے میں اچھا خاصا ہوم ورک کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ اجنبی ملک میں اپنی لاعلمی کے باعث پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ چونکہ ایک اہم مشن پر آئے تھے اور امید تھی کہ اس مشن کی تکمیل کے دوران خاصی ہلچل ہے گی اس لیے کسی قانونی راستے سے بھارت میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس صورت میں وہ جہاں بھی جاتے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں رہتے اور وقت بے وقت کی پولیس انکوائری ان کا ناک میں دم کیے رہتی۔

اب بھی ان کے لیے خطرات تو تھے۔ اگر کہیں کوئی پولیس والا اُنہیں گھیر لیتا تو وہ اس کی پوچھ تاچھ کے جواب میں کسی قسم کے شناختی کاغذات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتے تو مشکل حل ہو جاتی۔ آگے جا کر انہیں ایک ایسا بندہ مل جاتا جو ان کے لیے ضروری کاغذات تیار کروا دیتا جن کی موجودگی میں ان کے لیے وقتی طور پر یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ وہ بھارتی شہری ہیں۔ لیکن یہ تو بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو خطرے میں ہی تھے۔ اس لیے کوشش کر رہے تھے کہ سورج نکلنے سے قبل زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں۔ امرت کور کے مشوروں پر بھی انہوں نے اسی احتیاط کے پیشِ نظر عمل نہیں کیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے پکڑی جائے اور ان کے بارے میں سب کچھ اُگل دے تو اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ان کا تعاقب نہ کیا جا سکے۔ ان کی یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی اور سورج نکلنے تک وہ ایک قصبے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

چھوٹے علاقوں کی روایات کے مطابق وہاں صبح سویرے ہی معمولاتِ زندگی کا آغاز ہو گیا تھا اور ہاٹ، دُکانیں وغیرہ کھلی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے چائے خانے کے سامنے گھوڑا روک لیا۔

اس وضع قطع کے باوجود ان کے جسم پر چونکہ سربجیت کے قیمتی کپڑے تھے اس لیے دیکھنے والوں کو ان کے بارے میں یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی قریبی دیہات کے صاحبِ حیثیت جوان ہیں اور کسی خاص مقصد کے تحت اس قصبے تک آئے ہیں۔ انہوں نے جیسے ہی گھوڑا روک کر چائے خانے کی طرف قدم بڑھائے، ایک ہٹا کٹا سا لڑکا فوراً الرٹ ہو گیا اور اپنے کندھے پر پڑے میلے سے کپڑے سے جلدی جلدی کرسیاں صاف کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

''اِدھر بیٹھیں صاحب جی!''

وہ دونوں خاموشی سے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''حکم صاحب!'' لڑکا سربستہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''پراٹھے، انڈے، ایک پلیٹ حلوہ اور دو دودھ پتی۔'' سلّو نے شہریار سے مشورہ کیے بغیر آرڈر دیا۔

چائے خانے کے سامنے ہی دو افراد بڑے بڑے توؤں پر یہ لوازمات تیار کر رہے تھے اور وہاں بیٹھ کر ناشتہ کرنے والوں کے علاوہ کئی لوگ لفافوں میں بھی یہ اشیا خرید کر لے جا رہے تھے۔ چائے خانے کے بالکل ساتھ اس طرح کا انتظام خوب تھا۔ اس طرح لوگوں کو چائے کے ساتھ ساتھ بھرپور ناشتے کی بھی سہولت حاصل ہو جاتی۔ لیکن شہریار، سلّو کے آرڈر پر کچھ گھبرا سا گیا۔ اُسے اس قسم کا بھاری بھرکم ناشتہ کرنے کی قطعی عادت نہیں تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے یہ سب کھانا اوّل تو مشکل ہو گا لیکن اگر کسی طرح کھا بھی لیا تو شاید ہضم نہ کر پائے۔

''ہم جس گیٹ اپ اور جیسے علاقے میں ہیں، اس کے مطابق یہی ناشتہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی شدید بھوک لگ رہی ہے۔ بھاگ دوڑ میں رات کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب موقع ملا ہے تو بہتر ہے جی بھر کر کھا لیں۔''

اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپتے ہوئے سلّو نے سرگوشی میں کہا۔ ناچار شہریار کو بھی قائل ہونا پڑا۔

اور جب ان کی میز پر گرما گرم ناشتہ چُنا گیا تو اس کی خوشبو ہی اتنی اشتہا انگیز تھی کہ دل میں اس قسم کے بھاری ناشتے کے لیے ناپسندیدگی محسوس کرنے والا شہریار اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور ایک بار ہاتھ بڑھا تو اس نے اس وقت تک سلّو کا ساتھ دیا، جب تک جملہ لوازمات ختم نہ ہو گئے۔ یہ شدید بھوک کے ساتھ ساتھ ناشتے کی لذت کا بھی کمال تھا کہ وہ برسوں سے کاربند اصولوں پر سے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اب وہ پہلے والا شہریار عادل کب رہا تھا؟ اس شہریار عادل کو تو اس نے خود اپنی مرضی سے ہزاروں نقابوں میں چھپا دیا تھا اور آنے والے وقت میں جانے کون کون سے اور کتنے ناموں سے اپنا تعارف کروانے والا تھا۔

''مزہ آ گیا نا ناشتہ کر کے؟'' سلّو نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''ہاں یار! زبردست ناشتہ تھا۔'' اس نے اعتراف کیا۔

ذرا دیر میں ہی سلّو کے اشارے پر ان کی میز پر سے خالی برتن ہٹا کر دودھ پتی کے بڑے بڑے پیالے رکھ دیئے گئے۔ ناشتے کے تجربے کے بعد شہریار کے پاس اب اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پیالہ تھام لیا۔

اسی وقت قریبی میز سے ایک جوان العمر شخص اُٹھ کر ان کی میز کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بعد ساتھ بیٹھنے کی اجازت چاہی جو انہیں دینی پڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میرا نام جگدیش ہے۔ ادھر ہی کا رہنے والا ہوں۔ قصبے کے سارے لوگ مجھے ہور میں اُن کو جانتا ہوں۔ پر آپ لوگوں کی شکلیں میرے لیے نئی ہیں۔ کدھر سے آئے ہو آپ؟''

اس کا لہجہ اگرچہ مہذبانہ تھا لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کھوج تھی اور اس کھوجی تاثر کی وجہ سے وہ اچھی خاصی شکل وصورت کا مالک ہونے کے باوجود بڑا شاطر بندہ لگ رہا تھا۔

''تم نے ٹھیک پہچانا بھرا!..... اسیں اِدھر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ تارانگر پنڈ سے آئے ہیں۔ میرا نام رمیش ہے ہور یہ میرا اِنگا بھرا رویندر ہے۔ ہے تو یہ میرے چاچے دا پُتر پر تم سگا ہی سمجھو۔ آنے والے مہینے میں اس کا ویاہ ہونے والا ہے۔ ہور اپنے نِکے بھرا کا ویاہ ہو ہور اس میں شوشا نہ ہو، ایہہ کیسے ہو سکدا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ چل تجھے لے کر شہر چلتا ہوں۔ اُدھر سے ساری خریداری کرواؤں گا۔ بہت لمبا سفر ہے ہمارے پنڈ سے شہر کا۔ ہم لوگ پوری رات ہی سفر کرتے رہے ہیں۔ یہاں رُکے تھے کہ بھوجن کر کے تھوڑی دیر کسی سرائے میں آرام کریں گے، فیر آگے جائیں گے۔''

جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی۔ سلّو اس سے عمر میں چھوٹا تھا، اس حساب سے یہ کہنا مناسب بھی لگ رہی تھی۔

''کدھر جاؤ گے خریداری کے لئے؟..... اگر ہریانہ جانا ہے تو بتاؤ۔ میرا ایک یار اپنی دُکان کے لیے سامان لینے اُدھر جانے والا ہے۔ میں تمہیں اُس کے ساتھ کر دوں گا۔'' جگدیش نامی جوان کی آنکھیں اس کی بات سن کر چمکنے لگیں اور اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''دھنّے واد بھرا!..... پر ہمیں ہریانہ نہیں جانا۔ ہم دلّی جا کر خریداری کریں گے۔ سنا ہے وہاں وڈا بڑا مال ملتا ہے۔''

شہریار نے اس کی پیشکش رد کر دی۔ اب تک وہی اس نو وارد سے گفتگو کر رہا تھا اور سلّو سچ مچ ایسے کم دیہاتی نوجوان کی طرح خاموش اور شرمایا ہوا بیٹھا تھا جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہو اور وہ بڑے بھائی کی موجودگی میں اس موضوع پر گفتگو میں حصہ لینے سے ہچکچا رہا ہو۔

''کیا اس گھوڑے پر بیٹھ کر ہی دلّی جانے کا ارادہ ہے؟..... اگر ایسا خیال ہے تو سوچ لو کہ ویاہ کی مشکل سے ہی تم اپنے پنڈ واپس پہنچو گے۔'' جگدیش نے تمسخرانہ لہجے میں ان کے پاس موجود سواری کی بے بضاعتی کا احساس دلایا۔

''نہ بھرا جی! دلّی تک اس گھوڑے پر کیوں جائیں گے؟ ہم نے سوچا ہے کہ گھوڑا کسی بھلے آدمی کے ہاں یہیں رکھوا دیں گے ہور یہاں سے لاری میں دلّی کے لیے نکل جائیں گے۔ اُدھر سے خریداری کر کے واپس آئیں گے تو پہلے ادھر رُک کر اپنا گھوڑا لیں گے ہور فیر واپس اپنے پنڈ تارانگر پہنچ جائیں گے۔''

اُس کے تمسخرانہ انداز کو نظر انداز کر کے شہریار نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ جو شاطر محسوس ہونے والا شخص پوری طرح یقین کر لے کہ وہ واقعی بہت سادہ لوح دیہاتی ہیں جو پہلی بار اپنے گھر سے باہر نکلے ہیں اور انہیں زمانے کی چالبازی کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ جگدیش کی آنکھیں پہلے سے زیادہ چمکنے لگیں۔

''تم دونوں میں سے کوئی پہلے کبھی دلّی گیا ہے یا نہیں؟'' بظاہر اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

''نہ۔'' شہریار نے جواب دینے کے ساتھ زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور مزید بولا۔ ''اسیں پہلی بار اُدھر جا رہے ہیں۔ اصل میں اپنے ویاہ میں تو ایسا کوئی ہوش نہیں تھا۔ جو کچھ بڑوں نے کیا، اس پر شکر کر لیا۔

اب اپنا اِنگا بھرا ہے نا۔ اس کے ویاہ میں دل کے سارے ارمان نکالنے ہیں۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ بے ڈھنگے پن سے کسی ایسے ناآسودہ آدمی کی طرح ہنسا جسے اپنی شادی پر بلاوجہ خواہ مخواہ دھوم دھام ہونے کا قلق ہو لیکن ادب وآداب کے تکلفات اور بڑوں کے لحاظ نے اظہار کا موقع نہ دیا ہو۔

''یہ تو وڈی چنگی گل ہے۔ لگتا ہے تم اپنے اس بھرا سے سچ مچ بڑا پریم کرتے ہو۔ پر بھائیا جی! میں تم کو ایک گل صاف بتا دوں۔ اُدھر دلّی میں نئے آدمی کے لیے وڈی مشکل ہوتی ہے۔ دکان دار، آٹو رکشہ والے۔ کسی والے۔ ہوٹل والے سب مل کر نئے آدمی کو خوب لوٹتے ہیں۔ ادھر ویسے بھی بڑی مہنگائی ہے۔ وہاں کے بازاروں میں خریداری کے لیے تھوڑی بہت رقم سے گزارہ نہیں ہوتا۔ ٹھیک ٹھاک رقم ہو بندے کے پاس تو ادھر کا رخ کرے۔ ورنہ جانا بے کار ہے۔''

''رقم وی کوئی گل نہیں ہے۔ یہ اپنا بھرا ہے نا، اس کے ویاہ پر میں اپنی ساری کمائی لٹانے کو تیار ہوں۔''

شہریار اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ چالاک آدمی اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے بے وقوف بنا کر فائدہ اٹھا سکے۔ چنانچہ بے پروائی سے جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔ ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے ساتھ دلّی جاؤں گا۔ میرا اُدھر کئی واری جانا ہوا ہے۔ ہور میں مٹیا محل توں چاندنی چوک تک ہر جگہ کو چنگی طرح جاندا ہاں۔ پر جب تمہیں اپنے لٹنے کی فکر نہیں تو میں اپنا کام دھندا چھوڑ کر کیوں تمہارے ساتھ جاؤں؟ ہاں پر اگر تم چاہو تو اپنا گھوڑا میرے پاس چھڈ سکدے ہو۔ رام کی اِچھا سے چنگی حالت میں ہی پاؤ گے۔'' اس نے ایک اور جال پھینکا۔

''دھنّے واد بھرا! تم جیسے بھلے آدمی کے پاس گھوڑا چھوڑ کر ہم شانتی سے خریداری کے لیے دلّی جا سکتے ہیں۔'' اس نے جگدیش کے پاس اپنا گھوڑا چھوڑنے کا عندیہ دے کر اسے خوش کر دیا۔ البتہ دلّی ساتھ لے جانے کے لیے حامی نہ بھری کہ مبادا وہ شخص ان کے ساتھ چپک ہی نہ جائے اور انہیں اس سے جان چھڑانے میں اپنا وقت برباد کرنا پڑے۔ گھوڑے کی حد تک تو معاملہ اس لیے ٹھیک تھا کہ انہیں خود بھی اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور یہاں سے آگے جانے سے پہلے انہیں اس سے جان چھڑانی ہی تھی۔

''او نِکے! یہ کیا، تو کُڑیوں کی طرح بیٹھا بس شرمائے جا رہا ہے۔ چل ذرا وڈے بھرا کے لیے ملائی مار کر ایک پیالہ دودھ پتی تو منگوا۔'' جگدیش کو اپنے جواب سے خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے سلّو کو بھی کسی کام کرنے والے بڑے بھائی کی طرح جھڑکنے کا فریضہ انجام دیا اور اس نے بھی پوری سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔

چائے پی کر وہ جگدیش کے ساتھ اس سرائے کی طرف روانہ ہو گئے جو اس کے مطابق اس علاقے کی واحد سرائے تھی۔

⊛----✪----⊛

وہ بہت حسین لڑکی تھی۔

اس کے متناسب جسم کے اوپر جو چہرہ سجا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ چودھویں کا چاند بھی شرما جائے گا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ گھور آنکھیں، ستواں ناک، رس بھرے سرخ ہونٹ، دودھ میں گلال گھلی رنگت والی بے داغ جلد اور سیاہ ناگن سی زلفیں جو دیکھنے والے کو خود میں اُلجھا ڈالیں، سو وہ اُلجھ ہی گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا نام منیر تھا اور کچھ دن قبل وہ بشیر اکبر کے نائب کے عہدے پر فائز تھا لیکن وہاں جو انقلاب آیا اس کے نتیجے میں وہ نائب سے آقا کے عہدے پر جا پہنچا۔ نئی نئی ملی اس سرداری نے اسے فی حال اتنا الجھا ہوا تھا کہ کسی تفریح کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

بشیر اکبر کے اچانک غیاب کے حوالے سے اس نے شروع سے جو مؤقف اختیار کیا تھا، اگرچہ اب بھی اس پر سختی سے قائم تھا لیکن پھر بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے اسے وقتاً فوقتاً نمٹنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی ہی وجہ سے وہ فی الحال بہت محتاط بھی تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی کو خود پر اُنگلی اُٹھانے کا موقع نہ دے۔ اس کوشش کے باعث وہ سب سے بڑی تفریح، عورت سے بھی دُور رہ رہا تھا ورنہ یہ وہ چیز تھی جو بشیر اکبر کے دورِ اقتدار میں اسے کثرت سے میسر تھی۔ اس سلسلے میں بشیر اکبر نے اپنے کسی ساتھی پر کبھی پابندی عائد نہیں کی تھی اور اس آزادی کا فائدہ منیر جیسے لوگ خوب اٹھاتے تھے کیونکہ وہ اپنی برسوں پرانی بیویوں سے اکتا چکے تھے۔

منیر کی شادی کو پندرہ سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور اس سلسلے میں اس کی کبھی خوب صورت کہلانے والی بیوی چھ عدد بچوں کی پیدائش کے بعد پھول کر اتنی کپا ہو چکی تھی کہ اس موٹاپے میں اس کے نقش و نگار کے جانے کے ساتھ ساتھ جلد کی رنگت اور تازگی کو بھی زوال آ گیا تھا۔

اس زوال شدہ حُسن والی عورت کو اپنے چھ عدد بچوں کی پرورش پر لگا کر منیر خود دل بھر کر عیاشی کرتا تھا اور اس عیاشی کے لیے اسے ایسی آڑ مہیا تھی کہ کبھی پکڑ میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا عیار تھا کہ تنظیم کرتا دھرتا بن جانے کے بعد خود تو بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گیا تھا لیکن بیوی بچوں کو پہلے والے گھر ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ تنظیم کے سربراہ کی ذمے داری بہت بڑی ہے اور یکسوئی سے یہ ذمے داری نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ گھریلو زندگی کے جھمیلوں سے دور رہے۔ مثال کے طور پر پیش کرنے کے لیے بشیر اکبر کا طرزِ زندگی موجود تھا، جس نے اپنے مشن کی خاطر کبھی شادی نہیں کی تھی۔ منیر چونکہ پہلے سے شادی شدہ تھا، اس لیے یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا۔ اس لیے اس نے بندوبست کر دیا تھا کہ مستقل قیام تو بشیر اکبر والی رہائش گاہ پر رکھے گا لیکن وقتاً فوقتاً بشرطِ ضرورت بیوی بچوں سے ملنے بھی جاتا رہے گا۔

بیوی جو عرصے سے اُس کی بے رُخی اور بے اعتنائی سہہ رہی تھی، اس بات کو مانتی نہ تو کیا کرتی۔ اب بھی اب اس کی زندگی جس نہج پر آ گئی تھی، اس میں اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اسے اپنے اور بچوں کے خرچ پانی ملتا رہے۔ اور ظاہر ہے، منیر کے نائب سے سربراہ بننے کے بعد آمدنی میں اضافہ ہونا ہی ہوا۔ چنانچہ وہ صبر شکر کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور منیر صاحب کوچ کر کے بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ اسے بیک وقت بہت سے مسائل سے نمٹنا پڑ رہا تھا اور وہ بخوشی نمٹ رہا تھا کہ ہر تکلیف کے بعد راحت کی امید ہوتی ہے۔ اور اب سامنے جو لڑکی موجود تھی، اسے دیکھ کر اسے لگ رہا تھا کہ راحت مل ہی گئی ہے۔

لڑکی کو ایک ایسا شخص اپنے ساتھ لے کر آیا تھا جو برسوں سے تحریک کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور اس نے اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے باعث اتنی جگہ بنا رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا اسے بشیر اکبر سے ملاقات کی اجازت مل جاتی تھی۔ چنانچہ منیر کو بھی یہ اجازت دینی پڑی اور جب وہ اس کے سامنے آیا تو وہ اس سے مقصد پوچھنا بھول کر اس کے ساتھ موجود حُسنِ مجسم میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ حسینہ ایسی قیامت تھی کہ سنگھار نام پر اُس کی آنکھوں میں موجود کاجل کی دھار اور ٹھوڑی پر قریب قریب لگائے گئے تین تِلوں کے علاوہ

کوئی موجود نہیں تھا۔

حقیقت میں اُس کا حُسن اتنا کامل تھا کہ اُسے کسی مصنوعی سنگھار کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ لڑکی کو ساتھ لے کر آنے والے شخص نے منیر کی بے خودی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہ گل جاناں ہے سرکار!..... کشمیر کی رہنے والی ہے اور کل ہی میرے گھر پہنچی ہے۔ اس کا بھائی طالب علمی کے زمانے میں میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ ہم ساتھ گریجویشن کر رہے تھے اور ہماری اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کر رکھا تھا کہ زندگی میں کبھی بھی دونوں میں سے کسی کو مدد کی ضرورت پڑی تو دوسرا ہر حال میں دوستی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے اس کا ساتھ دے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میرا دوست اپنے والد کی موت کی خبر سن کر تعلیم مکمل کیے بغیر ہی کشمیر واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ میں بھی تعلیم مکمل کر کے واپس یہاں آ گیا اور اپنی زندگی میں مگن ہو گیا۔ لیکن کل جب گل جاناں میرے خط کے ساتھ میرے گھر پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ میرا ایک دوست ہوا کرتا تھا جو زمانے کی گردشوں میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ گل جاناں نے مجھے جو خط دیا، وہ میرے دوست نے میرے نام لکھا تھا لیکن اس وقت کے اب وہ زندہ نہ رہے۔ اس خط میں اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں دنیا میں تنہا رہ جانے والی اس کی عزیز بہن کو سہارا دوں۔ خط میں موجود تحریر اور گل جاناں کی زبانی سنائے جانے والے حالات کے نتائج جو تفصیل میرے سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ میرا دوست کشمیر واپس جانے کے بعد حریت پسندوں کی ایک تنظیم میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے ساتھ رہ کر جوشب و روز گزار رہا تھا، اس میں یہ لازمی تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ کسی لمحے گُل ہو جائے گا۔ اسے زندگی کی چاہ نہیں تھی۔ وہ بس اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا اور اس کا آرزومند تھا کہ اپنے باپ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس خواہش نے اس سے تعلیم کے علاوہ ماں، بہن اور بھائی سب کو چھڑوا دیا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ ان سے دور رہ کر ان کی محبت کو بھی فراموش کر گیا ہو۔ چاہے مہینوں ملاقات نہ ہو سکے لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ دور رہ کر بھی ان کی خبر گیری کرتا رہے۔ گھر میں جوان بھائی کی موجودگی کے باعث اسے تسلی تھی کہ ماں بہن کا خیال رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی اور موجود ہے۔ لیکن اس کا یہ اطمینان ایک دن ختم ہو گیا اور اس کے بھائی کو ایک مجاہد کا بھائی ہونے کے جرم میں بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس وقت اسے شدت سے احساس ہوا کہ ماں اور بہن کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ لاکھوں بہنوں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، ایک اپنی ماں اور بہن کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر گھر بیٹھ سکتا تھا؟ ویسے بھی عملاً اس کا اپنے گھر میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ جو اس کی جان کے پیاسے تھے اور جنہوں نے اس سے دشمنی میں اس کے بھائی کو ہلاک کر ڈالا تھا، بھلا اسے گھر میں چین سے کب رہنے دیتے؟ وہ دل پر پتھر رکھ کر تحریک کی ذمے داریوں میں مصروف ہو گیا لیکن شاید اسے احساس تھا کہ جلد وہ بھی بہت سوں کی طرح جامِ شہادت نوش کر لے گا اس لیے اس نے ماں بہن کے تحفظ کے لیے اتنا کیا کہ میرے نام ایک خط لکھ کر محفوظ کر دیا اور میرا پتہ اپنی بہن کو دے کر اسے سمجھایا کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ اب حالات اس کے لیے بہت سنگین ہو چکے ہیں تو وہ ماں کو لے کر اس خط سمیت میرے پاس آ جائے۔ اسے یقین تھا کہ میں طالب علمی کے زمانے میں اس سے کیا گیا عہد اب بھی نہیں بھولا ہوں گا۔

اس گل جاناں نے اس کی بات کو اپنے پلّو سے باندھ لیا اور جب بھائی کی شہادت کی اطلاع ملنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ہی اس کی ماں نے صدمے سے دم توڑ دیا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے، جب اسے اپنی
کے لیے کشمیر چھوڑنا ہوگا۔ یہ بھائی کی تحریک کے ایک ساتھی کے ساتھ مشکل سفر کر کے میرے گھر پہنچ گئی اور
مجھے اس کا خط دیا۔ مجھے اپنا دوست بھی یاد تھا اور اس سے کیا گیا وعدہ بھی۔ اس لیے میں اسے پناہ دینے سے
انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میری بیوی راضی نہیں ہوئی اور اس نے ایک رات میں ہی ہنگامہ کھڑا
کر دیا کہ اسے گھر سے نکالو۔''

''لیکن کیوں؟'' گل جاناں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ پوری توجہ سے پورا قصہ سنا
منیر نے سوال کیا۔

''وجہ بالکل واضح ہے سرکار! آپ گل جاناں کو غور سے تو دیکھیں، یہ کتنی حسین لڑکی ہے۔'' اس نے
دعوتِ نظارہ دی۔ جبکہ منیر تو یہ کام پہلے ہی کر چکا تھا اور اسے اعتراف تھا کہ لڑکی کا حُسن اتنا خطرناک ہے کہ
بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو بھی امتحان میں مبتلا کر دے۔ اس حُسنِ بے مثال کی وجہ بھی اب اس کے
سامنے آ گئی تھی کہ وہ اس خطے سے تعلق رکھتی تھی جسے جنت نظیر کہا جاتا تھا اور جنت میں تو حوریں ہی بستی ہیں
اور گل جاناں تو شاید ان حوروں میں بھی سب سے الگ ہی چمک دمک رکھتی تھی۔ اس کے جسم پر موجود کھردرے
لباس بھی اس پر خوب سج رہا تھا۔ یہ اور بات کہ منیر نے پہلے لباس پر توجہ نہیں دی تھی اور اس کے پیچھے چھپے
خزانے کو ہی نظروں سے کھوجنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''اس کے حسن سے ڈر کر میری بیوی نے شور مچا دیا کہ میں ہرگز ہرگز ایسے فتنے کو اپنے گھر میں نہیں
رکھوں گی جس کی وجہ سے مجھے اپنے شوہر کے بھٹکنے کا ڈر ہو۔ اب آپ ہی سوچیں کہ میں کیا کر سکتا تھا؟ شادی
نہ ہوئی ہوتی تو خود اس کا ہاتھ تھام کر سہارا دے دیتا۔ لیکن اب تو بیوی ہی کی سنی ہے کہ وہ میرے بچوں کی ماں
اور دکھ درد کی ساتھی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اتنے مان سے یہاں بھیجی گئی اپنی دوست کی
بہن کو بے آسرا چھوڑ دوں۔ اس لیے اس مشکل کے حل کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ میری مدد
کریں۔'' اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

''اسے کشمیر سے یہاں لانے والا شخص کہاں ہے؟'' منیر نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تو کل ہی اسے چھوڑ کر دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ آپ ایسے لوگوں کو جانتے ہی ہوں
گے کہ اپنے وجود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کتنی رازداری سے کام لیتے ہیں۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف کروانا
میرے گھر کچھ دیر رُکنا بھی گوارا نہیں کیا اور اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ اس لیے میں مکمل مجبور ہوں کہ اس
لڑکی کی ذمے داری کو خود اُٹھاؤں اور حالات کی وجہ سے اُٹھا بھی نہیں پا رہا۔''

اُس کا انداز بڑا بے بس تھا۔ اُس کے ساتھ موجود گل جاناں نے دورانِ گفتگو ذرا بھی لب کشائی نہیں
تھی اور لبالب آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ یوں سر جھکا کر بیٹھی تھی کہ جیسے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کی
منتظر ہو۔

اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے اس نمکین پانی نے منیر کے دل کی دنیا کو مزید تہ و بالا کر ڈالا اور وہ
شدت سے خواہش کرنے لگا کہ یہ لڑکی کسی طرح اسے مل جائے تو وہ اس کے سارے دکھ خود سمیٹ لے
لیکن وہ جس مقام پر تھا، وہاں زبان سے ایسی خواہش کا اظہار ممکن نہیں تھا چنانچہ صبر سے کام لیتے ہوئے
نہایت مدبرانہ لہجے میں مدعی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم بتاؤ کہ تمہاری کیا خواہش ہے؟ اگر کہو تو علاقے میں اس کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا جائے

ویسے ہی کوئی مناسب لڑکا ملے، اس سے اس کی شادی کر دی جائے؟''

''یہ تو ذرا لمبا پروسس ہو جائے گا سرکار! شادی کے لیے مناسب لڑکا ملنے تک یہ تنہا کسی جگہ کیسے رہ سکے
گی؟ نوجوان ہے اور اس پر سے بے حد خوب صورت بھی۔ لوگ تو اس کا جینا محال کر دیں گے۔'' اس نے فوراً
اعتراض کیا۔

''پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' منیر نے اس سے پوچھا۔

''میری درخواست تو یہ تھی کہ آپ گھریلو کام کاج کے لیے اسے اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھ لیں۔
میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بشیر اکبر صاحب کے دور میں جو ملازمہ گھریلو کام کاج کرتی تھی، وہ کسی
حادثے کا شکار ہو کر مر چکی ہے اس لیے لازم ہے کہ آپ کو ایک ملازمہ کی ضرورت ہوگی۔ گل جاناں کو رکھنے
سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ یہ محفوظ ٹھکانے پر ہے۔''

اس نے ایسی بات کہی جسے سن کر منیر کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ دل سے وہ خود آرزومند تھا کہ کسی طرح گل
جاناں کو اپنے قریب رکھ سکے لیکن مروّتاً اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ اب بھی اگرچہ اس کی خوشی اس کے چہرے
سے جھلکی پڑ رہی تھی لیکن وہ لہجے کو مدبرانہ رکھتے ہوئے بولا۔

''تم ہمارے بڑے اچھے دوست ہو اور ہمیں ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ اپنے لوگوں کی مشکلات
اور پریشانیوں کو حل کر سکیں۔ اگر اس لڑکی کو ہمارے ہاں ملازمہ رکھنے سے تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے تو ہمیں
تمہاری درخواست ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم پورے اطمینان سے اسے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہو۔''

بشیر اکبر کی گرفتاری کے بعد اس نے جو چھان بین کی تھی، اس کے نتیجے میں اس کے سامنے یہ بات بھی
آئی تھی کہ اس رات عبادت گاہ کے وسیع احاطے میں قائم ہسپتال میں مشابرم خان نامی مشکوک مریض کے
علاوہ بشیر اکبر کی گھریلو ملازمہ بھی موجود تھی۔ ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر اور ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس اس وقت اس
عورت کو ابارشن کے لیے راضی کر رہے تھے تاکہ اس کی کوکھ میں پلتی ناجائز اولاد کو دنیا میں آنے سے روکا جا
سکے۔ عورت کسی سند یافتہ اور تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں ابارشن کروانے کے لیے راضی نہیں تھی
اور اس سے نمٹنے میں ڈاکٹر اور نرس کو اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ کب مشابرم خان ہسپتال سے نکل گیا۔ بعد میں
انہوں نے عورت کو زبردستی کسی نہ کسی طرح ابارشن کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن عورت کے اندیشوں کے
مطابق وہ اس معاملے کو سنبھال نہیں پائے اور وہ اپنی جان سے چلی گئی۔

ڈاکٹر نے مشہور کر دیا کہ بشیر اکبر کی یہ ملازمہ کل دن میں صفائی کرتے ہوئے ایک اونچے اسٹول سے گر
گئی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور بہت زیادہ خون کے اخراج سے اس کی جان
چلی گئی تھی۔ عورت کی ڈیڈ باڈی کو سر پر بندھی ایک خون آلود پٹی کے ساتھ تابوت میں بند کر کے ورثاء کے
حوالے کر دینا ڈاکٹر کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

بیوی کی موت کی اطلاع سن کر دوسرے شہر سے دوڑ کر آنے والا اس کا شوہر تابوت کو دفنانے کے سوا اور
کر بھی کیا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کے آنے تک بشیر اکبر کے غیاب اور اس کے محافظوں کی پراسرار ہلاکت کا
غلغلہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ اگر وہ کسی قسم کے شک کی بنیاد پر دہائی دینے کی کوشش کرتا بھی تو اس کی آواز نقار
خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ اس مرنے والی ملازمہ کا قصہ جو بھی تھا، منیر کی ساری دلچسپی
اس بات میں تھی کہ وہ گل جاناں کو اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھنے کی صورت میں مزے سے دل کے سارے
ارمان پورے کر سکتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بہت بہت شکریہ سرکار! آپ نے میری درخواست قبول کر کے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔" منیر اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مدعی نے عاجزی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے حال کے منظر میں واپس کھینچا۔

"بس اب تم جاؤ۔ ہمارا جو فرض تھا، ہم نے وہ ادا کیا۔ تمہیں اتنا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" گل جاناں جیسا دُرِّ نایاب گھر بیٹھے ہاتھ آ جانے سے منیر کا لہجہ خود بخود ہی شاہانہ ہو گیا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم۔" وہ شخص فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر براہِ راست گل جاناں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ ہمارے سرکار ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ان کا حکم ہر حال میں پورا کرتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ان کے قریب رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ خیال رکھنا کہ انہیں تم سے کوئی شکایت نہ ہونے پائے اور یہ تمہیں جو بھی حکم دیں، تم بلا حیل و حجت بجا لاؤ۔"

گل جاناں نے اس کی ہدایت سن کر معصومانہ انداز میں زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ بغیر زبان ہلائے صرف سر کی جنبش سے رضامندی کا اشارہ دینے والی اس ادا نے منیر کا پہلے ہی لوٹ پوٹ دل اور بھی موہ لیا۔ اس نے بمشکل مدعی کے وہاں سے رخصت ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی تنہائی ملی، گل جاناں کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔

"جاناں! ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دو۔" پانی کا جگ اور گلاس اس کے بالکل سامنے میز پر رکھے تھے۔ وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر خود بھی آرام سے پانی پی سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے گل جاناں سے فرمائش کی تھی چنانچہ وہ نہایت سعادت مندی سے اپنی جگہ سے اُٹھی اور گلاس میں پانی انڈیل کر بڑی نزاکت کے ساتھ اسے پیش کیا۔ پانی پیش کرتا اُس کا مخروطی اُنگلیوں والا گلابی ہاتھ اتنا دلکش تھا کہ اس کے سامنے نفیس شیشے کا قیمتی گلاس معمولی لگ رہا تھا۔ منیر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی انگلیوں کو اس کے ہاتھ سے مس کیا اور سارے وجود میں برق سی دوڑتی محسوس کی۔ اُدھر گل جاناں کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

باقی پورا دن بھی منیر اُسے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے پکارتا رہا اور بہانے بہانے سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو بھی چھوتا رہا گل جاناں نے ایک بار بھی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی عام لڑکیوں کی طرح گھبرائی اور پریشان نظر آئی۔ اس کے رویے سے یوں لگ رہا تھا کہ اس نے خود کو کی گئی اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا ہے اور واقعی منیر کی ہر طرح کی خدمت بجا لانے کو تیار ہے۔

منیر جو اسے یہاں رکھتے وقت سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بیڈ روم تک لانے کے لیے کچھ صبر کرنا پڑے گا اور شاید زور زبردستی سے بھی کام لینا پڑے گا، رات آنے تک اُس کے رویے سے یقین کر چکا تھا کہ وہ آج ہی اسے اپنی خواب گاہ کی زینت بنا سکتا ہے۔ اس کا یہ یقین غلط بھی نہیں نکلا اور جب اس نے گل جاناں کو اپنے لیے جام تیار کرنے کے بعد اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ یہ کامیابی بہت بڑی تھی۔ منیر کی باچھیں کھل گئیں۔

"تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم میرے ساتھ اس گھر میں بہت عیش و آرام سے رہو گی۔"

گل جاناں سے جام لینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مخمور لہجے میں وعدہ کرنے لگا۔ اس کے لہجے اور حرکات و سکنات سے جھلکتا سرور بتا رہا تھا کہ وہ پینے سے پہلے ہی بہک چکا ہے

اور یہ تھا بھی سچ۔ وہ شراب سے پہلے شباب کے نشے میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"میں خوش ہوں کہ میرے بھائی کے دوست کی بیوی مجھے اپنے گھر رکھنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس کے انکار کی وجہ سے ہی میں آپ تک پہنچی ہوں۔ آپ کا گھر مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ یہاں سہولت کی ہر چیز موجود ہے۔ فریج میں اتنے مزے مزے کی کھانے کی چیزیں رکھی ہیں۔ وہاں کشمیر میں تو ہم بڑی مشکل میں رہتے تھے۔ جب تک بابا زندہ تھے، پھر بھی حالات ٹھیک تھے۔ ان کے مرنے کے بعد تو ہم پر زندگی تنگ ہو گئی۔ کھانے سے رُوکھی سوکھی کھانے کو ملتی تھی اور کبھی کبھی تو فاقہ ہی کرنا پڑتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس زندگی سے۔ اللہ نے میری قسمت کھول دی کہ اتنی تکلیفوں کے بعد یہاں پہنچا دیا۔ آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپ مجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے راضی ہو گئے میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی اور آپ کی اتنی خدمت کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

پہلے سے سرور میں آئے منیر کو اس کے الفاظ نے اور بھی خوش کر دیا اور اس کے ہاتھ کو جوش سے دباتے ہوئے بولا۔

"بھول جاؤ اپنی پچھلی ساری تکلیفوں اور دُکھوں کو۔ میرے گھر میں تم رانی بن کر رہو گی۔ یاد رکھنا! کہ میں نے یہاں تمہیں صرف اپنی ذاتی خدمت کے لیے رکھا ہے۔ جھاڑو، برتن، کھانا پکانا، یہ سارے کام وہ عورت کرے گی جو پہلے سے یہاں یہ کام کر رہی ہے۔ تم بس میرے کمرے میں رہ کر اسے ترتیب میں رکھنا اور وقت پر کھانا، پانی، چائے، کافی وغیرہ دیتی رہنا۔ تم زیادہ سے زیادہ میرے سامنے رہو، میرے لیے یہی خدمت ہی کافی ہے۔ تم جیسی مکھن ملائی سی لڑکی کو گھر کے سخت کاموں میں جھونکنا تمہارے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی اور مجھ جیسا ہمدرد دل رکھنے والا آدمی یہ ظلم کبھی نہیں کر سکتا۔"

"ویری نائس۔ آپ تو بہت ہی قدردان نکلے۔" اُس کی باتیں سن کر گل جاناں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور پھر جوش میں آ کر اس سے نہ صرف لپٹ گئی بلکہ چٹاخ سے اسے چوم بھی لیا۔

اس کی اس جسارت پر منیر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس خیال سے جوش میں آ گیا کہ لڑکی خود پکے ہوئے آم کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھانا اس کے خیال میں عقلمندی تھی۔ لیکن حقیقت میں اسے یاد نہیں رہا تھا کہ جوش میں اکثر انسان اپنا ہوش کھو دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

"بڑا چالو بندہ تھا۔ میرا تو بڑا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ذرا دو دو ہاتھ کر لوں۔ پر آپ نے اسٹوری ہی ایسی بنا دی کہ شرمیلے دُولہا کا رول پلے کرتے ہوئے بیٹھنا پڑا۔ ورنہ اُس سالے کو پتہ چل جاتا کہ وہ سیر ہے ہم سوا سیر۔" جگدیش سلّو اور شہریار کو سرائے میں چھوڑ کر رخصت ہوا تو تنہائی میسر آتے ہی سلّو کی زبان چل پڑی۔

"میں بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ دو نمبر آدمی ہے اور لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ٹھگنے کا کام خوب کرتا ہو گا۔ لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسے احساس نہ ہونے دوں کہ ہم اسے سمجھ گئے ہیں۔ ہم یہاں اکیلے ہیں اور ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ غیر متعلقہ لوگوں سے اُلجھے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں۔ اس قصبے میں ہم صرف اس لیے رُکے ہیں کہ پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ چند گھنٹے آرام کر کے تازہ دم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جائیں۔ باقی ہمارا کسی سے لینا دینا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جگدیش ہم سے وہ گھوڑا ہتھیا سکتا ہے۔ ہمیں امرت کور نے دیا تھا تو وہ اسے لینے دو۔ ہم نے کون سا اسے خریدا تھا۔ ویسے بھی آگے سفر کے لیے گھوڑے کو یہیں چھوڑنا ہوگا۔ تو کیا برا ہے کہ جگدیش اسے لے لے۔'' شہریار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''واہ واہ، ایسے ہی جگدیش کو گھوڑا ٹھگ کر کیوں لے جانے دیں؟ میں تو اس گھوڑے کی رقم کھرا کروں گا۔ تم دیکھنا کہ میں اسے کتنے اچھے داموں بیچتا ہوں۔ دیوی امرت کور کا گھوڑا کسی ٹھگ کے ہاتھ لگ جائے، یہ مجھے منظور نہیں۔'' اس کی نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر سلّو نے چمک کر اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے۔ جو جی چاہے کرنا۔ ویسے بھی تمہیں سودے بازی کرنا خوب آتی ہے۔ امرت کور سے تم نے اچھا سودا کیا تھا۔ کم از کم میں اکیلا ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔'' خشک لہجے میں بولتے شہریار کا اشارہ سربجیت کے قتل کی طرف تھا۔ امرت کور کی خواہش پر اسے قتل کر کے یہاں تک کے سفر کی سہولت حاصل کرنا سلّو کا کارنامہ تھا۔

''ہاہاہا.....'' سلّو اس کی بات سن کر زور سے ہنسا۔ ''سودے بازی کا نتیجہ تو سویرا ہونے پر امرت کور کے سامنے آیا ہوگا اور بے چاری بیٹھی ہمیں گالیاں اور کوسنے دے رہی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟'' قمیض اُتار کر اپنے بازو کے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے شہریار نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے پتی سربجیت کو قتل نہیں کیا تھا اور صرف چھت پر لٹا کر بے ہوش کیا تھا۔'' اس نے دیدے گھماتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔

''یہ تو وعدہ خلافی ہے۔'' شہریار اگرچہ سربجیت کے قتل پر دل سے راضی نہیں تھا لیکن سلّو کی زبانی یہ سن کر چونک گیا۔

''ایسے معاملات میں ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اُس سکھنی نے جو داستان سنائی تھی، اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بے چارہ سربجیت مظلوم ہو اور امرت کور اس سے کام لے کر اپنے عاشق کی خاطر اسے قتل کروانا چاہتی ہو۔ ہم بے کار میں اپنے سر قتل کا الزام لیتے اور مشکل میں پھنس جاتے۔ تم خود سوچو کہ سربجیت قتل ہو جاتا اور کسی وجہ سے امرت کور پکڑی جاتی تو اُس کا سارا سچ اُگل دینا تھا۔ پھر اُس کے سسرال والے اُس کے ساتھ تو جو سلوک کرتے سو کرتے لیکن انہوں نے ہمیں بھی نہیں چھوڑنا تھا۔ امرت کور سے ہمارے حلیے پوچھ کر وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور خوامخواہ مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ تم خود سوچو تو میں نے جو کچھ کیا، تمہیں ٹھیک لگے گا۔ سربجیت کی صبح آنکھ کھلی ہوگی تو وہ خود کو چھت پر پا کر تھوڑا حیران ہوا ہوگا۔ اور اگر نشے کا عادی تھا تو یہی سوچا ہوگا کہ ٹھرک میں چڑھ کر کب سو گیا، پتہ نہیں چلا۔ بہت سے بہت وہ بیوی پر چیخے چلائے گا کہ اُس نے اُس کا خیال نہیں کیا۔ رات بھر چھت پر ہی پڑا رہنے دیا۔ اس چال باز عورت کے پاس بولنے کے لیے کیا ہوگا؟ وہ دل میں ہمیں گالیاں ضرور دے گی لیکن ہمارے خلاف کچھ کر نہیں سکے گی۔ یوں راوی ہمارے لیے چین ہی چین لکھے گا۔'' وہ اپنی کارروائی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

''مجھے وہ لڑکی سچی لگی تھی۔'' شہریار نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور لیٹنے کے لیے تکیہ درست کرنے لگا۔ دونوں ہی بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے چند گھنٹوں کی نیند لینے کی اشد ضرورت تھی۔ سونے سے قبل انہوں نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا کیونکہ عادت نہ ہونے کی وجہ سے وہ سربجیت کے ریشمی دھوتی اور کرتے

الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''یہ مرد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اسے دنیا کی ہر خوب صورت لڑکی سچی لگتی ہے اور اس طرح وہ خود کو مصیبت میں پھنسا لیتا ہے۔'' سلّو نے اُس کی رائے پر فلسفیانہ لہجے میں تبصرہ کیا تو اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

شہریار نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا اور سینے تک جسم پر چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''بہتر ہے کہ تم اپنے شیطانی چرخے جیسے دماغ کو ضرورت سے زیادہ چلانے کے بجائے اب خاموشی سے سو جاؤ۔ ہمیں دہلی جانے والی بس پر آج ہی وقت پر سوار ہونا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹھیک الارم پر جاگ جائیں۔ میں نے سرائے کے مالک کو بتایا ہے کہ اسے ہمیں کب اُٹھانا ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ ہی اُٹھنا ہوگا۔ اس وقت شکایت مت کرنا کہ تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔''

''اوکے باس! نہیں کروں گا شکایت۔ لیکن ابھی میں سو نہیں سکتا۔ ابھی مجھے گھوڑے کا سودا بھی کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے سرائے کے مالک سے مدد لینی چاہیے۔''

سلّو فیصلہ کُن لہجے میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تو اس نے شانے اچکاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کرے گا اور شاید یہی کام کرنا باقی تھا جب ہی سلّو نے اس کی طرح دھوتی کرتے سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا تھا۔

سلّو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور اس کمرے کا رخ کیا، جہاں ان کی سرائے کے مالک سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی سرائے نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے بس دو تین ہی کمرے بنے ہوئے تھے اور عمارت کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بہت کم لوگ ہی ٹھہرتے ہوں گے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں زیادہ آتا ہی کون ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہوگا کہ دُور دیہاتوں سے کسی قسم کی خرید و فروخت کے لیے آنے والوں کو اگر رات ہو جاتی ہوگی تو وہ رات کے وقت سفر کرنے کے بجائے رات بھر کے لیے سرائے میں قیام کر کے صبح روانہ ہو جاتے ہوں گے۔

''کون.....؟'' وہ دفتر نما کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سرائے کے مالک نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ دراصل وہ دونوں پیر میز پر جمائے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور کھٹکا پیدا ہونے پر چونک گیا۔

''میں ہوں، رویندر۔ تمہاری سرائے کا پروہنا۔'' سلّو نے اس کے سامنے موجود کرسی پر ٹکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی حالت کافی خستہ تھی اور لگتا تھا کہ اگر زیادہ بوجھ پڑا تو زمین بوس ہونے میں دیر نہیں لگائے گی اس لیے وہ بہت احتیاط سے اس پر بیٹھا بلکہ ٹکا تھا۔

''او اچھا پُتر! کچھ کام تھا کیا؟'' بوڑھے نے میز پر سے ٹٹول کر اپنی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی تو اسے احساس ہوا کہ بوڑھے کی بینائی بہت کمزور ہے اور وہ عینک کے بغیر شاید ہی کچھ دیکھ پاتا ہو۔

''کام تو تھا چاچا! میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھوڑا کسی کو بیچ دیں۔ اگر تمہاری جان پہچان کے کسی بندے کو گھوڑا خریدنا ہو تو بتاؤ۔'' وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ چھوٹی عمر کے بڑے تجربے نے اسے بتایا تھا کہ بوڑھا ایماندار آدمی ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں۔

''ایہہ تو کوئی مسئلہ ہی نئیں پُتر!..... میرے وڈے پُتر کو ایک گھوڑے کی لوڑ ہے۔ میں اسے بلا کر گھوڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھا دیتا ہوں۔ اگر اسے پسند آیا تو وہ خرید لے گا۔'' اس کا مدعا سن کر بوڑھا جوش میں آ گیا اور فوراً باہر نکل کر کسی کو آواز دینے لگا۔

آواز سن کر آنے والے کو اس نے ہدایت کی کہ وہ بازار سے اس کے بڑے بیٹے کو بلا لائے اور خود واپس دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔

''بس ابھی آ جاتا ہے منڈا۔ میرا بلاوا سن کر فوراً دوڑا آئے گا۔ وڈی چنگی اولاد دی ہے بھگوان نے مجھے۔ ایک آواز پر میری گل سنتے ہیں سارے۔ بھگوان نے بھی ان پر وڈی کرپا کی ہے۔ کام دھندا چنگا چلتا ہے۔ یہ سرائے تو بس میں خود کو مصروف رکھنے کے لیے چلاتا ہوں ورنہ کوئی لوڑ نئیں ہے، اس بڈھے دے لیے کام دھندا کرنے کی۔''

بوڑھا واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھا تو خود ہی اسے بتانے لگا۔ اس کے دعوے کے مطابق اس کے بیٹے نے وہاں پہنچنے میں واقعی بالکل دیر نہیں لگائی اور فوراً ہی پہنچ گیا۔

''کی گل ہے پتا جی! منڈا بول رہا تھا تسی مینوں بلا رہے سی۔'' اس نے سلّو کو ایک نظر دیکھا اور باپ سے پوچھنے لگا۔

''آہو پتر! میں تینوں اس بندے نال ملانے واسطے بلا رہا تھا۔ ایہہ اپنا گھوڑا بیچنا چاہندا ہے تو میں نے کہا تُو دیکھ لے۔ تجھے اپنے کم کے لیے گھوڑے کی لوڑ تھی نا۔'' بوڑھے نے بیٹے کو بتایا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''گھوڑا میں نے دیکھا ہے۔ وہی ہے نا جو اُدھر دروازے کے پاس بندھا ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی اور اثبات میں جواب ملنے پر پوری طرح سلّو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد جلد ہی دونوں میں سودا طے پا گیا۔

''تسی تھوڑی دیر ادھر بیٹھو، میں ابھی روپے لاتا ہوں۔'' مناسب قیمت پر سودا ہو جانے پر اس نے سلّو سے کہا۔ اصل میں امرت کور کا عنایت کردہ گھوڑا واقعی اتنا زبردست تھا کہ جو پاتا، خوش ہی ہوتا۔

''ٹھیک ہے بھرا! پر خیال رکھنا کہ سودے کی گل باہر نہ نکلے۔ اُدھر قصبے کا ایک بندہ ہے جگدیش۔ اس کی بھی نظر تھی گھوڑے پر۔ پر اپنے کو وہ کچھ ٹھیک بندہ نہیں لگا اس لیے اس سے سودا نہیں کیا۔'' سرائے کے مالک کا بیٹا وہاں سے جانے لگا تو سلّو نے اسے ہدایت کی۔

''جگدیش..... وہ تو وڈا بدمعاش بندہ ہے۔ چنگا ہی ہوا کہ تسی اُس کی باتوں میں نئیں آئے ورنہ نقصان اُٹھاتے۔'' وہ فوراً ہی بولا تو سلّو اپنے اندازے کی تصدیق پر مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس کی جیب میں ایک معقول رقم پہنچ چکی تھی۔ رقم لے کر جیب تھپتھپاتا ہوا وہ کمرے میں آیا تو شہریار سو چکا تھا۔ وہ بھی کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کامیابی کی خوشی اور تھکن نے مل کر ایسا کام دکھایا کہ جب وہ بستر پر لیٹا تو ایسی ٹوٹ کر نیند آئی کہ کچھ ہوش نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اسے ان افراد کی آمد کی بھی خبر نہ ہو سکی جو دن کی روشنی میں بھی نیم تاریک پڑے کمرے میں کسی سائے کی طرح داخل ہوئے تھے۔

⊛----✪----⊛

سلّو اور شہریار دونوں ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔

کمرے میں داخل ہونے والے دونوں سائے محتاط قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے اور طے شدہ

منصوبے کے مطابق ایک سلّو کی چارپائی کی طرف اور دوسرا شہریار کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں نے اپنے بیگ چارپائیوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے داخل ہونے والے دونوں افراد نے بالکل بیگوں کو کھینچ کر باہر نکالا اور کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔

اس ساری کارروائی کے دوران وہ بار بار سوئے ہوئے شہریار اور سلّو کا جائزہ لیتے جا رہے تھے کہ کہیں ان میں سے کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔ آنکھ کھل جانے کی صورت میں وہ انہیں دو چار پٹخنیاں دے کر بے ہوش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن خیر گزری اور اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ خاموشی سے اپنی کارروائی مکمل کر کے واپس جانے لگے۔

''تم دونوں جو بیگ لے جا رہے ہو، ان میں کچھ نہیں۔ رقم تو میرے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔'' ابھی انہیں اپنے عقب سے آواز سنائی دی تو وہ بھڑک کر واپس پلٹے۔ دونوں میں سے ایک چارپائی خالی کرنے اور بولنے والا ایک دیوار کے قریب کھڑا تھا۔

دراصل یہ شہریار تھا جس کی آنکھ کسی خودکار حفاظتی نظام کی طرح ان دونوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھل گئی تھی۔ لیکن اس نے فوری طور پر انہیں چھیڑنے کے بجائے انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا اور عین اس وقت پر انہیں مخاطب کیا تھا، جب وہ اپنے تئیں کامیاب واردات کر کے واپس جا رہے تھے۔

اس نے انہیں واپس جاتے دیکھ کر اتنی پھرتی اور خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ ان کے پیچھے کتنی بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ شہریار نے انہیں مخاطب کیا تو وہ تیزی سے پلٹے اور ان میں سے ایک نے پھرتی سے خنجر نکال کر شہریار پر پھینکا۔ وہ ہوشیار تھا چنانچہ تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خنجر دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

اس وار کو ناکام ہوتے دیکھ کر دونوں نے بیک وقت شہریار کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگانے والوں میں سے ایک تو درمیان میں ہی دھڑام سے گر گیا جبکہ دوسرے کو شہریار کی پڑنے والی لات نے واپس اچھال دیا۔ درمیان میں گرنے والے کو سلّو نے سنبھال لیا۔ درحقیقت وہ شخص گرا بھی اس کے ٹانگ اڑانے سے تھا۔ سلّو کی آنکھ اس کارروائی کا آغاز ہوتے ہی کھل گئی تھی اور اس نے مناسب وقت پر اپنا حصہ بھی ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

کمرے کی محدود فضا میں ان کے درمیان ہونے والی یہ ہاتھا پائی زیادہ طول نہ کھینچ سکی۔ دراندازی کرنے والے وہ دونوں نامعقول افراد بے شک ہاتھ پیر چلانا تو جانتے تھے لیکن دو تربیت یافتہ لڑاکوں کو سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر وہاں ہنگامہ ہوا اور پھر جلد ہی دونوں زمین بوس ہو گئے۔ سلّو نے آگے بڑھ کر کمرے میں روشنی کر دی۔ روشنی میں جو چہرے ان کے سامنے آئے، ان میں سے ایک کو شناخت کرنا ان کے لیے دشوار نہیں تھا۔ وہ جگدیش تھا جو اس قصبے میں وارد ہوتے ہی ان سے چمٹ گیا تھا اور انہیں توقع تھی کہ یہ لالچی شخص کسی نہ کسی طرح انہیں ضرور تنگ کرے گا۔ اب جبکہ اس نے دن دہاڑے انہیں سوتا جان کر اُن کے کمرے میں گھس کر ان کے بیگ چرانے کی کوشش کی تھی تو اس کی نیت کھل کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔

''رام بھلی کرے۔ سب چنگا تو ہے بھایا جی؟''

اس سے قبل کہ وہ دونوں جگدیش سے باز پرس شروع کرتے، ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے ذرا سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں، سب چنگا ہے۔ اندر آ جاؤ۔''

شہریار نے جواب دے کر پوچھنے والے کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اُمید تھی کہ دستک دینے والا مقامی شخص ہوگا اور وہ اسے گواہ بنا کر جگدیش اور اس کے ساتھی کا فیصلہ کر ڈالیں گے۔ دروازہ کھلا تو ایک سادرمیانی عمر کا آدمی اندر داخل ہوا۔

''میں آپ کے سامنے والے کمرے میں رُکا ہوا ہوں۔ یہاں سے اُٹھا پٹخ ہور مار دھاڑ کی آوازیں دیں تو جانکاری کے لیے آ گیا۔''

اس نے سہمی ہوئی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اس کے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بزدل مزاج کا آدمی ہے اور اس نے اسی وقت کمرے کے دروازے پر دستک دینے کی جرأت کی ہے، جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ اندر صورتِ حال مکمل طور میں ہے۔

''تسی کدھر سے آ کر ایتھے ٹھہرے ہو؟'' سلّو نے اس سے پوچھا۔

''میں ہریانہ توں آیا سی۔ میں اوتھے دُکاناں تے مال سپلائی کرتا ہوں۔ سفر لمبا ہے، اس واسطے دیر آرام لئی ایتھے ٹھہر گیا ہوں۔'' اُس نے اپنے بارے میں بتایا تو سلّو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تسی اپنی ذاتی گڈی سے آئے ہو؟''

''آہو۔ میرے کول اِک سوزوکی ہے۔ اسی پر آیا ہوں۔'' اس نے بتایا تو وہ دونوں ہی خوش ہو گئے۔

''آؤ بھایا! آرام نال ایتھے بیٹھو۔ فیر میں تہانوں سارا الفرادسدا ہوں۔'' سلّو نے بڑی اپنائیت سے کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے جگدیش اور اس کے ساتھی کو زمین پر بے دیکھتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''تسی وڈے بھایا جی کو بتاؤ پا جی! کہ سارا قصہ کی ہے۔'' سلّو نے ذرا شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے شہریار سے درخواست کی تو وہ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ٹھیٹھ دیہاتی انداز میں شروع ہو گیا۔

''قصہ ایہہ ہے پا جی! کہ یہ جو اپنا نندا ورا ہے، وریندر، اس کا ویاہ ہونے والا ہے۔ ہور اسیں اس ویاہ کی تیاری کے لیے دلّی خریداری لئی جا رہے ہیں۔ اس قصبے میں آرام لئی ٹھہرے تھے۔ ادھر ہوٹل میں بدمعاش جگدیش مل گیا ہور اسیں اپنی سادگی کی وجہ سے اینوں بتا دِتّا کہ روپے لے کر خریداری واسطے ہیں۔ ہُن کیا معلوم تھا کہ یہ بدمعاش آدمی ہے ہور موقع ملتے ہی سانوں لوٹنے واسطے ایدھر گھس جائے تو رام کی کرپا نوں میری اکھ کھل گئی ہور اسیں انہاں نوں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بدمعاش ہمیں ڈرانے خنجر بھی لے کر آئے تھے پر انہاں نوں ملوم نئیں تھا کہ اسیں بچپن توں اکھاڑے وِچ ورزشاں کرکے بیٹھکاں لگا کے جوان ہوئے ہیں۔ ایسی پھینٹی لگائی ہے اس ماں دے پُتر تے اس دے ساتھی دی کہ جیون یاد رکھیں گے۔'' شہریار نے نہایت پُر تفاخر انداز میں اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''ایہہ تے وڈی بُری گل ہے۔ اس سرائے کے مالک نوں بلا کر گل کرو کہ ایتھے کیہہ ہور ہیا ہے۔ ویلے ایہہ حال ہے تو راتاں نوں تو ایتھوں گزرنا شریف آدمی واسطے ممکن ای نئیں ہے۔''

نووارد نے مشورہ دیا تو سلّو فوراً ہی باہر نکل گیا۔ باہر برآمدے میں بھی کوئی خاص روشنی نہیں تھی۔ میں عمارت بنائی ہی کچھ اس انداز میں گئی تھی کہ دن کے وقت بھی اندھیرے اور گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔

سرائے کے مالک کے دفتر نما کمرے کے سامنے پہنچا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اس کنڈی کھول کر اندر جھانکا۔ بوڑھا کرسی پر مزے سے سو رہا تھا۔

سلّو نے اسے جھنجوڑ کر جگایا اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے تفصیلات سن کر سیدھا ان کے کمرے کا رخ کرنے کے بجائے باہر کا رخ کیا اور ایک بچے کے ہاتھوں پیغام بھیج کر اپنے بیٹے اور قصبے کے معززین کو بلایا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک چھوٹا سا ہجوم جمع ہو گیا۔ جگدیش اور اس کے ساتھی اس دوران ہوش میں آ گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہاں قصبے کے معززین جمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے بے ہوش بن کر رہنے میں ہی عافیت جانی۔ سرائے کے مالک، اس کے بیٹے اور دیگر افراد نے پہلے شہریار اور سلّو سے حال مانگی کہ انہیں یہاں اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا پھر جگدیش اور اس کے ساتھی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے لگے۔

''اسیں ان دوناں نوں وڈی چھوٹ دے چکے ہیں۔ ہور ان کی بدمعاشیوں کو شما کرتے رہے ہیں کہ ویلے رج بندے توں ایسی غلطی ہو جاندی ہے، دونوں کسی ویلے سنبھل جائیں گے۔ پر اَج تو انہاں نے ساڈی ایہ ہی کٹوا دی ہے۔ اجنبی مسافروں نوں لوٹنے دی کوشش کرن والی حرکت ایسی نئیں ہے کہ شما کر دی جائے۔ اب پولیس کو ان کے بارے میں دسنا ہی ہوگا۔ دو چار مہینے حوالات میں رہ کر پھینٹی کھائیں گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔'' آخر کار سرائے کے بوڑھے مالک نے سب کی متفقہ رائے سے یہ فیصلہ سنا ڈالا۔

فیصلہ سن کر اب تک بے ہوش بنا پڑا جگدیش اور اس کا ساتھی اپنی جگہ سے اُٹھ گئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگے کہ اس بار انہیں معاف کر دیا جائے، آئندہ وہ بھول کر بھی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ لیکن ان دونوں کا فیصلہ حتمی تھا۔ شاید دو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے اپنے قصبے کے جوانوں کی حرکت نے انہیں بے پناہ شرمندہ کر دیا تھا اس لیے وہ کسی طور نرم پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جگدیش اور اس کے ساتھی کا قصہ نمٹا تو ان دونوں سے ایک بار پھر معذرت کر کے انہیں نہ صرف آرام کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا بلکہ سرائے کے مالک نے اپنی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

مناسب آرام اور پُر تکلف کھانے کے بعد وہ اس قصبے سے روانہ ہوئے تو کچھ اس طرح کہ سرائے میں آئے ہوئے تیسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار تھے جو انہیں کسی ایسے مقام پر چھوڑ دیتا، جہاں سے انہیں دہلی کے لیے براہِ راست سواری مل جاتی۔

⊛----✪----⊛

''سر! ایک مچھلی جال میں آئی ہے۔''

یہ اطلاع ملنے پر میجر اسفندیار آپریشن روم کی طرف دوڑا۔ یہاں تکنیکی عملہ وقت کی پروا کیے بغیر پوری مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے ایک خالی کرسی سنبھال کر ماتحت کا پیش کردہ ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیا۔ سماعتوں کے ذریعے اسے سمجھ آنے لگا کہ عبادت گاہ کے موجودہ کرتا دھرتا کی خواب گاہ میں گل جاناں نامی گلبری بلبل کون سے گل کھلا رہی ہے۔ اُس نے اپنی مطلب برآری کے لیے شراب اور شباب کے گویا دریا بہائے ہوئے تھے اور عقل کا کچا اور نفس کا غلام اس کے آگے پگھلتا جا رہا تھا۔

''یہ تو بڑی وکھری ٹائپ کی مچھلی ہے یار!..... تُو کہہ رہا تھا، مچھلی جال میں پھنسی ہے، پر مجھے تو لگتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ یہ خود کیل کانٹوں سے لیس ہو کر شکار کے لیے نکلی ہے۔'' اس نے سنائی دینے والی آوازوں پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خوش دلی سے اپنے ماتحت سے کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے سر جی! کبھی کبھی شکاری خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔ آپ بس ذرا سا اشارہ کریں، یہ شکاری مچھلی آپ کی ٹیبل پر ہو گی۔'' ماتحت نے ترنت جواب دیا۔

''تو بس سمجھو ہو گیا اشارہ۔'' اس نے جواب دیا تو چہرے کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے اور وہاں اب کھلنڈرے پن کی جگہ مکمل سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ معاملہ تھا بھی اہم۔ انہیں ابتدا سے ہی یہ یقین رہا تھا کہ بشیر اکبر کے غیاب کے بعد نیا سیٹ اپ قائم ہو جانے کے باوجود اس کے پیچھے موجود لوگ حقائق کا کھوج لگانے کے لیے ضرور میدان میں اُتریں گے اور اصولی طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے اس شخص کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہی سب سے اہم تھا جس نے بشیر اکبر کی جگہ لی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ مسلسل اس آدمی کو اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں اس کی رہائش گاہ کو بھی ''بگڈ'' کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان دنوں میں ہی ان پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ وہ ایک عیاش طبع آدمی ہے۔ گل جاناں کی اس کے گھر آمد سے بھی وہ باخبر تھے اور یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ملازمہ کی حیثیت سے گھر میں داخل ہونے والی اس لڑکی کو وہ اپنی داشتہ بنانے میں دیر نہیں لگائے گا۔ البتہ فوری طور پر یہ شک نہیں کیا جا سکا تھا کہ پناہ کی غرض سے آنے والی لڑکی اپنے ساتھ کچھ خاص مقصد لے کر آئی ہے۔ یہ بات تو انہیں رات کے اس پہر پتہ چل رہی تھی جب وہ اپنے ٹارگٹ کو شباب اور شراب کے نشے میں ڈبو کر اس سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ بشیر اکبر کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اس کے پیچھے کن لوگوں یا ادارے کا ہاتھ ہے۔ وہ کاٹھ کا اُلو بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر مل جانے پر سب کچھ اُگلتا جا رہا تھا۔

''ایک پارٹی عبادت گاہ جائے گی اور دوسری اس آدمی کے گھر جو اس فتنے کو لے کر آیا تھا۔ عبادت گاہ کے سامنے پہنچنے والی پارٹی کے لیے میں پہلے ہی اندر سے لائن کلیئر کروا دوں گا۔ تم لوگ پورے اطمینان سے جاؤ، مجھے رزلٹ میں بس کامیابی چاہیے۔''

اس نے بہت تیزی سے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے تھے اور ان پر عمل اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہو رہا تھا۔

گل جاناں کو لانے والے شخص کے گھر پر پہنچنے والی پارٹی پہلے اپنے ٹارگٹ پر پہنچی۔ وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے وقت کی پروا کیے بغیر پڑوسی کے دروازے پر دستک دی اور اُس سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

''یہ لوگ تو شاید لاہور گئے ہوئے ہیں۔ میری گھر والی نے ذکر کیا تھا کہ پڑوسن اپنے میکے والوں سے ملنے جا رہی ہے۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ اس کا میکہ لاہور میں ہے۔'' وردی پوشوں کو اپنے دروازے پر دیکھ کر وہ شخص تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور ایک ہی سانس میں خود کو حاصل معلومات منتقل کر دی تھیں۔

پارٹی کے لیڈر نے ذیشان کو اطلاع دی اور اس نے محلے کے دو معززین کی موجودگی میں تالا توڑ کر خانہ تلاشی کا حکم دے ڈالا تا کہ اگر کوئی مشکوک شے ملے تو اسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ ہدایات ملتے ہی پارٹی نمبر ایک اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس دوران دوسری پارٹی بھی اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئی تھی۔ اسفندیار نے پہلے ہی یہ بندوبست کر لیا تھا کہ عبادت گاہ کی سکیورٹی پر متعین افراد میں اپنے آدمی بھی شامل ہوں اس لیے اس وقت انہیں کوئی دشواری پیش

نہیں آئی اور وہ سیدھے رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

گل جاناں اور موجودہ راہنما صاحب یقینی طور پر قابلِ اعتراض حالت میں ملے۔ راہنما صاحب کے تو حواس اتنی بری طرح معطل تھے کہ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ گل جاناں نے تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن اسے بھی جوانوں نے قابو کر لیا۔ انہیں راہنما صاحب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور نہ ہی ساتھ لے جانے میں نقصِ امن کا بھی اندیشہ تھا اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر وہ لوگ صرف گل جاناں کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل اس فتنے کو بستر کی بڑی سی چادر میں لپیٹ لیا گیا تھا۔

وہ لوگ تیزی سے ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے۔ وہاں اسفندیار ان کا منتظر تھا۔ اس کے حکم پر چادر میں بالکل ساکت پڑی گل جاناں کا چہرہ کھولا گیا تو وہ سب چونک اُٹھے۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اسفندیار نے قریب جا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری میں پڑا ہوا تعویذ دانتوں تلے دبا ہوا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تم لوگوں نے یہاں لانے سے پہلے اس کی تلاشی لے کر اس کی سب چیزوں کو اپنے قبضے میں کیوں نہیں لیا تھا؟'' اس نے سرد لہجے میں اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔

''سوری سر! یہ جس حالت میں تھی، ہم نے بس یہی مناسب سمجھا کہ اسے چادر میں لپیٹ کر یہاں لے آئیں۔ ویسے بھی وہاں زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں تھا۔'' پارٹی کو لیڈ کرنے والے شخص نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت پیش کی تو اسفندیار نے برا سا منہ بنایا اور دوبارہ قریب جا کر گل جاناں کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کا خوب صورت چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کی پُتلیاں ساکت تھیں۔

یقینی طور پر اس کے گلے کے تعویذ میں جو زہر موجود تھا، وہ بہت سریع الاثر تھا جس نے چند منٹوں کے اندر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اب وہ ان کے لیے بالکل بیکار تھی۔ ایک لاش سے بھلا وہ کیا اور کیسے کچھ معلوم کر سکتے تھے۔

''اسے چیک کرو۔'' اسفندیار نے اس کے بالوں میں لگا موتیوں سے بنا نفیس سا کلپ نکال کر ماتحت کو پکڑایا تو وہ فوراً کلپ لے کر باہر نکل گیا۔

''ضروری کارروائی مکمل کرو اور لاش کو ٹھکانے لگانے کا حکم دو۔'' اسفندیار حکم دے کر خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ اب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ کچھ دیر بعد دوسری پارٹی کا لیڈر بھی وہاں پہنچ گیا اور رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''گل جاناں کو منیر تک پہنچانے والے شخص کا نام قاسم تھا۔ وہ یہاں کا مقامی نہیں تھا بلکہ بشیر اکبر کی یہاں آمد کے لگ بھگ پانچ سال بعد یہاں آیا تھا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن سے بشیر اکبر کے ذاتی مراسم تھے یا جنہیں وہ دوسروں کی نسبت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ہم نے اس کے گھر کی مکمل تلاشی لی ہے۔ فرنیچر، کپڑے اور گھریلو استعمال کا سارا سامان اپنی جگہ موجود ہے لیکن بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے باوجود ہمیں وہاں کسی قسم کے کاغذات، رقم یا زیورات وغیرہ جیسی چیزیں نہیں ملی ہیں۔ پورے گھر میں ایسا کوئی اہم یا فوٹو فریم موجود نہیں ہے جس سے ہم قاسم اور اس کے بیوی بچوں کی تصویریں حاصل کر سکیں۔ کوئی مشکوک چیز بھی نہیں ملی ہے۔ لیکن عام چیزوں کو چھوڑ کر گھر سے ہر اہم شے کا غائب ہونا اپنی جگہ خود مشکوک ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ قاسم پوری پلاننگ کے ساتھ یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ وہ بیوی کو میکے لے جانے کے بہانے یہاں سے نکل گیا ہے اور پیچھے ایسی کوئی نشانی نہیں چھوڑی ہے کہ گل جاناں کے پکڑے جانے کی صورت میں اُسے تلاش کیا جا سکے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے گل جاناں کو قاسم کے ذریعے منیر تک پہنچایا تھا، انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ منیر کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ اور گل جاناں کے اپنی کارروائی کے دوران پکڑے جانے کا امکان ہے۔'' اپنے ماتحت کے اندازوں کی تصدیق کرتے ہوئے اس نے اپنا تجزیہ بھی پیش کیا۔

اسی لمحے دستک دے کر ایک جوان اندر چلا آیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے کچھ دیر قبل اس نے گل جاناں کا کلپ چیک کرنے کے لیے دیا تھا۔

''کلپ چیک کر لیا گیا ہے سر! اس میں ایک بہت طاقتور مائیکروفون نما آلہ چھپا ہوا تھا جس کی مدد سے بہت دور بیٹھ کر بھی اس آلے کی رینج میں آنے والی آوازوں کو واضح طور پر سننا ممکن ہے۔'' اس نے آتے ہی رپورٹ پیش کی۔

''میرا یہی اندازہ تھا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک ہے اور جدید آلات کے استعمال کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت سے کھیلنا بھی خوب جانتا ہے۔ گل جاناں کی حیثیت ایک معمولی مہرے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اس خوب صورت لڑکی کو قربانی کا بکرا بنا کر نہایت کامیابی سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ان کے ایجنٹ بشیر اکبر کے ساتھ یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی اور وہ کیسے منظر سے غائب ہو گیا۔ ہم سے غلطی ہوئی کہ اس قسم کا خدشہ موجود ہونے کے باوجود کہ منیر کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے، وقت سے پہلے یہ بھانپنے میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ گل جاناں کو کسی خاص مقصد کے تحت منیر تک پہنچایا گیا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی اور منیر شراب کے نشے میں گل جاناں کے سامنے سب کچھ اُگل چکا تھا جو کہ یقینی طور پر کہیں اور سنا گیا ہے۔ گل جاناں جو ظاہر ہے اس لڑکی کا حقیقی نام نہیں ہے، اپنے بڑوں کے سامنے پہلے ہی یہ عہد کر کے آئی ہو گی کہ اگر گرفتاری کی نوبت آئی تو اپنے بارے میں کچھ اُگلنے کا خطرہ مول لیے بغیر پہلے مرحلے پر ہی خودکشی کر لے گی اور اس کے لیے اس کے پاس معقول انتظام بھی تھا۔'' کلپ سے متعلق رپورٹ سن کر اسفندیار نے ایک بار پھر حالات کا بھرپور تجزیہ کیا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں سر! مشاہرم خان کے ذریعے پہلے بندے کو پکڑنے سے لے کر اب تک ہمارے سامنے جو صورتِ حال پیش آئی ہے، اس میں یہ بات بہت واضح ہے کہ یہ لوگ جن افراد کو اپنی ماتحتی میں لے کر کام نکالتے ہیں، ان کے ذہنوں کو اس بُری طرح جکڑ لیتے ہیں کہ وہ وقت پڑنے پر اپنی جان لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔'' اس کے ماتحت نے اس کی تائید کی۔

''مطلب برآری کے لیے ہر جگہ ایسے احمقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اپنی جان لینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کے دل و دماغ میں خوش کُن خواب بھر دیئے جائیں تو پھر وہ یہ احمقانہ جرأت بھی کر بیٹھتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ خدا کی مخلوق کو آزار دے کر بھلا وہ خدا کی جنت کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے؟'' اسفندیار نے تبصرہ کیا پھر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

''اپنی وے، جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے پاس واحد کلیو قاسم ہی ہے۔ دیکھو کہ اسے تلاش کرنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے یا نہیں۔ آس پاس والوں سے معلومات حاصل کر کے اس کا اسکیچ بنواؤ۔ جہاں وہ ملازمت کرتا ہے، وہاں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے وہاں سے اس کے کوئی ڈاکومنٹس وغیرہ مل جائیں۔ یہ بھی دیکھو کہ اس کے بچے کس عمر کے ہیں اور اسکول وغیرہ جاتے تھے یا نہیں۔ اگر وہ اسکول جاتے تھے تو وہاں سے بھی ہمیں ان کے فوٹو گرافس کی شکل میں کوئی کلیو مل سکتا ہے۔ تم لوگ یہ کام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ مشاہرم خان کی سیفٹی کے لیے کیا، کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کے لیے خطرات سب سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اس سارے کیس میں وہ اپنے اصل نام کے ساتھ منظر پر آیا تھا اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ اس کے لیے پہلے کی طرح اپنی روٹین کی طرف پلٹنا مشکل ہو گا اور اس کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''اوکے سر!'' اس کا اشارہ پا کر دونوں ماتحت کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس مشن میں اس نے بہت ہی خاص اور اعتماد کے بندوں کو ساتھ رکھا تھا کہ اگر اس کے اردگرد کوئی بشیر اکبر کا چاہنے والا موجود ہو تو گڑبڑ نہ کر سکے ورنہ حالات اور بھی مشکل ہو جاتے۔ حقیقت میں وہ خود بھی اس معاملے میں بہت زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا اور صرف اس حد تک کام کر رہا تھا کہ کرنل توحید کو مطمئن کیا جا سکے۔ اب بھی وہ اس سارے معاملے پر باریک بینی سے غور کرتے ہوئے منتظر تھا کہ دن کا باقاعدہ آغاز ہو جائے تو کرنل توحید کو اب تک کے حالات کی رپورٹ پیش کر دے۔

⊛----✪----⊛

نیلی جینز پر سیاہ رنگ کے کھلے گلے کی ٹی شرٹ میں ملبوس جاوید علی متوسط طبقے کا کھلنڈرا سا نوجوان لگ رہا تھا۔

ایشان کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے رائے چند پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس وقت اپنی بائک پر سوار اسی کی دکان کی طرف جا رہا تھا۔

وہاں جانے کے لیے اس نے شام کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے خریداری کے بہانے رائے چند کی دکان کا ایک چکر لگائے گا، پھر سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر دکان بند ہونے تک اس پر نظر رکھے گا۔ دکان سے وہ اس کے پیچھے اس کے گھر تک جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد اگر ممکن ہوتا تو شاید وہ اس کے گھر میں گھس کر اسے اور اس کے گھر والوں کو اپنے قابو میں کرتا اور اس سے اس کی حقیقت اُگلوا لیتا۔ بہرحال، ابھی اس سلسلے میں اُس کا ذہن واضح نہیں تھا اور فی الحال تو وہ رائے چند کو دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا تھا۔

اپنے اس پروگرام کے مطابق اس نے بڑی بے پروائی سے رائے چند کی دکان کے عین سامنے اپنی بائک روکی اور اُنگلی میں کی چین گھماتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

رائے چند کی دکان جو کہ اچھی خاصی بڑی تھی، وہاں روزمرہ استعمال کے آئٹمز فروخت کیے جاتے تھے۔ دکان میں لمبائی کے رخ پر کافی بڑا انگریزی کے حرف ''L'' کی شکل کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا، جہاں شیشے کے شوکیس میں بے شمار اقسام کی ٹافیاں، چاکلیٹس، بسکٹس اور بچوں کی پسند کی الم غلم اشیا بھری پڑی تھیں۔ باہر رکھے ہوئے ریکس میں چپس اور پاپڑ جیسے آئٹمز نظر آ رہے تھے جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے دیواروں میں لکڑی کے شیلفس میں دودھ کے ڈبے، دلیے کے پیکٹس، صابن اور سرف کی تھیلیوں سے لے کر گھریلو استعمال کی بے شمار اشیا کا ایک ڈھیر ترتیب سے سجا ہوا تھا۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں دکان میں داخل ہوا اور بلا ضرورت شیلفس میں سجی بہت سی اشیا خریدنا شروع کر دیں۔ بعض اشیا کی صرف قیمت اور کوالٹی کے بارے میں استفسار کرنے پر اکتفا کیا اور بعض کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تبصرہ کیا کہ قیمت کے مقابلے میں ان کی کوالٹی مناسب نہیں ہے۔ اس طرح اسے وہاں کافی وقت گزارنے کا موقع مل گیا اور وہ بڑی ہوشیاری سے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ دکان پر دو تین سیلز مین تھے اور حقیقت میں وہ گاہکوں کو ڈیل کر رہے تھے۔

رائے چند کاؤنٹر پر بیٹھا صرف بل کے مطابق رقوم وصول کر رہا تھا۔ سفید کُرتے پاجامے میں کلین شیو وہ درمیانی سی عمر کا مرد دیکھنے میں خاصا شریف اور خوش اخلاق محسوس ہو رہا تھا۔ جاوید علی اپنی خریداری مکمل کر کے بل کی ادائیگی کے لیے اس کے سامنے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوا تو اس نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے اس سے رقم وصول کی اور اپنی دراز میں رکھ کر بقایا نکالتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔

''آپ اس علاقے میں نئے لگتے ہیں۔ میں پہلی بار آپ کو اپنی دکان پر دیکھ رہا ہوں۔''

''میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو آپ کی دکان دیکھ کر خیال آیا، والدہ نے گھریلو استعمال کی کچھ چیزیں لانے کا حکم دیا تھا۔ بس اس لیے یہاں چلا آیا۔ ویسے یہاں آ کر مجھے اچھا لگا۔ آپ کی دکان پر ہر شے بہت قرینے سے رکھی ہوئی ہے اور خریدنے والا نہایت سہولت سے خریداری کر سکتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھئے، میرے پاس سامان کی لسٹ نہیں تھی لیکن چیزوں پر نظر پڑتی گئی اور یاد آتا گیا کہ کیا خریدنا تھا۔'' جواباً اس نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنس کر بتایا۔

''پھر تو آپ میری دکان کو یاد رکھیے گا اور آئندہ بھی یہاں سے سودا خریدیئے گا۔ آپ کو یہاں سہولت کے ساتھ ساتھ خصوصی ڈسکاؤنٹ بھی ملے گا۔'' رائے چند نے ترغیب دیتے ہوئے اسے بقایا رقم واپس کی اور اس نے ایک نظر میں ہی دیکھ لیا کہ اس نے بننے والے بل کے مقابلے میں کم رقم کاٹی ہے۔

''آپ سے شاید حساب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے زیادہ روپے واپس کر دیئے ہیں۔'' اس نے فوراً ٹوکا۔

''نہیں، کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے ابھی سے آپ کو ڈسکاؤنٹ دینا شروع کر دیا ہے۔'' اس نے ہنس کر جواب دیا تو جاوید علی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا اس انتظار میں ہے کہ وہ کاؤنٹر سے ہٹے تو وہ رائے چند سے بات کرے۔

یہ بات کچھ عجیب تھی۔ کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ لڑکے نے دکان سے کوئی خریداری نہیں کی تھی بلکہ سیدھا کاؤنٹر کی طرف آیا تھا جبکہ دکان میں اچھا خاصا وقت گزار کر وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ رائے چند کا خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ گاہکوں سے صرف رقم کی لین دین کا کام کرتا ہے۔ ایسے میں اس لڑکے کا براہ راست وہاں آ کر کھڑا ہونا قابلِ غور تھا۔ وہ دکان سے باہر نکل گیا لیکن توجہ لڑکے کی طرف ہی رہی۔ باہر نکل کر سامان کا تھیلا بائیک پر باندھنے اور بائیک اسٹارٹ کرنے میں اس نے جان بوجھ کر خاصا وقت لگایا اور اس دوران بیک ویو مرر کی مدد سے دکان کے اندر کا جائزہ لیتا رہا۔

لڑکا سرگوشی میں رائے چند سے بات کر رہا تھا۔ جواب میں رائے چند کاؤنٹر سے اُٹھ کر دکان کے کسی اندرونی حصے کی طرف گیا اور ایک پیکٹ لا کر لڑکے کو تھما دیا جسے لڑکے نے فوراً ہی اپنی قمیض کے نیچے چھپایا اور تیزی سے دکان سے باہر نکل گیا۔ جاوید اس دوران بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔

لڑکے نے دکان سے نکل کر ایک قریبی گلی کا رخ کیا تو وہ اس سے پہلے بائیک اس گلی میں لے گیا۔ گلی کے کونے پر لے جا کر ایسے زاویے سے روک لی کہ لڑکا نظر آتا رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکا اسی گلی کے کسی گھر میں جاتا ہے یا آگے نکل جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ کسی گھر میں داخل نہیں ہوا اور گلی سے نکل کر آگے بڑھ

گیا۔ اس کا رخ ایک چھوٹے سے پارک کے دروازے کی طرف تھا۔

یہ بالکل اُجاڑ پارک تھا جس میں اُگائی گئی گھاس جانے کب کی سوکھ کر مٹی کے ساتھ رُل مل گئی تھی اور اِکا دُکا پرانے پیڑ پارک میں کھڑے چند ٹنڈ منڈ سے درختوں کے جھڑ جانے والے زرد اور سوکھے پتے ہی پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پارک بالکل ویران پڑا تھا اور وہاں کسی ذی نفس کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لڑکا دروازے سے گزر کر پارک میں داخل ہوا تو جاوید علی کو اندازہ ہوا کہ اس کی منزل پارک نہیں ہے بلکہ وہ پارک کے دروازے سے داخل ہو کر وہاں بنی پختہ روش پر سے گزرنے کے بعد دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

جاوید علی کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال آیا اور وہ بائیک کھڑی کر کے خود بھی تیزی سے لڑکے کے پیچھے لپکا۔

''اے لڑکے! بات سنو۔'' پارک میں داخل ہونے کے بعد اس نے لڑکے کو سخت اور بارُعب لہجے میں پکارا۔ اس کی پکار سن کر لڑکا رُک تو گیا لیکن اس کے چہرے پر واضح طور پر خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ جاوید علی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چشم زدن میں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے سخت نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیا بات ہے بھائی صاحب! آپ نے مجھے کیوں پکارا ہے؟'' لڑکے نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا۔

''بھائی صاحب نہیں، مائی باپ بولو۔ ہم پولیس والے تم جیسے آوارہ چھوکروں کے مائی باپ ہوتے ہیں۔'' اس نے چہرے کے تاثرات میں مزید سختی سموتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

''پپ..... پو..... پولیس..... مگر آپ.....'' اس نے جاوید علی کے جینز اور ٹی شرٹ میں نمایاں ہوتے اسمارٹ ورزشی جسم پر ایک نظر ڈالی اور حیرت اور خوف سے ملے جلے لہجے میں چند آدھے ادھورے جملے ادا کیے۔

''کیوں..... کیا تجھے یقین نہیں آ رہا؟..... اپنا کارڈ دکھاؤں کیا تجھے؟'' جواباً جاوید علی غرایا۔

''نہیں سر جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پر میری سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ نے مجھے کیوں روکا ہے؟'' اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے استفسار کیا تو اس کا لہجہ کسی گڑبڑ کی چغلی کھا رہا تھا۔

''وجہ بھی بتاتا ہوں بچو! تم ذرا میرے ساتھ ادھر تو چلو۔'' وہ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر ایک سنگی بینچ کی طرف لے گیا۔ اس سے قبل اُس نے اپنی ٹی شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اُڑسی پسٹل کی جھلک دکھا دی تھی جس کی وجہ سے لڑکے کا خوف کچھ اور بھی بڑھ گیا اور وہ کسی بھی قسم کی پس و پیش کیے بغیر ڈھیلے قدموں کے ساتھ بینچ کی طرف گھسٹتا چلا گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' بینچ پر بیٹھنے کے بعد اس نے لڑکے سے دریافت کیا۔

''حاذق۔'' اس نے مری مری آواز میں بتایا۔

''عمر؟''

''پندرہ سال۔''

''کس کلاس میں پڑھتے ہو؟'' وہ لڑکے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے کے لیے یونہی ضمنی سوالات کرتا جا رہا تھا۔

''نویں کا امتحان دیا ہے۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رہتے کہاں ہو؟''

''وہاں، اُس گلی کا چوتھا گھر میرا ہے۔'' اس نے ہاتھ سے اُس گلی کی طرف اشارہ کیا جس سے گزر کر وہ یہاں تک آئے تھے۔

''وہاں گھر ہے تو پھر آگے کہاں جا رہے تھے؟'' جاوید نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''وہ جی.....دوست کے پاس جا رہا تھا۔''

''کیوں؟'' اُس کا لہجہ کچھ اور سخت ہوا۔

اس بار لڑکے نے جواب نہیں دیا اور بس ہکلا کر رہ گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر جاوید علی نے جواب پر اصرار کرنے کے بجائے ایک اور سوال داغ دیا۔

''رائے چند کی دُکان پر کیا لینے گئے تھے؟'' اس سوال کا لڑکے پر زبردست ردِعمل ہوا اور اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اس کے انداز سے ایسا لگا کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہو لیکن ہاتھ جاوید علی کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے مجبور ہو۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' جاوید علی غرّایا۔

''کک.....کچھ نہیں جی۔ میں تو بس ان سے گھی کے ڈبے کی قیمت پوچھنے گیا تھا۔'' اسے آخر کار کوئی بہانہ سوجھ ہی گیا۔

''بکواس کرتے ہو۔ ابھی تمہاری تلاشی لے کر وہ پیکٹ نکالتا ہوں جو تم رائے چند سے لے کر آئے ہو۔'' اس نے لڑکے کو تقریباً جھنجوڑ ڈالا جس پر وہ باقاعدہ رو پڑا۔

''معاف کر دیں سر جی!.....آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی شروع کر دی۔

''پیکٹ نکال کر دکھاؤ مجھے۔'' اس نے لڑکے کو حکم دیا جس کی اُسے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔

جاوید علی نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا جائزہ لیا۔ پیکٹ کا سائز زیادہ بڑا نہیں تھا اور نہ ہی وزن زیادہ تھا۔ اُس نے اس پر چڑھا کور پھاڑ کر اسے کھولا۔ اندر سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور سی ڈی نکل کر سامنے آئی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں چار پانچ ہی سگریٹ تھے۔

''یہ کسے دینے جا رہے تھے؟'' اس نے دونوں چیزوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد مہری سے دریافت کیا۔ وہ چاہتا تو اتنی لمبی گفتگو کرنے کے بجائے پہلے ہی مرحلے میں لڑکے کی تلاشی لے کر یہ پیکٹ نکال لیتا۔ لیکن صرف احتیاطاً ایسا نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بے شک وہ جس پارک میں موجود تھے، وہ ویران اور اُجاڑ سا ہوا تھا لیکن اس کے آگے پیچھے گلیاں تھیں اور ان گلیوں میں رہنے والے یقینی طور پر اس پارک کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس لیے وہ یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا کہ کوئی اسے حاذق کے ساتھ زور زبردستی کرتا دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو اور اس معاملے میں مداخلت کرے۔ وہ دونوں جب سے یہاں بیٹھے تھے، وہاں سے صرف ایک شخص گزرا تھا اور یقیناً اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ حاذق نامی اس لڑکے سے کس نوعیت کی گفتگو کر رہا ہے۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ تم یہ پیکٹ کسے دینے جا رہے تھے؟''

''کسی کو نہیں۔ میں اپنے دوست شہباز کے گھر اس کے ساتھ یہ فلم دیکھنے جا رہا تھا۔'' لڑکے نے لڑکھڑاتے ہوئے جواب دیا جو کہ خاصا حیرت انگیز تھا۔ رائے چند کی دکان پر جنرل آئٹمز بکتے تھے، وہ کوئی ویڈیو

سٹور نہیں تھا، جہاں سے فلمیں لا کر دیکھی جاتیں۔

''تم اور تمہارا دوست سگریٹ بھی پیتے ہو؟'' اس نے ایک سگریٹ نکال کر اسے کھولتے ہوئے سوالات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''کبھی کبھی چھپ کر۔'' اس نے جھکی نظروں سے اعتراف کیا۔ اس دوران جاوید علی سگریٹ کو کھول چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس سگریٹ میں سفید زہر بھرا ہوا ہے۔

''اوئے، تم تو نشہ کرتے ہو۔'' اس نے یک دم لڑکے کی گدی پکڑ لی۔

''نہیں سر جی! قسم سے میں نشہ نہیں کرتا۔ یہ سگریٹ تو رائے انکل نے آج پہلی بار مجھے دیئے ہیں۔ کہہ رہے تھے پی کر دیکھو، اس کے ساتھ فلم دیکھنے کا مزہ ڈبل ہو جائے گا۔'' لڑکے نے خوف زدہ منمناہٹ کے ساتھ حقیقت کا انکشاف کیا۔

''یہ کون سی فلم ہے؟.....سی ڈی پر کوئی نام وغیرہ تو لکھا ہوا نہیں ہے۔'' ہیروئن بھرے سگریٹ دیکھ کر اسے اندازہ ہونے لگا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے اور شاید رائے چند ''را'' کے عمومی ایجنڈے کی پیروی کرتے ہوئے نوجوان نسل کی تباہی میں بھی کوئی کردار ادا کر رہا ہے۔

''یہ.....یہ وہ فلم ہے جی.....وہ.....جنہیں نیلی.....'' لڑکے نے اٹک اٹک کر بتانا شروع کیا تو اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ نوعمر لڑکا قابل اعتراض فلمیں دیکھتا تھا اور اسے ہیروئن کے نشے کی طرف بھی راغب کیا جا رہا تھا۔ ان دو چیزوں کے زندگی میں شامل ہونے کے بعد اس کی تباہی میں کیا شک کیا جا سکتا تھا۔

''تم دوست کے گھر میں بیٹھ کر یہ فلم دیکھتے اور سگریٹیں پیتے تو اس کے ماں باپ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟''

''اس کے امی ابو کسی شادی میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں اور رات کو دیر سے واپس آئیں گے۔ اسی لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا۔''

لڑکے نے بتایا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی صورت حال ہو گی۔ فی زمانہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بچے موقع ملتے ہی والدین کو چونا لگا دیتے تھے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ان حالات میں ماں باپ کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے صرف لڑکیوں کو ان کی حفاظت کے پیشِ نظر گھر میں تنہا نہیں چھوڑا جاتا تھا لیکن اب صورتِ حال تقریباً یکساں تھی۔ ترغیبات اور خدشات دونوں میں ہی زیادہ اضافہ ہو چکا تھا کہ دونوں ہی کی حفاظت ضروری ہو گئی تھی۔

موجودہ زمانے کے والدین کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اگر وہ اپنی اولاد اور اس کے مستقبل کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو نہایت احتیاط سے انہیں اپنی مستقل نگرانی میں رکھیں۔ احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ آج کل بچے شخصی آزادی کے نعرے کی وجہ سے اتنے حساس ہو چکے ہیں کہ اپنی زندگی میں والدین کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتے۔ ایسے میں ظاہر ہے والدین کے پاس یہی حل رہ جاتا ہے کہ غیر محسوس طور پر ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور ایسے مواقع میسر نہیں آنے دیں کہ وہ کسی شکاری کے جھانسے میں پھنسنے کے لیے آسان شکار نظر آئیں۔

''چلو تمہارے دوست کے گھر چلتے ہیں۔'' اس نے یک دم ہی ایک فیصلہ کیا اور حاذق کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

''کیا آپ اسے بھی گرفتار کر لیں گے؟'' اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ فیصلہ بعد میں ہوگا۔ پہلے میں اس سے ملاقات کرلوں۔'' جاوید علی نے سنجیدگی سے جواب دے کر اس کا ہاتھ ایک بار پھر گرفت میں لے لیا۔ مجبوراً اسے اس کے حکم کی تعمیل میں آگے بڑھنا پڑا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارک سے باہر نکلے تو حاذق اُسے ایک قریبی گلی میں لے گیا۔ اس گلی کے ایک مکان کے سامنے پہنچ کر حاذق نے کال بیل بجائی۔ فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی اور گیٹ کی کنڈی کھلنے لگی۔

''تو بھی بڑا سست ہے یار حاذق! اتنی دیر کردی آنے میں۔ معلوم نہیں ہے کیا کہ امی ابو کے آنے سے پہلے فلم واپس بھی.....''

بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو حاذق کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور باقی کے لفظ منہ میں ہی رہ گئے۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے حاذق کے سُتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں بچّو!..... پہلے تم اندر تو چلو۔'' اُس نے لڑکے کو دھکا دے کر پیچھے کیا اور خود حاذق کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے اندر گھس گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے بڑی پھرتی سے گیٹ دوبارہ بند کر دیا اور اپنا پسٹل نکال لیا۔ اس کی پھرتی کے سامنے وہ لڑکے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اتنا نڈر اور زیرک تھا کہ بڑے بڑے مجرموں کے لیے بھی اس کے سامنے ٹھہرنا آسان نہیں تھا، یہ دونو عمر لڑکے بھلا کیا اوقات رکھتے تھے۔ ان میں اگر کچھ دم خم تھا بھی تو پسٹل دیکھ کر نکل گیا۔

''اندر کمرے میں چلو۔'' اس کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے جاوید علی نے سرد لہجے میں حکم دیا اور ساتھ ہی پسٹل سے اشارہ بھی کیا تو دونوں لڑکے گرتے پڑتے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

اندر پہنچ کر اس نے ان دونوں کو ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا اور مزید چند سوالات کیے جن سے ایک طرف تو حاذق کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوگئی، دوسری طرف کچھ مزید معلومات بھی حاصل ہوئیں۔

لڑکوں کے بیان کے مطابق وہ تقریباً چھ ماہ سے رائے چند کی دکان سے اس طرح کی فلمیں لے کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں ان کے ایک ایسے دوست نے جو عمر میں ان سے چند سال بڑا تھا اور ساتھ کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے اُن کی اس سے دوستی تھی، اس راہ پر لگایا تھا۔ وہی انہیں رائے چند کی دکان پر لے گیا تھا اور اس کی سفارش پر رائے چند انہیں یہ فلمیں فراہم کرنے لگا تھا۔

حاذق کی طرح شہباز نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ کبھی کبھار سگریٹ نوشی کر لیتے ہیں لیکن نشے کے استعمال سے اس نے بھی انکار کیا تھا۔ جاوید نے ان سے ان کے اس دوست لڑکے کا نام پتہ معلوم کر کے اپنے پاس نوٹ کرلیا۔ اب وہ آگے کی کارروائی کے لیے تیار تھا اور اس سلسلے میں اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل بھی بنا چکا تھا۔ لیکن اس سے قبل ان لڑکوں کو کچھ دیر کے لیے غیر متحرک کرنا ضروری تھا چنانچہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً اُنہیں ایک رسّی سے باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اسے یہ تو معلوم ہی ہو چکا تھا کہ شہباز کے والدین کی رات گئے گھر آمد متوقع ہے اس لیے وہیں بیٹھ کر اطمینان سے اپنی کارروائی کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے اپنے منصوبے اور اس کی ضروریات کے مطابق سہولیات کی دستیابی کے بارے میں بتایا۔ وہاں سے منظوری ملنے پر وہ مزید مصروف ہوگیا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، اس کے لیے فی الحال ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے مہروں کو حرکت دینا

تھا۔ وہ یہی کرتا رہا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اب کارروائی شروع ہوا ہی چاہتی ہوگی تو وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ روانگی سے قبل اس نے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا جہاں ان دونوں لڑکوں کو قید کیا تھا۔ دونوں لڑکے بے بسی سے فرش پر پڑے تھے۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوف اُتر آیا کہ جانے اب یہ شخص ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔

''میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہوگی کہ جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں کسی کے سامنے زبان مت کھولنا۔ میں یہ ناخن تراش یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس میں ایک ننھا سا چاقو بھی لگا ہوا ہے۔ اب یہ تم دونوں کے اوپر ہے کہ کیسے اور کتنی دیر میں اس تک پہنچ کر ایک دوسرے کی رسیاں کاٹ کر اس قید سے نجات حاصل کرتے ہو۔ اگر ناکام رہے تو اپنے والدین کی آمد تک انتظار کر لینا۔ وہ خود تمہیں کھول لیں گے۔ میں اب جاتا ہوں۔ ٹاٹا۔ بائے بائے۔''

اس نے ناخن تراش لڑکوں سے کافی فاصلے پر موجود ایک میز پر رکھ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تو جانے سے پہلے اُنہیں کھول بھی سکتا تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ مکمل کارروائی کرنے سے قبل ان کا آزاد ہونا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے اچھا تھا کہ اس چھوٹی سی سزا کے ذریعے انہیں سبق مل جاتا اور وہ غلط حرکتیں چھوڑ کر سیدھی راہ پر آجاتے۔

وہاں سے نکل کر وہ سیدھا اس پارک کی طرف گیا جس کی دوسری جانب اس نے اپنی بائیک کھڑی کر رکھی تھی۔ پارک کے ایک دروازے سے دوسرے دروازے کے درمیان بنی پختہ روش پر سے گزرتے ہوئے اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ دو افراد اس کی بائیک کے قریب کھڑے ہیں اور بڑی عرق ریزی سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس نے قریب پہنچ کر جیب سے چابی نکالی تو وہ چونک گئے۔

''یہ بائیک تمہاری ہے جوان؟'' دونوں میں سے زیادہ عمر رسیدہ صاحب نے اسے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی میری ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟'' اس نے جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ لوگ اس سے زیادہ بحث کرنے کی کوشش نہ کریں اور بائیک پر سوار ہوگیا۔

''اعتراض تو چھوٹا لفظ ہے میاں! ہم تو پچھلے بیس پچیس منٹ سے اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جانے کب کوئی موٹر سائیکل پر بم باندھ کر یہاں کھڑی کر گیا ہے۔ ہم تو پولیس اسٹیشن فون کر کے اطلاع دینا چاہتے تھے اس مشکوک موٹر سائیکل کے بارے میں لیکن وہ بادشاہ لوگ بھی شاید آج سرِ شام ہی لمبی تان کر سو گئے ہیں اس لیے کوئی فون ہی نہیں اٹھاتا۔'' بڑے میاں جانے کس بات پر زیادہ خفا تھے۔ تھانے والوں کے نہ اٹھانے پر یا اپنے تئیں ایک مشکوک موٹر سائیکل کے ہاتھ سے نکل جانے پر۔

''آپ نے ٹھیک ہی سمجھا جناب! اس تھیلے میں بم ہی رکھا ہے۔'' اس نے رائے چند کی دکان سے ملحق گلی اشیا کے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بائیک کو کک لگائی تو وہ دونوں حضرات یوں پیچھے ہٹے کہ موٹر سائیکل ان پر چڑھاتے ہوئے بم بلاسٹ کردے گا۔

''یہ بم آج رائے چند کے سر پر پھٹے گا۔'' گلی سے گزر کر واپس رائے چند کی دکان کی طرف جاتے ہوئے وہ زیرلب بڑبڑایا تو اس کے کان پولیس کی گاڑی کا سائرن سن رہے تھے۔

اس نے بائیک اُس ریستوران کے سامنے لے جا کر روک دی جو رائے چند کی دکان کے عین سامنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود تھا۔ یہاں سے وہ پولیس والوں کی ساری کارروائی اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کارروائی کو
ہوئے اس کی نظر میں اپنے آدمی بھی آ گئے۔ اس ڈرامے میں جہاں پولیس کا کردار ختم ہوتا، وہیں سے اس
آدمیوں کا کام شروع ہو جاتا۔ اسے سکون محسوس ہوا کہ وہ صحیح وقت پر اپنے کردار کی ادائیگی کے لیے
موجود ہیں۔ رائے چند کی دکان میں داخل ہونے کے آٹھ دس منٹ بعد ہی پولیس والے برآمد ہوئے
کے چہرے فتح کی خوشی سے چمک رہے تھے۔ ان کے ساتھ بوکھلایا ہوا رائے چند موجود تھا اور اس کے
میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

دوسری طرف ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود تھیلے میں واضح طور پر کئی سی ڈیز نظر آ رہی
اردگرد کے دکاندار، ریستوران کا عملہ، گاہک اور راہ گیر اس کارروائی کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے
اپنی اپنی جگہ انگشت بدنداں تھے کہ ایک جنرل اسٹور پر سی ڈیز کا کیا کام تھا؟ ان میں سے چند یقیناً
حقیقت بھی ہوں گے جن میں سے ایک گروہ ان افراد کا ہوگا جنہیں رائے چند کے کالے دھندے
ہوگی اور وہ اس کے پکڑے جانے پر خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔ جبکہ دوسرے گروہ کے افراد کو پریشانی
ہوگی کہ رائے چند کی گرفتاری کے بعد وہ اپنے مطلب کی سی ڈیز کہاں سے حاصل کریں گے۔ جاوید
فی الحال دونوں ہی طرح کے لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ رائے چند کی گرفتاری کے بعد پولیس
کے وہاں سے روانہ ہوتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فی الحال تو رائے چند کو تھانے لے جایا جا
لیکن اسے کہیں اور اس کے استقبال کے لیے پہنچنا تھا تاکہ اس سے دو دو ہاتھ کیے جا سکیں۔

⊛----✪----⊛

''لو بھائیا جی! اسیں ہریانہ وچ پہنچ گئے ہیں۔ ایہہ ہریانہ دا شہر پانی پت ہے۔ ایتھے ساڈا گھر
میرے کول رُکو۔ نہا دھو کر روٹی شوٹی کھاؤ، فیر اگے چلے جانا۔ میں خود تہمیں دلی جانے والی بس
جاؤں گا۔'' وہ سرائے میں اپنے علاوہ ٹھہرے ہوئے دوسرے مسافر کی سوزوکی میں سوار ہو کر اس
اس کے شہر تک پہنچے تھے اور اب وہ اپنی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے خلوص
اپنے ساتھ اپنے گھر چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔

''بہت بہت دھنّے واد بھا جی! پر اس دی لوڑ نئیں ہے۔ اسیں تہانوں پہلے ہی دس چکے ہیں کہ
سے جلد دلی وچ پہنچنا چاہندے ہیں تاکہ اپنے راج کمار دے ویاہ کی تیاری کر کے واپس لوٹ جائیں۔
اس دے ویاہ توں فارغ ہونے کے بعد فیر کبھی ادھر آنا ہوا تو تہاڈے کول ضرور آئیں گے۔'' شہزاد
عاجزی اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا لیکن قبول کرنے سے بڑی خوب
سے انکار کر دیا۔

''تہاڈی مرضی جی۔ اگر بولو تو دلی کے لیے بس کے ٹکٹ کٹوا دیتا ہوں۔'' اس نے ان کے
حقیقت سمجھتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کیا اور ایک اور پیشکش کی۔

''نہ نہ..... ایہہ چھوٹا سا کم اسیں خود بھی کر سکدے ہیں۔ تسی اپنے گھر جاؤ ہور آرام کرو۔ ہم
میں گھوم پھر کر دیکھتے ہیں۔''

وہ اب اس شخص سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے اس لیے اس دوسری پیشکش کو بھی ٹھکرا کر
کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے چار و ناچار ان دونوں سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کر لے

اپنی گاڑی سے اُتار دیا۔ اُتارنے سے قبل البتہ وہ اُنہیں یہ بتانا نہیں بھولا تھا کہ دہلی کے لیے بسیں کہاں
ہیں اور ٹکٹ کے حصول کے لیے انہیں کیا کرنا ہوگا۔ اس کی فراہم کردہ ان معلومات کو ذہن نشین
کرتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور بازار کی رونقوں میں خود کو گم کر لیا۔

تاریخی اہمیت کے حامل اس شہر کے بازار میں گھومتے ہوئے شہریار کو مغل تاج دار ظہیر الدین بابر یاد آیا۔
اس مغل بادشاہ کے متعلق جو معلومات فراہم کرتی تھی، ان کی روشنی میں اسے جرأت مند اور بہادر سپہ سالار
کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پانی پت کے میدان میں ہی اس نے ابراہیم لودھی سے
لڑی تھیں۔ اس میدانِ جنگ کا تو کچھ پتہ نہیں تھا لیکن آج وہ اس کے بازار میں گھوم رہے تھے۔
میں گھوم پھر کر انہوں نے ایک دکان سے اپنے ناپ کے کپڑے خریدے، پھر ناپ کے جوتے بھی
لیے۔

خریداری کرتے ہوئے ان کا انداز اُن ٹھیٹھ دیہاتیوں جیسا تھا جو پہلی بار اپنے لیے شہری وضع قطع کے
اور جوتے خرید رہے ہوں۔ اُن کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دکان داروں نے اپنے
انہیں خوب لوٹا۔ اپنے کردار کو تقویت دینے کے لیے وہ آرام سے لٹ گئے۔ رقم کے معاملے میں ویسے
انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت ہی انہیں راستے کی ضروریات پوری کرنے
لیے معقول انڈین کرنسی فراہم کر دی گئی تھی۔ امرت کور کے گھوڑے کو فروخت کرنے کے باعث اس رقم
اضافہ ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے آرام سے خریداری مکمل کی اور پھر ایک عوامی حمام میں جا کر لباس
تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شیو بھی بنا ڈالی۔

پینٹ شرٹ اور جوتوں کی تبدیلی کے ساتھ ان کے سنورے ہوئے حلیوں نے ان کی وضع قطع کو بالکل
تبدیل کر کے رکھ دیا۔ کچھ دیر قبل جس شخص نے اُنہیں بازار کے قریب ڈراپ کیا تھا۔ اگر اس وقت وہ انہیں
لیتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے شناخت کی یہ تبدیلی ضروری بھی تھی تاکہ اپنے پیچھے
اتا پتہ چھوڑ کر نہ جائیں۔ فی الحال تو وہ خود کو انڈین معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں
ہوئے تھے۔ یہاں سے لباس کی خریداری کا بھی یہی مقصد تھا ورنہ جو کپڑے وہ پاکستان سے پہن کر نکلے
اس کے علاوہ بھی ایک ایک اضافی جوڑا اُن کے بیگ میں موجود تھا۔ پہنے ہوئے لباس تو راستے میں ہی
خراب ہو گئے تھے چنانچہ سرائے سے روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے انہیں تلف کر دیا تھا اور امرت کور
کردہ دھوتی کُرتے میں ہی یہاں تک آئے تھے۔ اب وہ ان دیہاتی کپڑوں سے بھی جان چھڑا چکے
نئے شہر کے فیشن میں رنگے ہوئے جوان دکھائی دے رہے تھے۔ پاکستان سے ساتھ لائے ہوئے
کا استعمال بھی انہوں نے اس لیے مناسب نہ سمجھا تھا کہ چہرے مہرے اور بول چال کے علاوہ
چغلی کر دیتا ہے کہ بندے کا تعلق کس جگہ سے ہے۔ چہرے اور بول چال میں تو وہ اپنی ربیت اور
بل بوتے پر خاصی تبدیلی لا چکے تھے، لباس بھی بھارتی تیار کردہ پہن لیا تو مقامی ہی لگنے لگے۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور دہلی تک براہِ راست جانے والی بس کے
لیے۔ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے وقت میں وہاں پہنچے تھے جب بس کی روانگی میں بس پندرہ
ہی باقی رہ گئے تھے اور اس کے باوجود انہیں اس میں سیٹیں مل گئی تھیں۔

''تم یہاں سے کھانے پینے کے لیے کچھ خریدو، میں ابھی آتا ہوں۔'' دہلی تک جانے کا انتظام ہوا تو
دوسرے اہم کام کا خیال آیا اور وہ سلّو کو ہدایت کر کے اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے ایک پبلک کال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آفس دیکھا تھا۔ وہ جن راستوں سے گزر کر بھارت پہنچے تھے، وہاں موبائل کے سگنلز نہیں آتے تھے اس اپنے پاس موبائل رکھنا بے کار تھا۔ اس قسم کے سارے انتظامات انہیں یہیں رہ کر کرنے تھے اور وہ اسی میں پی سی او تک جا رہا تھا۔

پاکستان سے روانگی سے قبل اُسے چند اہم فون نمبرز اور کوڈز ذہن نشین کروائے گئے تھے جہاں انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں کچھ مدد مل سکتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے ہی ایک نمبر پر رابطہ کر رہا تھا پر چونکہ سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اسے اس قسم کے رازوں میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ پی سے اپنا مطلوبہ نمبر ملا کر وہ کال ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ دو گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیئے ہیں۔'' اس نے طے شدہ کوڈ ورڈ ادا کیا۔

''جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔'' دوسری طرف سے جوابی کوڈ ورڈز ادا کیے گئے۔

''ہم پانی پت میں ہیں اور تھوڑی دیر بعد دہلی جانے والی بس میں سوار ہونے والے ہیں۔'' کوڈ سن کر اسے اطمینان ہو گیا کہ صحیح آدمی سے رابطہ ہوا ہے چنانچہ اپنے بارے میں اسے اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے۔ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس آپ سے ملوں گا۔'' اس نے جواب دیا اور انہوں نے ملاقات کے لیے وقت، ایک دوسرے کے حلیے اور نئے کوڈ ورڈز طے کر لئے۔ اس ساری گفتگو انہوں نے مشکل سے پانچ منٹ ہی صرف کیے تھے۔

پی سی او والے کو کال کا بل ادا کر کے وہ باہر نکل آیا۔ پی سی او میں یہ بات اچھی تھی کہ دو تین الگ بوتھ بنے ہوئے تھے چنانچہ اسے تنہائی میں اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس پی سی او کی خصوصیت اس نے پہلے ہی نوٹ کر لی تھی اسی لیے اس کا انتخاب بھی کیا تھا۔ کال سے فارغ ہو کر وہ اسٹاپ واپس پہنچا تو سلّو ہاتھ میں ایک شاپر لیے اس کا منتظر تھا۔

''ابھی میں نے یہ کچوریاں خرید لی ہیں۔ صحیح کھانا دہلی پہنچ کر ہی کھائیں گے۔'' شہریار کو دیکھ کر اس نے بتایا۔

''او کے، ایز یو وِش۔'' اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا، وہاں ماضی کی طرح لگی بندھی روٹین پر چلنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی پہلے کی طرح وہ نخرے دکھائے جا سکتے تھے۔ اپنے لیے اس نے جس زندگی کا انتخاب کیا تھا، اس میں کسی آوارہ گرد اور خانہ بدوش کا سا انداز اختیار کرنا لازم تھا۔ اس زندگی میں معمولات نہیں ہوتے، پسند ناپسند نہیں ہوتی اور معیارات قائم نہیں کیے جاتے۔ بس خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ کر مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے ہاتھ پیر چلائے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہی کر رہا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' سلّو نے لفافے سے ایک کچوری نکال کر کھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ایک کام سے گیا تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے بتانا نہیں چاہتے؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کیا.....؟'' اُس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور پوری طرح کچوریوں میں مصروف ہو گیا۔

چند منٹ بعد بس چلنے کا اعلان ہوا تو وہ دونوں بھی اس میں سوار ہو گئے۔ بس آرام دہ تھی۔ سبک رفتاری سے فاصلے طے کرتی ہوئی سونی پت اور کرنال سے گزر کر دہلی کی حدود میں داخل ہو گئی۔

دہلی کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے راستے میں کئی فارم ہاؤسز دیکھے۔ ساتھی مسافروں کی زبانی معلوم ہوا کہ ان فارم ہاؤسز کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بس نے انہیں مطلوبہ بس اسٹاپ پر اُتارا تو وہ دونوں سائیکل رکشے میں بیٹھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان دونوں کے پاس ایک ایک سفری بیگ کے سوا کوئی سامان نہیں تھا اس لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اسٹاپ سے پہلے کسی ہوٹل میں جا کر وہاں کمرہ بک کرواتے اور پھر اپنا سامان رکھ کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہوتے۔ ویسے بھی ہوٹل میں قیام کے لیے شناختی دستاویز کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے ان کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ اس شخص سے مل لیتے جس سے انہیں دہلی میں اپنے لیے مدد ملنے کی اُمید تھی۔ سلّو کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب اس نے سائیکل رکشے کو جامع مسجد چلنے کو کہا تو اس نے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ وہ یوں مطمئن تھا جیسے بھارت کسی خطرناک مشن پر نہ آیا ہو بلکہ سیر کے لیے آیا ہو اور اس سیر کے لیے سارے معاملات طے کرنا شہریار کی ذمے داری ہو۔

شہریار کے لیے اس کا یہ بے نیاز اور بے پروا انداز باعثِ تفکر نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسی لاابالی سلّو کے اندر وہ شخص چھپا ہوا ہے جو وقت پڑنے پر ایکشن میں آنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اس کی یہ بے نیازی تو اس کے نڈر اور دلیر ہونے کی دلیل تھی۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ہی اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آ گیا۔ درمیانی قامت کے گول مٹول سے اس آدمی نے سفید دھاریوں والی نیلی قمیض کے ساتھ سر پر سفید ہیٹ لگا رکھا تھا جو اس کی گوری رنگت پر جچ رہا تھا۔ فون پر اس شخص نے اپنا یہی حلیہ بتایا تھا چنانچہ شہریار اطمینان سے اس کی طرف بڑھ گیا اور اس کے عین سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

''دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ ہے، کہاں حاضری دوں کہاں نہیں؟''

''کہیں بھی جاؤ نہ جاؤ، درگاہ نظام الدین پر جانا مت بھولنا۔'' اس نے بھی جوابی کوڈ ورڈ دہرایا اور مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''فی الحال تو ہمیں سب سے پہلے کسی رہائش گاہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اپنے لیے شناختی دستاویزات، موبائل فونز اور ان کی سمز وغیرہ درکار ہوں گی۔'' اس نے فوراً اسے اپنی ضروریات سے بلا تکلف آگاہ کیا۔ تکلف کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے اس شخص سے رابطہ کرنے کے لیے کہا ہی اس لیے گیا تھا کہ وہ ان کی ضروریات پوری کر سکے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ سب ہو جائے گا۔ مجھے چند منٹ کے لیے مسجد کے اندر جانا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔ پھر ہم ایک جگہ چلیں گے۔'' اس نے خوش خلقی سے کہا۔

''آپ چلے جائیں۔ ہم یہیں آپ کا انتظار کرتے ہیں۔'' اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ یہیں سے دیکھ سکتا تھا کہ مسجد کے دروازے پر سکیورٹی کا زبردست انتظام ہے اور ان کے پاس کچھ اسلحہ موجود تھا۔ دروازے سے گزر کر وہ مسجد میں جانے کی صورت میں فوری طور پر پکڑے جاتے، چنانچہ یہیں انتظار کرنا مناسب تھا۔

انکار سن کر وہ شخص تنہا ہی چل پڑا۔ وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھنے لگے۔ مغل بادشاہ کی سرخ پتھروں سے تعمیر کروائی گئی یہ جامع مسجد پُرشکوہ گنبدوں اور میناروں پر مشتمل تھی اور اس سے وہ خصوصی طرزِ تعمیر جھلکتا تھا جو مغلوں سے منسوب ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مسجد کی سیڑھیوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیچے اور آس پاس صفائی کا شدید فقدان تھا۔ حالانکہ وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ حکومتِ ہند کو سیاحوں کی وجہ سے جو کثیر آمدنی ہوتی ہے، اس میں مسجد کا بھی اہم کردار ہے۔ بہرحال، اس وقت اس قسم کے معاملات پر کسی قسم کی رائے زنی نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ مسجد اور ہندوستان بھر میں موجود مسلمانوں کی تعمیر کردہ تاریخی اہمیت کی حامل عمارتوں سے ہر پاکستانی مسلمان کی طرح اس کی بھی جذباتی وابستگی تھی اور وہ بجا طور پر فخر کرتا تھا کہ مسلمانوں کے طویل عرصے ہندوستان پر حکمرانی کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو ان عمارتوں کی صورت انمول خزانے سے نوازا تھا۔

دنیا کے عجائبات میں سے ایک بے نظیر عجوبہ تاج محل، مسلمان مغل بادشاہ شاہجہاں کا کارنامہ ہونے کے باوجود ہندو نواز ہندوستان کے لیے کثیر زرِ مبادلہ کما کر دیتا تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کا ان پر ایک احسان تھا لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے کارہائے نمایاں ماضی کا حصہ بن چکے تھے اور پاکستان بننے کے بعد کوئی پاکستانی مسلمان اپنے آباء کی ان یادگاروں پر حقِ ملکیت نہیں جتا سکتا تھا اور حال کا قصہ یہ تھا کہ اسے اپنے وطن کے ایک مایہ ناز سائنس دان ڈاکٹر فرحان جمیل کو بھارتی بھیڑیوں کی قید سے نجات دلا کر واپس پاکستان لے جانا تھا۔

ماضی میں جو کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور جو کچھ بھارتی غنڈوں نے لوٹ لیا تھا، اس سب کے لیے بے شک کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن اپنا حال اور مستقبل بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ڈٹ کر ان غنڈوں سے مقابلہ کریں۔ ایسے ہی ایک مقابلے کا عزم دل میں لے کر وہ جان ہتھیلی پر لیے ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تھا اور یہ طے تھا کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو یہاں سے واپس لے کر ہی جائے گا۔

''چلیے، اب چلتے ہیں۔'' اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ مسجد کا نظارہ کرتے ہوئے وہ کتنے گہرے خیال میں ڈوب گیا تھا۔ نیلی قمیض والے نے آ کر دوبارہ مخاطب کیا تو حال کے منظر میں واپس آ گیا۔ نیلی قمیض والے سے اس نے اس کا نام دریافت نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی ان سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انہیں ناموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس انہیں معلوم تھا کہ وہ پاکستان کے لیے کام کر رہے ہیں اور اس سے آگے کسی قسم کے سوال و جواب کی گنجائش نہیں تھی۔

بھرے پُرے بازار سے گزرتے ہوئے وہ پیدل ہی جانے کن کن گلیوں سے گھماتا ہوا انہیں ایک مکان تک لے گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور باہر سے دیکھنے میں ہی لگتا تھا کہ مکینوں کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس آدمی نے دروازے پر دستک دی تو ایک جوان لڑکے نے دروازہ کھولا۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی لیکن بظاہر وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہوا دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں نیلی قمیض والے کے پیچھے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مکان کی حالت اندر سے بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسا باہر سے دیکھ کر اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا۔

''پہلے تمہاری شناختی دستاویزات کی تیاری کے لیے کام شروع کرتے ہیں۔'' اس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی کام کی بات شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں اس کے اور اس کے ساتھی کے رحم و کرم پر تھے۔ کمرے میں روشنی کا معقول انتظام کر کے ایک دیوار پر نیلی چادر تان دی گئی اور وہ دونوں ان کے چہروں پر اپنا ہنر آزماتے ہوئے دو تین مختلف حلیوں میں ان کی تصویریں لیتے چلے گئے۔ اُن کے سامنے آئینہ نہیں تھا لیکن ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ دونوں ہی افراد میک اپ کے فن میں ماہر ہیں۔

''میں نے تصویریں لے لی ہیں۔ کمپیوٹر پر ان پر مزید کام کر کے آپ دونوں کے لیے کئی شناختی دستاویزات تیار کروا دوں گا۔ اس کام کے لیے مجھے بس کل تک کی مہلت درکار ہو گی۔ اس کے بعد آپ آزاد ہوں گے کہ حلیہ بدل بدل کر ہندوستان بھر میں جہاں چاہے گھومتے پھریں۔ آپ کی شناخت کے سلسلے میں کوئی آپ پر شک نہیں کر سکے گا۔'' اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے انہیں آگاہ کیا جبکہ اُس کا ساتھی خاموشی سے سارا ساز و سامان سمیٹنے لگا۔

''تھینک یو..... یہ کام تو ہو گیا۔ باقی دوسرے معاملات.....؟'' شہریار نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''تین چار سیلولر فون کے سیٹ اور سیمیں میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔ رہائش کا مسئلہ ابھی میرا ساتھی آپ کے ساتھ جا کر حل کروا دے گا۔ صرف آج ہی آپ کو یہ پرابلم رہے گی، کل سے تو آپ کسی بھی ہوٹل میں آسانی سے قانونی طور پر قیام کر سکیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ اس دوران اس کا ساتھی سامان سمیٹ کر کمرے کے بعد واپس آ گیا۔

''یہ ایک اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ اس کی مدد سے آپ پورے ہندوستان میں کہیں سے بھی رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کارڈ کا تعلق ایک ایسے شخص کے اکاؤنٹ سے ہے جسے مرے ہوئے بھی پانچ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن بینک کے پاس ریکارڈ نہیں ہے۔ اکاؤنٹ میں ہم مختلف ذرائع سے رقم جمع کرواتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے بینک کے پاس یہ ریکارڈ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں ہو گا۔ بشرطیکہ آپ ذہانت، ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیں۔'' اس نے ایک کارڈ شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا پھر اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو وہ بالکل الرٹ کھڑا ہو گیا۔

''آیئے، میں آپ کو ہوٹل تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس نے انہیں ساتھ لیا اور گھر سے نکل گیا۔ اپنے ساتھی کی طرح وہ بھی انہیں پُر پیچ گلیوں سے گھماتا ہوا مٹیا محل بازار واپس لے آیا اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے کر داخل ہو گیا۔

''اور لالو بھائی! کیا حال ہے؟..... بھابی اور بچے سب ٹھیک ہیں نا؟'' کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ارے راہول! تم..... بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔ گھر پر بھی بہت دنوں سے نہیں آئے۔ تمہاری بھابی اور بچے تمہیں یاد کر رہے تھے۔'' لالو کے نام سے پکارے جانے والے شخص نے بھی جواباً گرم جوشی سے مصافحہ کیا جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ ان کے ساتھ آنے والے جوان کے اس سے خاصے خوش گوار اور بے تکلفانہ تعلقات ہیں۔ کاؤنٹر والے شخص نے اسے راہول کہہ کر پکارا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا وہ راہول کا روپ دھار کر یہاں رہ رہا تھا۔

''تمہیں تو اپنی مصروفیت کا علم ہی ہے لالو بھائی!..... کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ایک جگہ ٹِک کر بیٹھیں تو میل جول میں بھی باقاعدگی آئے۔''

''ہاں، مجھے سب معلوم ہے، تم صحافی لوگ کتنے بدمعاش ہوتے ہو۔ یہ بتاؤ، آج کل کس ہیروئن کے پیچھے لگ کر اسے بلیک میل کرنے کی تیاری کر رہے ہو؟'' لالو نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے کہاں لالو بھائی! تم یار لوگ بھی خوامخواہ بدنام کرتے ہو۔ میں ایسا بلیک میلر ہوتا تو شہر میں اپنا بھی کوئی بنگلہ اور کوٹھی ہوتی۔'' اس نے سنجیدہ شکل بنا کر تردید کی کوشش کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے بے وقوف نہیں بناؤ۔ مجھے سب معلوم ہے تمہاری چار سو بیسی کا۔'' لالو نے اس کی بات کو ماننے کرنے سے انکار کر دیا۔

''اچھا مت مانو۔ لیکن اب مہمانوں کے سامنے انسلٹ تو نہ کرواؤ۔ یہ میرے چاچا کے بیٹے ہیں پانی پت سے گھومنے پھرنے کے لیے نکلے ہیں۔ کچھ دن دہلی میں ٹھہریں گے، پھر آگے نکل جائیں گے تم ہوٹل میں ان کے لیے دو بیڈز کا ایک کمرہ تو بک کر دو۔'' وہ بڑی خوب صورتی سے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''کیوں نہیں بھئی، تمہارے مہمان ہیں تو ہمارے بھی مہمان ہوئے۔'' اس نے اُٹھ کر شہریار اور سلو سے ہاتھ ملایا پھر دوبارہ راہول کی طرف متوجہ ہوا۔ ''دونوں کے نام بتاؤ۔''

اس نے نام بتا دیے جو کہ جگدیش اور ویندر ہی تھے اور پتے کے خانے میں کوئی پتہ بھی لکھوا دیا۔ اس کی وجہ سے لالو نے شناختی کاغذات دکھانے پر بھی اصرار نہیں کیا اور ایک کمرے کی چابی نکال کر ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ چابی کے ساتھ منسلک ٹیگ پر کمرہ نمبر تیرہ لکھا ہوا تھا۔

''اچھا بھئی، تمہارے لیے کمرے کا انتظام تو ہو گیا۔ تم آرام سے یہاں رہو اور جہاں چاہے گھومو پھرو میں اب چلتا ہوں، ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'' کام ہوتے ہی اس نے ان دونوں سے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ارے یار! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ کم سے کم چائے تو پیتے جاؤ؟'' لالو نے اسے روکا۔

''نہیں، ابھی مجھے سچ مچ جانا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو گھر آ کر بھابی کے ہاتھ کے بنے گوبھی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ ابھی تم میرے حصے کی چائے میرے مہمانوں کو پلا دو۔'' وہ ہاتھ ہلاتا ہوا عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے روانہ ہوتے ہی لالو نے ایک پورٹر کو بلا کر ان دونوں کو ان کا کمرہ دکھانے کا حکم دیا۔ کمرے میں پہنچ کر سلو نے بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گیا۔

''تمہارے دوست کتنے کنجوس ہیں۔ کھانا تو دُور کی بات، ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔'' ٹانگیں پھیلا کر بستر پر لیٹے لیٹے اس نے تبصرہ کیا۔

''ہم یہاں تفریحی دورے پر نہیں آئے ہوئے ہیں کہ لوگ ہماری خاطر مدارات کرتے پھریں۔ اگر ہمارے لیے جو کچھ کرنا چاہئے تھا، وہ انہوں نے کیا۔ تم کھانا کھانا چاہتے ہو تو ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں یہیں منگوا لیتے ہیں۔'' نیلی قمیض والے سے ملنے والے موبائلز میں سے ایک موبائل میں سم لگاتے ہوئے اس نے سلو کی بات کا جواب دیا۔

''نہیں، کہیں باہر چلتے ہیں۔ ذرا سیر بھی ہو جائے گی اور کھانا بھی کھا لیں گے۔'' وہ جو بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ جیسے بھوک اور تھکن کے مارے برا حال ہو، یکدم ہی باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ شہریار نے مسکراتے ہوئے اس کے پروگرام کی تائید کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ سلیم عرف سلو نامی یہ بلا بڑی آفت ہے اور ذرا سا سفر یا بھوک اسے اتنی آسانی سے نڈھال نہیں کر سکتے۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی نے اپنے سامنے بیٹھے رائے چند کو غور سے دیکھا۔ وہی اُجلا سفید لباس اور نرم سے دینے والے نقوش تھے اس شخص کے جس سے اچھا بھلا بندہ دھوکا کھا جائے اور ذرا شک نہ ہو کہ کیسی شیطان

رکھنے والا آدمی ہے۔ سی ایف پی والوں کی نظر میں تو وہ اس لیے آیا تھا کہ انہیں اس پر ''را'' کا مبینہ ہونے کا شک تھا لیکن اس کے علاوہ بھی وہ ایسے جرائم میں ملوث تھا کہ اس پر قانون کی گرفت ہونا ضروری تھی۔

وہ بدبخت اخلاق باختہ فلموں اور منشیات کی مدد سے بڑی چالاکی اور خاموشی کے ساتھ نوجوان نسل کو تباہ کرنے کے مشن پر جتا ہوا تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کا ساتھ دینے میں لالچ اور طمع میں مبتلا قانون کے رکھوالے برابر کے شریک تھے۔ وہ کتنا ہی شریف صورت سہی لیکن بہرطور یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کے ان کارنامے اور غیر قانونی دھندوں کی بن گن پولیس کو نہ ملی ہو۔ وہ سب جانتے تھے لیکن پابندی سے پہنچنے والے نذرانے نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔ اب جو اوپر سے سخت احکامات ملے تو انہیں چار و ناچار اس کی دکان پر چھاپہ مار کر مال برآمد کرنا پڑا۔ چھاپہ مارنے والی ٹیم کا انچارج انسپکٹر یقیناً اس وقت بہت حیران ہوا ہو گا اب اسے اوپر سے ہی یہ احکامات ملے کہ معقول رشوت قبول کر کے رائے چند کو آزاد کر دیا جائے۔ انسپکٹر ہوشیار تھا۔ اس نے موقع کا خوب فائدہ اُٹھایا اور رائے چند سے مول تول کر کے خاصی بڑی رقم اینٹھنے میں کامیاب رہا۔

رائے چند کے لیے اصل اہمیت آزادی کی تھی سو اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر کے اپنے لیے آزادی خرید لی۔ چالاک بنیے نے شاید یہ سوچ رکھا ہو کہ یہ نقصان اپنے غیر قانونی دھندوں سے بعد میں پورا کر لوں گا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ تھانے سے نکلنے کے بعد وہ اس سے بھی بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ اس نے فون کر کے اپنے بیٹے سے رقم منگوائی اور پھر اسے واپس بھیج دیا کہ تم واپس جاؤ، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ تھانے میں اس نے خود کو گرفتار کرنے والے انسپکٹر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کی کہ باقاعدگی سے پہنچنے والے نذرانے کے باوجود آخر اس نے اس پر ہاتھ کیوں ڈالا۔ اگر معمول کے نذرانے سے زائد رقم ہی درکار تھی تو وہ ویسے بھی بتا سکتا تھا۔ انسپکٹر بھی گھاگ آدمی تھا، سچ اور جھوٹ کو آپس میں ملاتے ہوئے اسے یہ کہانی سنائی کہ علاقہ مکینوں میں سے کسی نے اوپر شکایت کر دی تھی کہ رائے چند اس ایک دکان دار علاقے میں منشیات اور گندی فلموں کا کاروبار کر رہا ہے، اس کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ ایس پی صاحب نے تھانے فون کر کے ایکشن لینے کا حکم دیا تو مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ مہلت اتنی کم تھی کہ وہ پہلے سے اسے اطلاع بھی نہیں دے سکا کہ اپنی دکان سے ساری مشکوک چیزیں ہٹا لے۔ لیکن اب حق نمک ادا کرنے کے لیے اسے آزاد کرنے کو تیار ہے۔ اوپر والوں کو وہ یہ کہانی سنا سکتا تھا کہ چھاپے میں رائے چند کی دکان سے کچھ برآمد نہیں ہوا اور تفتیش کے نتیجے میں بھی پولیس کو اس سے ایسی کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں جن کی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیا جا سکتا چنانچہ معمولی تنبیہہ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مستقبل میں اس پر رائے چند پر سخت نظر رکھی جائے گی۔

یہ ساری کہانی سن کر رائے چند شاداں و فرحاں تھانے سے روانہ ہو گیا کہ اس کے دوست انسپکٹر نے بے شک ایک بڑی رقم لینے کے بعد اسے بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا اور مستقبل میں بھی اسی طرح اس کی مدد کرتا رہے گا۔ یہ نہ تو انسپکٹر کو معلوم تھا، نہ رائے چند کو کہ مستقبل اس کے لیے کتنا بھیانک ثابت ہونے والا ہے۔ تھانے سے نکل کر وہ کچھ دُور ہی پہنچا تھا کہ سی ایف پی کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور ہیڈ کوارٹر پہنچا کر جاوید علی کے حکم کے مطابق بغیر کسی قسم کے سوال جواب کے بڑے کلاسیکل انداز میں اس کی پھینٹی لگا دی۔ یہ انداز تھا جو پولیس والے بھی اختیار کرتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رائے چند کو بھی خوب جی بھر کر مار پڑی۔ لیکن ایسے طریقے سے کہ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ آیا، ہڈی ٹوٹی پھوٹی۔ چہرہ تو بالکل بھی متاثر نہیں ہوا البتہ چیخیں مارتے مارتے اور یہ پوچھتے پوچھتے رائے چند کا حلق خشک ہو گیا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس سلوک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن اس پر تشدد کرنے والے تعمیلِ حکم میں گونگے بہرے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُسے اپنی کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تشدد کرنے والوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق خود ہی اپنے ہاتھ روک دیئے اور اسے اس کا وہی سفید اُجلا لباس دوبارہ پہنا دیا گیا جسے بغرضِ تشدد اُتار دیا گیا تھا۔ لباس پہنانے کے بعد ان لوگوں نے اسے جوس وغیرہ پلایا اور پھر اس کرسی پر لا بٹھایا۔

یہاں بیٹھنے کے بعد اس نے جاوید علی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ چند لمحے قبل دیکھا گیا جاوید علی کا چہرہ بھلا اس کی یادداشت سے کیسے نکل سکتا تھا؟ البتہ وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوا کہ اس کی دکان پر عام گاہک بن کر آنے والا یہ شخص حقیقت میں کوئی عام آدمی نہیں تھا اور اس پر آنے والی مصیبت ٹوٹی ہے، اس میں اس شخص کا پورا پورا ہاتھ ہے۔

''تم حیران ہو رہے ہو گے رائے چند! کہ تمہیں یہاں لا کر کسی قسم کے سوال جواب کے بغیر اتنی بری طرح کیوں مارا پیٹا گیا تو میں تمہاری یہ حیرت دُور کر دیتا ہوں۔ تم پڑنے والی اس مار کو اپنے گھناؤنے دھندے کی سزا کی پہلی قسط سمجھ لو اور عقل مند ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ جب پہلی قسط ہی ایسی ہے تو تعاون نہ کرنے کی صورت میں ہم تمہارا کیا حشر کریں گے۔'' نظروں ہی نظروں میں کچھ دیر ایک دوسرے کو تولنے کے بعد جاوید علی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور تمہارا تعلق کس محکمے سے ہے؟ میں مانتا ہوں کہ مجھ پر لگائے گئے الزامات درست ہیں لیکن میں کوئی واحد شخص تو نہیں ہوں جو اس شہر میں یہ دھندا کر رہا ہے۔ تم نے سب میں سے کسی کو کچھ نہیں کہا اور مجھے پکڑ کے لے آئے جبکہ میں ہمیشہ بہت پابندی سے پولیس کو اس کا حصہ دیتا رہا ہوں۔ اب بھی میں تھانے میں ایک خاصی بڑی رقم جمع کروانے کے بعد وہاں سے نکلا ہوں اور یقین ہوں کہ اتنی خدمت کے بعد کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالے۔''

رائے چند نے ذرا ناراضگی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جسے سن کر جاوید علی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ شخص اس کے وطن کے مستقبل کو تباہ و برباد کر رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس جرم کے مداوے کے لیے چند ضمیروں کو کرارے نوٹوں سے نواز دینا کافی تھا۔ ادھر خود اس کا یہ حال تھا کہ جتنی دیر میں ساری کارروائی ہوئی اور سی ایف پی والوں نے رائے چند کو یہاں لا کر اس کی خاطر مدارات کی، وہ مسلسل مصروف رہا۔

حاذق اور شہباز نامی لڑکوں سے اس نے ان کے اور ان کے دوستوں کے جو ٹیلی فون نمبر دیئے تھے، ان پر فون کر کے ان لڑکوں کے والدین کو آگاہ کیا کہ ان کے بچے کیا کچھ کرتے پھر رہے ہیں۔ ان والدین سے اس نے یہ بھی درخواست کی کہ اپنے بچوں سے پوچھ گچھ کر کے ان سے مزید ایسے لڑکوں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں جو ان کے بچوں ہی کی طرح ان قبیح عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں تاکہ بروقت اطلاع دے کر انہیں ان برائیوں سے نجات دلائی جا سکے۔ ساتھ ہی اس نے انہیں یہ بھی پیشکش کی کہ اگر اس سلسلے میں انہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو تو وہ بلا جھجک اس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

اس مقصد کے لیے اس نے ان تمام والدین کو ایک پی او بکس نمبر دے دیا تھا، جہاں وہ اپنی گزارشات اسے بھیج سکتے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے یہ بھی درخواست کی تھی کہ اگر رائے چند کے علاوہ بھی کوئی شخص اس

کے علاقے میں اس قسم کا دھندا کر رہا ہے تو وہ اسے آگاہ کر سکتے ہیں۔ اطلاع دینے والے کے لیے بھی اپنی شناخت ظاہر کرنا ضروری نہیں ہوگا، البتہ اس کی دی گئی اطلاع پر قرار واقعی کارروائی کی جائے گی۔ لوگوں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور اپنے تعاون کی پوری پوری یقین دہانی بھی کروائی تھی۔

اپنے طور پر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ واقعی ان منشیات فروشوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور سی ایف پی کا دائرۂ کار محدود ہونے کے باوجود اپنے بڑوں کو اس بات کے لیے راضی کرے گا کہ اپنے محدود وسائل اور نفری کے باوجود وہ اس مسئلے کے حل کے لیے پوری پوری کوشش کریں کیونکہ ان کا کام ہی وطن کی حفاظت تھا اور وطن کی حفاظت کے لیے سب سے ضروری یہی تھا کہ اس کے مستقبل یعنی نوجوان نسل کو بچایا جائے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو رائے چند! کہ اس شہر میں تمہارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں لیکن صرف تم ہماری گرفت میں آئے ہو۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ تم بدقسمت ہو اور دوئم یہ کہ ان میں سے کسی اور پر ''را'' کا مبینہ ایجنٹ ہونے کا الزام نہیں ہے۔'' جاوید علی کا جملہ مکمل ہوا تو رائے چند نامی رڈی حالت میں ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔

''یہ..... یہ..... تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔'' اس نے جاوید علی کو جھٹلانے کی کوشش کی۔

''یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ اور کتنی ٹھوس ہے، اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا لو کہ پچھلے کئی مہینوں سے ہم تمہاری نگرانی کروا رہے ہیں۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ نگرانی کس تاریخ سے اور کیوں کروائی جا رہی ہے۔'' اس نے رائے چند کو بتانا شروع کیا کہ کس تاریخ کو اسے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور اب تک کس طریقے سے اس کی نگرانی کی جاتی رہی ہے۔

''تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ جس تاریخ کا تم ذکر کر رہے ہو، اُس دن میں ہسپتال گیا ضرور تھا لیکن اپنی بیوی کی رپورٹس لینے۔ اُس کے پتے میں پتھری ہے اور اس کا علاج اسی ہسپتال سے ہو رہا ہے۔'' رائے چند نے ایک بار پھر اسے جھٹلانے کی کوشش کی اور نہایت معصومیت سے بولا۔ ''میں تو جانتا بھی نہیں ہوں کہ تم شہریار نامی جس شخص کا نام لے رہے ہو، وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟''

''اس مسئلے کو تم جانے دو۔ میرے آدمی بندے کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس لانے میں ایکسپرٹ ہیں۔ تمہیں سب یاد آ جائے گا کہ شہریار کون ہے اور تم نے اس کے نمونے کیوں حاصل کیے تھے۔ یہ کوئی کمرۂ عدالت نہیں ہے جو مجرم جھوٹے دلائل دے کر خود کو بچا لے۔ ہم دلائل نہیں صرف حقائق کو سننے والے لوگ ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی اور قوتِ برداشت پر منحصر ہے کہ تم کتنی دیر میں سچ اُگلنا شروع کرتے ہو۔ البتہ ایک بات کا میں تمہیں یقین دلا دوں کہ سچ اُگلے بغیر تمہیں موت کی آغوش میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔''

جاوید علی کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ رائے چند کے لیے اس کے دل میں رحم کی کوئی رمق تھی بھی نہیں۔ ایک طرف وہ سب سے بڑے دشمن ''را'' کا ایجنٹ تھا تو دوسری طرف موت کا بیوپاری۔ ایسے شخص کو تو اگر اُسے اختیار دیا جاتا تو وہ سات بار اذیت ناک موت کی سزا دیتا۔ اس وقت بھی اس نے اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بُری طرح تھرّانے لگا۔ یہ تھرتھراہٹ اس برقی رو کا نتیجہ تھی جو اچانک ہی اس کی کرسی میں دوڑا دی گئی تھی۔

دھاتی کرسی میں چند سیکنڈز کے لیے دوڑنے والی برقی رو نے رائے چند کے حلق سے چیخیں نکلوا دیں۔

''میرے آدمیوں کو بتاؤ کہ تم منشیات اور مخربِ اخلاق فلموں کا دھندا کرنے والے کن کن لوگوں سے ملوث ہو اور ''را'' کے کن کن سورماؤں سے تمہارے روابط ہیں؟ میرے ان دو سوالوں کا جواب حاصل کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے یہ لوگ تم پر اتنا ستم ڈھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ تمہاری روح بلبلا اُٹھے گی۔ لیکن یہ تمہارے جسم کا ساتھ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' رائے چند کے بجلی کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اسے دھمکایا اور رائے چند کے ناول سا ہو کر رہ گیا۔ رائے چند کی چیخیں اس کے تعاقب میں کمرے سے باہر تک آ رہی تھیں۔

''واہ بھئی..... کیا فنٹاسٹک کھانا ہے اِدھر کا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ دہلی میں رُکوں اور تینوں وقت اسی ہوٹل میں آ کر کھانا کھاؤں۔''

لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے سلّو نے جھوم کر کھانے کی تعریف کی اور ساتھ ہی خواہش بھی بیان کی۔

''تم ایسا کرنا کہ جب شادی کرو تو ہنی مون منانے کے لیے اپنی بیگم کو یہیں لے آنا اور خوب دل بھر کر دہلی کے کھانے کھانا۔ فی الحال میں تو تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔'' شہریار نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔

کل رات کھانے کے لیے وہ اسی ہوٹل میں آئے تھے اور سلّو کو یہاں کا کھانا اتنا پسند آیا تھا کہ وہ وہاں سے روانہ ہوتے وقت ناشتے کا مینیو معلوم کرتا ہوا نکلا تھا۔ شہریار کو سادہ ناشتہ کرنے کی عادت تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ سادہ ناشتہ اُنہیں اس ہوٹل کی انتظامیہ بھی فراہم کر سکتی تھی جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن سلّو کی ضد پر اسے ناشتے کے لیے ''نوادر'' نامی اس ہوٹل میں آنا ہی پڑا تھا اور بلاشبہ وہاں فراہم کیا جانے والا ناشتہ بے حد لذیذ تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں پیدل ہی اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔ بازاروں کی خاک چھاننے کے علاوہ انہوں نے مختلف بس سروسز کے دفتروں اور ریلوے اسٹیشن کا دورہ بھی کیا تھا۔ اس طرح اُنہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دہلی سے باہر جانے کے لیے انہیں کن ذرائع سے اور کن اوقات میں سہولیات مل سکتی ہیں۔ اس آوارہ گردی میں ان کا اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا اور بھوک بھی خوب چمک گئی تھی۔ بھوک لگنے پر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا گیا تو سلّو کا انتخاب ایک بار پھر ''نوادر'' ہوٹل ہی تھا۔ شہریار کے نزدیک آپس میں بہتر تعلقات کے لیے ایسے چھوٹے موٹے لاڈ اُٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اب کھانا کھاتے ہوئے سلّو کھانے کی شان میں رطب اللسان تھا۔

''آئیڈیا برا نہیں ہے استاد!..... ویسے تو لگتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں شادی کی لکیر نہیں ہے۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے شادی ہو گئی تو صرف یہاں کے کھانوں کی خاطر میں یہاں ہنی مون منانا پسند کروں گا۔ بلکہ ایسا کروں گا کہ اپنی بیوی کو شیف کی ٹریننگ دلوانے کے لیے کچھ عرصہ یہاں ملازمت دلوا دوں گا۔ بس یہ سمجھو ساری زندگی کے عیش ہیں۔''

سلّو بھی موڈ میں تھا اس لیے خوشگوار لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی گفتگو کا یہ حصہ مشروب پہنچانے کے لیے ان کی میز پر آنے والی ویٹریس نے بھی سنا اور مسکرا کر خوش دلی سے بولی۔

''ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے ہمارے کھانوں کو پسند کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جب بھی دوبارہ یہاں آئے، ہمارے کھانوں کا یہی معیار پائیں گے۔''

''جی ہاں۔ لیکن بس شرط اتنی ہے کہ کھانا آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں سے ہی سرو کیا جائے۔

کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ کھانے کے اس سواد میں آپ کے ان خوب صورت ہاتھوں کا بھی بڑا دخل ہے۔'' ویٹریس کی دخل اندازی کا برا مانے بغیر سلّو نے شوخی سے اسے جواب دیا۔

''ایسی بددُعا نہ دیں سر! میں نے مجبوری میں صرف کچھ عرصے کے لیے یہ ملازمت کی ہے، ورنہ میرے پاس ماسٹرز کی ڈگری ہے اور جیسے ہی میری پرابلم سولو (Solve) ہوئی، میں کسی اچھی نوکری پر لگ جاؤں گی۔'' اس نے انہیں بتایا، پھر یکدم موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد کر سکتے ہیں۔''

''نو تھینکس۔ جو کچھ ہے، وہی بہت ہے۔ آپ اپنے دوسرے کسٹمرز کو دیکھ سکتی ہیں۔'' اس بار سلّو کے بجائے شہریار نے اسے جواب دیا۔ وہ خود نپا تلا کھانا کھا کر اپنا ہاتھ روک چکا تھا اور ایک ویٹریس کے ساتھ اس کی اس غیر ضروری بے تکلفی کو پسند نہیں کیا تھا۔ کتنا ہی نرم دل اور غریب پرور سہی لیکن وہ تھا تو ایک بیوروکریٹ خاندان کا حصہ، چنانچہ اس کے اندر بیوروکریسی کے کچھ نہ کچھ جرثومے بہرحال موجود تھے اور اس کے نزدیک یہ نہایت غیر مہذبانہ حرکت تھی کہ ایک ویٹریس اس طرح گفتگو میں دخل دے اور جواباً اس کی حرکت کا برا ماننے کے بجائے اس سے بے تکلفی برتی جائے۔ ویٹریس نے بھی اس کا یہ موڈ بھانپ لیا اور خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

''تم بھی بڑے بدذوق ہو یار!..... اتنی خوب صورت لڑکی باتیں کر رہی تھی کہ لے کر اسے بھگا دیا۔'' سلّو نے ایک اور لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کی حرکت پر تبصرہ کیا۔

''خوب صورت لڑکیاں خطرناک بھی ہوتی ہیں۔ اگر تم خوب صورتی کو دیکھ کر طرح پھسلتے رہے تو ہم کسی نہ کسی مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔'' شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

''مشکلوں سے ڈرنے والے اے آسماں! ہم نہیں۔'' سلّو نے بے نیازی سے اسے جواب دیا اور مشروب کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

اُس کے اس انداز پر شہریار اسے فقط گھور کر رہ گیا اور خود بھی مشروب پینے لگا۔ ابھی مشکل سے اس نے گھونٹ ہی لیے تھے کہ ڈائننگ ہال کے ایک حصے سے شور سا سنائی دیا۔ وہ دونوں ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ کونے والی ایک میز تھی جس پر دو تین آدمی موجود تھے اور کچھ دیر قبل انہیں کھانا پیش کرنے والی ویٹریس اس میز کے قریب نظر آ رہی تھی۔ میز کے گرد بیٹھے تین آدمیوں میں سے ایک نے ویٹریس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور وہ بلند آواز میں اسے اپنا ہاتھ چھوڑنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

''یہ ہاتھ تو اب نہیں چھوٹنے کا۔ تُو ہمارے من کو بھا گئی ہے۔ اور اس من کو شانتی اسی سے ملے گی، جب ہمارے بیڈروم میں ایک رات گزارے گی۔''

ویٹریس کے کہنے پر اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اس شخص نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ جواباً اس لڑکی نے اپنے دوسرے آزاد ہاتھ کا طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔ ڈائننگ ہال میں اس وقت کئی لوگ موجود تھے اور یہ قصہ شروع ہوتے ہی سب کھانا پینا بھول کر اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اتنی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ لڑکی نے اس شخص کے منہ پر تھپڑ مارا تو خاموشی کی وجہ سے تھپڑ کی گونج پورے ڈائننگ ہال میں سنائی دی۔

''بڑی تیکھی شے ہے۔'' سلّو نے زیر لب تبصرہ کرتے ہوئے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکیڑے۔ ادھر لڑکی کے تھپڑ مارتے ہی جیسے ایک بھونچال آ گیا تھا۔ تھپڑ کھانے والے آدمی کے ساتھ ہی دونوں بندے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کھڑے ہوئے اور انہوں نے شکاری جانوروں کی طرح لڑکی کو دبوچ لیا۔

''سالی! تیری اتنی ہمت کہ دادا پر ہاتھ اُٹھائے۔ تیری تو ہم بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔'' وہ بری طرح اس لڑکی پر پل پڑے تھے اور بلا دریغ جوتے مکے مار رہے تھے۔ شہریار اور سلّو اس منظر کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ ہال میں بیٹھے ہوئے ا۔ ۔وں میں سے کسی نے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ بلکہ کئی نے تو خاموشی سے وہاں سے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

''شما کر دیں سرکار! نادان ہے۔ نئی نئی نوکری پر لگی ہے۔ آپ کو جانتی نہیں ہے۔'' ہوٹل کے منیجر تک ہنگامے کی خبر پہنچی تو وہ دوڑا آیا اور تھپڑ کھانے والے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے عاجزانہ درخواست کرنے لگا۔

''کپڑے پھاڑ دو سالی کے اور گلے میں رسّی ڈال کر اڈّے تک لے جاؤ تاکہ ساری دلّی کو پتا چل جائے کہ نادر دادا سے پنگا لینے والے کا کیا حشر ہوتا ہے۔''

منیجر کی درخواست کو قطعی نظرانداز کرتا ہوا وہ بری طرح غرّایا۔ اور اس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوتے ہی لڑکی کو زدوکوب کرتے ہوئے دونوں افراد نے اس کے لباس پر ہاتھ ڈال دیا۔ ایک نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ پھٹ گیا اور اندر سے اس کا گورا بدن جھانکنے لگا۔ وہ جو مار کھا کر چلّا یا رحم کی درخواست نہیں کر رہی تھی، اس حرکت پر بری طرح رونے چلّانے لگی۔

سلّو اور شہریار کے لیے اب ممکن نہیں تھا کہ اتنا بڑا ظلم اپنی نظروں کے سامنے ہوتا دیکھیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ وہ گویا کسی اندرونی ربط کے تحت اپنی جگہ سے بیک وقت کھڑے ہوئے اور پل بھر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اس لڑکی کو ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

''شرم نہیں آتی ایک کمزور عورت سے ایسا سلوک کرتے ہوئے؟'' سلّو نے ان میں سے ایک کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار گھونسا مارا جبکہ دوسرا شہریار کی لات کی زد میں آ گیا۔

''یہ کون مائی کے لال ہیں جو نادر دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کر رہے ہیں؟'' ہال میں موجود افراد میں سے کسی نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور پھر وہاں افراتفری سی مچ گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ہوٹل سے باہر نکلنے لگے۔ ادھر ان چاروں کے درمیان زبردست معرکہ جاری تھا۔

نادر دادا کے آدمی مضبوط ہاتھ پیر کے اور اچھی قد و قامت کے مالک تھے۔ لڑنے بھڑنے میں ماہر لگتے تھے لیکن ان میں وہ تیزی اور پھرتی نہیں تھی جو شہریار اور سلّو میں تھی۔ وہ پینترے بدل بدل کر ان پر حملے کرتے تھے اور یہ دونوں نہ صرف کامیابی سے ان کا حملہ روک دیتے تھے بلکہ پلٹ کر ایسا وار کرتے کہ وہ بلبلا اُٹھتے تھے۔

اس لڑائی کو دیکھنے والے اب بہت کم افراد وہاں رہ گئے تھے۔ ایک نادر دادا تھا جو اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا اور اطمینان سے کرسی پر براجمان اس طرح وہ فائٹنگ دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا منظر ہو۔ دوسرا اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس تھی جو ان دونوں سے جان چھوٹ جانے پر کھسکتی ہوئی فاصلے پر موجود ستون تک چلی گئی تھی اور اس سے ٹیک لگا کر اس انداز میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس نے

ہاں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے اور گھٹنے سمیٹ کر پیٹ سے لگا رکھے تھے۔ اس طرح شاید اس نے اپنی بے بسی کی کوشش کی تھی۔ وہ خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں اپنے لیے لڑتے ہوئے ان دو اجنبیوں کو دیکھ رہی تھی جن کے جسم میں خون کی جگہ شاید پارا بھرا ہوا تھا اور وہ یوں اُچھل اُچھل کر لڑ رہے تھے کہ ابھی پیر زمین پر پوری طرح ٹکتے نہیں تھے کہ وہ دوبارہ فضا میں بلند ہو جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے صحیح معنوں میں نادر دادا کے پٹھوؤں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔

اس منظر کا تیسرا ناظر ہوٹل کا منیجر تھا جس کے چہرے پر حیرانی سے زیادہ پریشانی تھی۔ وہ گردن کو دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے مسلسل حرکت دیتے ہوئے اس نقصان کا تخمینہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا جو قیمتی شو پیس، کراکری اور فرنیچر وغیرہ کے ٹوٹنے پھوٹنے کے نتیجے میں ہوٹل کو اٹھانا پڑتا۔

ان تین ناظرین کے علاوہ چوتھی ناظر ہوٹل کی ریسپشنسٹ تھی جو ڈر کر کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گئی تھی اور وہاں سے کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتی تھی۔ ان چار افراد کے علاوہ وہاں موجود گاہک اور ہوٹل کا سارا عملہ اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے نکل چکا تھا۔ چند منٹ کے دورانیے پر مشتمل اس لڑائی میں واضح طور پر سلّو اور شہریار کا پلڑا بھاری نظر آ رہا تھا۔

نادر دادا کے آدمیوں نے جب دیکھا کہ ہاتھ پاؤں کی لڑائی میں ان دونوں لڑکوں کو قابو کرنا آسان نہیں ہے تو ان میں سے ایک نے نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل کھینچ کر نکال لیا اور ہیجان زدہ لہجے میں چیخا۔

''بس بہت ہو گئی۔ اب تم دونوں سیدھے ہو کر ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہارے جسموں کو چھلنی کر ڈالوں گا۔'' اُس کی اس دھمکی نے لمحہ بھر کے لیے سارے منظر کو ساکت کر دیا۔

شہریار اور سلّو خوامخواہ کسی چکر میں پڑ جانے سے بچنے کے لیے اپنے ہوٹل سے نکلتے وقت اسلحہ ساتھ لے کر نہیں نکلے تھے۔ اپنے طور پر تو وہ بس صرف گھومنے اور دہلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ کسی قسم کی دستاویزات کی عدم موجودگی میں وہ اگر کسی ایسی جگہ چلے گئے جہاں اسلحے کا استعمال کرنے والے آلات نصب ہوئے تو خوامخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ لیکن یہاں معاملہ ایک کمزور اور مظلوم لڑکی کی عزت کا تھا اور وہ اپنے تحفظات کے بارے میں کچھ سوچے بغیر اس جھگڑے میں کُود پڑے تھے۔

''طمنچہ اندر رکھ بخشو! مرد بن کر اگر مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تجھ میں تو ہیجڑوں کی طرح بیٹھ کر تالیاں بجا۔ اسلحے کے زور پر بے ایمانی سے مقابلہ جیتنے کی کوشش نہ کر۔''

ساکت منظر کو نادر دادا کی گرج دار آواز نے ایک بار پھر متحرک کر دیا۔ حکم سنتے ہی بخشو نے تو چوروں کی طرح نظر چراتے ہوئے اپنا اٹھا ہوا بازو نیچے کر لیا البتہ دوسرے نے کچھ کارکردگی دکھانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس کا رخ سلّو کی طرف تھا جس نے اپنی جگہ سے بس معمولی سی حرکت کی اور بڑے آرام سے حملہ آور ہونے والے کو اٹھا کر پیچھے کی طرف پٹخ دیا۔

''بس کرو تم لوگ یہ ڈرامے بازی۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم لوگوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔ میں ان کو موٹی رقمیں دیتا ہوں نا تم حرام خوروں کو، انہیں کھا کھا کر تمہارے جسموں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ دیکھنے میں ایسے ہو لیکن ایک چوہے تک سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے تم میں۔ بس ہٹ جاؤ ایک طرف اور انجام کا انتظار کرو۔''

لگتا تو یوں تھا کہ مقابلے کا نیا راؤنڈ شروع ہونے جا رہا ہے لیکن نادر دادا کی پھٹکار سن کر اس کے دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گر گئے فوراً ہی ایک طرف ہٹ گئے اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

''نام کیا ہے تم دونوں کا؟'' اپنے آدمیوں کو کنارے لگانے کے بعد نادر دادا ان دونوں کے مقابل آ کر کھڑا ہوا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''میں جگدیش ہوں اور یہ میرا کزن رویندر۔ ہم یہاں دہلی میں گھومنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' شہریار نے عام سے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ ویسے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ نادر دادا نامی یہ شخص یقینی طور پر کسی بڑے گینگ سے تعلق رکھتا ہے یا پھر اسے کسی بڑے آدمی کی پشت پناہی حاصل ہے اس لیے لوگ اس سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ سرِ عام ایک لڑکی سے ایسی چھیڑ چھاڑ کرنے پر کسی نے اسے یا اس کے آدمیوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور یہ صورتِ حال ایک طرح سے ان کے لیے مناسب نہیں تھی۔ وہ یہاں ایک خاص مشن پر آئے تھے اور آتے ہی کسی بڑے غنڈے سے بھڑ جانے کی وجہ سے بڑی مشکلات میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے تدبر سے اس صورتِ حال سے نمٹنا تھا اس لیے نادر دادا سے گفتگو کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔

''یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اگر دہلی کے رہنے والے ہوتے تو میرے آدمیوں کے مقابلے پر آنے کی ہمت کبھی نہیں کرتے۔'' نادر دادا نے مسکرا کر اسے جواب دیا پھر ایک بار دوبارہ ان دونوں کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تمہاری جی داری من کو بہت بھائی ہے۔ اس جی داری کے صدقے ہی میں تمہاری جان بخشی کر رہا ہوں ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بندہ نادر دادا کے بندوں سے پنگا لے اور اسے اپنے ہاتھ پیر سلامت واپس جانا نصیب ہو۔ تم دونوں خوش قسمت ہو۔ پتہ نہیں تم میں کیا بات ہے کہ تمہیں معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔''

''تھینک یو سو مچ دادا! آپ کے برتاؤ سے پتہ لگ گیا ہے کہ آپ سچ مچ بہادر آدمی ہو۔ کیونکہ ایک بہادر ہی دوسرے بہادر کو ایسے سراہتا ہے۔''

کسی مشکل میں پڑے بغیر آسانی سے مسئلہ نمٹتا دیکھ کر شہریار نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس شخص کو کسی بات سے طیش دلانے کے بجائے مزید مکھن لگا دیا جائے ورنہ کچھ دیر قبل اس نے جس طرح ایک لڑکی پر ہاتھ ڈالا تھا، وہ کسی طور ایک بہادر کا شیوہ نہیں ہوتا۔

''ہمارے ہاں بہادروں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ اگر تمہارا ہمارے ساتھ شامل ہونے کا من کرے تو کسی سے بھی پوچھ لینا کہ نادر دادا کا اڈا کہاں ہے؟ وہ سیدھا تمہیں ہمارے پاس پہنچا دے گا۔''

اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی جس کے جواب میں ظاہر ہے شہریار کو خاموشی ہی اختیار کرنی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر نادر دادا نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

منیجر بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے گیا اور دروازے کے قریب اسے روک کر اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔

جواب میں نادر نے بھی کچھ کہا جس کے بعد منیجر کی اُتری ہوئی صورت پر ذرا رونق دوڑی اور اس نے خود آگے بڑھ کر نادر دادا اور اس کے آدمیوں کے لیے بڑے احترام سے دروازہ کھولا۔ ان تینوں کے باہر جانے کے بعد وہ پلٹ کر واپس آیا تو اس کے چہرے پر حیرت نظر آ رہی تھی۔

''یہ تو چمتکار ہو گیا۔ دادا نے نہ صرف آپ دونوں کو شما کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ میرے ہوٹل کا ہوا

سارا نقصان خود بھرے گا۔'' ان دونوں کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بے یقینی سے بتایا۔

''چلو، یہ تو تمہارے لیے اچھا ہو گیا۔ اب ایسا ہے کہ ہم دونوں چلتے ہیں۔ تم اُس بے چاری ویٹریس کی ڈریسنگ وغیرہ کروا کر اسے اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرو۔'' منیجر کو جواب دینے کی ذمے داری بھی شہریار نے ہی سنبھالی۔ اصل میں وہ سلّو کے لاابالی پن اور بے باکی سے ذرا خائف رہتا تھا اس لیے عموماً ایسے مواقع پر گفت و شنید کی ذمے داری از خود سنبھال لیتا تھا۔

''سوری سر! میرے لوگوں میں سے کوئی یہ ہمت نہیں کر سکے گا کہ دادا کو ناخوش کرنے والی عورت کی مدد کر سکے۔ ہاں، آپ کی بات الگ ہے۔ آپ میں ہمت تھی تو ہی آپ نے دادا کے آدمیوں پر ہاتھ ڈالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دادا نے خود آپ کے لیے معافی کا اعلان کیا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اسے اس کے گھر تک پہنچانے کے لیے آپ سے بہتر کوئی نہیں ہو گا۔''

منیجر کا جواب سن کر ان دونوں نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔ یہاں ان کے ساتھ اُلٹی آنتیں پڑیں والا معاملہ ہو گیا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس سارے جھگڑے کا سبب بننے والی ویٹریس ان کے سامنے تھی۔ اپنی نیم عریانی کو چھپانے کی کوشش کرتی وہ خوب صورت لڑکی زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت سخت ہراساں بھی تھی اور ضروری تھا کہ اس مشکل گھڑی میں کوئی اسے سہارا دے۔ ان دونوں سے ہی انکار نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی جب وہ اس کی خاطر غنڈوں سے بھڑ جانے کی خطرناک حرکت کر چکے تھے تو پھر اسے اس کے گھر تک پہنچا دینا تو نسبتاً کم خطرناک کام تھا۔

''اوکے، ہم یہ کام کر دیتے ہیں۔'' شہریار نے منیجر پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور سلّو کو اشارہ کیا تو وہ ایک میز پوش کھینچ کر اُتارتے ہوئے ستون کے ساتھ نڈھال بیٹھی ویٹریس کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کچھ روپے ہیں اس کی مرہم پٹی کروانے کے کام آئیں گے۔'' منیجر نے اپنا پرس نکال کر اس میں سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے شہریار کی طرف بڑھائے۔

''نو تھینکس۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے انکار کر دیا اور سلّو کی طرف بڑھ گیا جو میز پوش سے لڑکی کی ستر پوشی کرنے کے بعد اسے سہارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔ شہریار نے اسے دوسری طرف سے سہارا دیا اور پھر وہ دونوں اسے لے کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ہوٹل سے باہر نکل کر انہوں نے ایک آٹو رکشہ روکا اور لڑکی سے اپنے گھر کا پتہ بتانے کو کہا۔ لڑکی کے پتہ بتانے کے بعد آٹو والے سے کرائے کا معاملہ طے ہوا اور وہ اس طرح لڑکی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے کہ لڑکی درمیان میں بیٹھی تھی اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں تھے۔

راستے بھر ان میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ شہریار نے ایک بار راستے میں کسی کلینک یا ہسپتال پر رُک جانے کے بارے میں ضرور استفسار کیا لیکن لڑکی نے خود انکار کر دیا۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ نادر اور اس کے غنڈوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کے نتیجے میں لڑکی کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ماتھے پر کافی بڑا سا گومڑا نظر آیا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی نیل اور خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس پر مستزاد اس کا لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ لوگ اسے لے کر کسی ہسپتال جاتے تو انہیں جواب دینا پڑتا کہ لڑکی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ پولیس کیس ہونے کی وجہ سے ہسپتال کی انتظامیہ پولیس کی آمد سے قبل اسے ٹریٹمنٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی اور پولیس سے سامنا کرنا ان کے اپنے حق میں مناسب نہ ہوتا، وہ بھی اس صورت میں کہ کسی دادا ٹائپ غنڈے سے ٹکر لے چکے تھے اور ان کے پاس شناختی دستاویزات تک نہیں تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطلوبہ پتے پر پہنچ کر لڑکی نے رکشہ رُکوایا اور وہ لوگ نیچے اُتر آئے۔ رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کرنے تک لڑکی دروازے پر دستک دے چکی تھی۔ وہ نچلے طبقے کا ایک محلّہ تھا جہاں چھوٹے چھوٹے بے رونق و بدنما گھر بنے ہوئے تھے۔ لڑکی نے دروازے پر کئی دستکیں دیں، تب کہیں جا کر دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا شخص عجیب و غریب تھا۔ اس نے چوخانے والی لنگی پر میلی سی بنیان پہن رکھی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ سر کے بال اور داڑھی بے حد اُلجھی ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اسے نہائے ہوئے کئی مہینے پھر شاید مہینے گزر گئے تھے۔ وہ دروازے پر نمودار ہوا تو بدبو کا ایک بھبکا سا محسوس ہوا۔

''تُو کیوں بے وقت آ گئی میری نیند خراب کرنے؟'' اس نے نہ تو لڑکی کے ابتر حلیے کی طرف توجہ دی اور نہ ہی اس کے پیچھے کھڑے دو اجنبیوں کی طرف۔ بس اسے دیکھ کر بڑبڑایا اور جھومتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

''آپ دونوں اندر آ جائیں۔'' لڑکی نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر ان سے کہا۔

''میرے خیال میں پہلے میں آپ کے لیے کسی میڈیکل اسٹور سے کچھ میڈیسن اور بینڈیج وغیرہ کا سامان لے آؤں۔'' شہریار اندر جاتے ہوئے ذرا سا ہچکچایا۔

''میرے پاس فرسٹ ایڈ باکس موجود ہے اس لیے اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف کے باعث ہونٹوں سے سسکی سی نکل گئی۔

''پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے گھر والے زخموں کی صفائی اور ڈریسنگ میں آپ کی مدد کر دیں گے۔ ساتھ میں آپ کوئی پین کلر لے لیجئے گا، درد سے آرام آ جائے گا۔ میرے اندازے کے مطابق تو آپ کو کوئی بھی بہت زیادہ گہری چوٹ نہیں لگی ہے۔ گھر پر ہی چند دن پابندی سے دوائیں لینے کے ساتھ آرام کریں گے تو طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔ البتہ اگر آپ محسوس کریں کہ کوئی اندرونی گھاؤ ہے تو ہسپتال چلی جائیں گا۔'' شہریار اب وہیں سے واپس پلٹنے کے موڈ میں تھا۔

''میرے کوئی گھر والے نہیں ہیں۔ صرف ایک گھر والا ہے جو اتنے ہوش میں نہیں ہوگا کہ میری مرہم پٹی کروانے میں مدد کرے یا مجھ سے ہمدردی کرے۔''

وہ بہت آہستہ سے ہی بولی تھی لیکن اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اور کچھ تلخی سی محسوس ہوئی تھی۔ البتہ وہ دونوں اس انکشاف پر چونک سے گئے تھے کہ اتنی کم عمر اور کامنی سی نظر آنے والی وہ لڑکی شادی شدہ تھی اور بیوی بھی اس عجیب الخلقت شخص کی تھی جسے ایک نظر دیکھنے پر ہی انہیں گھن سی محسوس ہوئی تھی۔ سلّو پر تو اس انکشاف کا زیادہ ہی اثر ہوا اور اس نے زیرلب ''اُوئی ماں! اتنا بڑا دھوکا۔'' کہتے ہوئے ہلکی سی سیٹی بجا ڈالی تھی۔ البتہ شہریار اس انکشاف سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا چنانچہ بردباری سے بولا۔

''اوکے، ہم اندر چل کر آپ کی ہیلپ کر دیتے ہیں۔''

''تھینک یو سو مچ۔'' اس نے شکریہ ادا کیا اور خود اندر داخل ہو کر انہیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا جس کے در و دیوار سے غربت ٹپک رہی تھی۔ لڑکی انہیں لے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

''آپ لوگ یہاں بیٹھیں، میں کپڑے چینج کر لوں پھر فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتی ہوں۔'' انہیں وہاں بٹھا کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ چلتے ہوئے اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس نے ہمت کر کے خود کو اس حد تک سنبھال لیا تھا کہ کسی کے سہارے کے بغیر چل سکے۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں سستا سا مختصر فرنیچر رکھا تھا اور

بے حد استعمال شدہ دری بچھی ہوئی تھی۔ البتہ صفائی خوب تھی۔ دیوار پر ایک لکڑی کا ریک بھی لگا ہوا تھا جس میں بہت سی کتابیں سجی تھیں۔ ان کتابوں میں سے زیادہ تر انگریزی زبان میں تھیں اور مطالعے کا شوقین شہریار اور سے ان کے نام پڑھ کر ہی یہ بتا سکتا تھا کہ وہ خاصی مہنگی کتابیں ہیں۔ گھر کا عسرت زدہ ماحول اور اس کے شوہر کو دیکھ کر یہ کتابیں یہاں اجنبی سی لگتی تھیں لیکن اجنبی تو وہ لڑکی بھی لگی تھی اس ماحول میں۔

''سوری، آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ میں اپنے زخموں کو دھونے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو سوچا چائے بھی بنا لوں۔'' کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہ صرف لباس بدل چکی تھی بلکہ چہرہ دھو کر زخموں پر مرہم وغیرہ بھی لگا لیا تھا۔

''آپ نے چائے کا تکلف کیوں کیا؟ ہم تو آپ کی مدد کے خیال سے اندر آ گئے تھے اور آپ اس مصیبت میں پڑ گئیں۔'' اسے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے دیکھ کر شہریار نے بے ساختہ ہی ٹوکا۔

''تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے میرے لیے خود کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالا تو کیا میں آپ کے لیے چائے بھی نہیں بنا سکتی تھی؟''

اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے چائے کی پیالیاں ان دونوں کی طرف بڑھائیں۔ پیالیاں نفیس اور ملائم ستھری تھیں اور ان میں موجود چائے بھی خوش رنگ اور خوشبودار تھی۔ چکھنے پر ذائقہ بھی بہت اچھا لگا۔

''فنٹاسٹک..... میں نے کہا تھا نا کہ اصل کمال آپ کے ہاتھوں کا ہے۔ اب دیکھیں، یہ چائے ہوٹل نوادر کے کسی شیف نے تیار نہیں کی پھر بھی کتنے مزے کی لگ رہی ہے۔'' پہلا گھونٹ بھرتے ہی سلّو نے شوخی سے کہا جس پر وہ ہولے سے ہنسی پھر ہلکا سا کراہ کر چپ ہو گئی۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک بار پھر وہی گفتگو کا آغاز کیا۔

''کیا میں اپنے محسنوں کے نام جان سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ میں رویندر ہوں اور یہ میرے دوست جگدیش ہیں۔ ہم دہلی گھومنے کے لیے آئے ہیں۔'' سلّو نے فوراً اس کے سوال کا جواب دیا۔ وہ خاصا سمجھ دار تھا اور یہ اندازہ لگا کر ہی منہ کھولتا تھا کہ کہاں کیا بولنے پر شہریار کو اعتراض نہیں ہوگا۔

''میرا نام عائشہ ہے لیکن یہاں زیادہ تر لوگ مجھے آشا کہتے ہیں۔'' اس نے بھی اپنا تعارف کروایا پھر وہ بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ گھومنے کے لیے نکلے ہیں اور میری ہمدردی میں خود اپنے لیے اتنی بڑی مصیبت مول لے بیٹھے ہیں۔''

''جانے دیں۔ وہ معاملہ تو اب ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ نادر دادا نے ہم سے کیا کہا تھا۔'' سلّو نے کان پر سے مکھی اُڑانے والے انداز میں اسے جواب دیا۔

''اس غلط فہمی میں مت رہیے گا۔ میں نے اپنی ڈریسنگ کے بہانے آپ دونوں کو اندر ہی اس لیے بلایا تھا کہ آپ کو خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ وہ خطرناک اور عیار آدمی ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے آدمیوں کو آپ دونوں کے ہاتھوں زحمت اٹھانی پڑی ہے، یہ اس کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اب یہ بات نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیل گئی ہو گی اور مجھے نہیں لگتا کہ اس نے آپ لوگوں کی بہادری سے متاثر ہو جانے کا جو ڈراما کیا ہے، اس میں کوئی حقیقت بھی ہے۔ وہ صرف وہاں سے اپنی بچی کھچی عزت بچا لے گیا ہے اور گرنے کے باوجود اپنی ٹانگ اونچی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ڈرامے کے بعد وہ پوری کوشش کرے گا کہ آپ لوگ یہاں سے بچ کر نہ نکلنے پائیں۔ وہ نہایت سفاکی سے آپ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبرت کا نشان بنا کر پورے دہلی کو یہ خاموش پیغام دینے کی کوشش کرے گا کہ نادر دادا کے آدمیوں
بھڑنے والوں کا انجام کسی طور پر اچھا نہیں ہوسکتا۔''

وہ جو کچھ اُنہیں بتا رہی تھی، وہ ان کے لیے تشویش ناک تھا۔ اگر وہ اس طرح کے مسائل میں
جاتے تو اپنے اصل مشن پر کام کرنا مشکل ہو جاتا۔

''جب تمہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے خطرناک لوگ ہیں تو کیا ضرورت تھی نادر دادا پر ہاتھ اٹھانے
سلّو نے کچھ جھلا کر اس سے یہ سوال کیا۔ کیونکہ بہرحال معاملے کے اس حد تک جانے میں عائشہ کے
بہت زیادہ ہاتھ تھا۔

''میں بکاؤ مال نہیں ہوں جو اس جیسا غنڈہ موالی سرِ راہ میرا ہاتھ پکڑے اور کوئی بھی بے ہودہ
کرے تو میں نظرانداز کر دوں۔ اس گندے آدمی کی بات ماننے سے یہ بہت بہتر تھا کہ میں اس
کے ہاتھوں اپنی جان سے چلی جاتی۔ کم از کم لوگ اس بات کے تو گواہ رہتے کہ میں نے اپنی عزت بچانے
کوشش میں اپنی جان دے دی۔'' اس نے غصے سے سلّو کی بات کا جواب دیا۔

''اونہہ عزت..... تمہارے خیال میں وہ شخص اب تمہیں بخش دے گا؟..... تمہارے کہنے کے مطابق
ہم دونوں کی جان کا دشمن بن چکا ہوگا تو کیا فساد کی اصل جڑ کو چھوڑ دے گا؟'' سلّو نے اس کے غصے
ہوئے بغیر دوبدو جواب دیا۔ شہریار البتہ خاموشی سے اس گفتگو کو سن رہا تھا اور سن کر اندازہ لگانے کی کوشش
رہا تھا کہ اس مصیبت سے بچنے کی کیا صورت نکل سکتی ہے۔

''میں اس کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گی۔ یہ دیکھو..... یہ اب ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ اگر
نادر دادا کے آدمی مجھ سے ٹکرائے تو صحیح سلامت بچ کر نہیں جا سکیں گے۔ اور بالفرض میں ان سے مقابلہ
کر سکی تو ایک گولی اپنے دل میں اتار کر اس جسم کو ٹھنڈا کر دوں گی۔''

اس نے اپنے لباس میں سے ایک چھوٹا سا لیڈیز پسٹل باہر نکالا اور اسے لہراتے ہوئے اپنے
اظہار کیا۔ یہ اظہار کرتے ہوئے اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ
ہے، اس پر عمل کرنے کی بھی جرأت رکھتی ہے۔

ویسے بھی اُس کی جرأت مندی کا مظاہرہ وہ کچھ دیر قبل ہوٹل میں دیکھ ہی چکے تھے۔ یہ جانتے ہوئے
اس کے مقابل دہلی کا نامی گرامی غنڈہ ہے، اگر اس نے اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی تو اس کا مطلب
کہ وہ واقعی فطرتاً دلیر لڑکی ہے اور اتنے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کی یہ بے باکی بڑی حیرت انگیز تھی۔
وہ تو تھی ہی پوری کی پوری حیرت انگیز چیز۔ اس کی بول چال اور نشست و برخاست کا انداز دیکھ کر
کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس پسماندہ سے محلے میں رہتی ہوگی اور ایسے میلے کچیلے آدمی کی
گی جسے انہوں نے کچھ دیر پہلے ہی دروازے پر دیکھا تھا۔

''آپ تو مجھے کوئی اونچی شے لگتی ہو میڈم! یہ اتنا مہنگا پسٹل آپ کے پاس کہاں سے آیا؟'' سلّو
شناس تھا اس لیے اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کافی قیمتی ہے چنانچہ مشکوک
میں اس سے پوچھنے لگا۔

''یہ مجھے میرے ایکس ہزبینڈ نے دلایا تھا۔ وہ ایک مل اونر تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں
زیورات پہن کر اکیلی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوں تو میرے پاس اپنی سیفٹی کے لیے کچھ ہونا چاہئے۔''
اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ لیکن وہ لوگ تو حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ

عائشہ شوہر ایک مل اونر تھا اور اب وہ ایک ابتر حلیے والے آدمی کے ساتھ اس تنگ و تاریک مکان میں بسی ہوئی
گی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے انقلاب کے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہی رہی ہوگی اور ان کے دلوں میں خوامخواہ
وجہ جاننے کا تجسس جاگ اُٹھا تھا۔

''تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ میرا باپ بھی مل اونر تھا اور اس نے اپنے لیے مل اونر داماد کا ہی
انتخاب کیا تھا۔'' اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا جو شاید اپنے حالات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کر
گئی تھی۔ اس کے ان انکشافات سے البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ جو اس اُلجھن میں تھے کہ اس کی شخصیت اس
ماحول سے لگا نہیں کھاتی، وہ دُور ہو گئی تھی لیکن ایک نئی اُلجھن پیدا ہو گئی تھی کہ آخر وہ عرش سے فرش پر کیسے اور
کیونکر پہنچی؟ یہ اُلجھن سوال بن کر ہونٹوں پر چلی آئی جسے سن کر وہ پہلے تلخی سے مسکرائی اور پھر نہایت اُداسی سے
بتانے لگی۔

''میری زندگی کی کہانی وہی عام سی ہے جو ہمیشہ سے ہمارے معاشرے میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ میں
اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی تھی اور ساتھ ہی ذہین بھی۔ میں نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور اپنی چلبلی
فطرت کی تسکین کے لیے ایک نیوز پیپر میں جاب کرنے لگی۔ وہیں ایک شخص وِجے بھی تھا۔ میری ہی طرح
ذہین اور خوب صورت۔ ہم دونوں کو پتہ بھی نہیں چلا اور ساتھ کام کرتے کرتے ہم ساری زندگی ساتھ بتانے
کے خواب دیکھنے لگے محبت کے نشے نے ہمیں اتنا سرشار کیا کہ ہم بھول گئے کہ ہمارے درمیان مذہب اور
کلاس کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ خیال آیا تو وِجے نے وعدہ کیا کہ وہ میری خاطر اپنا مذہب بدل لے گا۔
اس کے اس وعدے کے سہارے میں نے پاپا سے اس کے بارے میں بات کرنے کی جرأت کر لی۔ وہ ہمیشہ
میری ہر خواہش پوری کرتے رہے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس خواہش کو بھی رد نہیں کریں گے۔ لیکن
میرا خیال غلط ثابت ہوا اور پاپا نے فیصلہ سنایا کہ مذہب تبدیل کر لینے کے باوجود وِجے جیسا ٹٹ پونجیا اُنہیں
داماد کے طور پر قبول نہیں ہوگا۔

میں نے بہت کوشش کی، خودکشی کی دھمکی تک دے کر دیکھ لی لیکن وہ راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے
زمانہ قدیم کے کسی بادشاہ کی طرح مجھے میرے کمرے میں نظربند کرنے کے بعد میرا رشتہ اپنے ایک دوست
کے بیٹے سے طے کر دیا۔ میں نے انہیں دھمکی دی کہ میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔ جواب میں
انہوں نے مجھے وہی فرسودہ دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ اسی وقت میری ماں کو طلاق دے دیں گے۔
میں جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں میری ماں سے بہت محبت تھی اور وہ ایک دن بھی ان کے بغیر
نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا میں اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ میرے باپ ہونے کی وجہ سے وہ بھی میری رگ رگ کو
پہچانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ان کی دھمکی کا مجھ پر اثر نہیں ہوگا اس لیے انہوں نے مجھے پریشرائز کرنے
کے لیے ایک ایسی حرکت کی جس کی مجھے ان سے بالکل بھی اُمید نہیں تھی۔ انہوں نے شادی سے صرف چار
دن پہلے وِجے کی بہن کو اغوا کروا لیا۔ مایوں والے دن جب میری چھوٹی بہن کارڈلیس لے کر میرے کمرے
میں آئی کہ وِجے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے تو میں حیران رہ گئی کہ میرے گھر کا کوئی فرد وِجے سے میری
بات کیسے کروا سکتا ہے؟

اسی حیرت میں مبتلا جب میں نے بہن سے کارڈلیس لے کر ہیلو کہا تو وِجے میری آواز سن کر رو پڑا اور
بولا۔ عائشہ! میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں کہ اپنے پاپا کی بات مان لو اور خاموشی سے یہ شادی کر لو۔''
اس پر میں حیران رہ گئی کہ وِجے یہ سب کیوں کہہ رہا ہے؟ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے اور باعزت رہائی کی شرط تمہاری شادی کے لیے ہاں رکھی گئی ہے۔ اس جواب سے صاف ظاہر تھا کہ اس کام کے پیچھے پاپا کا ہاتھ تھا۔ پاپا اتنے با اختیار آدمی تھے کہ وجے جیسا نوآموز صحافی جو ابھی اپنا کیریئر بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا، ان سے قطعی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ صحافی برادری میں سے بھی کوئی ان کے خلاف اس کا ساتھ نہیں دیتا چنانچہ صرف وجے کی محبت میں، میں نے پاپا کے سامنے ہار مان لی اور ساجد کی بیوی بن کر اس کے گھر چلی گئی۔ لیکن اس عہد کے ساتھ کہ جس گھر سے میری ڈولی اُٹھی ہے، اب وہاں میرا جنازہ بھی نہیں جائے گا۔

شادی کے بعد میں ایک بار بھی پاپا سے ملنے نہیں گئی۔ یہاں تک کہ رسم کے مطابق میری ماں، بہن اور بھابی مجھے میکے لے جانے کے لیے آئیں تو میں نے انکار کر دیا۔ ساجد میری اس حرکت پر بہت حیران ہوا لیکن مجھے اپنے فیصلے میں اٹل دیکھ کر انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ شادی کے بعد میں نے خود کو ایک اچھی بیوی اور بہو ثابت کیا اور اپنے ساتھ کی گئی پاپا کی زیادتی کا بدلہ ساجد کی فیملی سے لینے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کو پورا سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ نے ہمیں ایک بیٹی بھی دے دی۔ دیکھنے میں، میں خوش باش تھی اور ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن میرا اندر میری اس زندگی سے خوش نہیں تھا۔ میں مہنگے کپڑوں، اچھے کھانوں اور ہیرے جواہرات وغیرہ سے خوش ہونے والی لڑکی ہی نہیں تھی۔ مجھے زندگی میں تھرل اور ایڈونچر اچھا لگتا تھا اور یقین تھا کہ اگر پاپا، وجے سے میری شادی کر دیتے تو اس کے ساتھ رہ کر میں وہی زندگی گزارتی جو مجھے پسند تھی۔ لیکن انہوں نے اپنی ضد پوری کرنے کے لیے مجھے اتنی بری طرح بلیک میل کیا تھا کہ میرا دل ان سے خراب ہو گیا تھا۔

پورے پانچ سال تک میں ساجد کے ساتھ ایک اَن چاہی زندگی گزارتی رہی اور خود کو خوش ظاہر کرنے کی اداکاری بھی کرتی رہی۔ لیکن پھر میری زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ کمال، ساجد کا چچازاد بھائی تھا اور نشے کی لت میں مبتلا تھا۔ والدین جب اس کا علاج کروا کروا کر ہار گئے تو انہوں نے میرے سسر سے مدد کی درخواست کی۔ میرے سسر اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئے اور یہاں اس کا علاج ہونے لگا۔ گھر کی بہو کی حیثیت سے مہمان کا خیال رکھنا یوں بھی میرا فرض تھا۔ پھر کمال کا کیس بھی ایسا تھا کہ مجھے لگا، میری بے مقصد زندگی کو کوئی مقصد مل گیا ہو۔ کھانے پینے، گھومنے پھرنے کے سوا بھی تو زندگی کچھ ہوتی ہے نا؟ بس میں نے ٹھان لی کہ کمال کو نشے کی لت سے نکالنا ہے۔ میری توجہ اور نصیحتوں کا اُس پر اچھا اثر ہوا اور وہ کسی حد تک اپنے علاج کے لیے تعاون کرنے لگا لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی نشے کو بھول چکا ہو۔ ایک دن میں نے اس پر غصہ کیا کہ وہ دن کے وقت تو نشے کو ہاتھ نہیں لگاتا لیکن رات کو جب میں اس کی نگرانی نہیں کر سکتی تو نشہ کرنے لگتا ہے۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ اس کا حل یہ ہے کہ میں دن رات اس کے ساتھ رہنے لگوں۔ اس وقت تو میں نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا لیکن بعد میں وہ چلتے پھرتے یہی فرمائش کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اسے میرا ساتھ مل گیا تو وہ خود کو سدھار لے گا۔ میرا دماغ بھی ایک دن پھر گیا۔ میں نے سوچا کہ میں ساجد کے گھر رہ کر جو بے مقصد زندگی گزار رہی ہوں، اس میں میرے لیے کون سا سکون ہے۔ اگر میں کمال کی بات مان لیتی ہوں تو میرے کریڈٹ پر ایک کارنامہ تو ہوگا کہ میں نے ایک شخص کی زندگی کو بچا لیا۔ اس پھر سب کچھ بدل گیا اور میں یہاں پہنچ گئی۔"

وہ اپنی داستانِ زندگی سنا رہی تھی اور وہ سانس روکے سنتے جا رہے تھے۔

"یہ سب آسانی سے تو نہیں ہوا ہوگا..... تمہیں خاصی مشکل اُٹھانی پڑی ہوگی؟"

"وہ تو اُٹھانی پڑی تھی۔ جب میں نے ساجد سے طلاق مانگی تو ہر طرف بھونچال آ گیا۔ سب لوگ مجھے سمجھانے لگے کہ میں ایسی غلطی نہ کروں یہاں تک کہ پاپا، جن سے میری برسوں سے بات چیت بند تھی، وہ بھی دوڑے آئے لیکن میں اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹی۔ پاپا نے اپنے طور پر پتہ لگانے کی کوشش کی کہ کہیں میرا وجے سے دوبارہ رابطہ تو نہیں ہو گیا۔ لیکن ظاہر ہے اُنہیں ایسی کوئی سن گن نہیں ملی۔ ان گزرے ہوئے سالوں میں وجے نہ صرف شادی کر چکا تھا بلکہ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کا سفر بھی طے کر لیا تھا اور ایک چینل سے معاہدے کے تحت دبئی میں رہ کر ان کے لیے کام کر رہا تھا۔

میرے گھر والوں سمیت سب نے بہت کوشش کی کہ طلاق مانگنے کی وجہ جان سکیں لیکن اس بار میں نے کمال کا نام کسی کو بتانے کی غلطی نہیں کی ورنہ شاید پاپا مجھے بلیک میل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ میں نے اپنی چار سال کی بیٹی کو ساتھ لیا اور سسرال کا گھر چھوڑ کر ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگی۔ اب سب نے دیکھ لیا کہ میں اپنی ضد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں تو میرے سسر نے ساجد کو سمجھایا کہ جو عورت تمہارے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہے، اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ یوں مجھے طلاق ہو گئی۔ عدت کا عرصہ میں نے کرائے کے مکان میں محدود رہ کر گزارا۔ میرے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ گزر بسر کے لیے کوئی پریشانی نہیں تھی پھر میں اپنے ساتھ پاپا کی طرف سے ملا میں دیا گیا زیور بھی لے کر آئی تھی میرا ارادہ تھا کہ زیور بیچ کر کمال کا علاج کروا دوں گی اور بعد میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کہیں ملازمت کر لوں گی۔ کمال ٹھیک ہو جاتا تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر عدت کی مدت میں کمال سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ بعد میں وہ مجھ سے ملا تو پہلے سے بھی بری حالت میں تھا۔ میرے پیچھے کسی نے اس کے علاج پر توجہ نہیں دی اور وہ آزادی پا کر پہلے سے زیادہ شدت سے نشہ کرنے لگا۔

اُسے اس حالت میں دیکھ کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ بس ہمت کی اور اسے علاج کے لیے ہسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے بعد وہ کچھ سنبھلا تو اس نے شادی کے لیے رٹ لگا دی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہ پوری طرح سیٹل ہو جائے، پھر شادی کر لوں گی۔ میں خود بھی ان دنوں اپنی جاب میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کمال نے رٹ لگا لی کہ میں اس سے فوری طور پر شادی کروں ورنہ وہ ڈاکٹرز سے تعاون کرنا چھوڑ دے گا۔ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننی پڑی اور شادی ہوتے ہی نئے سرے سے پوری فیملی میں ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے فون پر تو کسی نے روبرو مجھے خوب باتیں سنائیں اور الزام لگایا کہ میں نے خود سے کم عمر شخص کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنا بسا بسایا گھر توڑ ڈالا۔ میں اس الزام پر چپ رہی کیونکہ لاکھ کہتی کہ میں نے کمال کی محبت میں نہیں بلکہ ہمدردی میں اور اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ کیونکہ ان میں سے کوئی میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ لگنے والے اس الزام کے ساتھ مجھے پاپا اور ساجد کے مزید دو بڑے الزام سہنے پڑے۔ پاپا کا خیال تھا کہ میں نے اس بات کو کبھی نہیں بھلایا تھا کہ انہوں نے وجے سے میری شادی نہیں ہونے دی، اس لیے میں نے انتقاماً یہ حرکت کر کے ان کی عزت اچھالنے کا انتظام کیا۔ ادھر ساجد کو بھی کسی طرح وجے والے معاملے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ ایک طرف میرے طلاق لے کر کمال سے شادی کرنے کا غم اور دوسری طرف یہ الزام کہ اس کی بیوی شادی سے پہلے کسی کی محبوبہ رہی تھی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا اور اس دیوانگی میں اس نے الزام لگایا کہ اس کے نکاح میں رہ کر میں نے جس بچی کو جنم دیا، وہ اس کی نہیں تھی بلکہ میں میکے سے اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوکھ میں ساتھ لے کر آئی تھی جب ہی تو شادی کے بعد اتنی جلدی بچی کی پیدائش ہوگئی تھی۔

میں نے پاپا کا الزام خاموشی سے سہہ لیا تھا لیکن ساجد کے الزام پر سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اسے چیلنج کیا کہ وہ ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر اپنے اس الزام کو سچ ثابت کر دے۔ سچ وہ بھی جانتا تھا اس لیے ٹیسٹ کے لیے راضی نہ تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے ٹیسٹ نہیں کروایا تو میڈیا پر اس سارے معاملے کو اُٹھاؤں گی اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ سب کے سامنے اپنا یہ الزام واپس لے۔ میری دھمکی نے اثر کیا اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے صرف غصے میں یہ بات کہی تھی ورنہ اسے ایسا کوئی شک نہیں تھا۔ میں پھر بھی پیچھے نہیں ہٹی اور کہا کہ ٹیسٹ تو تمہیں ہر صورت کروانا ہوگا تاکہ دوسروں کے دلوں میں شک کا بیج پڑ گیا ہے، وہ جڑ سے اُکھڑ سکے۔ اُسے ٹیسٹ کروانا ہی پڑا۔ کیونکہ میں بغیر ٹیسٹ کروائے اس کی جان چھوڑنے والی بھی نہیں تھی۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ ایک عورت کے لیے یہ کتنی اہم بات ہوتی ہے کہ اس کے کردار پر اُنگلی اُٹھائی جائے اور یہاں تو معاملہ میری عزت سے بھی بڑھ کر تھا۔ آگے چل کر میری بچی کے لیے پرابلمز کھڑی ہو سکتی تھیں۔ شک باقی رہتا تو لوگ کہتے، کیا معلوم واقعی وہ سچ مچ حرام کی اولاد ہو۔ اسے کبھی اپنے خاندان اور معاشرے میں وہ مقام نہیں ملتا جو ایک نارمل بچے کا حق ہوتا ہے۔''

بڑی روانی سے اپنے کارنامے سناتی ہوئی وہ خاصی بلند حوصلہ عورت لگ رہی تھی جو دیکھنے میں تو بڑی نازک سی تھی اور اپنی اصل عمر سے کئی سال چھوٹی بھی نظر آتی تھی لیکن مضبوطی میں مردوں کو بھی مات دیتی تھی۔ ایسی عورت اگر انجام کی پروا کیے بغیر نادر دادا پر ہاتھ اُٹھا بیٹھی تھی تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

''ساجد کے الزام سے چھٹکارا ملا تو کمال کے والد میدان میں اُتر آئے۔ انہوں نے کمال کو اپنے ہمالی کے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے الزام میں جائیداد سے عاق کر ڈالا۔ میرے لیے اس بات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی بلکہ میں شروع سے ہی اس کی توقع کر رہی تھی۔ لیکن کمال کو اپنے والد کے فیصلے سے دھچکا لگا۔ وہ ناز و نعم میں پلا تھا اور ہمیشہ ایسی ہی زندگی گزارنا چاہتا تھا اور ظاہر ہے میں اپنی جاب کے ذریعے وہ معیار زندگی قائم نہیں رکھ سکتی تھی جو کسی مل اونر یا بڑے تاجر کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے بستر سے لے کر کپڑوں، جوتوں، کھانوں اور برتنوں تک ہر چیز پر اعتراض تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ یہ بات سمجھ لے لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور اس غم کو بھلانے کے لیے ایک بار پھر شدت سے نشے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاید تمہیں اندازہ ہو کہ یہ علاج اتنا سستا نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی اس کی خاطر اپنے زیورات کا ایک بڑا حصہ بیچ چکی تھی۔ جو بچا تھا، وہ میں نے بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے بیچ ڈالا۔ اس کا بورڈنگ اسکول میں ایڈمیشن کروایا تاکہ وہ گھر کے ماحول سے دور رہے اور کمال کی نفرت کا نشانہ بننے سے بچ سکے۔ بچ جانے والی رقم سے میں نئے سرے سے کمال کا علاج شروع کروانا چاہتی تھی لیکن اس نے مجھ سے زیادہ تیزی دکھائی اور اپنی لت پوری کرنے کے لیے وہ رقم چوری کر ڈالی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ میں جہاں جاب کر رہی تھی، وہاں کے کرتا دھرتا سے میری اَن بن ہوگئی اور مجھے جاب سے نکال دیا گیا۔

جاب چھوٹنے پر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور سوچا کہ کہیں اور اپلائی کر دوں گی لیکن جب اس کام کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ میرے ڈاکومینٹس غائب ہیں۔ کمال سے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب میں نے اپنی بہت ساری کتابیں بھی غائب دیکھیں تو سمجھ گئی کہ اس نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے روپے حاصل کرنے کی خاطر وہ کتابیں بیچ ڈالی ہیں اور ان کے ساتھ ہی میرے ڈاکومینٹس

کسی طرح چلے گئے ہیں۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ ان کی ڈپلی کیٹس نکلواؤں لیکن اس کی بھی کچھ ڈاکومینٹس ہوتی ہیں جو پوری کرنے میں میرے سامنے کچھ رکاوٹیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس چکر میں لمبا وقت لگ سکتا ہے اور گھر چلانے کے ساتھ ساتھ بچی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی مجھے رقم کی ضرورت ہوگی اس لیے سب سے پہلے تو کرائے کا وہ مکان چھوڑا جو یہاں کے مقابلے میں کافی بہتر علاقے میں تھا اور اس حساب سے اس کا کرایہ بھی زیادہ تھا۔ مکان چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے وہاں موجود تقریباً تمام قیمتی چیزیں بھی بیچ ڈالیں۔ اس طرح مجھے کافی بچت ہوگئی اور بچنے والی رقم میں نے گھر میں رکھنے کی غلطی کرنے کے بجائے ایڈوانس فیس کے طور پر بچی کے اسکول میں جمع کروا دی۔ اب اس کی طرف سے مجھے یہ اطمینان ہے کہ اگر چند مہینے تک مجھے معقول ملازمت نہیں ملتی ہے، تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ یہ گھر میں نے بہت کم کرائے ضروری سامان سمیت حاصل کیا ہے اور ظاہر ہے کمال جو پہلے ہی ناخوش تھا، یہاں آنے پر اور زیادہ ناراض ہے۔ میں اس کی ناراضگی کو غلط نہیں سمجھتی لیکن فی الحال خود بھی مجبور ہوں۔ ایک سہیلی کے توسط سے ''نوادر'' میں ویٹریس کی جاب حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گھر کا دال دلیہ چلتا رہے۔ ڈاکومینٹس کی ڈپلی کیٹس مل جانے پر جب مجھے کوئی اچھی جاب مل جاتی تو میں ایک بار پھر کمال کا علاج شروع کروا دیتی۔ لیکن اب دیکھو کہ وقت مزید زندگی کا کون سا رخ دکھاتا ہے۔ اپنے زندگی کے حالات اور واقعات سے تو میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میں جو ارادہ باندھوں اور جو خواب دیکھوں، حقیقت اس کے برخلاف ہی نکلتی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں یک دم ہی نمی اُمڈ آئی۔

''پلیز نہیں۔ آپ تو بہت حوصلہ مند اور مختلف عورت ہیں۔ اس طرح آنسو بہا کر خود کو عام عورتوں کی صف میں مت کھڑا کیجیے۔'' وہ بڑی عجیب شخصیت کی مالک تھی اور اس نے مروّجہ اصولوں سے ہٹ کر اپنی زندگی کے لیے بڑے انوکھے فیصلے کیے تھے۔ پھر بھی وہ قابلِ ستائش محسوس ہوتی تھی۔ ایسی بہادر عورت کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا ایک تکلیف دہ تجربہ تھا چنانچہ شہریار اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا۔

''آپ پہلے شخص ہیں جو مجھے اس طرح سراہ رہے ہیں ورنہ تو تقریباً ہر شخص مجھے ملامت ہی کرتا ہے کہ ایسی بے وقوف عورت ہو کہ عیش و آرام کو ٹھکرا کر اپنے لیے یہ ذلت اور عسرت بھری زندگی منتخب کر ڈالی۔'' اس نے نزاکت سے انگلی کی پور سے آنکھوں کے کناروں تک چلی آنے والی نمی کو صاف کیا اور بولی۔

''یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ عام لوگ کبھی بھی خاص لوگوں کو سمجھ نہیں پاتے اور آپ ایک خاص ہستی ہیں۔'' شہریار نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

''نوازش۔'' اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر خوش دلی سے کہا۔

''آپ کمال نامی اس مخلوق سے چھٹکارا کیوں حاصل نہیں کر لیتیں؟ یہ شخص آپ کی زندگی سے نکل گیا تو آپ کے لیے تھوڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔'' سلّو نے اسے مفت مشورہ دیا جسے سن کر اس نے شدت سے نفی میں سر کو دائیں بائیں جنبش دی اور بولی۔

''اگر میں آسانیوں کی ہی خواہش مند ہوتی تو وجے جیسے مڈل کلاسیے کے ساتھ محبت کر کے اس کے گھر والوں کے خواب کیوں دیکھتی؟ اپنے باپ سے تعلقات کیوں توڑتی؟ اور ساجد کا گھر کیوں چھوڑتی؟..... زندگی میں جدوجہد کی قائل ہوں اور شاید میری زندگی میں یہ زیادہ لکھی گئی ہے۔ پھر کمال کا تو میرے سوا کوئی ہے ہی نہیں جو میرے چھوڑنے کے بعد اسے گلے لگا لے۔ مجھے ہی اسے سمیٹنا اور سنبھالنا پڑے گا اور یقین ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو میں یہ کام کر گزروں گی۔ وہ ایک دن ضرور نشہ چھوڑ کر خود کو معاشرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا کارآمد فرد ثابت کرے گا اور اس وقت اگر اس نے مجھے چھوڑنا چاہا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بس کر دیجئے نیک پروین صاحبہ! آپ کی اتنی انوکھی سوچ اب مجھ سے مزید ہضم نہیں ہو سکتی۔" نے مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے لیکن اس کی آنکھوں میں عائشہ کے ستائش تھی، اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس انوکھی عورت سے متاثر ہوا ہے۔

"ٹھیک ہے، مجھے چھوڑ دیتے ہیں اور اب آپ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ میرا مشورہ آپ دونوں فوری طور پر دہلی چھوڑ دیں تاکہ نادر دادا کے عتاب سے بچ سکیں۔"

"اور تم؟..... تمہارا کیا ہوگا؟" شہریار نے پوچھا۔

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" اس نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا لیکن اسے بدستور اپنی طرف سے دیکھتے پا کر سنجیدگی اختیار کر لی اور بولی۔ "نوادر میں جو کچھ ہوا، اس کی خبر کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچ جائے گی۔ اگر نہ بھی پہنچی تو میں خود پہنچانے کا بندوبست کر دوں گی۔ ہمارے درمیان لاکھ اختلافات مگر وہ یہ کسی صورت برداشت نہیں کریں گے کہ ان کی بیٹی کی عزت کوئی غنڈہ سرِ عام اُچھال سکے۔ ان پاس دولت کی طاقت ہے اور کئی صاحبِ اختیار لوگ ان کے دوست ہیں۔ سب مل ملا کر نادر دادا کو نکیل ہی دیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں اپنا ارادہ بتا ہی چکی ہوں۔ دو چار میرے ہاتھوں مارے جائیں میں اپنی جان سے چلی جاؤں گی اور یہ کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہے۔ آخر کار تو ہر شخص کی زندگی انجام ہونا ہے۔ ہاں، مجھے مرتے وقت یہ افسوس رہے گا کہ میں جس مقصد کے لیے ساجد کا گھر چھوڑ کر وہ پورا نہیں ہو سکا۔"

اب شہریار کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ نہ ہی وہ اس کے لیے اس سے زیادہ فکر مندی اظہار کر سکتا تھا کیونکہ وہ تو خود پُر خطر راہوں کے مسافر تھے اور کسی طور اس لڑکی کو پناہ نہیں دے سکتے ویسے بھی وہ جس فطرت کی مالک تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کی بھی تو وہ ہرگز قبول نہیں کرتی کیونکہ وہ کمال کو بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں ان مسائل سے نکالے اور تم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکو۔" اس پورے خلوص کے ساتھ عائشہ کو دعا دی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے ماہ بانو کی یاد آ گئی تھی۔ حالانکہ عائشہ کی طرح بے باک اور آزاد مزاج نہیں تھی، ہاں البتہ عزت کے معاملے میں بے حد حساس تھی اور بچانے کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی بالآخر امریکہ پہنچ گئی تھی۔

ماہ بانو کا خیال ذہن میں آیا تو دل میں ایک کسک سی جاگی۔ وہ کتنا مجبور تھا کہ اپنے ہاتھوں اسے کس بنا ڈالا تھا۔ لیکن خوشی بھی تھی کہ وہ زندگی کے خارزاروں میں بھٹکنے سے بچ کر اسلم کے ساتھ ایک محفوظ گزار رہی تھی۔ وہ اسلم کے بارے میں پُر یقین تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اپنی محبت سے اس کے دل پر لگا ہر زخم مندمل کر سکتا ہے۔

"ایک بات کہوں، تم برا تو نہیں مانو گے؟" عائشہ کی آواز اُسے لمحۂ وجود میں واپس لائی۔

"کہو۔"

"تم دونوں نے مجھے اپنے غلط نام بتائے ہیں۔ تم نے خود کو ہندو ظاہر کیا ہے لیکن جن الفاظ میں تم مجھ سے گفتگو کرتے رہے ہو، اسے دیکھتے ہوئے میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم دونوں ہو اور کسی خاص وجہ سے اپنی اصلیت چھپا رہے ہو۔"

وہ بولی تو وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سن پڑ گئے۔ عائشہ کی صاف ستھری اُردو سن کر، اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ہندوؤں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور انہیں اس کے ساتھ اسی لب لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ہم دونوں نے اپنے شوق سے اُردو سیکھی ہے اور جب کبھی آپ جیسی اُردو دان سے بات چیت کرنے کا موقع ملے تو اس کا فائدہ اٹھا کر خود بھی بولنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔" پہلے شہریار نے خود کو سنبھالا اور پھر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں اپنی بات پر اصرار نہیں کروں گی۔ اگر آپ خود کو جگدیش اور رویندر کہلوانے پر مُصر ہیں تو مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔"

عائشہ نے جو جواب دیا، اس سے واضح تھا کہ وہ اس کی دی ہوئی وضاحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ شہریار نے بھی زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی۔ ان کے حق میں اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے بارے میں مزید کھوج لگانے کا ارادہ نہیں رکھتی ہے۔"

"یہاں بیٹھے سوچ بچار ہی کرتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی؟..... میں نے تم دونوں سے کہا ہے کہ فوری طور پر دہلی سے روانہ ہو جاؤ اور تم ابھی تک میرے گھر جیسی خطرناک جگہ پر بیٹھے ہوئے ہو۔"

"اوہ ہاں..... واقعی ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے" شہریار نے اس کی تائید کی لیکن اپنی جگہ وہ خود اُلجھن میں تھا کہ دہلی سے فوری طور پر کس طرح نکلے؟ ان کے مددگار نے انہیں شام کے بعد شناختی دستاویزات مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا جن کے بغیر زیادہ سفر کرنا ان کے لیے یوں بھی خطرناک ہو سکتا تھا لیکن اب صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ یہاں ٹھہرنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میرے خیال میں تم دونوں کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرے ہوئے ہو گے اور وہاں یقینی طور پر تمہارا سامان بھی موجود ہوگا۔ اگر نادر دادا تم سے انتقام لینا چاہتا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے آدمیوں نے اب تک مختلف ہوٹلوں میں تم دونوں کی تلاش شروع کروا دی ہوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اگر تمہارے سامان میں کوئی قیمتی شے نہیں ہے تو اسے وہیں پڑا رہنے دو اور ہوٹل جانے کا خطرہ نہ مول لو۔"

عائشہ نے انہیں ایک اور مشورے سے نوازا لیکن اس کا یہ مشورہ اس لیے قابلِ قبول نہیں تھا کہ ان کے بیگز میں اسلحے اور کرنسی کے علاوہ دیگر ضروری چیزیں بھی موجود تھیں۔

"ہم اپنا سامان ہوٹل میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اس میں ہماری بہت اہم چیزیں موجود ہیں۔"

عائشہ کے مشورے کا اس نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور بولا۔ "نادر یا اس کے آدمیوں کو ہمارے نام معلوم نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی تصویر ہے، اس لیے صرف زبانی حلیہ بتا کر ایک ہوٹل میں جا کر ہمیں تلاش کرنا ان کے لیے اتنا آسان نہیں ثابت ہوگا۔ اس سارے پروسس میں کافی وقت لگ سکتا ہے اس لیے ہمارے پاس چانس ہے کہ ہم وہاں جا کر اپنا سامان لے آئیں۔"

"بالکل ٹھیک، چلو ہم ابھی چلتے ہیں۔" سلّو نے بھی اس کی تائید کی اور کھڑا ہو گیا۔

"ایک منٹ رُکو۔ میرے خیال میں، میں اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔" عائشہ نے انہیں روکا۔

"وہ کیسے؟"

"میری ایک عزیز سہیلی ہے شکنتلا! میری خاطر وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں اس کے ذریعے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارا سامان منگوا دوں۔ اس دوران تم اس کے گھر پر بھی رک سکتے ہو۔ روکنے کو میں بھی روک لوں لیکن اس کا امکان ہے کہ وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے اور تم مارے جاؤ گے۔'' اس نے اپنی تجویز پیش کی۔

''شکریہ لیڈی۔ آپ نے ہمیں جو پیشکش کی اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں لیکن اس بات کو کسی طور مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ ہماری خاطر اپنی سہیلی کو خطرے میں ڈالیں۔ ہم مرد ہیں، کسی نہ کسی طرح خود کو بچا ہی لیں گے۔ اس لیے نہ تو آپ کوئی زحمت کریں اور نہ ہی کسی دوسرے کو زحمت میں ڈالیں۔ اب ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا۔'' شہریار نے غور سے اس کی تجویز سنی ضرور لیکن فوراً ہی رد کر دی اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں اللہ سے آپ دونوں کی سلامتی کے لیے دعا کروں گی۔'' وہ ان کے ہمراہ دروازے تک آئی اور بالکل ایسے لہجے میں کہا جیسے کسی محاذ پر جانے والے سپاہی کی بہن کہتی ہو گی۔

''ایک بار پھر شکریہ۔ ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے بھی دعاؤں کی ہی۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر وہ دونوں آگے پیچھے نکل گئے۔ گلی سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی سواری کو تلاش کرنے کے بجائے پیدل ہی چلنے کو ترجیح دی تھی۔

''بیٹھے بٹھائے ہم نے یہ سالی اچھی مصیبت گلے لگا لی۔ اب پتہ نہیں وہ خبیث دادا ہمیں کتنا خوار کروائے گا۔'' فرماں برداری سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے سلّو نے اپنے انداز سے صورتِ حال پر تبصرہ کیا جس کے جواب میں اس نے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا۔ اصل میں وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھا جہاں کچھ دیر سکون سے بیٹھا جا سکے۔

چند منٹ چلنے کے بعد بالآخر ایک پبلک پارک کی صورت میں ایسی جگہ مل گئی۔ وہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر اس نے اپنا موبائل نکالا۔ شکر تھا کہ اچھی خاصی مار دھاڑ اور اُچھل کود کے باوجود نہ تو موبائل اس کی جیب سے نکل کر کہیں گرا تھا اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچا تھا چنانچہ اس وقت وہ اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

''شیر نے اپنی سلطنت میں قدم رکھ دیئے ہیں۔'' ذہن نشین کیا ہوا مخصوص نمبر ملانے کے بعد رابطہ ہونے پر اس نے طے شدہ کوڈ ادا کیا۔

''جنگل کے جانور اس کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔'' دوسری طرف سے جوابی کوڈ دہرایا گیا۔

''ہم مشکل میں ہیں۔ کچھ دیر پہلے ''نوادر'' ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہماری نادر دادا نامی غنڈے کے آدمیوں سے ہاتھا پائی ہو گئی تھی اور اب امید ہے کہ اس کے بندے ہمیں ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ کیا تم ہمارے ہوٹل سے ہمارا سامان نکالنے کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟'' صحیح آدمی سے رابطہ ہو جانے کا یقین ہونے پر اس نے فوری طور پر اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اوہ گاڈ!..... تو وہ تم دونوں تھے۔ اس واقعے کی بازگشت تو دور تک پھیل گئی ہے۔ بہرحال، تم کہاں ہو؟ مجھے اپنی لوکیشن بتاؤ۔ پھر میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا اور پھر فوراً ہی اس سے پوچھنے لگا۔ جواب میں اس نے عائشہ کی زبان سے سنا، علاقے کا نام بتانے کے ساتھ ساتھ اس پارک کے اطراف کی نشانیاں بھی بتا دیں جہاں وہ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو۔ میں خود تمہیں لینے آتا ہوں۔'' وہ فوراً ہی بولا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اب ان کا

ان کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ یہی کرتے رہے۔ تقریباً پچیس منٹ بعد انہیں اپنا مددگار کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔

''میں اپنے ساتھ گاڑی لایا ہوں۔ اس میں ایک ڈرائیور بھی موجود ہے۔ تم دونوں راستے بھر کوئی بات نہ کرنا اور بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔'' کسی قسم کے تکلف میں پڑے بغیر اس نے سنجیدگی سے انہیں ہدایت کی اور پھر چل پڑا۔ وہ دونوں بھی اس کے پیچھے تھے۔

وہ ان کے لیے جو گاڑی لایا تھا، وہ ایک ٹیکسی تھی۔ ٹیکسی میں ان کے بیٹھتے ہی سفر شروع ہو گیا بیس منٹ میں وہ ایک تنگ گلی کے کونے پر ٹیکسی سے اُتر رہے تھے۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی تو ان کا پیدل سفر شروع ہوا اور وہ انہیں مختلف گلیوں سے گزارتا ہوا اس گھر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں وہ پہلے بھی آ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج اس نے دروازے پر دستک دینے کے بجائے جیب سے چابی نکال کر دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر انہیں لیے اندر داخل ہو گیا۔

''یہ آپ نے بڑا غضب کیا کہ نادر دادا جیسے بندے سے اُلجھ بیٹھے۔ اس غلطی کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے۔'' اندر پہنچتے ہی وہ تشویش سے بولنا شروع ہو گیا۔

''ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ کیا بلا ہے۔ ہم نے تو بس ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوتی دیکھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔'' منہ پھلا کر جواب دینے کا فریضہ سلّو نے انجام دیا۔

''وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے بارے میں آپ لوگ اس بات سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں اتنا کچھ ہونے کے باوجود پولیس کا کوئی آدمی پھٹکا تک نہیں ہو گا کیونکہ یہ نادر کا حکم ہے کہ جہاں وہ اور اس کے بندے کسی لفڑے میں اُلجھے ہوں، وہاں پولیس کا نام و نشان بھی نظر نہ آئے۔'' اس نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اوہ، آئی سی۔ یعنی وہ اتنا بڑا غنڈہ ہے کہ پولیس بھی اس سے ڈرتی ہے؟''

''بالکل۔'' وہ زور سے گردن ہلا کر بولا۔

''تو پھر اب تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟'' شہریار نے استفسار کیا۔

''میں نے راہول کو فون کر دیا تھا۔ وہ کچھ بندوبست کر کے آتا ہو گا۔ اس کے آنے تک تم دونوں اپنے حلیوں میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو تاکہ کوئی فوری طور پر تمہیں شناخت نہ کر سکے۔''

اس نے نہ صرف مشورہ دیا بلکہ حلیوں کی تبدیلی میں ان کی مدد بھی کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے پر راہول بھی واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ان دونوں کے بیگز لٹکے ہوئے تھے۔

''اوہ مائی گاڈ!..... بڑی مشکل سے لالو بھائی کو سمجھا بجھا کر یہ بیگز لے کر آیا ہوں۔ وہ بھی اس بات کا کام کرنے کے بعد کہ اس کی جان کسی مشکل میں نہ پھنس سکے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگز نیچے زمین پر رکھے تو سلّو نے آگے بڑھ کر ایک بیگ کھولا اور اندر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

''اچھی طرح چیک کر لو، ہر چیز موجود ہے یا نہیں؟ میں نے تو بڑی جلدی میں سارا کام نمٹایا ہے۔ دوسرے کمرے سے یہ بیگ نکالنے کے ساتھ اسی رنگ کے دو بیگ کپڑوں اور دیگر سفری سامان سمیت وہاں سے اٹھا کر آیا ہوں۔ اب اگر نادر دادا کا کوئی آدمی تمہارا پوچھتا ہوا لالو بھائی تک پہنچا تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ تم ٹھہرے ہوئے تو اس کے ہوٹل میں ہی ہیں لیکن صبح سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آئے۔ ثبوت میں وہ تمہارے زیر استعمال کمرہ اور سامان دکھا دے گا۔ بس پھر اللہ اللہ خیر سلّا۔ آگے تو دادا کی مرضی ہو گی کہ کیا ہوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ لالو البتہ اس شرط پر زبان نہیں کھولے گا کہ ہونے والے کسی نقصان کو بھرنے کی ذمے داری ہم اٹھا گے۔'' اس نے اُنہیں تفصیلات سے آگاہ کیا اور بوتل منہ سے لگا کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پینے لگا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں سے بس کے ذریعے بستی نظام الدین تک چلے جاؤ۔ وہاں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی آتے ہیں۔ تم اپنے موجودہ گیٹ اَپ کے ساتھ وہاں کے ماحول میں آسانی سے گھل مل جاؤ گے۔'' راہول خاموش ہوا تو پہلے والے شخص نے بولنا شروع کر دیا۔

''ہم دہلی سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔'' شہریار نے مطالبہ کیا۔

''سوری، ابھی تم لوگوں کی شناختی دستاویزات تیار نہیں ہو سکی ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ کل تک کا وقت لگ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ جہاں میں کہہ رہا ہوں، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ رہو گے میں خود وہاں آ کر تمہیں کاغذات پہنچا دوں گا۔''

اس نے درپیش مسئلہ بتایا تو ان کو اس کی بات ماننی پڑی۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے بیگ شانوں سے لٹکائے بستی نظام الدین کے لیے جانے والی بس پر سوار ہو رہے تھے۔ انہیں وہاں جانے کا مشورہ دینے والے کے خیرخواہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ بس سے اُترنے کے بعد رکشہ کر کے درگاہ تک چلے جانا اور وہاں موجود سراؤں میں سے کسی میں قیام کر لینا۔

انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور ایک سرائے میں کمرہ بک کروانے کے بعد دیگر زائرین کی طرح خود بھی درگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں بے شمار لوگ تھے جو ہندو، مسلم اور سِکھ کی تخصیص کے بغیر اپنی حاجتیں لے کر وہاں آئے ہوئے تھے۔ صحیح غلط کی بحث اپنی جگہ لیکن یہ امر حیرت ناک تھا کہ اس ہندوستان میں جہاں اصل میں ہندوؤں ہی کا راج تھا، ایک مسلمان بزرگِ دین کی ایسی عزت تھی کہ ان سے گزر جانے کے طویل عرصے بعد بھی ہر ایک کے دل پر راج کرتا تھا اور یہ حکمرانی ایسی تھی جسے کوئی مٹا نہیں سکتا تھا۔

وہ دونوں بھی کچھ دیر تک زائرین کے ساتھ درگاہ کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے پھر وہاں پکنے والی دیگ کے لیے نذرانہ دے کر باہر نکل گئے۔ عقیدے کے مطابق اس دیگ کے لیے نذرانہ وہ لوگ دیتے تھے جو کوئی حاجت لے کر وہاں آتے تھے۔ انہیں حاجت کوئی نہیں تھی لیکن اس خیال سے نذرانہ دے دیا تھا کہ ہر روز سینکڑوں لوگوں کو مفت کھانا فراہم کرنے والی دیگ میں تھوڑا سا حصہ ان کا بھی پڑ جائے گا۔

سرائے واپس آ کر انہوں نے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آج صبح سے ہی وہ مستقل سفر میں تھے اور اب جا کر بستر کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی تھی اس لیے لیٹتے ہی سو گئے۔ صبح دستک کی آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔

''شاید سرائے کا مالک ہو گا اور ناشتے کے بارے میں پوچھ رہا ہو گا۔'' شہریار نے اپنی جگہ لیٹے لیٹے اندازہ لگایا۔

''جو بھی ہو، اُس کو ٹال دو۔ میں ابھی کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔'' سلّو نے کروٹ بدل کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مجبوراً شہریار کو ہی بستر چھوڑنا پڑا۔ ویسے بھی آج وہ معمول کے خلاف بہت دیر تک سو چکا تھا۔ اس کے بستر سے اُتر کر دروازے پر جانے تک دستک ایک بار پھر دی گئی جو پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

''کون ہے بھائی! ذرا صبر کرو۔ آ رہا ہوں۔'' اس نے وہیں سے کہا اور دروازے کی طرف لپکا۔

''کون ہے؟'' دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے احتیاطاً دریافت کیا۔

''پولیس۔ دروازہ کھولو۔'' باہر سے جو جواب دیا گیا، اسے سن کر شہریار تو شہریار، بستر پر کروٹ بدل کر سونے والا سلّو بھی اُچھل پڑا۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پولیس کی موجودگی کا سن کر وہ دونوں ہی ساکت رہ گئے۔ دلّی کے نوادر میں عائشہ نامی ویٹریس سے ہمدردی کرتے ہوئے وہ نادر دادا نامی جس شخص سے بھڑ گئے تھے، اس کے بارے میں علم نہیں تھا کہ وہ کتنی پہنچ والا ہے۔ اندازہ ہوا تو تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ عائشہ سمیت ان کے دہلی میں موجود مددگاروں نے بتایا کہ نادر دادا سے دشمنی مول لے کر دہلی میں خیر و عافیت سے رہنا ممکن نہیں ہے۔ وہ فوری طور پر دہلی چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے کہ شناختی کاغذات کی عدم موجودگی قدم قدم پر مشکلات کھڑا کرتی۔ چنانچہ اپنے ہمدردوں کے مشورے اور مدد سے حلیہ بدل کر بستی نظام الدین پہنچ گئے تھے اور زائرین کی سرائے میں مقیم تھے۔ لیکن کیا ستم تھا کہ یہاں ابھی رات ہی گزری تھی کہ پولیس کے ہرکارے دروازے پر پہنچ گئے۔

غالب امکان یہی تھا کہ ان کے پیچھے نادر دادا کا ہی ہاتھ ہو گا۔ دہلی کے ایک بڑے غنڈے سے دشمنی مول لینے کے بعد پولیس والے اس کے اشارے پر ان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتے تھے، یہ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اور یہاں تو معاملہ اور بھی بڑھ کر تھا۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتے تو شناختی دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث اپنے بچاؤ کے لیے کوئی ثبوت اور گواہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو گرفتار کر لینے کی صورت میں پولیس کے ساتھ ایک تیر سے دو شکار کر لینے والا خوش نما اتفاق پیش آ جاتا۔ ایک طرف وہ نادر دادا کے ہرکاروں کو پکڑ کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے تو دوسری طرف غیر ملکی جاسوسوں کو پکڑ لینے کا اعزاز حاصل ہو جاتا۔

موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے کسی طور یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھ آ جاتے۔ چنانچہ پکڑے جائے فرار تلاش کرنے کے لیے شہریار نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ دو سنگل بیڈز والا یہ کمرہ کچھ اتنا بڑا نہیں تھا۔ کمرے میں اٹیچڈ باتھ کی سہولت بھی نہیں تھی۔ دیواریں سپاٹ تھیں اور کسی کھڑکی کا نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ ایک روشن دان تھا جو زیادہ بلند بھی نہیں تھا لیکن اس کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے کسی انسانی وجود کے گزرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔

فرار کے سارے راستے مسدود پا کر اس نے سلّو کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بستر چھوڑ چکا تھا، اس کا اشارہ پا کر فوراً حرکت میں آیا اور ہتھیار تھام کر دروازے کی آڑ میں اس طرح آ کھڑا ہوا کہ ضرورت پڑنے پر فائر کر سکے۔

''دروازہ کھولتے ہو یا توڑ دیں؟'' دروازہ کھلنے میں تاخیر ہوئی تو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے دوبارہ دستک دی گئی اور ساتھ ہی سخت لہجے میں دھمکایا بھی گیا۔

''آ رہا ہوں سر جی! ذرا کپڑے پہن رہا تھا۔'' شہریار نے سادگی سے جواب دیا اور دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ لیکن اس سے قبل کہ پٹ کھولتا، باہر عجیب ہنگامہ شروع ہو گیا۔

''پکڑو، بھاگنے نہ پائیں سالے۔'' کوئی زور سے چیخا اور پھر بھاگنے دوڑنے کی آوازوں کے ساتھ دو فائر اور چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے شہریار نے احتیاط سے ایک پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ ان کے کمرے کے دروازے پر اب کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا اور وہ سب سرائے کے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے دو قدم باہر نکل کر دیکھا تو دروازے کے قریب دو افراد پڑے ہوئے نظر آئے جنہیں یقینی طور پر گولیاں لگی تھیں۔ ان گرے ہوئے افراد میں سے ایک نے شہریار کے دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ بلند کیا اور گولی داغ دی۔ گولی نے سب سے آگے بھاگ کر جاتے ہوئے پولیس والے کو نشانہ بنایا اور وہ بری طرح چیختا ہوا گر گیا۔ اس کے گرتے ہی اس کے باقی ساتھی یکدم ہی مشتعل ہو گئے اور انہوں نے بنا تکلف اپنی رائفلوں کا منہ کھول دیے۔ بیک وقت کئی گولیاں پولیس والے پر فائر کرنے والے شخص کی طرف لپکیں اور پل بھر میں اس کے جسم میں کئی سوراخ ہو گئے اور ان سوراخوں میں سے خون کے فوارے اُبل پڑے۔

وہ خاصا صحت مند اور جان دار شخص تھا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں کھانے کے باوجود فوری طور پر جان نہیں گیا بلکہ اذیت سے بری طرح اُچھلنے اور تڑپنے لگا۔ ایک انسانی وجود کا اس طرح کرب میں مبتلا ہونا اس طور پر کوئی خوش کن نظارہ نہیں تھا۔ شہریار کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے لوگ بھی افسوس اور خوف کی ملی کیفیت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص تڑپ تڑپ کر ختم ہو گیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر پڑا اس کا ساتھی بھی ساکت ہو گیا حالانکہ وہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھنے والی گولیوں میں سے کسی ایک کا بھی نشانہ نہیں بنا تھا لیکن شاید اس کے مرنے کے منظر نے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وہ خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا یا بے ہوش بن جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ دونوں کو کسی قابل نہ پا کر پولیس والوں نے حرکت کی اور اپنی کارروائی مکمل کرنے لگے۔

''کیا فائدہ ایسے لالچ کا۔ دولت کی ہوس میں جان بھی چلی گئی۔'' اس منظر کو دیکھتے تماشائیوں میں سے کسی ایک نے تبصرہ کیا۔

''مجھے تو دکھ ہو رہا ہے۔ کیسا کڑیل جوان ہے۔ اس کی ماں، بہنیں اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش دیکھیں گی تو ان کے من پر کیا گزرے گی۔'' کہیں سے ایک اور تبصرہ آیا۔

'کیا بات ہے بھائی صاحب! یہ کیا قصہ ہے؟'' تبصروں نے اس کے دل میں تجسس جگایا تو اس نے قریب کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا۔

''ڈکیت تھے جناب! دہلی کے ایک بینک میں ڈکیتی مار کر یہاں آ کر چھپ گئے تھے۔ پولیس کو کسی طرح خبر ہو گئی اور انہوں نے صبح صبح یہاں ہلّا بول دیا۔ ان ڈاکوؤں کے چکر میں وہ سرائے کے ایک ایک کمرے کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان دونوں نے دیکھا کہ پکڑے جانے کا خدشہ ہے تو بھاگنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر اب جس حال میں پڑے ہیں، آپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

ادھیڑ عمر شخص نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا جہاں مرنے والے ڈاکو کی لاش کو سفید کپڑے سے ڈھانپا جا چکا تھا جبکہ اس کے زخمی ساتھی کو گرفتار کرنے کے بعد طبّی امداد کے لیے ہسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔

''واقعی بڑے افسوس اور عبرت کا مقام ہے۔'' اس نے بھی جوابی تبصرہ کیا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سلّو بھی اس دوران باہر نکل چکا تھا اور اس سارے منظر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''خلاص۔'' شہریار کو سامنے پا کر اس نے صورتِ حال پر یک لفظی تبصرہ کیا اور اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''میں تو دوبارہ سونے کے لیے لیٹ رہا ہوں۔ تمہارا دل چاہے تو ناشتہ پانی کر لو۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اعلان کیا اور غڑاپ سے بستر پر جا گرا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے خراٹے کمرے میں

گونجنے لگے اور وہ یوں اطمینان سے سو گیا جیسے کچھ دیر قبل دیکھی جانے والی خون میں نہائی انسانی لاش اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ حالانکہ صورتِ حال ذرا سی مختلف ہوتی تو پولیس کا نشانہ بننے والے ان دونوں افراد کی جگہ وہ خود بھی ہو سکتے تھے۔

شہریار نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑا اور کمرے کی محدود جگہ میں ہی اپنی معمول کی ورزش کرنے لگا۔ ایف پی کو جوائن کرنے سے پہلے بھی صبح اُٹھ کر ورزش کرنا اس کا معمول رہا تھا۔ تربیت کے بعد اس معمول میں کچھ مزید سخت مشقوں کے ساتھ اور بھی زیادہ باقاعدگی آ گئی۔ اپنے موجودہ مشن کے دوران بھی وہ اس کام کے لیے موقع نکال ہی لیتا تھا۔ ورزش سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پسینہ خشک ہونے کا انتظار کیا اور پھر تولیہ اُٹھا کر نہانے چلا گیا۔ سرائے سے اس دوران مقتول ڈاکو کی لاش اُٹھائی جا چکی تھی اور پولیس اپنی کارروائی کر کے واپس چلی گئی تھی۔ اس نے لائن سے بنے غسل خانوں میں سے ایک غسل خانے کا رخ کیا اور بھرپور غسل لے کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو وہاں سلّو کے ساتھ راہول بھی موجود تھا اور ان کے درمیان ناشتے کے لوازمات سجے تھے۔

''آ جاؤ بھئی، ناشتہ کر لو۔ گرم اور مزیدار ہے۔'' اسے دیکھ کر سلّو نے دعوت دی تو وہ بلا تکلف ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وقت بھی خاصا ہو گیا تھا اور ورزش کے بعد غسل نے بھوک بھی خاصی چمکا دی تھی اس لیے ناشتہ واقعی بہت مزے کا لگا۔

''تم دونوں کے کاغذات تیار ہو گئے ہیں۔ ان کاغذات کے علاوہ بھی مزید کچھ کاغذات تیار کروا کر ان شہروں کے پی او بکس میں محفوظ کر دیئے جائیں گے جن کے بارے میں امکان ہے کہ تمہیں اپنے مشن کے سلسلے میں جانا پڑے گا۔''

ڈاکٹر فرحان کے بارے میں اُنہیں کنفرم نہیں پتہ تھا کہ وہ کس شہر میں ہیں بلکہ کچھ شہروں کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ شاید ان میں سے کسی جگہ وہ موجود ہو سکتے ہیں۔ اسی حوالے سے راہول نے انہیں اطلاع دی تھی۔ اطلاع دینے کے ساتھ اس نے شناختی کارڈز وغیرہ نکال کر اس کے حوالے کیے۔ شناختی کارڈز پر لگی تصویریں ان کے موجودہ حلیوں کے مطابق ہی تھیں۔ شہریار نے شکریے کے ساتھ انہیں وصول کر لیا۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث آج صبح وہ بڑی مشکل میں پھنسنے والے تھے۔

''نادر دادا والے معاملے کا کیا ہوا؟'' اس نے راہول سے ایک اہم سوال کیا۔

''اس کے آدمی تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس چکر میں وہ لالو بھائی کے ہوٹل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے دوستی کا پاس کرتے ہوئے وہی کہا جو میں نے اُنہیں سکھایا تھا۔ ہوٹل کے خالی کمرے سے وہ تم دونوں کے وہ بیگز لے کر چلے گئے جو میں نے تمہارے اصل بیگز کی جگہ رکھ دیئے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ نادر دادا کے لوگ اب بھی تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں جلد سے جلد یہاں سے نکل کر کسی دوسرے شہر پہنچ جاؤ۔ میرے مطابق تمہارے لیے سب سے بہتر ممبئی جانا ہو گا۔ دہلی ریلوے اسٹیشن سے ممبئی کے لیے راجدھانی ٹرین چلتی ہے۔ میں تمہارے لیے اس کی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ یہ ٹکٹ لو اور فرسٹ کلاس کے مزے لوٹتے ہوئے ممبئی پہنچ جاؤ۔'' راہول نے ٹکٹ نکال کر ان کے سامنے رکھے تو شہریار کو ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنا پڑا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔'' راہول نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً ہی وہاں سے روانہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک کہہ رہا تھا وہ۔ تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ شکریہ تو اسے ہمارا ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس کی خالی خولی میزبانی کے بدلے میں آج میں نے اسے اتنا زبردست ناشتہ کروایا ورنہ میں بھی اس کی طرح اسے سوکھے منہ ٹرخا سکتا تھا۔''

راہول کے جانے کے بعد سلّو نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اُسے اس بات کی بہت شکایت تھی کہ راہول والی رہائش گاہ پر اس نے اور اس کے ساتھی نے کام کی بات کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی اور یہاں تک کہ انہیں مہمان خیال کر کے چائے تک کا تکلف نہیں کیا تھا۔

''جانے دو یار!'' شہریار نے اس کی بات سن کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور سمجھانے لگا۔ ''وہ بے چارے پتہ نہیں کتنے مشکل حالات میں یہاں کام کر رہے ہیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کتنی مشکل اور مختلف ہوتی ہے۔ اپنی اصل شخصیت، وطن اور خاندان سمیت ہر شے کو بھول کر صرف مقصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہر گھڑی خطرے کی تلوار سر پر لٹکتی رہے اور دل میں یہ اندیشہ ہو کہ پتہ نہیں کب اور کیسے ہماری اصلیت کھل جائے۔''

''وہ بے چارے ہیں اور ہم تو جیسے پکنک پر نکلے ہیں۔'' اس کی بات سن کر سلّو بڑبڑایا۔

''ابھی تک تو سمجھو پکنک ہی منا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر روانگی کے لیے تیاری کرنے لگا۔ سلّو نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

وہ اسٹیشن پہنچے تو ٹرین کی روانگی میں تقریباً آدھ گھنٹہ باقی تھا اور اس بات کا اعلان پبلک سروس سسٹم سے کیا جا رہا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے گاڑی کا نام لے کر تکرار کے ساتھ روانگی کا وقت بتایا جانے لگا۔ ٹرین کے پلیٹ فارم پر لگنے تک وہ چائے نوشی کے ساتھ ساتھ اخبار بینی بھی کرتے رہے۔ یہ انگریزی اخبار تھا جس کے مطالعے میں ایک تو ان کا وقت اچھا گزرا، دوسرے چہروں کے سامنے ایک آڑ بھی رہی۔ بدلے ہوئے حلیوں میں ہونے کے باوجود انہوں نے اس احتیاط کو مناسب سمجھا تھا کہ اگر نادر دادا کے گُرگے وہاں منڈلا رہے ہوں تو انہیں غور سے ان کا جائزہ لینے کا موقع نہ مل سکے۔ اخبار بینی کی مصروفیت سے کسی کے شک میں پڑنے کا گمان یوں نہیں تھا کہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھے حضرات میں سے اکثریت اسی مشغلے میں مصروف تھی۔

گاڑی کے پلیٹ فارم پر لگ جانے کا اعلان سن کر انہوں نے اپنے اپنے اخبار رول کر کے بغل میں دبائے اور ٹرین کی طرف بڑھ گئے۔ فرسٹ کلاس میں ان کے لیے مخصوص کوپے شاندار تھا۔ ایک نرم کاؤچ پر ڈھیر ہوتے ہوئے سلّو نے بغل میں دبا ہوا اخبار ایک طرف ڈالا اور اپنی کنپٹیوں کو اُنگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے بیزاری سے بولا۔

''آج میں نے اتنی انگریزی پڑھ لی ہے کہ لگتا ہے بدہضمی ہو جائے گی۔ سالی یہ انگریزی ان لوگوں نے ہم کو ڈنڈے کے زور پر سکھائی تھی ورنہ بالکل شوق نہیں تھا فرنگیوں کی زبان سیکھنے کا۔''

''چلو، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کچھ تو اچھا کیا۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے تبصرہ کیا۔ وہ خود بھی اس وقت ایک کاؤچ پر ہی براجمان تھا لیکن سلّو کے برعکس اخبار لپیٹ کر رکھنے کے بجائے ایک بار پھر کھول لیا تھا۔ اخبار پڑھتے ہوئے اُس کی نظر اس چھوٹی سی خبر پر بھی پڑ گئی جس میں نوادر ہوٹل میں پیش آنے والا واقعہ مختصراً بیان کیا گیا تھا۔ خبر میں نادر دادا کا نام نہیں تھا اور شاید اس طرح اس کی ساکھ بچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہریار نے سلّو کو بھی وہ خبر پڑھ کر سنائی۔

''نام کیسے لکھتا سالا اخبار والا۔ نادر دادا اپنی اس بیہجتی (بے عزتی) کے لیے اس کی واٹ نہ لگا دیتا کیا۔'' اس نے تبصرہ کیا جس سے شہریار نے بھی اتفاق کیا اور آخر کار خود بھی اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد سلّو ہی کی طرح پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نادر دادا کیا تھا اور کیا نہیں، ان کے لیے تو اصل بات اس بات کی تھی کہ وہ اس سے بچ کر نہایت آسانی سے دہلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ممبئی کی طرف مزے سے رواں دواں تھے۔

⊛----✪----⊛

''ہم نے رائے چند کو اُدھیڑ ڈالا ہے سر! اس نے اپنے سارے غیر قانونی دھندوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی قبول کیا ہے کہ وہ ''را'' کے لیے کام کرتا رہا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور انہیں جب اس سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو وہ خود اس سے رابطہ کر لیتے ہیں۔''

رائے چند کو جاوید علی نے اپنے جن ماتحتوں کے حوالے کیا تھا، ان میں سے ایک نے رپورٹ دی۔ اس رپورٹ کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

رائے چند کو تفتیشی مراحل سے گزارنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ انہیں اپنے کام میں خاصی مہارت حاصل تھی اس لیے یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا کہ رائے چند جیسا شخص اُنہیں غچا دینے میں کامیاب رہا ہوگا اور اتنی سختی سے گزرنے کے بعد بھی جھوٹ بول رہا ہوگا۔ اس کی نگرانی کے دوران بھی ایک طرح سے اُس کے اس بیان کی تصدیق ہوئی تھی۔ اسے گھر سے دُکان اور دُکان سے گھر جانے کے سوا آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ہسپتال سے شہریار کے خون وغیرہ کے نمونے لے کر گیا تھا، تب بھی کسی سے ملاقات کے لیے نہیں گیا تھا اور غالب گمان یہی تھا کہ ''را'' کا کوئی ایجنٹ گاہک کے روپ میں آ کر اتنے چپکے سے وہ نمونے لے گیا تھا کہ نگرانی کرنے والے کو بھی شک نہیں گزرا تھا۔

''اس نے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بتایا جن سے وہ ہیروئن اور فلمز حاصل کرتا ہے؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا۔

''یس سر! اس کا کہنا ہے کہ یہ اشیا اسے ایک عورت سپلائی کرتی ہے۔ وہ عورت ایک ایسی سیلز ویمن کے روپ میں اس کے گھر آتی ہے جو بظاہر خواتین کے استعمال کی اشیا گھر گھر لے جا کر فروخت کرتی ہے۔ رائے چند کے مطابق اس کی آمد کے وقت رائے چند گھر پر موجود نہیں ہوتا اور دکان پر رہتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں عورت اس کی بیوی کو ایک پارسل دے کر چلی جاتی ہے اور بدلے میں اس کی بیوی طے شدہ رقم ادا کر دیتی ہے۔'' ماتحت نے جواب دیا۔

''یہ طریقہ کار بہت زیادہ عجیب نہیں ہے یار! مانا کہ عورت احتیاط کے پیشِ نظر اس کی دکان پر آنا مناسب نہیں سمجھتی ہوگی لیکن رائے چند پر گھر میں موجود نہ رہنے کی پابندی کیوں ہے؟ متوسط طبقے کی آبادیوں میں اس طرح سے گھروں پر ساز و سامان فروخت کرنے والی خواتین کی آمد ایک عام سی بات ہے۔ گھریلو خواتین بازاروں کے مقابلے میں اطمینان سے ان خواتین سے خریداری کرنا بہتر سمجھتی ہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے گھر کی آزاد فضا میں آسانی سے جانچ پڑتال کر کے خریداری کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔ بسا اوقات پر اگر گھر میں مرد حضرات موجود ہوں تو خود ہی ایک سائیڈ پر ہو جاتے ہیں چنانچہ اگر یہ سمجھا جائے کہ رائے چند کی موجودگی میں اس عورت کے اس کے گھر آنے سے کسی قسم کے شکوک و شبہات جنم لینے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خدشہ تھا، اس لیے اس نے یہ پابندی عائد کی تھی تو کچھ عجیب غیر منطقی سی بات ہو گی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اہتما
خاص اس لیے کیا گیا ہے کہ رائے چند اس عورت کو نہ دیکھ سکے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!..... مجھے بھی یہ معاملہ کچھ عجیب لگا ہے۔'' ماتحت نے اس کی تائید کی۔

''آؤ ذرا چل کر دیکھتے ہیں، رائے چند کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' جاوید علی اپنی جگہ سے اُٹھ
اپنے ساتھی کے ساتھ چل پڑا۔

رائے چند تفتیش کے مخصوص کمرے میں ایک اسٹریچر پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی اور
اس رائے چند سے قطعی مختلف لگ رہا تھا جسے جاوید علی نے اس کی دکان پر دیکھا تھا۔

''کیا حال ہے رائے چند!..... کیا خیال ہے، تمہاری اس حالت کی فلم بنا کر ان نوجوانوں میں تقسیم کر
جائے جنہیں تم اخلاق باختہ فلمیں دکھا کر تباہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر انہیں
نصیحت اور ان کے والدین کو سکون حاصل ہو گا کہ ابھی اس ملک میں وہ لوگ موجود ہیں جو اس کے مستقبل
برباد کرنے کی کوشش کرنے والوں کے ہاتھ توڑ دینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں
رائے چند کے لیے سخت نفرت تھی۔ جواب میں رائے چند نے اپنا منہ موڑ لیا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ اس کا سارا دم خم نکال دیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے ابھی اس میں بہت جان باقی
اور جب جان باقی ہے تو لازمی ہے، سینے میں کچھ راز بھی باقی ہوں گے۔ اسے چھت سے اُلٹا لٹکا دو تا کہ
اپنے اندر کے راز اُگلنے میں زیادہ مشکل نہ ہو۔''

اس کی زبان سے حکم جاری ہوتے ہی بڑی سرعت سے اس پر عمل ہوا اور فوراً ہی رائے چند چھت پر
ایک آنکڑے کے ساتھ لٹکتی زنجیر میں اُلٹا لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک خاطر مدارت ہو
تھی، اُلٹا لٹکنے سے جہاں اس کا سارا خون چہرے کی طرف سمٹ آیا، وہیں خوف کے بادل بھی چھائے ہو
نظر آنے لگے۔

اُس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے جاوید علی نے ایک ساتھی کو اشارہ کیا تو رائے چند پر قیامت ٹو
پڑی اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ یہ کمال بجلی کے اس جھٹکے کا تھا جو اس کے پیر کے ساتھ بندھی زنجیر سے گزر
بس لمحے بھر کے لیے اس کے جسم سے گزرا تھا لیکن اُسے ایسے ہلا گیا تھا جیسے زلزلہ زمین کو لرزا کر رکھ دیتا ہے۔

''تم نے عیدِ قرباں پر بکروں کی قربانی ہوتے ہوئے تو دیکھی ہو گی۔ اُنہیں بھی اسی طرح اُلٹا لٹکا کر ا
کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ میرے آدمی کسی قصاب سے کم ماہر نہیں ہیں۔ یہ آرام سے کسی بکرے کی طر
تمہاری کھال اُتار سکتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہو گا کہ بکرے کی کھال اس کی جان نکلنے کے بعد اُتاری جا
ہے اور یہاں کھال اُترنے سے تمہاری جان نکلے گی۔''

اس کے نہایت سفاکی سے ادا کیے گئے جملے ابھی ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک آدمی ہاتھ میں تیز دھا
چھرا لیے رائے چند کے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تت..... تم مجھ سے ایسا غیر انسانی سلوک نہیں کر سکتے۔''

رائے چند بجلی کے جھٹکے سے تو سنبھل گیا تھا لیکن زندہ حالت میں کھال اُترنے کے خیال سے دہشت
زدہ ہو کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''انسانوں والا سلوک انسانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، تجھ جیسے درندے کے ساتھ نہیں جس کے کا
کرتوت معصوم زندگیوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ تُو نے کبھی ان معصوموں کا سوچا ہے جو تیرے دیئے ہوئے

اپنی رگوں میں اُتار کر خود بھی لمحہ لمحہ مرتے ہیں اور اپنے محبت کرنے والوں کو بھی جیتے جی مار دیتے ہیں۔
میں مبتلا ایک جوان کی ماں کے دل کی تڑپ اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو تُو اپنی کھال اُتارے جانے
صورت میں محسوس کرے گا۔''

اُس کے لہجے کی سختی اور درشتی میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا تو اس نے ہاتھ
اٹھا کر رائے چند کے بازو کی جلد پر ایک ہلکا سا چرکا لگایا۔ رائے چند بُری طرح چیخنے لگا۔ اُس کی ان چیخوں
ہونے والی تکلیف سے زیادہ اس دہشت کا دخل تھا کہ اس کے پورے جسم کی کھال کو اسی طرح اُتارا
جانے والا ہے۔

''چیخنے چلّانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کمرے سے باہر تمہاری آواز نہیں جا سکتی۔ اور اس کمرے
موجود لوگ صرف وہی بات سنتے ہیں جو ان کے کام آ سکے۔'' جاوید علی نے نہایت سرد مہری سے اسے
فراہم کی۔ کچھ بھی پوچھنے سے قبل وہ اسے اتنا دہشت زدہ کر دینا چاہتا تھا کہ جھوٹ یا انکار کی گنجائش ہی
رہے۔

''تم مجھ سے پوچھو، میں وہ سب بتاؤں گا جو تم پوچھو گے۔'' حسبِ توقع رائے چند لائن پر آ گیا۔

''تمہیں مال سپلائی کرنے والی عورت کون ہے؟'' اس نے پہلا سوال کیا۔

''میں اُسے نہیں جانتا۔ مجھے اوپر سے حکم تھا کہ جب وہ عورت مال دینے میرے گھر آئے تو میں
موجود نہ رہوں۔ ویسے بھی وہ پہلے سے بتا کر مقررہ وقت پر نہیں آتی۔ میری غیر موجودگی میں اچانک ہی
کبھی آ جاتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''پھر تم اُسے مال کی پے منٹ کیسے دیتے ہو؟''

''میں طے شدہ رقم ہمیشہ اپنے گھر کے سیف میں محفوظ رکھتا ہوں۔ وہاں سے میری پتنی نکال کر اسے
دیتی ہے۔'' وہ شرافت سے جواب دے رہا تھا۔

''اس طریقے سے تمہیں مال کی سپلائی میں پریشانی نہیں ہوتی؟ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہو گا کہ عورت کے
لانے سے پہلے ہی تمہارا اسٹاک ختم ہو جائے، اس صورت میں تم کیا کرتے ہو؟''

''ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کبھی ایک دو دن کا فرق پڑ جائے تو پڑ جائے ورنہ زیادہ تر وہ میرا اسٹاک ختم
ہونے سے پہلے ہی نیا مال سپلائی کر دیتی ہے۔''

''تمہیں کبھی تجسس نہیں ہوا کہ اس عورت کو دیکھو؟'' جاوید علی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ
ابھی تک اُلٹا لٹکا ہوا تھا اور بے پناہ سرخ ہوتے اس کے چہرے سے تاثرات کا اندازہ لگانا ذرا مشکل تھا۔

''میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا تو اوپر والے میری کھال میں
بھسّ بھروا دیتے۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔

''اوپر والے کون؟'' جاوید علی نے درشتی سے پوچھا۔ جواباً وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''میں نے پوچھا ہے، اوپر والے کون؟'' جاوید علی کی آواز کچھ اور بھی سخت ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کے
ساتھی کا چھرا ایک بار پھر رائے چند کے جسم کی طرف بڑھا۔

''وہی جنہوں نے میرے ذریعے ہسپتال سے اے سی شہریار کے خون اور بالوں کے نمونے منگوائے
تھے۔'' اس نے دہشت زدہ ہو کر جواب دیا لیکن اب بھی ''را'' کا لفظ زبان پر نہ لا سکا۔ البتہ مطلب واضح تھا
اس لیے جاوید علی کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسلحہ، منشیات، اخلاق باختہ فلمیں۔ دشمن ہر رُخ سے وار کر کے انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تباہ کرنے پر تُلا ہوا تھا اور اسے یہ آسانی اس لیے تھی کہ اس ملک میں اس کا ساتھ دینے کے لیے رائے چند اور ریاض انور جیسے کئی غدار موجود تھے۔

''اگر تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا، تب بھی تمہیں تمہاری بیوی نے تو اس کے بارے میں کچھ بتایا ہو گا؟'' اس نے رائے چند کو کریدنے کی کوشش کی کیونکہ ''را'' والوں تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس اب صرف یہی اُمید تھی کہ کسی طرح اس عورت کا سراغ مل جائے۔

''نہیں، وہ عورت چہرے پر نقاب لگا کر آتی تھی اس لیے وہ بھی کچھ نہیں جانتی۔''

''ٹھیک ہے۔ جب تم کچھ نہیں جانتے اور کچھ نہیں بتا سکتے تو ہمارے سامنے صرف تم ہی ہو جس کے ذریعے ہم اپنے دل میں بھڑکتی آگ کو بجھا سکیں..... اُدھیڑ ڈالو اس کو۔ اس کی چیخیں مجھے سکون دیں گی۔''

وہ رائے چند سے بولتے بولتے اچانک اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا جس نے فوراً ہی اُلٹے لٹکتے رائے چند کے جسم پر چھرا چلا دیا۔ چند اِنچ کی کھال کا ٹکڑا کٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ساتھ ہی رائے چند نے ایک دل دوز چیخ ماری لیکن چھرے کو ایک بار پھر اپنے جسم پر محسوس کر کے چیخوں کو قابو کر لیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''رُک جاؤ۔ میں تمہیں ایک کام کی بات بتا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ۔'' جاوید علی کو پہلے ہی یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور چھپائے ہوئے ہے، اس لیے اطمینان سے بولا۔

''یہ سچ ہے کہ مال سپلائی کرنے کے لیے آنے والی عورت نقاب میں آتی تھی لیکن ایک دن اتفاق سے اس کے چہرے سے نقاب سرکنے کے کارن میری پتنی نے اس کی شکل دیکھ لی تھی۔ شکل اُسے یاد رہ گئی اور ایک روز وہ میرے ساتھ خریداری کے لیے باہر نکلی ہوئی تھی تو اُس نے اُس عورت کو دیکھ کر مجھے اُس کے بارے میں بتایا۔ اس وقت وہ عورت نقاب میں نہیں تھی اور بڑے ماڈرن کپڑے پہنے ایک مساج سینٹر میں جا رہی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہاں وہ کسی کام سے گئی تھی یا ملازمت کرتی ہے۔ میں نے تو اوپر والوں کے ایما سے کبھی دوبارہ اس طرف کا رخ بھی نہیں کیا۔'' آخر اُس نے ایک اہم راز اُگل ہی دیا۔

''اسے نیچے اُتار دو۔'' جاوید علی نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی جس پر پہلے ہی کی طرح سرعت سے عمل کیا گیا۔

''عورت کا حلیہ بتاؤ۔'' رائے چند کو دوبارہ اسٹریچر پر لٹایا گیا تو وہ اس کے مقابل کھڑا ہوتا نرمی سے پوچھنے لگا۔

اس بار اُس نے بغیر کسی مزاحمت کے عورت کا حلیہ تفصیل سے بتا دیا۔

''اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دو۔'' حلیہ معلوم کرنے کے بعد اس نے مزید وہاں رُکنا بیکار سمجھا اور ہدایت کرتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

''مجھے گولی مار دو پلیز!'' پیچھے سے رائے چند نے اس سے درخواست کی۔ یقیناً وہ اذیتوں سے تنگ آ چکا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہاں سے زندہ رہائی ممکن نہیں اس لیے درد بھرے لہجے میں یہ التجا کر رہا تھا۔

''ابھی انتظار کرو۔ شاید میرے دل میں تمہارے لیے غصہ کچھ کم ہو جائے تو میں تمہیں ایسی آسان موت کا تحفہ دے سکوں۔''

اس نے مڑے بغیر سرد مہری سے جواب دیا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ اس وقت اسے رائے چند کے مستقبل کا

فیصلہ کرنے سے زیادہ اہم کام درپیش تھے اور وہ صرف انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔

⊛----✪----⊛

وہی جانا پہچانا منظر تھا۔

مزار کے احاطے میں کھچا کھچ لوگ بھرے ہوئے تھے اور بڑی عقیدت سے اپنی باری آنے پر نذرانے چڑھا رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی چودھری قیمتی پوشاک میں سب سے شاندار اور اُونچی کرسی پر براجمان تھا اور اس کے اردگرد رکھی دیگر کرسیوں پر اس کے خاص مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ عام لنگر کے علاوہ حویلی کے مہمان خانے میں خاص مہمانوں کے لیے خصوصی دعوت کا بھی اہتمام تھا۔

مریدوں کے ہاتھ جوڑنے اور قدموں سے لپٹ کر اپنی عقیدت کے اظہار کا وہ سلسلہ بھی جاری تھا جو چودھری کے گھمنڈ میں مزید اضافے کا سبب بنتا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود آج اُسے وہ تسکین حاصل نہیں ہو رہی تھی جو ہمیشہ اس موقع پر وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ اس بے چینی اور بے لذتی کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔

سب سے اہم سبب تو یہ تھا کہ اب دل سے اپنے مطلق العنان حاکم ہونے کا احساس مٹنے لگا تھا۔ وہ لاکھ خود کو بہلاتا کہ آج بھی پیر آباد اور گردونواح کے دیہاتوں پر اس کی حکمرانی ہے لیکن دل کو یہ خیال کچوکے لگاتا رہتا تھا کہ وہ خود کسی کے زیر اثر آ چکا ہے اور اپنے فیصلوں کے لیے کچھ اَن دیکھی قوتوں کا محتاج ہے۔ نشیات کے دھندے نے اسے بے تحاشا دولت سے تو ضرور نوازا تھا لیکن ساتھ ہی دوسروں کے زیر نگین ہونے کے ذلت آمیز احساس سے بھی آشنا کر دیا تھا۔

دوسرا ذلت آمیز احساس اپنی جوان بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے کا تھا۔ اگرچہ اب تک عوام کو اس معاملے کے بارے میں ڈھنگ سے کوئی خبر نہیں تھی اور مختلف بہانے بنا کر کشور کے غیاب پر پردے ڈالے جاتے رہے تھے لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات تو ضرور موجود ہوں گے اور کسی کو یقین نہیں آتا ہو گا کہ چودھری نے اپنی سات پردوں میں رہنے والی بیٹی کو امریکہ کے آزاد معاشرے میں رہنے والے اس کے بھائی کے پاس بھیج رکھا ہے۔

اس کے دل کو کچوکے لگانے والا تیسرا احساس مراد شاہ کے رویے کا تھا۔ وہ خاندانی روایات سے بالکل منحرف تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کشور کے سلسلے میں بھی عدم تعاون کی راہ اختیار کی تھی۔ چودھری کا خیال تھا کہ اگر وہ ساتھ دیتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کشور اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

مراد شاہ کے باغی پن کا یہ عالم تھا کہ چودھری نے اس کی تمام تر کوتاہیوں کو نظرانداز کر کے ازخود اسے فون کیا اور عرس کے موقع پر پاکستان آنے کی ہدایت کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ چودھری لاکھ اسے سمجھاتا رہا کہ وہ مستقبل کا گدی نشین ہے اور اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ خاص مواقع پر یہاں موجود رہ کر تربیت حاصل کرے لیکن وہ نہیں مانا اور صاف کہہ دیا کہ اُسے ایسی جھوٹی عزت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک بھی کہہ ڈالا کہ اگر دادا جی سچ مچ روحانی صلاحیتیں رکھنے والے کوئی نیک بزرگ ہوتے تو وہ ان کے عرس کے موقع پر آنے کا سوچ بھی سکتا تھا لیکن یہ جاننے کی صورت میں کہ دادا جی آخری عمر تک بے راہ روی میں مبتلا رہے اور عیش ونشاط کی محفلیں سجاتے رہے، وہ ہرگز بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس پروگرم میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ اُس کی ایسی صاف گوئی پر چودھری بڑا تلملایا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ بیٹا جوان اور خود مختار تھا۔ اور اس کی دولت کی پروا کیے بغیر امریکہ میں اچھی خاصی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے عاق کرنے کی دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر کب سے دانت نکالے بیٹھے اس کے داماد سب ہڑپ کرنے بیٹھ جاتے اور وہ بیٹے سے بھلے کتنا ہی ناراض ہوتا، کسی اور کو اس کی جگہ لیتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی گستاخی کے باوجود خاموش رہنے پر مجبور تھا۔

بظاہر حاکم ہوتے ہوئے مختلف معاملات میں اپنی بے بسی کے احساس نے اُسے بے کیفی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بے کیفی کے اس عالم میں اس نے مزار پر چادر چڑھانے کے ساتھ ساتھ دیگر رائج رسومات کی ادائیگی کی اور اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ حویلی پہنچ گیا۔

ان مہمانوں میں نیا اے سی عمیر آفندی بھی شامل تھا جس کی وہاں خوب آؤ بھگت کی جا رہی تھی اور وہ بظاہر اپنی اس پذیرائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کھانے کے بعد منشی نے کوشش کی کہ عمیر کو شب بسری کے لیے روک سکے لیکن وہ نجی مصروفیت کا بہانہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہمان البتہ آج رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے اور حسبِ روایت ان کے لیے شراب و شباب کے ساتھ شب بسری کا انتظام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے مختلف علاقوں سے چن چن کر پیشہ ور عورتوں کو جمع کیا گیا تھا ان عورتوں میں سے ایک چودھری کا بھی گرمانے بھی رات گئے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دی گئی۔

شوخ میک اَپ، زرتار لباس اور زیورات سے لدی پھندی وہ عورت بالکل مختلف تھی پھر بھی جانے کیوں عین عرس والی رات اُسے اپنی خواب گاہ میں دیکھ کر اُسے ماہ بانو یاد آ گئی۔ سیاہ چادر کے ہالے میں میک اپ سے مبرّا، تھکن کا احساس لیے ماہ بانو کے معصوم سے چہرے اور اس پیشہ ور عورت کے مکار مسکراہٹ والے چہرے میں کوئی قدر مشترک نہ ہونے کے باوجود اسے ماہ بانو یاد آئی تو احساسِ شکست بھی جاگ اُٹھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ماہ بانو کی اپنی زندگی میں آمد کے اس پہلے روز وہ پہلی بار شکست کے احساس سے دوچار ہوا اور اس کے بعد پے در پے اسے کئی مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یعنی ماہ بانو وہ پہلی ہستی تھی جو شگون بن کر اس کی زندگی پر چھا گئی تھی۔ اس کا خیال دل میں آیا تو پھر وہ جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو گیا۔ شراب نے پہلے ہی حواس کو معطل کر رکھا تھا۔

اس عورت کو دیکھ کر ماہ بانو کیا یاد آئی، اسی پر ماہ بانو کا گمان ہونے لگا اور دل میں اسے توڑ پھوڑ کر دینے کی خواہش اس تیزی سے اُبھری کہ خود پر قابو نہ رہا۔ اوّل اوّل تو اس عورت نے اُس کی جارحیت برداشت کیا کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ ایسے کئی گاہکوں سے نمٹ چکی تھی جو ذرا متشدد طبیعت کے مالک ہوتے تھے لیکن چودھری تو جیسے اس کا انجر پنجر ڈھیلا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ لاکھ بچاؤ کی کوشش کرتی رہی، چاہا کہ اپنی مہارت سے چودھری کے جنون کو قابو میں کر لے لیکن کامیاب نہیں ہو سکی اور آخر کار خوف زدہ ہو کر چیخنے چلّانے لگی۔

اس کی چیخ و پکار کی آوازیں کمرے سے باہر تک سنی گئیں لیکن کس کی ہمت تھی کہ چودھری کی خواب گاہ میں داخل ہوتا۔ چیخ و پکار کی یہ آوازیں اتنی بڑھیں کہ حویلی کی اوپری منزل تک بھی جا پہنچیں۔ بچے کو سلانے کی کوشش میں فریدہ ان آوازوں کو سن کر چونکی اور انہونی کے احساس سے حقیقت جاننے کے لیے نیچے آئی۔ نیچے آ کر اُسے فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ آوازیں چودھری کی خواب گاہ سے آ رہی ہیں۔

وہ چودھری کے ملازمین اور چھوٹی چودھرائن کی طرح اس سے ڈرنے اور دبنے والی نہیں تھی کہ کان لپیٹ کر خاموش کھڑی رہتی۔ وہ کسی شیرنی کی طرح غصے میں چلتی چودھری کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچی اور اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

نشے اور انتقام سے بدمست چودھری اس مداخلت پر ہوش میں آیا لیکن اس وقت تک خاصی دیر ہو چکی تھی اور زخموں سے لہولہان عورت بستر پر پڑی اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی۔

''اسے دیکھو اور فوراً کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' اُس نے غرّانے والے انداز میں اپنے پیچھے کھڑے منشی کو حکم دیا۔ اگرچہ وہ حویلی کے مکینوں میں شاید سب سے کم حیثیت اور اختیارات کی مالک تھی لیکن تھی تو بہرحال حویلی کی بہو۔ اور وہ بھی اس وقت ایسے کرّ و فر سے بات کر رہی تھی کہ اُس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فوراً ہی ایک گاڑی ڈاکٹر کو لانے کے لیے روانہ کی گئی اور عورت کو ایک چادر میں لپیٹ کر دوسرے کمرے میں منتقل کیا گیا۔ چودھری اس دوران بالکل خاموش کھڑا رہا۔

''آج تو تُو اپنے پیروں پر کھڑا ہے چودھری! لیکن اُس دن سے ڈر جب قدرت تجھ سے تیری سیاہ کاریوں کا انتقام لینے پر تُل جائے گی۔''

فریدہ نے اُسے دہکتی نظروں سے گھورتے ہوئے نفرت سے کہا اور ایک جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل کر اوپری منزل کی طرف بڑھ گئی۔ یہاں اس کا کردار ختم ہو چکا تھا اور اب یہ اس عورت کی قسمت پر منحصر تھا کہ وہ زندہ بچتی ہے یا نہیں۔

مرکزِ صحت سے ڈاکٹر داور، ڈرائیور کے ساتھ حویلی پہنچے تو زخمی طوائف آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی سی کوشش کی لیکن اس کی ٹوٹتی سانسوں کی ڈوری کو دوبارہ نہ جوڑ سکے۔

''یہ ختم ہو گئی ہے۔'' انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے منشی کو اطلاع دی اور واپسی کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے انہیں یہ سمجھنے میں قطعی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ اس عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حویلی میں جنم لینے والی ایسی داستانیں حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی دفن کر دی جاتی ہیں اور انہیں قطعی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ حویلی والوں کو اس کیس کو پولیس تک لے جانے کا مشورہ دے سکیں۔

ان کے واپس جاتے ہی باقی کے معاملات منشی نے سنبھال لئے۔ فوراً ہی حویلی کی ملازماؤں کی مدد سے عورت کو غسل دے کر اس کی لاش کو کفن میں لپیٹ دیا گیا اور صبح ہونے سے قبل ہی اُس نائیکہ کو حویلی بلا لیا گیا جس کے کوٹھے سے وہ عورت منگوائی گئی تھی۔ اپنی ایک ساتھی کی موت کی خبر سن کر وہ بری طرح بپھر گئی۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا بائی جی! ہمیں معلوم ہے تمہارا بڑا نقصان ہوا ہے اور ہم اس نقصان کی ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم قیمت بولو۔ ہم بغیر کسی اعتراض کے ادا کر دیں گے۔'' منشی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے بولنے سے روکا اور دوٹوک لہجے میں پیشکش کی۔

نائیکہ تجربہ کار تھی اور ایسے مواقع سے بھرپور فائدہ اُٹھانا جانتی تھی چنانچہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بڑے درد بھرے لہجے میں بولی۔

''انسان کا بھی کبھی کوئی مول ہوا ہے منشی جی! اور یہ تو میرے کوٹھے کا سب سے انمول ہیرا تھا جو آپ لوگوں نے برباد کر دیا۔''

''کہا ہے نا کہ اس ہیرے کی قیمت بتاؤ۔ تم جو مانگو گی، ادا کیا جائے گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منشی کو بھی ہر حال میں یہ معاملہ نمٹانا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ موجودہ حالات میں چودھری ایسے کسی اسکینڈل کو سہارنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

''صرف میری گل تو نہیں ہے نا منشی جی! اس کا ایک بھائی بھی ہے جو میرے کوٹھے پر ہی طبلہ بجاتا ہے۔ وہ بھلا کیسے اپنی بہن کی قیمت لینے پر راضی ہوگا؟'' نائیکہ نے فوراً مظلوم شکل بنالی۔

''کیسے راضی نہیں ہوگا؟ جو آدمی اپنی بہن کو ہر رات نئے آدمی کی سیج سجانے کی قیمت وصول کرسکتا ہے وہ اس کے مُردہ جسم کی قیمت کیسے وصول نہیں کرے گا؟ میں اچھی طرح جانتا ہوں ایسے خونی رشتوں کو۔ تمہارے ہاں ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر اس کا بھائی کوئی اعتراض کرے تو اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔ اس کے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ موقع کا فائدہ اُٹھا کر قیمت وصول کرلے ورنہ بعد میں رونے پیٹنے کے سوا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

منشی نے اسے عقل کی راہ دکھائی تو نائیکہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کرڈالا۔ اُس کا مطالبہ سن کر منشی کچھ کہے بغیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو منشی جی! میں نے زیادہ رقم نہیں بتائی۔ اپنا نقصان پورا کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس رقم میں سے اس کے بھائی کو بھی تو حصہ دینا پڑے گا ورنہ وہ اپنا منہ کیسے بند رکھے گا؟'' وہ بھی جانتی تھی کہ رقم بہت بڑی ہے اس لیے منشی کی خاموشی پر اپنے حق میں دلیل دینے لگی۔

''میں اور تُو دونوں ہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تُو نے جو مانگا ہے، وہ تیری اوقات سے بہت زیادہ ہے لیکن میں نے تجھے زبان دے دی ہے۔ اس لیے اطمینان رکھ کہ تیرا مطالبہ ضرور پورا ہوگا۔ اب یہاں سے اُٹھ اور لاش لے کر یہاں سے روانہ ہوجا۔''

منشی نے سخت لہجے میں اسے جواب دیا تو وہ خوشی سے اپنی باچھوں کو پھیل جانے سے بمشکل روک سکی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو رقم وصول ہونے والی ہے، وہ اتنی زیادہ ہے جو وہ طوائف ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی اسے کما کر نہیں دے سکتی تھی۔ رہا اس کے بھائی کا حصہ تو کوٹھے پر بے دام غلام بن کر کام کرنے والا وہ سولہ سترہ سالہ لڑکا بھلا اُس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ وہ سیدھا سادہ جوان تو دو وقت کی روٹی کے لیے بھی اس کا محتاج تھا۔

کچھ دیر بعد وہ لاش کے ساتھ حویلی سے خاموشی سے روانہ ہوگئی۔ زرتار لباس میں سج سنور کر چھم چھم دل جیت لینے کی خواہش سینے میں لے کر آنے والی طوائف کو کہاں علم تھا کہ جب وہ اس حویلی سے لوٹے گی تو اپنی زندگی کی بازی ہار کر سفید کفن میں لپٹی واپس جارہی ہوگی۔ اور یہ تو دنیا میں آنے والے ہر نفس کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ واپسی میں اپنے ساتھ کیا لے کر لوٹے گا۔ وہ تو بس دنیا جیت لینے کی دھن میں یہاں رائج اصولوں کی تال پر کسی طوائف کی طرح دیوانہ وار ناچتا رہتا ہے اور جب یہ رقص رُکتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں میں چبھے کانٹوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

⊛-----✪-----⊛

ممبئی ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر وہ دونوں باہر آئے تو فوراً ہی ایک ٹیکسی ان کے سامنے آرُکی۔

''شیواجی ہوٹل۔'' سلّو نے اُسے بتایا۔ ممبئی اُس کا دیکھا بھالا شہر تھا اور یہاں کے بارے میں وہ ہر معلومات رکھتا تھا۔ سفر کے دوران ہی اس نے مشورہ دیا تھا کہ اگر ممبئی پہنچ کر شیواجی ہوٹل میں قیام کیا جائے

تو بہتر رہے گا۔ اس لیے سلّو نے چھوٹتے ہی ٹیکسی والے سے اس ہوٹل کا نام لیا اور معاملات طے ہونے پر دونوں ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔

سلّو نے ابھی بیٹھنے کے بعد اپنی طرف کا دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ ایک لڑکی کھلے دروازے سے آندھی طوفان کی طرح ٹیکسی میں گھس گئی اور تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ بند کرلیا۔

''او میڈم!.....کون ہو تم؟'' اُس کی جرأت پر سلّو نے غرّا کر پوچھا۔

''مجھے اندو کہتے ہیں۔ تم لوگ شیواجی جارہے ہو تو میں نے سوچا تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ اکیلی ہوں الگ ٹیکسی لے کر کیا کروں گی؟'' اُس کا اطمینان قابلِ دید تھا اور ایسے دوستانہ لہجے میں بتا رہی تھی جیسے برسوں سے برسوں کی آشنائی ہو۔

''پر ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے۔ تمہیں پھوکٹ (مفت) کی ٹیکسی چاہیے تو کوئی اور بندہ تلاش کرلو۔'' سلّو کو طیش آگیا۔

اس دوران ٹیکسی ڈرائیور اور شہریار دونوں خاموش رہے تھے۔ ڈرائیور شاید اس لیے کہ یہ اس کا معاملہ نہیں تھا اور شہریار اس لیے کہ وہ خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی متناسب جسامت کی مالک تھی اور اس نے چست جینز پر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے شانوں تک آتے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک کے علاوہ اس نے کسی قسم کا سنگھار نہیں کر رکھا تھا۔ البتہ اپنے بے نقوش کی وجہ سے وہ اس عالم میں اچھی لگ رہی تھی لیکن پھر بھی اس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ مردوں کو لبھانے کے لیے گھر سے نکلنے والی کوئی پیشہ ور عورت نہیں تھی۔ اپنے بے باکانہ رویے کے باوجود وہ کچھ مختلف اور منفرد لگ رہی تھی۔

''تم تو بڑے اِل مینرڈ آدمی ہو۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے اپنے جسم کو یوں جنبش دی جیسے ٹیکسی سے اترنے لگی ہو لیکن پھر پلک جھپکتے میں اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا سا پسٹل نکال لیا۔

''چلو، اب شرافت سے چل پڑو۔'' اُس نے پسٹل سلّو کے پہلو سے لگا کر حکم دیا تو وہ کچھ اور بھی طیش میں نظر آنے لگا اور یوں محسوس ہوا کہ پسٹل کی پروا کیے بغیر اندو نامی اس لڑکی پر پل پڑے گا۔ اُس کی اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے شہریار نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے سے باز رہنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ وہ پہلے ہی انجن اسٹارٹ کرچکا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی بڑھا دی۔

''مجھے صرف تم سے لفٹ چاہیے تھی۔ اگر تم ویسے ہی مان جاتے تو مجھے یہ نہیں نکالنا پڑتا۔'' ٹیکسی ممبئی کی سڑکوں پر دوڑنے لگی تو اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں وضاحتی جملہ ادا کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہیں لفٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کرائے کا پرابلم تو ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو مان نہیں سکتا کہ اتنا مہنگا پسٹل رکھنے والی کا پرس خالی ہوگا۔'' سلّو نے بھی اس دوران اپنے آپ کو کسی حد تک پُرسکون کرلیا تھا چنانچہ اپنے تجسس کو زبان دی۔

''لگتا ہے اسلحے کے بارے میں خاصی جانکاری رکھتے ہو۔ کس گروپ کے بندے ہو؟'' اس کے سوال میں سے اپنے مطلب کا نکتہ چن کر اس نے اُلٹا سلّو پر سوال داغا۔

اس سوال سے اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی خطرناک ہے اور اس سے زیادہ بات چیت کرنا مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے اس لیے بنا جواب دیئے چہرہ دوسری طرف موڑ کر اردگرد سے گزرتے ٹریفک کا جائزہ لینے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کی اس ادا پر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی ضرور لیکن پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شیوا جی ہوٹل پہنچ کر ان کا سفر ختم ہوگیا۔

ٹیکسی رُکنے پر اس نے اُترنے سے پہلے اپنا پرس کھول کر اس میں سے چند نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف اُچھالے اور پھر اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے سلّو سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے پیسوں کا کوئی پرابلم نہیں ہے پھر بھی تھینکس فار دی لفٹ۔'' وہ جیسے آندھی کی طرح ان کی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی، ویسے ہی اپنی بات کہہ کر آناً فاناً ٹیکسی سے اُتری اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''لڑکی تھی یا کوئی چھلاوا؟'' ٹیکسی ڈرائیور بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ان دونوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے شانے اُچکا کر خود بھی ٹیکسی سے اُتر گئے۔

اس وقت وہ دونوں ہی نفاست سے سلے قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں سفری بیگ کے بجائے اچھی کوالٹی کے بریف کیس تھام رکھے تھے۔ حلیے میں یہ تبدیلی انہوں نے سفر کے دوران کی تھی۔ اب کوئی اُنہیں دیکھتا تو یہی اندازہ لگاتا کہ وہ معزز کاروباری افراد ہیں۔

ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی خوش اخلاقی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی مرضی کے مطابق انہیں دو سنگل بیڈ والے کمرے فراہم کر دیئے۔

کمروں کے حصول کے لیے اُنہیں کوئی دشواری اس لیے بھی پیش نہیں آئی کہ اب ان کے پاس شناختی کاغذات موجود تھے جن کی موجودگی میں ہوٹل کی انتظامیہ کو انہیں کمرے فراہم کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔

کمرے مل جانے پر انہوں نے سب سے پہلے فریش ہو کر کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ انہیں کہاں سے باقاعدہ کام کا آغاز کرنا ہے، اس سلسلے میں کافی معلومات دہلی میں ہی حاصل ہوگئی تھیں۔

ڈاکٹر فرحان جمیل کی تلاش کا آغاز انہوں نے اس انسپکٹر سے کرنے کا فیصلہ کیا جس نے ان پر الزام لگنے کے بعد انہیں گرفتار کیا تھا اور بعد میں کیس کا رخ موڑ کر انہیں پاکستانی جاسوس قرار دے دیا تھا۔ انہیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق وہ انسپکٹر اب نہ صرف ترقی پا چکا تھا بلکہ ایک چھوٹے علاقے سے ممبئی جیسے شہر ٹرانسفر کیا جا چکا تھا۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ معنی خیز تھیں۔ فرحان جمیل کے کیس پر کام کرنے کے بعد اُس انسپکٹر پریم ناتھ کی جیبیں بھی نوٹوں سے بھر گئی تھیں تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں تو انعام کچھ زیادہ ہی ملا تھا۔ ایک طرف ترقی ہوئی تھی تو دوسری طرف وہ ممبئی جیسے شہر پہنچ گیا تھا جہاں یقیناً دن دُگنی رات چوگنی کمائی کھا رہا تھا۔

غسل سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھالیا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ ابھی ان کے پاس خاصا وقت تھا اس لیے ہر کام اطمینان سے کر رہے تھے۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق پریم ناتھ عموماً رات گیارہ بجے کے بعد اپنے گھر سے نکل کر روزانہ ایک نائٹ کلب جایا کرتا تھا۔ یہ ایسا وقت ہوتا تھا جب اس کے ساتھ ایک سپاہی کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ انہیں یہ معلومات ممبئی میں مقیم اپنے ایک آدمی سے حاصل ہوئی تھیں۔ دہلی کی طرح یہاں وہ شخص ان کی مدد کے لیے موجود تھا۔ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر انہیں مطلوبہ اسلحہ اور محفوظ ٹھکانہ فراہم کرے۔

اپنے طور پر وہ کافی عرصے سے پریم ناتھ کی نگرانی بھی کر رہا تھا لیکن اُسے براہِ راست چھیڑنے کا مجاز نہیں تھا۔ اسے ممبئی میں رہ کر ایک عرصے تک اپنی مخصوص خدمات انجام دینی تھیں اس لیے اس کے نظروں میں آنے کا خطرہ نہیں مول لیا جا سکتا تھا۔ ان کی پشت پر رہ کر وہ ان کی جتنی مدد کر سکتا تھا، کرتا لیکن اصل ایکشن انہیں ہی لینا تھا۔

کھانے کے دوران وہ اپنا لائحہ عمل طے کر چکے تھے۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد اُنہیں کہیں سے ایک گاڑی اور موٹر بائیک چرانی تھی۔ ان چوری شدہ سواریوں میں ہی وہ پریم ناتھ کے اغوا کی مہم پر نکلتے اور اسے لے کر اس ٹھکانے پر پہنچ جاتے جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے حاصل کیا جا چکا تھا۔ اپنے طور پر ان کی منصوبہ بندی مکمل تھی اور وہ اس مہم پر بس نکلنے ہی والے تھے کہ وہ ہوگیا جس کی اُنہیں قطعی توقع نہیں تھی۔

کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک کے ساتھ روم سروس کے الفاظ سن کر دروازہ کھولنے کے لیے جانے والا سلّو گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں بیرے کے بجائے چند مسلح افراد سے سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے تو پورے اطمینان سے بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے صرف اس لیے دروازہ کھول دیا تھا کہ چند لمحے قبل خود اس نے انٹرکام پر روم سروس سے رابطہ کر کے برتن لے جانے کو کہا تھا۔ لیکن اب تین مسلح افراد اسے دھکیلتے ہوئے کمرے کے اندر گھسے چلے آئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟' دونوں ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا شہریار بھی اس افتاد پر بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ تمہیں ہمارے ساتھ چلنے پر معلوم ہوگا۔'' ان میں سے ایک نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟.....ہم تمہارے ساتھ کیوں جائیں گے؟.....آخر ہمارا قصور کیا ہے؟'' بحث میں اُلجھا کر شہریار ایک طرف تو ان کا جائزہ لے رہا تھا اور دوسری طرف اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر کس زاویے سے ان پر حملہ کر کے اپنا بچاؤ کیا جا سکتا ہے۔

اپنے حلیوں اور بول چال سے وہ کوئی سرکاری آدمی نہیں لگتے تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی گینگ سے متعلق ہیں۔ گینگ کا خیال آنے پر فطری طور پر اس کا ذہن نادر دادا کی طرف چلا گیا۔

دہلی میں عائشہ نامی جس ویٹریس کو بچانے کے لیے وہ نادر دادا کے غنڈوں سے جھگڑ بیٹھے تھے، اُس نے انہیں یہی بتایا تھا کہ دو اجنبیوں کے ہاتھوں اپنے گُرگوں کی وہ شکست اس کے لیے سخت بے عزتی کا باعث بنی ہوگی اور وہ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان سے انتقام لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ غیر ضروری مسئلوں میں نہیں اُلجھنا چاہتے تھے اس لیے نادر دادا کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے فوری طور پر دہلی سے فرار ہو کر ممبئی پہنچ گئے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر ابھی اُنہیں یہاں پہنچے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ انہیں گھیر لیا گیا تھا۔

ان تینوں مسلح افراد کی مشاقی اُن کے کھڑے ہونے کے انداز، اسلحے پر گرفت اور نظروں کی تیزی سے بخوبی ظاہر ہو رہی تھی۔ انہوں نے اتنی مہارت سے ان دونوں کو کور کیا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سی حرکت کرتا تو نظر میں آئے بنا نہ رہ پاتا۔

''تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب بھائی جی کے سامنے پہنچ کر ملیں گے۔ ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ تمہیں یہاں سے اُن تک پہنچا دیا جائے۔ اب یہ تم پر ہے کہ سیدھے طریقے سے چلتے ہو یا ہم تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہیں اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لے جائیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی شخص نے اسے جواب دیا جواب تک گفتگو کر رہا تھا۔ شہریار نے ایک نظر سلّو کی طرف دیکھا۔ وہ ا
انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

اسے سلّو کی مہارت پر کوئی شبہ نہیں تھا اور جانتا تھا کہ بے شک اس وقت وہ بری طرح گھرے ہو
ہیں اور ان کا اسلحہ بھی بریف کیس میں بند ہے، اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ وہ دونوں مل کر ان تینوں کو ا
کر لیں۔ لیکن ابھی صورتِ حال مکمل طور پر ان پر واضح نہیں تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کمرے میں موجود
تین مسلح افراد کے علاوہ ان کے کتنے ساتھی ہیں جو باہر مدد کے لیے موجود ہیں۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ
اس وقت ایک اچھے ہوٹل کے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے کمروں میں پہنچنے والے مسلح افراد اتنی طاقت
رسائی والے تو ہو سکتے تھے کہ ان کے یوں دندناتے ہوئے ہوٹل میں گھس آنے اور دو مہمانوں کو بزور اسلحہ
کر کے لے جانے پر ہوٹل کی انتظامیہ خاموش رہتی۔ لیکن یہ کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان غنڈوں کو ا
کر کے ہوٹل سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے تو انتظامیہ پولیس کو آگاہ نہیں کرتی اور وہ پولیس کی نظروں
کسی صورت نہیں آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس نے سلّو کو ٹھنڈا رہنے اور کچھ نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ
کر وہ ریلیکس ہو گیا اور یوں شانے اچکائے جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو کہ یہاں سے نکال
کس جگہ لے جایا جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے سے
تمہیں اس بات کا احساس ہو گا کہ تم غلط آدمیوں کو لے گئے ہو۔''

اس نے اپنے ساتھ کھڑے مسلح افراد کو اپنے بنا مزاحمت کے ساتھ چلنے کا عندیہ دیا تو انہیں آگے
کا حکم دیا گیا۔ حکم دینے والوں نے ان کے ہاتھ اوپر نہیں اُٹھوائے تھے اور نہ ہی باندھنے وغیرہ کی کوشش کی
جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنے اوپر بھرپور اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ان کے سامنے کسی کی اتنی مجال
ہو سکتی کہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر سکے۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے تو شہریار کو اپنے فیصلے کی درستگی کا اندازہ ہوا کمرے سے نکلتے ہی
کوریڈور میں چوکس کھڑا ایک مسلح فرد نظر آ گیا۔ دو کو انہوں نے لفٹ سے نیچے جانے کے بعد ہال میں دیکھا
وہاں ہوٹل کا عملہ اور کچھ گاہک بھی موجود تھے اور خاصے سراسیمہ نظر آتے تھے۔

وہ باہر نکلے تو ایک تاریک شیشوں والی گاڑی اور دو تین موٹر سائیکلیں ان کی منتظر تھیں۔ انہیں گاڑی
سوار کروا کر دو افراد ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ تیسرا ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو
گاڑی میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا اور گاڑی اسٹارٹ بھی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے اسے
سے آگے بڑھا دیا۔ پیچھے موٹر سائیکلیں بھی غراتی ہوئی آگے بڑھیں۔

یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی۔ وہ جس گاڑی میں سوار تھے، اس میں جدید اسلحے سے لیس تین
بالکل چوکس بیٹھے تھے۔ چوتھا فرد ڈرائیور تھا اور یقینی طور پر وہ بھی مسلح تھا۔ وہ کسی طور گاڑی میں موجود ان
پر قابو پا بھی لیتے تو ان موٹر سائیکل سواروں کا کیا کرتے جو گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اگر
گاڑی میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت محسوس کرتے تو ان کی گنوں کے دہانے شعلے اُگلنے لگتے۔ وہ یہ جانے
کس جرم کی پاداش میں پکڑے گئے تھے، اپنی جان سے چلے جاتے۔ ایسی موت مرنے سے یہی بہتر تھا کہ
کچھ انتظار کر لیتے کہ شاید تقدیر کوئی بہتر موقع عنایت کر دے۔ ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے
موجود ہتھیار ان بریف کیسوں میں بند تھے جو اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص کے قدموں میں پڑے تھے۔ انہیں

کمرے سے نکال کر لاتے ہوئے انہوں نے ان کے بریف کیس بھی ساتھ لے لیے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا
ہوٹل میں الگ الگ کمرے لینے کے باوجود وہ دونوں نہ صرف کھانے کی غرض سے ایک کمرے میں جمع
بلکہ انہوں نے اپنے بریف کیس بھی ساتھ رکھے تھے۔ بریف کیس مخصوص نمبروں سے کھلنے والے تھے اس
لازمی طور پر تو یہ خدشہ نہیں تھا کہ انہیں کھول لیے جانے کی صورت میں ان کی ذات کچھ اور مشکوک ٹھہرے
لیکن فی الحال وہ خود بھی استفادہ حاصل کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

موٹر سائیکلوں کی جلو میں گاڑی انہیں لیے نہ جانے کس سمت دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کچھ فاصلہ اور طے
تو اگلی سیٹ پر تن کے بیٹھے شخص نے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں فیکے! کیا پوزیشن ہے؟..... کوئی نظر تو نہیں آیا؟''

''ٹھیک ہے..... مجھے بھی کوئی دکھائی نہیں پڑا۔ تم لوگ نکلو ادھر سے۔ اپن انہیں بھائی جی کے پاس لے
پہنچتے ہیں۔''

اس نے یہ جملے کس سے کہے ہیں، انہیں اس کا اندازہ کچھ دیر میں اس وقت ہو گیا جب گاڑی کے پیچھے
ہوئے موٹر سائیکل سواروں کو ایک ایک کر کے غائب ہوتے دیکھا۔

''تم لوگ آخر ہمیں کیوں اور کس بھائی جی کے پاس لے جا رہے ہو؟..... ہم سیدھے سادے کاروباری
ہیں۔ ہمارا کسی جھگڑے پھڈے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہوتے ہی کچھ آس بندھی تو شہریار نے موقع کی تلاش میں گفتگو کا آغاز
کیا۔ اتنی دیر میں وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ انہیں یوں ہوٹل کے کمرے سے اُٹھوا لینے میں انڈر ورلڈ کے کسی بندے
کا ہاتھ ہے۔ لیکن ظاہر ہے وہ ایسے کسی جھگڑے میں پھنسنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے اس کی کوشش تھی
کسی طرح ان لوگوں سے یہیں جان چھڑا لے۔ انہیں باتوں میں لگانے کی صورت میں ایسا کوئی موقع مل
تا تھا جب اسے اور سلّو کو ایکشن میں آنے کا موقع مل جاتا۔ موٹر سائیکل سواروں کے غائب ہونے کے بعد
امید سی بندھ گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح گاڑی میں موجود لوگوں سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے تو یہاں سے
رہو جائیں گے۔

''بولا تھا نا کہ بھائی جی کے سامنے پہنچ کر سب پتہ چل جائے گا۔ پھر کیوں میرے کان کھا رہا ہے؟''
سیٹ پر سوار شخص نے اجڈ پن سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''دیکھو اگر تم پیسے وغیرہ کے چکر میں ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے ہو تو سمجھ لو کہ ہم کوئی بہت بڑے
مین نہیں ہیں۔ بس چھوٹا سا بیوپار ہے۔ تم نے ہمارے گھر والوں سے تاوان مانگا بھی تو وہ دو چار لاکھ
زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکیں گے۔''

اس شخص کے لہجے کی پروا کیے بغیر شہریار نے اس سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا جس پر وہ کچھ طیش میں آ
اور پلٹ کر غصے سے بولا۔

''سالے! تجھے بولا ہے نا چپ رہ۔ پھر کیوں بک بک کیے جا رہا ہے؟''

''بڑے بھائی سے گالی دے کر بات مت کرو۔ ورنہ میں تمہاری ان گنوں کی پروا کیے بغیر تمہارا گلا دبا
گا۔'' سلّو کا ذہن بہت تیز تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ شہریار کیا چاہ رہا ہے اس لیے اس کا ساتھ دینے پر
ربستہ ہو گیا اور ایسی بات کی کہ اس شخص کے اشتعال میں مزید اضافہ ہو جائے۔ یہ تو اب تک طے ہو چکا تھا
وہ لوگ انہیں کسی بھائی جی تک زندہ لے جانے کے پابند ہیں اس لیے مشتعل ہونے کی صورت میں بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ سے زیادہ انہیں زخمی یا بے ہوش کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن جان سے نہیں مارا جاتا.....اور جب ان کے پاس اپنی جان کی سلامتی کی ضمانت تھی تو تھوڑا رِسک لینے میں کیا حرج تھا؟

''گلا دبائے گا.....میرا گلا دبائے گا؟.....میں تیرے ہاتھ توڑ کر ہڈیوں کے اتنے ٹکڑے کر دوں گا کہ تیرے اس بھائی سے گنے بھی نہیں جائیں گے۔'' حسبِ توقع وہ سخت مشتعل ہو گیا اور پیچھے مڑ کر سلّو پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

ان دونوں کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے اس کے آدمیوں کو بھی سلّو کی جسارت یقیناً گراں گزری تھی اس لیے ان کے چہروں کے عضلات بھی تن گئے تھے اور توجہ پوری طرح ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ایسے میں جب ان کی چلتی گاڑی کے عین سامنے کچھ فاصلے پر دھماکا ہوا تو کوئی بھی خود کو سنبھال نہیں سکا اور سڑک پر روانی سے دوڑتی ہوئی گاڑی بری طرح لہرا گئی۔

دھماکے کی نوعیت کیا تھی اور کس نے اور کیوں یہ دھماکا کیا تھا، سلّو اور شہریار کے پاس ان سوالوں میں اُلجھنے کی فرصت نہیں تھی انہیں ایک موقع ملا تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کر سکتے تھے۔ آگے والا تو پہلے ہی اس وجہ سے مشکل میں پھنس گیا تھا کہ سلّو پر مڑ کر حملہ کرنے کی کوشش میں اس کا زاویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ دھماکے کی وجہ سے گاڑی کا توازن بگڑا تو اسے زوردار جھٹکا لگا اور اس کا سر دروازے سے جا ٹکرایا۔ ڈرائیور لہراتی گاڑی کو سنبھالنے کی فکر میں ہلکان تھا اس لیے انہیں بس ان دو سے ہی نمٹنا تھا جو ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ اگرچہ گاڑی کو جھٹکا لگنے سے وہ دونوں خود بھی کسی قدر متاثر ہوئے تھے لیکن درمیان میں پھنس کر بیٹھے ہونے کی وجہ سے ان کا توازن زیادہ نہیں بگڑا تھا چنانچہ وہ خود کو سنبھال کر اپنی اپنی طرف موجود بندوں سے بھڑ گئے تھے۔

اس موقع پر انہیں ایک بار پھر غیبی مدد ملی اور گاڑی جس پر ڈرائیور کسی حد تک قابو پا چکا تھا، ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دوبارہ ڈگمگائی۔ اس کے ساتھ ہی فوراً ہی ایک اور دھماکا سنائی دیا اور گاڑی رک گئی۔ ان کے کان مؤخر الذکر دونوں دھماکوں کی نوعیت کو شناخت کر سکتے تھے۔ یہ گاڑی کے ٹائروں کے پھٹنے کے نتیجے میں گونجنے والے دھماکے تھے جن کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کہیں سے چلائی جانے والی گولیوں کی زد میں آ کر پھٹے ہیں۔

گاڑی رکتے ہی ڈرائیور اور اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر موجود شخص نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی۔ چھلانگ لگاتے ہوئے ان کی کوشش تھی کہ خود کو دروازے کی اوٹ میں رکھیں۔ لیکن ان کی قسمت خراب تھی کہ ان کی توقع کے خلاف پیچھے سے دو برسٹ چلے اور ان دونوں کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ اصل میں اب تک ہونے والی کارروائی کے نتیجے میں انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ حملہ آور سامنے کے رخ پر موجود ہیں لیکن وہ پیچھے بھی موجود تھے اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر بڑی آسانی سے لقمۂ اجل بنا دیا تھا۔ ادھر پیچھے والے افراد پر سلّو اور شہریار آفت بن کر ٹوٹے ہوئے تھے۔

سلّو نے اپنے مقابل کے چہرے پر تابڑ توڑ مکے برسا کر اُس کی ناک کی ہڈی توڑنے کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک آنکھ بھی مضروب نظر آ رہی تھی۔ جواب میں اس نے بھی ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی تھی اور پہلے گھونسے کے بعد ہی سلّو کے شانے پر اپنی گن سے ایک زوردار ضرب لگائی تھی لیکن اس کے بعد اسے کوئی موقع نہیں ملا۔ سلّو نے نہ صرف اسے گن سے محروم کر دیا تھا بلکہ اتنی ٹھکائی بھی لگا دی تھی کہ اگر اسے باہر گولیوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ خود اسے چھوڑ کر گاڑی سے نکل بھاگتا۔ بہرحال

اس کی تو مقابلے پر ڈٹے رہنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ کسی نہ کسی طرح اپنے ہاتھ چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس مقابلے میں شہریار اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ اس کے حصے میں آنے والے آدمی کی گن جھٹکے کی وجہ سے پہلے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور وہ بلا خوف و خطر اس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ البتہ اس کا دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سخت جان تھا۔ شہریار نے موقع ملنے پر اس کے آگے کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر مارا تو ضرب کی شدت کی وجہ سے اس کا سر پیچھے سے کھل گیا لیکن وہ مقابلے پر ڈٹا رہا اور اپنی انگلیوں سے اس طرح شہریار کا گلا جکڑ لیا کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

مقابل کے اس داؤ سے خود کو نکالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے بال جکڑ کر اس کا سر دروازے پر مارنے کی کوشش کی لیکن پہلے کی طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ ادھر وہ تھا کہ اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا جس کی وجہ سے شہریار کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔

اس سے قبل کہ اس کے حواس جواب دے جاتے، اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے مقابل کے سر پر اس مقام پر دونوں ہاتھوں سے ضربیں لگانی شروع کر دیں جہاں سے اس کا سر چوٹ کھا کر پھٹ گیا۔ زخمی جگہ پر لگائی جانے والی ان ضربوں پر وہ بلبلا اٹھا اور شہریار کے گلے پر اس کی گرفت قدرے کمزور پڑ گئی۔ اگر اس وقت وہ لوگ گاڑی کی محدود فضا کے بجائے کسی کھلی جگہ پر ہوتے تو ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیروں سے کام لینے کا بھی موقع مل جاتا لیکن فی الحال تو ہر ایک ہی کھل کر لڑنے سے قاصر تھا۔

''تم چاروں گاڑی سے باہر نکل آؤ اور یاد رکھنا کہ اگر کسی نے بھی اُلٹی سیدھی حرکت کی تو سیدھا اوپر پہنچا دیا جائے گا۔''

اس سے قبل کہ اندر جاری کشمکش کسی فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہوتی، دائیں بائیں سے دروازے کھولے گئے اور دو گن بردار اُن کے سروں پر آ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر سلّو کی عجیب مضحکہ خیز حالت ہو گئی۔ عین اس وقت جب دروازہ کھولا گیا، سلّو نے اسے ایک اور زوردار مُکا رسید کر دیا۔ مُکا کھا کر وہ پیچھے کی طرف اُلٹا اور دروازہ کھلنے کے نتیجے میں اس کا آدھا جسم گاڑی سے باہر لٹک گیا جبکہ ٹانگیں اندر ہی پھنسی رہیں۔ سلّو نے اُترنے کا راستہ بنانے کے لیے اسے ٹانگ سے ضرب لگاتے ہوئے نیچے دھکیلا اور پھر خود بھی اُتر گیا۔ اس دوران شہریار اور اس کا مقابل بھی دوسری طرف سے اُتر چکے تھے۔

سلّو اور شہریار کو معلوم نہیں تھا کہ اچانک حملہ کر کے مداخلت کرنے والے لوگ کون تھے؟ اور وہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آتے؟ فی الحال تو ان کی ہدایت پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں تھا چنانچہ انہوں نے فوری عمل کیا اور باہر نکلنے کے بعد جب اُنہیں اردگرد کا جائزہ لینے کی فرصت ملی تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہ کسی بارونق سڑک کے بجائے کسی رہائشی کالونی کی ذیلی سڑک پر ہیں۔ اس سڑک پر سے ظاہر ہے وہاں رہنے والوں کے علاوہ مشکل سے ہی کوئی گزرتا ہوگا اس لیے سڑک سنسان پڑی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اگر ان کی گاڑی کے آگے بھی کوئی گاڑی موجود ہو تو ہنگامہ شروع ہونے کی صورت میں اس کا ڈرائیور وہیں سے اسے بھگا لے گیا ہو۔ کیونکہ پاکستان ہو یا انڈیا، دونوں جگہ یہ رویّہ تو عام تھا کہ لوگ کسی جھگڑے میں اُلجھنے یا اس کے گواہ بننے کے مقابلے میں موقع سے غائب ہو جانا سب سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اور اس کی وجہ مشترک تھی۔ عام آدمی کے ساتھ پولیس کا ناروا سلوک.....دونوں ہی ممالک میں مجرموں سے زیادہ بے قصور کو ستانے اور پھنسانے کا کام تھا اس لیے عام آدمی پولیس کے معاملے میں ملوث نہ ہونے ہی کو سب سے بہتر سمجھتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم دونوں اس گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ نیچے اُترے تو انہیں گھیرنے والوں میں سے ایک نے سلو اور شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں ذرا فاصلے پر کھڑی ایک بڑی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس حکم کی تعمیل کروانے کے لیے ایک مسلح شخص ان کے سر پر سوار ہو گیا چنانچہ انہیں قدم اٹھانے پڑے۔ وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ فائرنگ کی زوردار آواز کے ساتھ انسانی چیخیں سنائی دیں۔ انہیں یہ سمجھنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ بچ جانے والے باقی دو افراد کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔

''جلدی چلو، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔'' ان پر گن تانے پیچھے آتے شخص نے غراتی آواز میں حکم دیا تو انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ معلوم نہیں یہ نئے حملہ آور کون تھے؟ وہ تو ابھی یہی نہیں سمجھ پائے تھے کہ بھائی جی کہلانے والے شخص کے غنڈوں نے انہیں ہوٹل سے کیوں اُٹھایا ہے کہ یہ نئی پارٹی میدان میں کود پڑی اور اب شاید وہ ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں جا رہے تھے۔

''ہری اپ، اندر آ جاؤ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' اگرچہ وہ گن پوائنٹ پر گاڑی کی طرف بڑھنے پر مجبور تھے لیکن ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ موقع ملتے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیال پر عمل پیرا ہونے کی نوبت آنے سے پہلے ہی گاڑی میں سے ایک نسوانی چہرے نے جھانک کر انہیں پکارا تو وہ نہ صرف حیران ہوئے بلکہ کچھ بھی کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور اندر بیٹھ گئے۔

''چلو، اس سے پہلے کہ بھائی جی کے آدمی یہاں پہنچیں، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' ان کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور اسی لڑکی نے تیز لہجے میں کہا جو اُن کے شرافت سے گاڑی میں بیٹھنے کا سبب بنی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ممبئی ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زبردستی ان کی ٹیکسی میں سوار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا نام اندو بتایا تھا اور وہ اب بھی انہی کپڑوں میں ملبوس تھی جن میں انہوں نے اسے چند گھنٹے قبل پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اندو نامی اس لڑکی کے الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ پہلے سے اسٹارٹ گاڑی چل پڑی۔ انہوں نے کھڑکی کے شیشے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود دیگر اسلحہ بردار افراد بھی تیزی سے بھاگ کر ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ وہ دوسری گاڑی بھی چند سیکنڈز میں ان کی گاڑی کے پیچھے فراٹے بھرتی ہوئی آنے لگی۔

''وہاں اس گاڑی میں ہمارے بریف کیس بھی تھے۔'' شہریار کو اندو کا انداز کچھ دوستانہ لگا تھا اس لیے اُس کے سامنے اپنے بریف کیسوں کے لیے دُہائی دی۔

''فکر نہ کرو۔ میرے ساتھی بہت ہوشیار ہیں۔ وہ کام کی کوئی بھی چیز چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ تمہارے بریف کیس تمہیں واپس مل جائیں گے۔''

اندو نے اسے تسلی دی تو وہ خاموش ہو گیا۔ زیادہ بات کرنے کی گنجائش اس لیے نہیں تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اندو سمیت گاڑی میں موجود ہر فرد کے چہرے اور جسم تنے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت سے ایسا لگتا تھا کہ راہِ فرار اختیار کرنے کے باوجود انہیں یہ خطرہ ہو کہ کسی طرف سے حملہ ہو جائے گا۔ چند لمحوں بعد فضا میں فائرنگ کی آوازیں گونجیں تو گویا ان کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

''وہ باسٹرڈ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔'' اندو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری پیچھے کی طرف مڑ گئی اور وہاں کا منظر دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔

''ڈونٹ وری۔ پچھلی گاڑی میں روی اور شنکر موجود ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک ان کی گاڑی کو اپنے پیچھے

لگا نہیں دیں گے۔'' اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اسے تسلی دی۔ اور یہ تسلی اس وقت بالکل درست ثابت ہوئی جب پے در پے ہوتی فائرنگ کے دھماکے کے درمیان انہوں نے ایک ذرا مختلف دھماکا سنا اور ساتھ ہی اندو پُرمسرت انداز میں چیخی۔

''وہ مارا۔ اُن کی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا ہے اور وہ سڑک چھوڑ کر کچے میں اُتر گئی ہے۔''

''بس تو سمجھو اب ہم بنا کسی کٹھنائی کے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ تم ریلیکس ہو کر بیٹھ جاؤ۔'' اگلی سیٹ والے نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔ اس بار وہ واقعی ریلیکس ہو گئی اور سیدھی ہو کر بیٹھنے کے بعد ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''خوش ہو جاؤ، تم دونوں کی چمڑی اُدھڑنے سے بچ گئی۔''

''تھینکس فار یور ہیلپ۔ لیکن ہمیں یہ سارا چکر سمجھ نہیں آیا۔ یہ کون لوگ تھے جو اس طرح ہمیں ہوٹل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے؟'' موقع ملتے ہی شہریار نے اپنی اُلجھن دور کرنے کی کوشش کی۔

''انہوں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اندو نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''کسی بھائی جی کا ذکر کر رہے تھے، اس کے علاوہ کوئی بات نہیں بتائی۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''اور تم نہیں جانتے کہ یہ بھائی جی کون ہے؟'' اس نے بغور ان دونوں کے چہروں کو دیکھا۔

''نہیں۔'' اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

''کیا پہلی بار ممبئی آئے ہو؟'' وہ مستفسر ہوئی۔

''ہاں، پہلی بار یہاں کی ایک پارٹی سے بزنس کا موقع ملا ہے۔ اسی پارٹی سے میٹنگ کے لیے آئے تھے اور یہاں آتے ہی عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پہلے تم اسٹیشن پر ٹکرا گئیں، پھر وہ بھائی جی والے جان کو آ گئے۔ اور اب پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

شہریار نے کسی ایسے سیدھے سادے کاروباری شخص کے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا جو اس ساری صورتِ حال سے بہت زیادہ گھبرا گیا ہو۔ سلو بھی اگرچہ خاموش تھا لیکن اپنے چہرے کے پریشان تاثرات سے اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

''یہ ممبئی ہے ڈیئر! یہاں آدمی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہاں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کر لینی چاہیے۔ بائی داوے، تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو اور کیا کاروبار کرتے ہو؟'' اندو مسکرا کر تبصرہ کیا اور ساتھ ہی دو نئے سوالات بھی داغ دیئے۔ وہ خاصی پُرکشش لڑکی تھی اور مسکراتے ہوئے اور بھی اچھی لگتی تھی۔

''ہم پانی پت سے آئے ہیں۔ ہمارا مصالحوں کا بزنس ہے۔ ''سواد'' کے نام سے ہمارے مصالحوں کے پیکٹ بکتے ہیں۔ شاید کبھی تمہارے سننے میں یہ نام آیا ہو۔''

اُس نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ کیونکہ اندازہ تھا کہ ممبئی سے اتنی دُور پانی پت کے علاقے سے نہ تو واقف ہو گی اور نہ ہی بے شمار کمپنیوں کے پکنے والے مصالحہ جات کے پیکٹس میں ایک نئے نام کا اضافہ چونکانے کا سبب بنے گا۔ نتیجہ حسبِ توقع نکلا اور اندو بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

''مجھے ایسا کوئی نام یاد نہیں۔ اصل میں میرا کوکنگ وغیرہ میں کوئی خاص انٹرسٹ نہیں ہے اس لیے اس قسم کی پروڈکٹس کے بارے میں ٹیلی ویژن پر چلنے والے کمرشلز بھی کبھی خاص دلچسپی سے نہیں دیکھے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی ہمارا بزنس نیا بھی تو ہے۔ یہاں کی پارٹی سے ڈیل ہو جائے تو ہم اپنی پروڈکٹس کی پبلسٹی کے لیے نئے اور اچھے کمرشلز بنوا کر ٹیلی ویژن پر چلوائیں گے۔'' شہریار نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے اس خاتون کے اپنی پروڈکٹ سے ناواقف ہونے پر خاصی مایوسی ہوئی ہو۔

''آئی تھنک تمہیں اب ممبئی میں بزنس کا خیال چھوڑ دینا چاہئے۔ کم از کم اب تم دونوں تو یہاں رہ کر اپنے بزنس کے معاملات نہیں دیکھ سکتے۔ بھائی جی تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا اور تمہیں ہرگز نہیں چھوڑے گا۔' اندو نے کچھ تاسف سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

اس ساری گفتگو کے دوران ان کا سفر مسلسل جاری رہا تھا اور گاڑی مختلف سڑکوں سے تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی۔

''آخر وہ شخص بیٹھے بٹھائے ہمارا دشمن کیوں بن گیا ہے؟ ہم تو اسے جانتے بھی نہیں ہیں۔'' اس بار سلّو نے پہلی بار زبان کھولی اور غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔

''یہ میں تمہیں آرام سے بیٹھ کر بتاؤں گی۔ اب تو ہم منزل پر پہنچ ہی گئے ہیں۔'' گاڑی ایک بنگلے کے دروازے پر رُکی اور ڈرائیور نے ہارن بجایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ اُس کی بات سنتے ہی اس لیے وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

ہارن کے جواب میں بنگلے کا گیٹ فوراً ہی کھل گیا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ ان کے پیچھے آنے والی گاڑی رہائشی علاقہ آنے سے پہلے ہی منظر سے غائب ہوگئی تھی چنانچہ یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس کے سواروں نے ان کے بحفاظت منزل پر پہنچ جانے کا یقین ہو جانے پر اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

گاڑی کے پورٹیکو میں رُکنے پر وہ دونوں بھی اندو اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے اُتر گئے۔ پھر وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے کے رہائشی حصے میں داخل ہو گئے۔

''اس طرف آ جاؤ۔'' اندر داخل ہونے کے بعد اندو انہیں لیے ایک کمرے میں گھس گئی۔ یہ کمرہ ڈرائنگ روم کی طرز پر سیٹ تھا۔ اندو نے ان دونوں کو ایک بڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پھر صوفے کے ساتھ رکھی تپائی پر موجود انٹرکام کا بٹن دبا کر تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''تین کافی بھیجو۔''

''تم دونوں میں سے کوئی ڈرنک تو نہیں کرنا چاہتا؟'' حکم صادر کرتے ہی اسے خیال آیا تو وہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ دونوں ہی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آرام سے بیٹھو۔ اس بنگلے کے اندر تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' مسکرا کر اُن سے مخاطب ہوئی وہ خود بھی بہت ریلیکس لگ رہی تھی۔

''یہاں خطرہ نہیں ہے لیکن یہاں سے باہر تو خطرہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شہر میں کچھ غنڈے ہماری بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، ہم اپنا بزنس کیسے کریں گے؟'' شہریار کا انداز اب خالص کاروباری بندے کی طرح کا تھا جو فطرتاً بزدل بھی ہو لیکن بزنس کا اچھا موقع بھی گنوانے کے لیے تیار نہ ہو۔

''آئی ایم سوری، یہ ہماری وجہ سے ہوا ہے۔ میرا تمہاری ٹیکسی میں لفٹ لینا تمہارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔'' اس نے شرمساری کا اظہار کیا۔

''لیکن کیوں؟..... تم نے کہا تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کر سارا چکر بتاؤ گی تو اب بتاؤ۔'' سلّو نے اس سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر وہی جاندار اور پُرکشش مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''کم بولتے ہو لیکن ہو ہینڈسم۔ فلموں میں کام کرو تو اینگری ینگ مین کا رول بہت اچھا کرو گے۔'' اس نے پرس کا پیٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے چھیڑنے والے انداز میں تبصرہ کیا اور پھر پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ سلّو نے اسے گھورتے ہوئے ایک سگریٹ نکال لیا۔ البتہ شہریار نے موڈ نہ ہونے کا اشارہ کر کے انکار کر دیا۔

''دیکھو یار! چکر یہ ہے کہ میں ایک جرنلسٹ ہوں اور لوگوں کے رازوں کا کھوج لگانا میرا پروفیشن ہی نہیں، ہابی بھی ہے۔ میرے جیسے جرنلسٹوں کی یہاں بڑی مانگ ہے اور میں بھی ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہوں جو میری سروسز کے اچھے چارجز دے سکیں۔ اشوک صاحب میرے اچھے کسٹمرز میں سے ایک ہیں اور آج کل میں ان کے کہنے پر بھائی جی کے گینگ کے راز حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس چکر میں، میں نے بھائی جی کے ایک خاص بندے کو بھی پھنسا لیا تھا اور اُسے اُلّو بنا کر بہت کچھ اُگلوانے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی۔ لیکن پھر اُسے مجھ پر شک ہو گیا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے پوچھ تاچھ کرتا، میں منظر سے غائب ہوگئی۔ آج بہت دن بعد ممبئی ریلوے اسٹیشن کے باہر میرا کسی کام سے جانا ہوا تو میرا اس سے سامنا ہو گیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اس لیے ہوشیاری سے کام لے کر پہلے اس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر کیا اور دوسری گاڑیوں کی آڑ لے کر بچتی بچاتی تمہاری ٹیکسی تک پہنچ گئی۔ اس وقت تم لوگ ٹیکسی ڈرائیور سے شیوا جی ہوٹل چلنے کی بات کر رہے تھے۔ میری اپنی گاڑی تو پارکنگ میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہارے ساتھ شیوا جی تک جاؤں گی۔ شیوا جی کے بالکل سامنے والی بلڈنگ میں اشوک صاحب کا ایک فلیٹ ہے، اس لیے مجھے وہاں چھپنے میں آسانی رہتی۔ لیکن بیڈ لک یہ ہوئی کہ شاید اس نے بھی تمہاری زبان سے شیوا جی ہوٹل کا نام سننے کے ساتھ مجھے تمہاری والی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے میں تو ہوٹل کے راستے ہی روانہ ہونے کی وجہ سے بچ گئی لیکن تم دونوں کو میرا ساتھی سمجھتے ہوئے اس نے اپنے بندوں کے ذریعے گھیر لیا تاکہ تمہارے ذریعے میرا ٹھکانہ معلوم کر سکے۔''

وہ بڑی عجیب کہانی سنا رہی تھی۔ لیکن اس کی ظاہری شخصیت دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس قسم کی عورت سمجھا جائے لیکن وہ جن حالات میں اور جن لوگوں کے ساتھ ملی تھی، اس کی بات نہ ماننے کا بھی کوئی سوال نہیں تھا جبکہ وہ خود بھی اپنے بارے میں یہی اعتراف کر رہی تھی۔

''وہ تمہیں دُور سے گولی بھی تو مار سکتا تھا۔ اس نے اتنی آسانی سے تمہیں ہمارے ساتھ نکلنے کیوں دیا؟'' اس کی ساری کہانی سن کر شہریار نے نقطۂ اعتراض اُٹھایا۔

''جسے آپ چاہتے ہوں، اسے گولی مارنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ہماری منزل تو ممبئی ہی ہے اس لیے وہاں ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ وہاں اکیلا تھا، فائرنگ کرنے کی صورت میں مشکل میں بھی پھنس سکتا تھا۔ اس کی گاڑی کا ٹائر پہلے ہی میں پنکچر کر چکی تھی۔'' اس نے نہایت اطمینان سے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سمجھ میں آ گئی کہ بھائی جی کے غنڈوں نے تمہارے چکر میں ہمیں گھیر لیا تھا لیکن یہ بتاؤ کہ تم ہماری مدد کو کیسے پہنچیں؟'' شہریار نے دوسرا سوال اُٹھایا۔ جب وہ آسانی سے ہر بات بتاتی جا رہی تھی تو اپنی ہر اُلجھن دور کر لینا ہی مناسب تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں شیوا جی ہوٹل کے بالکل سامنے والی بلڈنگ میں تھی۔ وہیں کی ایک کھڑکی سے میں نے بھائی جی کے آدمیوں کو ہوٹل کے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ میری تلاش میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں اور ظاہر ہے، میں تو انہیں وہاں نہیں مل سکتی تھی لیکن میری وجہ سے تم دونوں مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔ میرے من کو یہ اچھا نہیں لگا کہ تم دونوں بیکار میں پھنس جاؤ۔ میں خود تو بلڈنگ کے پیچھے کے راستے سے نکل گئی لیکن دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ دیکھتے رہیں، بھائی جی کے بندے کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے جب مجھے فون پر بتایا کہ وہ لوگ تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں تو میں نے تمہیں بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہم نے جس سڑک پر ان کی گاڑی کو گھیرا تھا وہ بھائی جی کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سڑک پر جو ہنگامہ ہوا تو اس کی آوازیں وہاں تک گئی ہوں گی۔ جب ہی تو ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور اس کا انجام بھی تم نے دیکھ لیا تھا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ لوگوں کی جان بچانے کے لیے میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود کو کتنے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ سگریٹ کا دھواں خارج کرتے ہوئے اس نے کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ ان کی گفتگو کے دوران ایک ملازم نہایت خاموشی سے کافی سرو کر کے چلا گیا تھا۔

''خاک جان بچائی ہے تم نے ہماری۔ اس سے اچھا تو تم ہمیں ان لوگوں کے ساتھ جانے دیتیں۔ وہاں جا کر کیا ہوتا؟..... وہ ہم سے تمہارے بارے میں پوچھتے اور ہم بتا دیتے کہ تم زبردستی ہماری لیکسس میں بیٹھی تھیں اور شیوا جی پہنچنے کے بعد اُتر کر کہیں چلی گئیں۔'' سلّو نے ایک بار پھر خاموشی توڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔

''اس گمان میں مت رہنا للّو! ..... بھائی جی کے آدمی اتنی آسانی سے تمہاری بات ماننے والے نہیں تھے۔ وہ سچائی جاننے کے لیے تمہاری چمڑی اُتار کر رکھ دیتے اور پھر کہیں جا کر مانتے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں اس اذیت سے بچانا چاہتی تھی اس لیے اتنا کھٹ راگ پھیلایا۔'' اندو نے نخوت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے اپنا احسان جتلایا۔

''بچت تو ہماری اب بھی نہیں ہوئی۔ ہم یہاں بزنس میٹنگ کے لیے آئے تھے اور اب حال یہ ہے کہ یہاں سے باہر نکلے تو مارے جائیں گے۔'' وہ اب بھی اس کا احسان ماننے کو راضی نہیں تھا۔

''میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے اس طرح حملہ کر کے ہمیں چھڑا لانے پر تو ان لوگوں نے یہی گمان کیا ہوگا کہ ہم تمہارے خاص آدمی تھے اور اب ہمارے لیے خطرہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا ہے۔'' شہریار نے بھی سلّو کا ساتھ دیتے ہوئے اندو کو اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

''او کے، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب میں تمہارے لیے بس اتنا ہی کر سکتی ہوں کہ تمہیں ممبئی سے حفاظت کے ساتھ نکال دوں۔ اور اس کا انتظام جلدی ہو جائے گا۔ جب تک تم دونوں آرام کرو۔ کوئی ضرورت ہو تو بھی بتا سکتے ہو۔ نوکر تمہاری ہر اچھا پوری کرے گا۔'' اسے یوں اپنی غلطی گنوانا پسند نہیں آیا تھا چنانچہ کچھ نازیبا سے کہتی ہوئی اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''ہمارے بریف کیس ابھی تک ہمیں نہیں ملے ہیں۔'' اسے جاتا دیکھ کر شہریار نے جلدی سے یقین دہانی کروائی۔

''مجھے یاد ہے۔ یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں تمہارے بریف کیس مل جائیں گے۔'' اس نے لاپروا لہجے میں جواب دیا اور مزید کسی بات کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئی۔ ویسے بھی اس سے مزید کچھ کہنا بیکار تھا کیونکہ یہ تو وہ بھی جانتے تھے کہ بریف کیس دوسری گاڑی میں جانے والے بندے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے اور وہ گاڑی اس کے ساتھ اس بنگلے میں نہیں آئی تھی۔ اسلحے کے علاوہ ان بریف کیسوں میں ان کی چند اہم چیزیں بھی موجود تھیں اس لیے وہ انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس صورت میں انتظار ہی سب سے بہتر تھا۔

ویسے بھی فی الحال پریم ناتھ والے منصوبے پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے اُنہیں دوبارہ نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی پڑتی چنانچہ وہ انتظار کرتے رہے۔

ملازم نے ایک بار پھر خود ہی ان سے پوچھے بغیر چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ کی چیزیں پیش کر دیں۔ وہاں ٹیلی ویژن سیٹ موجود تھا اس لیے وہ وقت گزاری کے لیے خبریں دیکھتے رہے۔ خبروں میں دو آدمیوں کے تصادم اور اس کے نتیجے میں بھائی جی کے گرگوں کے مارے جانے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ خبریں دیکھتے ہوئے ہی انہوں نے ٹی وی کی اسکرین پر بھائی جی اور اشوک صاحب کی تصویریں بھی دیکھیں۔ بھائی جی کی طرف سے الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے آدمیوں کے قتل کے پیچھے اشوک کا ہاتھ ہے لیکن اشوک نے اس الزام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کھلی بدمعاشی کے مظاہرے ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہوئے ہی سہی، خاصا وقت گزر گیا اور اندو ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس بار اس کے دونوں ہاتھوں میں ان کے بریف کیس لٹکے ہوئے تھے۔

''یہ لو تمہارے بریف کیس اور فوراً یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ باہر گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تم دونوں یہاں سے سیدھے ریلوے اسٹیشن جاؤ گے اور وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر دہلی۔ فرسٹ کلاس میں دہلی تک کے لیے کوپے بک کروا دیا گیا ہے۔ وہاں سے تم اپنے حساب سے پانی پت جانے کا انتظام کر لینا اور پھر دوبارہ کبھی ممبئی کا رخ مت کرنا ورنہ آئندہ کے لیے میں تمہاری کوئی گارنٹی نہیں لے سکتی۔'' اس نے بریف کیس فرش پر رکھے اور انہیں کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر اپنی کہہ کر کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے باہر نکل گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا لیکن کچھ کہہ اس لیے نہیں سکے کہ اندو کے باہر جاتے ہی وہ شخص اندر آ گیا اور گاڑی میں اگلی نشست پر بیٹھا رہا تھا۔

''چلیں؟'' اُس نے اس لہجے میں یہ ایک لفظ ادا کیا جیسے سوال نہ کر رہا ہو، اُنہیں حکم دے رہا ہو۔ چار و ناچار انہیں قدم آگے بڑھانے پڑے۔ کیونکہ اس وقت وہ عام کاروباری افراد کا کردار ادا کر رہے تھے اور ظاہر ہے کوئی سیدھا سادہ کاروباری شخص غنڈوں سے اختلاف کی ہمت تو نہیں کر سکتا تھا۔

اس بار انہیں جس گاڑی میں سفر کروایا گیا، وہ پہلی کے مقابلے میں چھوٹی تھی لیکن اس کے تاریک شیشوں کے پیچھے وہ سب کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر بھی وہ شخص ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

''یہاں ہمارے کچھ آدمی ہر طرف نظر رکھے ہوئے ہیں پھر بھی میں تم لوگوں کو بالکل ٹائم پر لایا ہوں۔ اتری جلدی چلو ورنہ ایک منٹ بعد ٹرین نکل جائے گی۔''

وہ دونوں اپنے طور پر یہ سوچ چکے تھے کہ اسٹیشن پہنچ کر کسی طرح وہاں سے نکلنے کی تدبیر کریں گے لیکن یہاں تو ایسا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نہایت افراتفری میں انہیں تقریباً چلتی گاڑی میں سوار ہونا پڑا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے فرسٹ کلاس کے اس کوپے میں جا بیٹھے جو اُن کے لیے بک کروا دیا گیا تھا۔

قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی۔ وہ دہلی کے ایک دادا سے بچتے بچاتے ممبئی پہنچے تھے اور ممبئی کے دو دادوں کی مہربانی کی وجہ سے دوبارہ دہلی کی طرف جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

''میرے خیال میں اب تمہیں جاب چھوڑ دینی چاہیے۔'' وہ حسبِ معمول ناشتے کے لیے اسٹور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب اسلم نے اس سے یہ بات کہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ کیوں جناب؟'' اس نے دوپٹے کو دونوں شانوں پر اچھی طرح پھیلاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تمہاری حالت ایسی ہے کہ تم گھر میں رہ کر زیادہ سے زیادہ آرام کرو، تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔'' اسلم نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اچھی تو وہ ہمیشہ سے لگتی تھی لیکن جب سے ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہوئی تھی، چہرے پر ایک الگ ہی نور آ گیا تھا اور اسلم کا دل پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی طرف کھنچتا تھا۔

''میں کوئی دنیا کی انوکھی عورت تھوڑی ہوں جو ماں بننے جا رہی ہے۔ آپ نے اپنے ہاں کے گاؤں دیہاتوں میں نہیں دیکھا کہ کیسے عورتیں آخری وقت تک کھیتوں میں سخت محنت کرتی رہتی ہیں بلکہ بعض دفعہ وہیں ڈیلیوری کی نوبت آ جاتی ہے میری جاب تو اتنی سخت بھی نہیں ہے جو آپ اتنے گھبرا رہے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر اسلم کی تشفی کروانے کی کوشش کی۔

''تم اپنا ان عورتوں سے مقابلہ نہیں کرو۔ ان کے شوہروں کو ان کا خیال نہیں ہوتا ہوگا لیکن میری تو تم جان ہو۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں تمہیں کیسے پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھوں۔'' اس نے عقب سے ماہ بانو کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے لمبے گھنے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسلم کی اس حرکت پر بالوں پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور گھنے بال ایک آبشار کی صورت اسلم کے چہرے اور شانوں پر آ گرے۔

''کیا کر رہے ہیں؟ اتنی مشکل سے بال سمیٹے تھے، سب بکھرا دیئے۔ اب دوبارہ باندھنے میں دیر لگے گی۔ مجھ پر الزام مت رکھیے گا کہ لیٹ کروا دیا۔'' اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

''میں تو چاہتا ہوں کہ تم جاؤ ہی نہیں۔ بس آرام سے گھر پر بیٹھو اور آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاری کرو۔''

اس نے کچھ اور بھی قریب ہوتے ہوئے اس کے بالوں کی مہک اپنے سانسوں میں اُتاری۔ اُس کی اس وارفتگی پر ماہ بانو کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ اسلم کی یہ وارفتگی اور والہانہ پن اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، وہ اوّل روز سے ہی اسے اسی طرح چاہ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اُس کی اتنی بے تحاشا محبت پر کچھ گھبرا جاتی تھی اور اندر ہی اندر ایک احساسِ جرم ستانا شروع کر دیتا تھا۔ اپنے دل و دماغ پر لاکھ پہرے بٹھانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بہت دھیمے سُروں میں بجنے والا ساز شہریار کی محبت کا ہے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اسے بھلا نہ پائی تھی، بس خود کو پابند کر لیا تھا کہ ہونٹوں پر شہریار کا نام تک نہ آئے۔ شہریار نے بھی اسے یہاں بھیجتے ہوئے اسے پابند کیا تھا کہ وہ کسی صورت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے گی۔ چنانچہ اسے پاکستان میں ہونے والے واقعات کی کوئی خبر نہیں تھی اور واحد خبر رساں دل تھا جو اسے اطلاع دیتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے، سلامت ہے۔ اس دیوانے دل کو اس کی وحشتوں سے بچانے اور پابندیوں میں جکڑے رکھنے کے لیے وہ اپنا ہر دم مصروف رہنا ضروری سمجھتی تھی لیکن اب اسلم فرمائش کر رہا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ گھر بیٹھ کر اسے آرام نہیں ملے گا بلکہ بے لگام سوچیں پاگل کرنے چلی آئیں گی۔

''کن خیالوں میں ڈوب گئیں؟ کیا آنے والے مہمان کے بارے میں سوچ رہی ہو کہ وہ بیٹی ہوگی یا بیٹا؟..... کچھ بھی ہو بھئی، مجھے تو جی جان سے پیارا ہوگا۔ کیونکہ وہ میری جان کے وجود کا حصہ جو ہوگا۔'' اسلم اس وقت خاصے رومانی موڈ میں تھا۔ ماہ بانو نے کسمسا کر اس کی بانہوں کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی لیکن

کامیاب نہ ہو سکی۔

''یہ آپ کو بے وقت کی شوخیاں کیوں سوجھ رہی ہیں؟ مجھے تیار ہونے دیں نا۔'' ناکامی کی صورت میں اس نے بے بس سے انداز میں ذرا جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا لیکن اسلم کہاں قابو میں تھا۔ پے در پے اس کے کئی گرم بوسوں نے ماہ بانو کی گردن کی پشت کو دہکا ڈالا تھا۔

''اسلم! میں کہہ رہی ہوں نا کہ مجھے تیار ہونے دیں۔ ہمیں وقت پر اسٹور پہنچنا ہے۔'' اس بار اس نے ناراضگی سے اسلم کو پیچھے دھکیلا۔

''اور میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی جاب چھوڑ دو تو اس پر تم ذرا توجہ نہیں دے رہیں۔'' اس بار وہ کچھ ذرا سا خفا ہوا۔

''میں اس لیے توجہ نہیں دے رہی ہوں کہ میں آپ کی طرح جذبات سے نہیں بلکہ حقیقت پسندی سے سوچ رہی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کی بات اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ماں جتنی متحرک ہوگی، بچے کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ مکمل آرام کا مشورہ صرف ان عورتوں کو دیا جاتا ہے جن کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہو۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ گھر میں فارغ بیٹھنا میرے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔ میرے پیچھے میرا ایک دردناک ماضی ہے۔ میں بہت مصیبتوں سے گزری ہوں اور اپنے بہت قریبی رشتوں کو کھویا ہے۔ مجھے اب بھی یہ خیال بے چین رکھتا ہے کہ وہاں پیر آباد میں میرے سگے ماں باپ کیسی تنہا اور بے یار و مددگار زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ سوچیں کہ اگر میں فارغ بیٹھ گئی تو اذیت ناک سوچیں مجھے چین سے کہاں جینے دیں گی؟ گھر سے باہر نکلتی ہوں اور مصروف رہتی ہوں تو دل بہلا رہتا ہے۔ دل و ذہن کو مصروف رکھنے والی سرگرمیاں ختم ہو گئیں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی اب ہمیں آنے والے بچے کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ مصطفیٰ بھائی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ ہمیں یہ سہولت ہمیشہ حاصل رہے۔ حالات میں کبھی بھی کوئی ایسی تبدیلی آ سکتی ہے کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے۔ اس صورت میں کرائے کے کسی گھر میں رہنا اور اس کے اخراجات برداشت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وقت اور سہولت سے فائدہ اٹھا کر ہم جتنی بچت کر سکتے ہیں، کر لیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہم دونوں مل کر محنت کریں۔ یہ کوئی پاکستان نہیں ہے نہیں کہ ایک شخص کما کر لائے تو پورا گھر کھا لے۔ یہاں تو سب کو جینے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔'' وہ جوش میں آئی تو بولتی چلی گئی جبکہ اسلم کو یک دم ہی چپ لگ گئی۔

''تم تیار ہو کر باہر آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' وہ اس کو کسی قدر سنبھال کر پلٹا اور باہر کی طرف جانے لگا۔ اس کے انداز سے ماہ بانو کو لگا کہ وہ اس کے ساتھ کچھ زیادتی کر گئی ہے اور جو آپ کو اتنا چاہیں، ان کا دل دُکھانا تو کسی صورت اچھا نہیں ہوتا۔ احساس ہونے پر وہ فوراً ہی اسلم کے پیچھے لپکی اور اس کا بازو تھام کر اسے باہر جانے سے روکا۔

''آئی ایم ویری سوری اسلم! میری باتیں شاید آپ کو بری لگی ہیں۔''

''نہیں، برا ماننے کی کیا بات ہے؟ تم نے کچھ بھی غلط تو نہیں کہا۔ میں ہی ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔'' اس نے دھیرے سے ماہ بانو کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا۔

''آپ میرے ساتھ اس طرح نہیں کریں اسلم! ایک آپ کی محبت ہی تو ہے جو مجھے اس دنیا میں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ آپ بھی مجھ سے رُوٹھ گئے تو میں کیا کروں گی؟'' وہ روہانسی ہو کر اس کے سینے سے لگ گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ عورت کے آنسو تو وہ ہتھیار ہیں جو بڑے بڑے سورماؤں کو فتح کر لیتے ہیں۔ اسلم جیسا محبت کرنے والا کہاں ان کا وار سہہ پاتا، فوراً ہی گھبرا گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماہ بانو! میں واقعی تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اور میں پورے دل سے تمہیں جاب پر چلنے کی اجازت دے رہا ہوں۔'' اس نے ماہ بانو کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے رخسار پر سے آنسو صاف کیے۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ رونے سے اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے سے پڑ گئے تھے جو اسے کچھ اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اسلم نے بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں کو ایک ایک کر کے چوم لیا۔

''میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ اب تم پانچ منٹ کے اندر تیار ہو کر آ جاؤ ورنہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کبھی بھی مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' ماہ بانو کھلکھلا کر ہنسی۔ اسے دھوپ میں بارش کا منظر یاد آ گیا اور اس نے مسکرا کر اپنے دل میں اُس کے اس یقین کی تائید کی کہ وہ کبھی اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ کم از کم اپنی مرضی سے تو ہرگز نہیں۔

⊛----✪----⊛

جاوید علی نے مساج سینٹر میں قدم رکھا۔

یہ خاصی جدید اور خوب صورت عمارت تھی اور شہر کے پوش علاقے میں واقع تھی۔ جاوید علی نے اس سینٹر کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق یہاں طبقۂ امراء کے افراد کا آنا جانا تھا اور مرد و زن دونوں ہی وہاں مساج کروانے کی غرض سے آتے تھے۔

سینٹر کو ایک سابق ایس پی کی بیگم چلا رہی تھی جو کہ خود بھی خاصی ماڈرن عورت تھی اور سننے میں آیا تھا کہ جوانی میں آدھے شہر کے مردوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اب بھی وہ خاصی پہنچ والی تھی، اسی لیے اس کے مساج سینٹر کے بارے میں خاصی افواہوں کے باوجود اب تک پولیس نے ایک بار بھی چھان بین کی زحمت نہیں کی تھی۔

جاوید علی کو اپنی ٹیم کی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوا تھا کہ یہ مساج سنٹر محض ایک آڑ ہے ورنہ اصل میں یہاں کوئی اور ہی دھندا کیا جا رہا ہے۔ اس دھندے میں عیاشی کا سامان فراہم کرنے سے لے کر بڑی پارٹیوں کو بلیک میل کرنے تک سب کچھ شامل تھا اور ظاہر ہے اس مقصد کے لیے مساج سینٹر میں جہاں خوب صورت لڑکیاں اور ہینڈسم لڑکے ملازمت کرتے تھے، وہیں خفیہ گارڈز اور خفیہ کیمرے بھی موجود تھے۔ خفیہ کیمروں کی موجودگی کا سب سے بڑا سبب ان فلموں کی تیاری تھی جو چنیدہ گاہکوں کی قابل اعتراض حالت میں بنائی جاتی تھیں اور پھر انہیں بلیک میل کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ مساج سینٹر کی اس بدنام شہرت کے باوجود وہاں آنے والے گاہکوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی تھی اور لوگ باقاعدگی سے وہاں آتے رہتے تھے۔ بہرحال، وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا براہِ راست ان کے ادارے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس قسم کے جرائم ان کے دائرۂ کار میں آتے تھے۔ انہیں تو بس اس عورت کی تلاش تھی جو رائے چند کو غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی تھی۔

رائے چند نے انہیں اس عورت کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ اس اعتبار سے خاصا منفرد تھا کہ رائے چند کے مطابق وہ لمبے قد کی لیکن جاپانیوں کے سے نقش و نگار رکھنے والی عورت تھی۔ جاوید علی نے باری باری اپنے دو ماتحتوں کو گاہکوں کے روپ میں مساج سینٹر بھیجا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنی خدمت انجام دینے والی لڑکیوں کے علاوہ اور بھی کئی خواتین کو دیکھا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی رائے چند کے بتائے ہوئے حلیے پر پوری نہیں اُترتی تھی۔

سی ایف پی کے دو جوان مستقل مساج سینٹر کی نگرانی کر رہے تھے لیکن انہوں نے بھی وہاں اس حلیے کی کسی عورت کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا جس سے انہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ شاید رائے چند نے ان سے بیانی کی ہے۔ لیکن آج اچانک ہی نگرانی کرنے والے جوانوں نے اطلاع دی کہ اس حلیے کی ایک عورت مساج سینٹر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ پیچھے اس کے آدمی اور پولیس کی ایک چھاپہ مار ٹیم تیار تھی جو اس کی طرف سے اشارہ ملتے ہی سینٹر پر ریڈ کر دیتی۔

''ہیلو سر!..... دیبا مساج سینٹر میں خوش آمدید۔'' وہ گلاس ڈور کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، استقبالیہ پر موجود لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ خاصی طرح دار لڑکی تھی اور اس نے ٹاپ لیس بلاؤز کے نیچے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ اُسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ بہت ہی پُرکشش انداز میں مسکرائی اور پھر اپنی مترنم آواز میں اسے خوش آمدید کہا۔

وہ اس اعتبار سے بڑی زبردست لڑکی تھی کہ اسے قدرت نے خوب صورت چہرے اور پُرکشش جسم کے ساتھ دلکش آواز سے بھی نوازا تھا۔ ورنہ عموماً اتنا زبردست تناسب کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید وہ اسی تناسب کی وجہ سے استقبالیہ پر بٹھائی گئی تھی کہ آنے والا پہلے مرحلے میں ہی متاثر ہو جائے اور یقین کر لے کہ یہاں اسے جو بھی ملے گا، وہ زبردست ہی ہوگا۔

''یو آر سو بیوٹی فل۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تم سے زیادہ خوب صورت لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

جاوید علی نے کسی دل پھینک عاشق کی طرح چھوٹتے ہی اس کی تعریف کر دی جس پر وہ بڑی ادا سے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور نہایت لگاوٹ سے بولی۔

''اِٹس آ کمپلیمنٹ فار می۔''

''بھئی جو سچ تھا، وہ میں نے بتا دیا۔'' جاوید علی نے بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا۔

''ایسا شاید اس لیے ہے کہ آپ اس سے پہلے کبھی ہمارے مساج سینٹر نہیں آئے۔ یہاں آپ کو مجھ سے زیادہ خوب صورت چہرے اور جسم دیکھنے کو ملیں گے۔'' اب اس کا انداز خالص کاروباری تھا۔

''اوہ، تم نے تو مجھے تجسس میں ڈال دیا ہے۔ میں بے چین ہو کہ ایک ہی دن میں اپنی زندگی کی دوسری خوب صورت لڑکی کو دیکھ سکوں۔'' وہ بھی برسرِ مطلب آ گیا۔

''اپنے کوائف نوٹ کروا دیں۔'' وہ فوراً ہی اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔

''نام؟''

''کیپٹن انس شیر علی۔'' اس نے پورے اعتماد سے بتایا۔

''اوہ..... تو آپ آرمی سے ہیں۔'' وہ ذرا سا چونکی۔

''کیوں، یہاں آرمی والوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے کیا؟'' جواب میں اس نے مسکرا کر پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آرمی والے خود ہی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ شاید اپنی ٹف رائمز اور ریگولر ایکسرسائز کی عادت کی وجہ سے انہیں فرصت اور ضرورت دونوں ہی نہیں ہوتیں۔'' اس نے وضاحت کی تو وہ بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں بھی پچھلے کئی دن سے چھٹیوں پر لاہور آیا ہوا ہوں اور چھٹیوں کی وجہ سے روٹین میں تھوڑا فرق آ گیا ہے اس لیے سوچا ذرا جسم کو فٹ کروایا جائے اور سستی نکالی جائے تاکہ واپس جانے پر ایڈجسٹ کرنے میں آسانی رہے۔''

''ڈونٹ وری سر! یہاں سے آپ ایسے فٹ فاٹ ہو کر جائیں گے کہ پھر دوبارہ بار بار ہمارے پاس آنے کا دل چاہے گا۔'' اس نے اعتماد سے دعویٰ کیا اور مزید کوائف حاصل کرنے لگی۔

جاوید علی کو اپنے دو ساتھیوں کے تجربے کی بنیاد پر ان سوالات کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا اس لیے اپنے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہا جن کی بنیاد پر وہ اسے کوئی امیر کبیر شخص سمجھ کر خصوصی اہمیت کا حامل سمجھے۔ امارت کے ساتھ آرمی کے بیک گراؤنڈ کے ٹچ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا اور وہ لڑکی بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔

کمپیوٹر پر اس کے کوائف منتقل کرنے کے بعد وہ اس کی طرف رخ کر کے دل آویز انداز میں مسکرائی، عین اسی وقت اس کے سامنے رکھے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

''یس میم!'' اس نے انٹرکام اُٹھا کر مؤدبانہ لہجے میں کہا اور دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ چند ثانیے کی مختصر بات سن کر اس نے اسی مؤدبانہ لہجے میں ''اوکے میم!'' کہا اور ریسیور رکھتے رکھتے ہی دوسرے ہاتھ سے گھنٹی کا بٹن دبا دیا تھا۔ فوراً ہی ایک بیس بائیس سالہ اسمارٹ سی لڑکی مختصر لباس میں وہاں نمودار ہو گئی۔

''سر کو روم نمبر ففٹین میں لے جاؤ۔'' ریسپشنسٹ لڑکی نے اسے حکم دیا۔

''اوکے مس!'' وہ کہہ کر جاوید علی کی طرف پلٹی۔ ''آیئے سر!''

جاوید علی اس کی راہنمائی میں چل پڑا۔ عمارت باہر سے جتنی خوب صورت نظر آتی تھی، اندر سے بھی اتنی ہی خوب صورت اور جدید تھی۔ وہاں صفائی کا بھی خوب خیال رکھا گیا تھا۔ فرش کی سطح اتنی چمکیلی اور شفاف تھی کہ چلتے ہوئے اسے اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔

اس کی راہنما لڑکی لچکیلی چال چلتی، اسے سیڑھیوں سے اوپر لے گئی۔ اوپری منزل میں قطار سے کمرے بنے ہوئے تھے اور ہر کمرے کے دروازے سے اوپر کمرہ نمبر بھی درج تھا۔ ان میں سے کچھ نمبر روشن تھے اور کچھ نہیں۔ روشن نمبروں کا مطلب وہ جانتا تھا۔ جن کمروں کے نمبر روشن تھے، وہاں گاہک موجود تھے۔ کمرہ نمبر پندرہ کے سامنے پہنچ کر لڑکی نے سائیڈ میں لگا چھوٹا سا بٹن دبایا تو ردِعمل میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک طویل گاؤن پہنے دراز قامت لڑکی جس کے چہرے کے نقوش جاپانیوں کے سے تھے، ان کے استقبال کے لیے کھڑی تھی۔

اس کا چہرہ دیکھ کر جاوید علی کا دل بلّیوں اُچھل پڑا۔ آج سینٹر میں اس کی موجودگی کا سن کر اگرچہ وہ خاصا پُرامید تھا لیکن گمان نہیں تھا کہ براہِ راست اسی سے واسطہ پڑ جائے گا۔

''ہیلو سر!..... پلیز اندر تشریف لائیں۔''

جاوید علی کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور حلاوت آمیز لہجے میں اسے دعوت دیتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جاوید علی کو بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھانا پڑا جسے اس نے بہت جوش سے تھاما اور پھر چھوڑنے کے

بجائے ہلکے سے دباتے ہوئے اندر کھینچ لیا۔

اندر وہی ماحول تھا جو کسی مساج سینٹر کے کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔ درمیان میں پڑا خصوصی طرز کا بیڈ، ریکس میں رکھی مختلف بوتلیں اور اسٹینڈز پر ٹنگے تولیے وغیرہ۔ ان چیزوں کے علاوہ ایک روم ریفریجریٹر بھی موجود تھا جس کا مقصد اسے اس وقت فوراً ہی سمجھ آ گیا جب اس نے لڑکی کو اس میں سے بیئر کے ٹن نکال کر لاتے دیکھا۔

''میں نے سوچا کہ پہلے آپ کی تھوڑی سی تواضع کر دوں۔'' ایک ٹن اُسے تھما کر وہ خود بیڈ سے کچھ فاصلے پر موجود کرسی پر جا بیٹھی۔ جاوید علی کو پہلے ہی اس نے بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ ٹن ہاتھ میں لیے وہ اس کی جانب دیکھنے لگا۔ کرسی پر وہ ایسے انداز اور زاویے سے بیٹھی تھی کہ اس کا طویل گاؤن سامنے سے کھل گیا تھا اور اس سے اس کی لمبی خوب صورت ٹانگیں عریاں حالت میں گھٹنوں کے اوپر تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''فی الحال میں اس کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہا لیکن تم جیسی خوب صورت میزبان کو انکار بھی نہیں کیا جا سکتا اس لیے تھوڑی سی چکھ لیتا ہوں۔''

اس نے ایسا ظاہر کیا کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو گیا ہے اور ٹن کھول کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ صرف پینے کی اداکاری کر رہا تھا، پی نہیں رہا تھا۔

''سننے میں تو آیا ہے کہ آرمی والے بڑے شوق سے یہ شغل کرتے ہیں اور آپ معمولی سی بیئر کے لیے تکلف سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ مخمور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آرمی والے شوق ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کا اپنا ایک ڈسپلن ہوتا ہے اور چاہیں بھی تو اسے توڑنے میں خاصی مشکل محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اس وقت پینے کا عادی نہیں ہوں، صرف تمہارا دل رکھنے کے لیے چکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں آرمی میں ہوں؟..... ابھی تو ہمارا آپس میں انٹروڈکشن بھی نہیں ہوا؟'' اسے جواب دیتے ہوئے اس نے سوال بھی داغ دیا۔

''سمجھیں جادو سے۔'' وہ کھلکھلائی اور ٹن ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس طرح شاید وہ مزید کچھ کہنے سے بچنا چاہتی تھی۔

جاوید علی نے بھی جواب پر اصرار نہیں کیا۔ اسے معلوم تھا کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے استقبالیہ کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن لی ہو۔ اسے عین وقت پر بجنے والا انٹرکام بھی یاد آیا۔ امکان یہی تھا کہ اس کے کوائف جان کر اسے جاوید علی میں خصوصی دلچسپی محسوس ہوئی ہو اور اس نے خود اسے وہاں بلوایا ہو۔

''تمہیں تو جادو سے پتہ چل گیا لیکن مجھے ایسا کوئی جادو نہیں آتا اس لیے تمہیں اپنا انٹروڈکشن خود کروانا پڑے گا۔''

''میں عالیہ ہوں۔ اس مساج سینٹر میں میرا میڈم دیبا کے ساتھ ففٹی پرسنٹ کا شیئر ہے اور عام طور پر میں صرف یہاں کے انتظامات کی نگرانی کرتی ہوں یا اگر کوئی گاہک پسند آ جائے تو خود اسے سروسز فراہم کرنے میں حرج نہیں سمجھتی۔'' اس نے اپنے بارے میں بتایا۔

''یعنی میں ان چند خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں یہ موقع ملا ہے؟'' جاوید علی نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ ہنس دی۔

''ویسے تمہارا نام سن کر مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی ہے۔ تمہارے نقوش سے میں تمہیں جاپانی سمجھا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بھی گفتگو کو طول دے کر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اس کے آدمی اشارہ ملنے کے بعد یہاں پہنچ کر پوزیشن سنبھال لیں۔

''نقوش سے جاپانی سمجھے تھے اور قد دیکھ کر کیا سوچا تھا؟'' اس نے شوخی سے پوچھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ڈسٹ بن تک گئی جس میں اس نے بیئر کا خالی ٹن ڈال دیا۔

''ہاں، قد کے معاملے میں حساب کتاب کچھ گڑبڑ ہے۔'' جاوید علی نے اُلجھن کے اظہار کے لیے ایک ہاتھ بالوں تک لے جا کر آہستہ سے کھجایا۔ ''عام طور پر جاپانی لڑکیوں کا قد لمبا نہیں ہوتا اور تم خاصی لمبی ہو۔ لیکن یار! کچھ ایکسپشنل کیسز بھی تو ہوتے ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ تم ان میں سے ایک ہو۔''

''میں تمہاری اُلجھن دُور کر دیتی ہوں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری ماں جاپانی اور باپ پاکستانی ہے۔ اور میں دونوں کا مکسچر۔''

اپنی بات کہہ کر وہ کھلکھلائی تو جاوید علی نے بھی اس کا ساتھ دیا اور سائیڈ پر ذرا سا جھک کر اپنے ہاتھ میں تھاما بیئر کا ٹن وہاں موجود تپائی پر رکھ دیا۔

ٹن رکھ کر وہ سیدھا ہوا تو نظروں کے سامنے گویا بجلی سی کوند گئی۔ اس کے لمحے بھر کی حرکت میں ہی عالیہ نے اپنا طویل گاؤن اُتار پھینکا تھا اور اب ایک مختصر سی بکنی میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''میرے خیال میں اب کام شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ لہراتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی اور اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اتار کر ایک قریبی اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔

''آدمی بڑے اسمارٹ ہو۔'' قمیض ٹانگ کر وہ دوبارہ اس کے نزدیک آئی اور اس کے کسرتی جسم پر اپنی لمبی اُنگلیاں پھیرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

''سب فوج کی زندگی کا کمال ہے۔'' اسے عالیہ کا قرب ناگوار گزر رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اس کے بغیر اپنے مقصد کو نہیں پا سکے گا اس لیے لہجے اور تاثرات کو خوشگوار ہی رکھا تھا۔

''یہ تو ہے۔ تم فوجی ہوتے ہی کمال کے ہو۔ میرا تم سے پہلے بھی ایک فوجی سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ تمہاری طرح ینگ نہیں تھا پھر بھی بڑی زبردست چیز تھا۔ افسوس کہ ایک بار کے بعد دوبارہ واپس ہی نہیں آیا۔'' وہ آپ جناب کا تکلف چھوڑ کر اب بے تکلفی کے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اور اسے بہت نرمی سے بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کرنل توحید نام بتایا تھا اس نے مجھے۔ بہت ہینڈسم اور زور آور آدمی تھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہو گا؟ دل میں بڑی شدید خواہش ہے کہ کبھی دوبارہ اس سے مل سکوں۔ تم تو خود آرمی میں ہو۔ کبھی سامنا ہو تو پیغام دینا کہ دیبا مساج سینٹر والی عالیہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔''

''میں کیسے انہیں یہ پیغام دے سکتا ہوں؟ ایک کرنل سے کیپٹن رینک کے کسی بندے کو ایسی بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔'' عالیہ کی زبان سے کرنل توحید کا ذکر سن کر وہ چونک گیا تھا۔ اس بات پر یقین کرنا تو خیر مشکل تھا کہ کرنل توحید کبھی اس مساج سینٹر پر عالیہ نام کی اس عورت سے ملے ہوں گے، البتہ عالیہ کی ذات کچھ اور بھی مشکوک ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے کوائف نوٹ کرواتے ہوئے اپنے آپ کو قابلِ توجہ بنانے کے لیے یہ بتایا تھا کہ اس کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر جنرل تھے اور شاید اصل میں یہی بات عالیہ کے لیے قابلِ توجہ ٹھہری تھی ایک بریگیڈیئر جنرل کی فیملی سے کسی کرنل کے مراسم ہونے کا بہت زیادہ امکان تھا اور اس امکان کی بنیاد پر عالیہ اس کی مدد سے کرنل توحید کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے کرنل توحید پر ہونے والا وہ خودکش حملہ نہیں بھولا تھا جس میں وہ سی ایف پی کے جوانوں کی پھرتی کے باعث بال بال بچے تھے۔ ان پر وہ حملہ شہریار کی سابقہ بیوی ڈاکٹر ماریہ کے قتل کے بعد انتقامی کارروائی کے طور پر کیا گیا تھا اور ڈاکٹر ماریہ مبینہ طور پر ''را'' اور ''موساد'' کی ڈبل ایجنٹ تھی۔ اور اب عالیہ اس کے حوالے سے چھان بین کر رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا بھی ان دونوں تنظیموں یا کم از کم کسی ایک سے ضرور تعلق ہے۔

''کسی عام کیپٹن کی نہیں ہو سکتی لیکن ایسا کیپٹن جو خود بریگیڈیئر جنرل کا بیٹا ہو، ایسی جرأت کر سکتا ہے۔'' عالیہ نے وہی بات کہی جو اس کے اپنے دھیان میں تھی۔

''تم کرنل صاحب کو ٹھیک سے جانتی نہیں ہو اس لیے ایسی بات کہہ رہی ہو۔ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہیں اور نجی محفلوں میں بھی ڈسپلن کو توڑنا پسند نہیں کرتے۔'' اس نے عالیہ کو تاثر دیا کہ وہ کرنل توحید سے بخوبی واقف ہے۔ ردِعمل میں اس نے عالیہ کے چہرے پر دوڑتی خوشی کی لہر کو بخوبی محسوس کیا۔

''ٹھیک ہے، تم میں ہمت نہیں ہے تو مجھے اُن کا ایڈریس دے دینا۔ میں تمہیں دکھاؤں گی کہ تمہارے وہ ہارڈ اینڈ ٹف کرنل صاحب، عالیہ کے سامنے کیسے موم بنتے ہیں۔''

اس نے ابھی تک اُس کا باقاعدہ مساج شروع نہیں کیا تھا اور یونہی اِدھر سے اُدھر اُنگلیوں کو گردش دے رہی تھی۔ شاید وہ سمجھی تھی کہ ایک بے وقوف کیپٹن ہاتھ آ گیا ہے اور اس سے وہ آسانی سے کرنل کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گی۔

''اے، ذرا احتیاط سے۔ میرا تعویذ خراب نہیں ہونا چاہیے۔'' عالیہ کی گردش کرتی لمبی انگلیاں بے دھیانی میں اس کے گلے میں موجود تعویذ سے جا ٹکرائی تھیں۔ اس نے موضوعِ گفتگو تبدیل کرنے کا یہ موقع مناسب سمجھا اور اسے ٹوکا۔

''اوہ سوری۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ تم جیسا ماڈرن آرمی آفیسر بھی یہ تعویذ وغیرہ جیسی چیزیں پہنتا ہے۔'' اس نے فوراً ہی معذرت کرنے کے ساتھ حیرت کا بھی اظہار کیا۔

''میری ماں دیہاتی بیک گراؤنڈ کی ذرا پرانے خیالات کی عورت ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک میں یہ تعویذ اپنے گلے میں پہنے رہوں گا، ہر بلا اور مصیبت سے بچا رہوں گا۔'' اس نے بتایا۔

''چلو پھر دیکھتے ہیں کہ تمہاری ماں کا یہ تعویذ آج تمہیں مجھ جیسی خوب صورت بلا سے کیسے بچاتا ہے؟'' اس نے شوخی سے کہتے ہوئے جھک کر اس پر چھا جانے کی کوشش کی۔

اسی پل ایک ساتھ دو باتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ایک جاوید علی کی گردن کے قریب پیدا ہونے والا ارتعاش اور دوسرے کمرے میں موجود کسی خفیہ اسپیکر سے اُبھرنے والی آواز۔ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔ نہ تو یہاں کی آوازیں باہر جا سکتی تھیں اور نہ ہی باہر کی آوازیں اندر آ سکتی تھیں، شاید اسی لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔

''پولیس نے سینٹر پر ریڈ کر دیا ہے۔ پلیز آپ سب الرٹ ہو جائیں۔'' اسپیکر سے اُبھرنے والی گھبرائی ہوئی آواز کو اس نے شناخت کر لیا۔ وہ وہی مترنم آواز والی ریسپشنسٹ تھی جس سے وہ استقبالیہ کمرے میں مل چکا تھا۔

اس کی آواز سن کر اس نے بڑی خوبصورتی سے فطری ردِعمل کا اظہار کیا اور عالیہ کو دھکیل کر اپنے اوپر سے ہٹاتے ہوئے اس اسٹینڈ کی طرف دوڑا جہاں اس کی شرٹ موجود تھی۔ شرٹ اسٹینڈ سے اُتار کر اس نے نہایت پھرتی سے پہن لی اور بٹن لگاتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں عالیہ سے پوچھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تو بتاؤ؟''

''اتنے پریشان مت ہو کیپٹن! ہم سچویشن کو ہینڈل کر لیں گے۔ یہ پولیس والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' عالیہ نے بھی اس دوران اپنا گاؤن پہن لیا تھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے دلاسا دے رہی تھی۔

''تم میرا پرابلم نہیں سمجھو گی۔ آج کل پولیس والے میڈیا کی ٹیم ساتھ لے کر ریڈ کرتے ہیں۔ تم تو شاید بعد میں مک مکا کر کے اپنا دھندا چلاتی رہو گی لیکن میری یہاں موجودگی ظاہر ہو گئی تو میرے خاندان کی ساکھ پھر کبھی نہیں لوٹ سکے گی۔ مجھے کسی کی بھی نظروں میں آئے بغیر فوراً یہاں سے نکلنا ہے اور تم مجھے باہر نکالو گی۔'' وہ طیش کا مظاہرہ کرتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا۔

''اوکے، میں کچھ کرتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ۔'' وہ اسے لے کر کمرے سے باہر نکلی تو معاملے کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہوا۔ وہاں خاصا شور تھا اور دیگر کمروں میں موجود افراد بھی باہر نکل آئے تھے۔ نیچے سے پولیس والوں کی وارننگ کے ساتھ ساتھ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''اس طرف چلو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کوریڈور کے آخری سرے کی طرف بھاگی۔ اس سرے پر بھی سیڑھیاں موجود تھیں۔ وہ اسے لے کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئی۔

نیچے پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا رخ کیا اور دفتر کے انداز سے سجے اس کمرے میں ٹھہرنے کے بجائے وہاں موجود دوسرے دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ اب وہ عمارت کے بغلی حصے میں تھے۔

''ہمیں یہ دیوار پھاند کر باہر نکلنا ہو گا۔'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اسے بتایا۔

''ہم اس دیوار کو پھلانگ کر کہاں نکلیں گے؟'' جاوید علی نے اس سے دریافت کیا۔

''گلی میں۔ یہ ایک پتلی سی گلی ہے جس کے دوسری طرف ایک پرائیویٹ اسکول کی باؤنڈری وال ہے۔ اس وقت اسکول بند ہو گا۔ ہم اس کی باؤنڈری وال کراس کر کے اندر اس وقت تک چھپ سکتے ہیں جب تک پولیس یہاں سے چلی نہیں جاتی۔ وہاں بیٹھ کر میں اوپر کسی کو نمبر ملاؤں گی تو پولیس والوں کا دماغ خود ہی ٹھکانے آ جائے گا۔''

وہ پتہ نہیں کیسے اس کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی لیکن بہت زیادہ پریشان بہر حال نہیں لگ رہی تھی اور پوری طرح پُر یقین تھی کہ سچویشن اس کی منشا کے مطابق کنٹرول میں آ جائے گی۔

''تمہیں جو کچھ کرنا ہے، بعد میں کرتی رہنا۔ فی الحال تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' جاوید علی ہر صورت اسے وہاں سے باہر نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے سوچنے کا موقع نہ ملے۔ اس کے ٹوکنے پر وہ حرکت میں آئی اور اس کا سہارا لے کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس کے دیوار پر چڑھنے کے انداز میں خاصی مشاقی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔

وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کود گیا۔ درمیانی گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ وہ دونوں اسے پار کر کے اسکول کے احاطے کی طرف بڑھے اور ابھی وہ اسے سہارا دے کر دیوار پر چڑھا ہی رہا تھا کہ گلی روشنیوں سے بھر گئی۔

''خبردار!..... بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' روشنی کے ساتھ ہی ایک للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ دونوں ہی گویا ٹھٹک کر رک گئے۔ پھر عالیہ نے تیزی سے اپنے گاؤن میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا

لیکن جاوید علی نے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے اس کی کلائی کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو ایڈیٹ!..... مجھے فون کرنا ہے۔'' وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غصے سے غرائی لیکن ظاہر ہے وہ اس کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ اسی پل بھاگتے ہوئے قدم ان کے عین سامنے آ کر رک گئے اور ایک گن کی نال عالیہ کی کنپٹی سے جا لگی۔

''اسے گاڑی میں ڈالو۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' جاوید علی نے گن بردار اور اس کے دوسرے ساتھی کو حکم دیا۔

''یُو.....'' عالیہ کچھ سمجھتی ہوئی اس کی طرف غصے سے مڑی۔

''حرکت مت کرو۔ ورنہ یہیں ماری جاؤ گی۔'' گن بردار نے سختی سے اسے حکم دیا پھر یک دم ہی گن کا دستہ نپے تلے انداز میں اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ لہراتی ہوئی نیچے گرنے لگی تو اس کے دوسرے ساتھی نے اسے سنبھال لیا اور کندھے پر ڈال کر گلی کے دوسرے سرے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ یہ گلی خاصی پتلی تھی اس لیے وہ لوگ اپنی گاڑی اندر نہیں لا سکے تھے اور مجبوراً عالیہ کو اپنے کندھے پر اٹھا کر گاڑی تک لے جانا پڑا تھا۔

کارروائی کرنے والے، جاوید علی سمیت گاڑی میں بیٹھ گئے تو گاڑی آگے بڑھ گئی۔ جاوید علی یہاں جلدی میں آیا تھا اس لیے اسے اپنے پیچھے گاڑی یہاں کھڑی رہ جانے کی ٹینشن نہیں تھی۔ سی ایف پی اور پولیس کا کوئی ایڈونچر ہونے کے باوجود انہوں نے احتیاط رکھی تھی کہ پولیس کو بھی ان کا کوئی اتا پتہ نہ ملے۔ وہ پولیس کے محکمے میں بھری ہوئی کالی بھیڑوں کی وجہ سے ان پر کبھی بھی پورا اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اس کارروائی کے لیے بھی پولیس والوں کو اوپر سے بس اتنے احکامات دیئے گئے تھے کہ خفیہ ایجنسی کے دو افراد انہیں اپنے ساتھ جس جگہ لے جائیں، وہاں بغیر کسی جھجک کے ریڈ کر دیں اور ریڈ کی جگہ پر سے یہ دونوں افراد جو کچھ اپنی تحویل میں لینا چاہیں، لینے دیں۔ پولیس کا کام صرف اتنا ہو گا کہ عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کر کے عمارت اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد آگے کی کارروائی کے لیے انہیں مزید ہدایات جاری کی جائیں گی۔

مقامی تھانے کا انچارج اور دیگر افسران اگرچہ ان احکامات پر جز بز تو ہوئے تھے، خاص طور پر انہیں یہ بات بری طرح کھلی تھی کہ انہیں استعمال تو کیا جا رہا ہے لیکن اعتماد نہیں کیا جا رہا تھا لیکن حکم کی تعمیل مجبوری تھی کہ احکامات آئے ہی اوپر سے اور سختی کے ساتھ تھے کہ ان کے پاس چوں چرا کی گنجائش نہیں تھی۔

''ہاں، کیا رہا؟'' گاڑی نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ جاوید علی کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی اور سنجیدگی سے بولا۔

''پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دی ہیں۔ تھانہ انچارج کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ اس کارروائی پر بالکل بھی خوش نہیں ہے اور مجبوری میں ہی سب کچھ کر رہا ہے۔ اوپر کے احکامات کے علاوہ تھوڑا دباؤ میڈیا کا بھی ہے۔ ہم جس نیوز رپورٹر کو اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ وہ اپنے ہینڈی کیم سمیت مسلسل پولیس والوں کے سر پر سوار ہے۔ میڈم دیبا نے بھی خاصا شور مچا رکھا تھا اور پولیس والوں کو مسلسل دھمکیاں اور گالیاں دے رہی تھی کہ پابندی سے ملنے والے ماہانہ بھتے کے باوجود انہوں نے اس کے سینٹر میں قدم رکھنے کی جرأت کیسے کی۔ وہ تو تھانہ انچارج نے ہی میڈیا کے بندے کی موجودگی کا احساس دلا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ورنہ پبلک کو اور بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو مل جاتا۔'' دوسری طرف موجود شخص پُر جوش انداز میں اسے تفصیلات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے آگاہ کرنے لگا۔

''یہ سب تو ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، تم لوگوں کے کام کا کیا رہا؟'' اس نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

''ہم نے کافی کچھ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ مختلف مقامات خصوصاً کمروں میں نصب کیمروں سے تیار کی جانے والی ویڈیوز ہمارے قبضے میں ہیں۔ اس کے علاوہ کمپیوٹرز سے ہارڈ ڈسکس بھی نکال لی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود مجھے لگتا ہے کہ یہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ ہم دو افراد محدود وقت میں سب کچھ نہیں دیکھ سکیں گے۔ ہمیں اس عمارت کو اپنی کسٹڈی میں لینا ہوگا۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''ٹھیک ہے۔ پولیس والوں کو بتا دو کہ فی الحال وہ عمارت سے ملازمین کے علاوہ کوئی بھی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے اور وقتی طور پر عمارت کا کنٹرول بھی انہیں تمہارے ہاتھ میں دینا ہوگا۔ بعد میں ضروری کارروائی کر کے عمارت ان کے حوالے کر دی جائے گی۔'' اس نے ہدایت جاری کی۔

''او کے باس!.....اور کچھ؟''

''اور یہ کہ اس نیوز رپورٹر سے ہوشیار رہنا۔ اسٹوری بنانے کے چکر میں یہ لوگ اپنی حدود سے تجاوز کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اور یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ اس ریڈ میں سی ایف پی یا کسی دوسرے خفیہ ادارے کی شمولیت کا قطعی ذکر نہیں آنا چاہئے۔''

اس نیوز رپورٹر کو انہوں نے ایک بڑی اسٹوری کا لالچ دے کر خود اس کارروائی میں ساتھ رکھنے کا انتظام کیا تھا لیکن اس پر چند شرائط بھی لاگو کی گئی تھیں جن میں ایک کسی خفیہ ادارے کی موجودگی کو راز میں رکھنا بھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بس وہی کچھ ریکارڈ کر سکتا تھا جس کی اسے اجازت دی جاتی۔ رازداری کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی کیمرہ ٹیم اور ٹیکنیکل اسٹاف کو ساتھ لانے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی اور وہ تنہا ہی اپنے ہینڈی کیم کی مدد سے اس موقع کی کوریج کر رہا تھا۔

''ڈونٹ وری۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ یہاں سے جانے سے پہلے اسے اپنے کیمرے میں محفوظ ویڈیوز سمیت ہر چیز کی مکمل تلاشی دینی پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر تم اطمینان سے اپنا کام کرو۔ تم دونوں جب تک وہاں موجود ہو، تمہیں کور دینے کے لیے ہمارے ساتھی آس پاس موجود رہیں گے۔''

وہ موبائل آف کر کے واپس جیب میں رکھنے لگا تو ہاتھ خود بخود ہی اپنے گلے میں موجود تعویذ سے ٹکرایا۔ اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس تعویذ کو اپنے گلے سے اتار کر محفوظ کرنے کے لیے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔

آج کے اس مشن میں اس تعویذ نے بڑی کرامات دکھائی تھیں۔ بظاہر وہ سیاہ ڈوری میں پرویا ہوا عام سا چوکور تعویذ تھا لیکن حقیقت میں اس میں ایک نہایت طاقتور اور جدید ساخت کی ننھی سی ڈیوائس رکھی گئی تھی۔ اس ڈیوائس کی مدد سے اس کے ساتھی دُور گاڑی میں بیٹھے مساج سینٹر میں اس کی کسی بھی فرد سے ہونے والی گفتگو اچھی طرح سنتے رہے تھے۔

اس کے علاوہ اس میں ایک دوسرے کو کاشن دینے کی سہولت بھی موجود تھی۔ مساج سینٹر میں عالیہ سے سامنا ہوتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو کاشن دے دیا تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اسی طرح اسے کاشن دے کر اپنے ایکشن کے لیے ریڈی ہونے کا عندیہ دیتے رہے تھے۔ تعویذ کے ساتھ رابطے میں موجود جلد کی سطح پر یہ کاشن ایک تھرتھراہٹ کی صورت میں محسوس ہوتا تھا اور کسی دوسرے کو اس

کی نہیں ہو پاتی تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ عالیہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اپنی دانست میں تو وہ اس تو حید تک پہنچنے کے لیے کسی کھلنڈرے سے کیپٹن کو قابو میں کرنے جا رہی تھی لیکن کھیل ہی کھیل میں بازی پلٹ گئی تھی اور اب وہی صورت سے بھولا نظر آنے والا کیپٹن چہرے پر سخت تاثرات سجائے اسے بے خبری کے عالم میں اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔

بے ہوشی کی حالت میں پچھلی نشست پر بیٹھی عالیہ کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ شکل و صورت سے بھولا بھالا نظر آنے والا یہ کیپٹن اس کے ''را'' اور ''موسا'' سے ملتے تانے بانوں کی وجہ سے اس کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ''را'' والوں کی وجہ سے اپنی پہلی محبت کو کھویا تھا۔ اسے کبھی بھی، کسی بھی حال میں شازمین کا چہرہ بھولتا نہیں تھا اور افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس کی یادداشت میں ہر دم تازہ رہنے والا شازمین کا چہرہ اپنے خوب صورت خدوخال کے ساتھ نہیں بلکہ اس اذیت اور خوف کے ساتھ منجمد تھا جس سے وہ ''را'' کے ایجنٹوں کی تحویل میں گزری تھی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ''را'' کے کسی ایجنٹ کے ہاتھ آ جانے کے بعد وہ اس کے ساتھ کسی رُو رعایت یا نرمی سے کام لیتا۔ اس طرح عالیہ کا بُرا وقت اس کے بہت قریب آ گیا تھا لیکن وہ اس سے بے خبر پچھلی نشست پر بے ہوش پڑی کبھی دائیں والے تو کبھی بائیں والے کے کندھے پر گری جا رہی تھی۔

⊛----✪----⊛

''مجھے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا سر؟'' ذیشان نے اپنے فون پر عمیر آفندی کی کال ریسیو کی تو خود کو خاصی مشکل میں محسوس کیا۔

عمیر آفندی کو شہریار کی جگہ دلوانے میں سی ایف پی نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اس نے اب تک یہ ثابت کیا تھا کہ اس کا انتخاب درست ہے۔ وہ دیانت داری اور سمجھ داری کے ساتھ اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دے رہا تھا لیکن اس دوران اسے ایک بڑے صدمے سے گزرنا پڑا تھا۔ اس کا کزن اظفر جو درحقیقت سی ایف پی کا جوان تھا، جنگل کا راز جاننے کی کوشش میں اپنے ساتھیوں سمیت اپنی جان گنوا چکا تھا۔ عمیر ہی تھا جس نے اس بات کا کھوج لگایا تھا کہ اظفر اور اس کے ساتھیوں کی موت کے پیچھے کوئی حادثہ نہیں بلکہ باقاعدہ قاتلانہ منصوبہ موجود تھا اور اسی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد تحقیقات کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ وہاں جنگل میں ایسا کیا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑ رہی ہیں۔

''مجھے تمہارے جذبات کا پوری طرح احساس ہے عمیر! شاید تم یقین نہیں کرو لیکن اظفر کو کھونے کا ہم سب کو بھی اتنا ہی دُکھ ہے جتنا تمہیں۔ بلکہ ہمارا دُکھ تو اس حوالے سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اظفر کے ساتھ ہم نے اپنے چار ساتھی مزید گنوائے ہیں اور ہم مزید کوئی کارروائی کرنے میں تذبذب کا شکار بھی اسی لیے ہیں کہ کہیں کسی بھرپور پلاننگ کے نہ ہونے کی صورت میں ہمیں مزید نقصان نہ اٹھانا پڑے۔'' آخر خود کو سنبھال کر اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یوں کہیں کہ آپ لوگ ڈر رہے ہیں اور آپ کے پاس اظفر جیسا کوئی دوسرا بندہ نہیں ہے جو بے خوف اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔'' وہ ذرا تلخ ہوا۔

''تم غلط ہی نہیں سمجھ رہے، ہمارے ساتھیوں کے ساتھ زیادتی بھی کر رہے ہو۔ ہم میں سے ہر ایک ہر وقت وطن کی خاطر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اندھا دھند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے آدمیوں کو آگ میں جھونک دیں۔ ہمارا ہر ایک ساتھی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے اور اظفر جیسے خوبیوں والے جوانوں کو کھونے کے بعد ہم سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کی صورتِ حال کتنی خراب ہے۔ ہم اس کو بھولے نہیں ہیں کہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی کارروائی کرنی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ افرادی قوت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے تھوڑا انتظار کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے لوگ کئی دوسرے محاذوں پر مصروف ہیں اور فی الحال ہم اس طرف توجہ دینے پر مجبور ہیں۔ جنگل میں آپریشن کرنا ہماری آئندہ کی پلاننگ میں شامل ہے لیکن اب یہ آپریشن پولیس کے ذریعے نہیں کرنا چاہتے۔ پولیس میں موجود کالی بھیڑوں اور رازداری کے فقدان کی وجہ سے ایسی کوئی کوشش وقت اور پیسے کے زیاں کے علاوہ کچھ ثابت نہیں ہوگی۔ چنانچہ چاہے تمہیں کتنا ہی ناگوار گزرے، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمہیں بھی ہماری طرح موزوں وقت تک کے لیے صبر کرنا ہوگا۔'' اس نے عمیر کے تلخ جملے کے جواب میں ذرا طوالت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ لوگ مشابرم خان کو بھی واپس ڈیوٹی پر نہیں بھجوا رہے ہیں۔ وہ میرے پاس آ جائے تو کم از کم دونوں ہی مل کر کچھ کر ڈالیں گے۔ وہ جی دار بندہ ہے، میرا ساتھ ضرور دے گا۔'' عمیر کی سُوئی ابھی تک اٹکی ہوئی تھی۔

مشابرم خان کے معاملے میں ہم مجبور ہیں۔ وہ کچھ ایسے معاملات میں ملوث ہو گیا ہے کہ اب اس کا منظرِ عام پر آنا خود اس کی جان کی سلامتی کے لیے خطرناک ہوگا۔ کم از کم اب وہ اپنی پہلی والی جگہ پر تو ہرگز کام نہیں کر سکے گا۔ اس کے لیے ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں۔'' ذیشان نے اسے دوٹوک جواب دیا۔

''اس طرح تو میں یہاں کچھ نہیں کر سکوں گا اور چودھری اور اس کے گرگے اپنی من مانی کرتے رہیں گے۔'' وہ جھنجلایا۔

''ایک بات یاد رکھو عمیر! ہم قصائی نہیں ہیں۔ ہم اپنے لوگوں کی وطن کے لیے محبت اور جذبات کو دیکھتے ہوئے اُنہیں کسی مذبح خانے میں ایسے ہی نہیں دھکیل دیتے۔ اگرچہ ہم ہیں ہی خطروں کے کھلاڑی پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ایک ایک فرد کی حفاظت کا خیال رکھیں۔''

ذیشان بھی اب بے حد سنجیدہ موڈ میں آ چکا تھا لیکن عمیر کی ذہنی رو شاید کچھ بہکی ہوئی تھی چنانچہ اس نے جھنجلاہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ذرا غصے سے بولا۔

''آپ احتیاطیں ہی کرتے رہیں گے اور یہاں چودھری اور اس کے گرگے خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہاں ایسا کوئی فرد نہیں جو ان کے ہاتھ پکڑ سکے۔ وہ خود کو قانون کی گرفت سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔''

''وہاں کون سا نیا واقعہ ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں جان سکوں کہ تم اتنے ڈسٹرب کیوں ہو؟'' ذیشان کا لہجہ یک دم ہی نرم پڑ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو عمیر جیسے کھرے شخص کے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی ہے۔

چودھری کے گاؤں میں ہونے والے سالانہ عرس کے بارے میں تو آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے۔ اپنی اسی پالیسی کے مطابق کہ چودھری سے اُلجھے بغیر اپنے کام کیے جاتے رہیں۔ میں اس عرس میں شریک ہوا تھا لیکن صرف کھانے کے وقت تک۔ میرے پی اے عبدالمنان نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چودھری کے اصرار پر وہاں رات بسر کرنے والے عیاشی اور فحاشی کی ہر حد پھلانگ جاتے ہیں اور ظاہر ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عرس کی رات وہاں بڑا ہنگامہ ہوا اور چودھری نے تشدد کے ذریعے وہاں آئی

طوائف کو قتل کر ڈالا۔ اصولاً اس پر قتل کا مقدمہ چلنا چاہئے تھا لیکن چودھری نے نائیکہ کا منہ نوٹوں سے بھر بند کر دیا اور اس کے اپنے ذاتی ملازمین میں سے تو کسی کے منہ کھولنے کا ویسے ہی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا تو بے چاری طوائف کے قتل کا مقدمہ کون درج کرواتا؟ اب آپ بتائیں کہ وہ عورت بے شک طوائف تھی اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک انسان کا یہ حق ہے کہ اگر کسی نے اس پر زیادتی کی ہے تو ذمے دار افراد اس کی دادرسی کریں۔ وہ مظلوم طوائف اپنی جان سے جانے کے بعد قبر کے اندھیروں میں منتظر ہوگی کہ کسی طرح تو نظامِ انصاف کام کرے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ سرے سے کوئی مدعی اور گواہ ہی نہیں ہے۔''

عمیر اپنے ڈپریشن کی وجہ آہستہ آہستہ بتاتا چلا گیا۔ حادثے کا علم اسے ان خبروں کے ذریعے ہوا تھا جن پر چھپانے کی کتنی ہی کوشش کی جائے، مگر وہ سرگوشیوں کی صورت اردگرد گردش کرتی رہتی ہیں۔

''یہ واقعی بہت افسوس ناک واقعہ ہے لیکن اس واقعے پر بیٹھ کر صرف افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کوشش کرو کہ کسی طرح اس معاملے میں چودھری پر گرفت کی جا سکے۔'' ذیشان نے خود بھی افسوس کرتے ہوئے اس کو مشورہ دیا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں؟ جبکہ کہیں قتل کا کوئی مقدمہ ہی درج نہیں ہوا ہے اور نہ ہی کوئی عینی شاہد موجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق موت کی وجہ سیڑھیوں سے گرنا قرار دی گئی ہے۔'' وہ کچھ مایوس سا تھا۔

''تم یہ کر سکتے ہو کہ اس کیس کی تحقیقات کرواؤ۔ وہاں پولیس میں ڈی ایس پی منظور نامی ایک آدمی کافی اثر و رسوخ کا ہے۔ تم پیچھے رہتے ہوئے اس سے اس سلسلے میں کام لے سکتے ہو۔ مرنے والی کی قبر کشائی کروا کر اس کا پوسٹ مارٹم کرواؤ۔ لیکن اس سے پہلے اس کا کوئی ایسا والی وارث یا قریبی سہیلی وغیرہ ڈھونڈو جو اس حادثے پر دل سے افسردہ ہو اور اس بات پر راضی ہو جائے کہ چودھری کے نام نہ سہی، کسی نامعلوم فرد کے خلاف ایف آئی آر درج کروا دے۔ نائیکہ نے رقم لے کر خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے سب نے بھی اس صورتِ حال کو قبول کر لیا ہو۔ لوگ کسی کی طاقت سے خوف زدہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ سارے کے سارے لوگ ہی بے حس ہوں۔ وہاں اس کوٹھے پر کوئی تو ہوگا جسے اس صورتِ حال نے توڑا ہوگا۔ تمہارا کام ہے کہ کسی بھی طریقے سے اس شخص کا کھوج لگاؤ۔ باقی رہی گواہ کی بات تو وہ تمہیں پولیس کے اندر بھی مل سکتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق چودھری کے چھوٹے بیٹے بہزاد شاہ کی بیوی فریدہ اپنے سسر سے سخت نفرت کرتی ہے اور اگر ہم کسی طرح اس تک رسائی حاصل کر لیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ گواہی کے لیے تیار ہو جائے گی۔'' وہ ایک کے بعد ایک مشورے دیتا چلا گیا جو عمیر آفندی کے دل کو لگے۔

''آپ نے مجھے بہت اچھی لائن آف ایکشن دے دی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چودھری کی گردن گرفت میں لے سکوں۔'' حسبِ توقع وہ کوئی راہ نظر آتے ہی پُرجوش ہو گیا۔

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔'' ذیشان جانتا تھا کہ چودھری جیسے بندوں کے لیے اس نظام میں اس قسم کے الزامات سے بچنے کے لیے کتنی گنجائش اور سہولتیں موجود ہیں پھر بھی اس کی ہمت بندھائی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ قتل کے اس کیس میں بے شک چودھری کو کوئی سزا نہ ملے اور الزام ثابت نہ ہو، پھر بھی اتنا ہوگا کہ اس کے دامن پر لگنے والے داغوں میں ایک داغ کا اضافہ ہو جائے گا۔

''میں اس کیس کو حل کرنے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔'' عمیر نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''ہم بھی اظفر کے قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اور انہیں ایک دن ان کے انجام تک ضرور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچائیں گے۔'' جواباً ذیشان نے اسے یقین دہانی کروائی اور دوسری طرف کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

اگرچہ اس نے بہت سبھاؤ سے عمیر کو اس وقت نمٹایا تھا لیکن خود اس کے اپنے اعصاب جھنجھنا اُٹھے تھے اور وہ کسی بھی کام کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ چنانچہ عجیب اعصاب زدہ حالت میں اپنی نشست چھوڑ دی اور ایک ایسی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا جس میں بے شمار کیسوں کی فائلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک فائل اظفر والے کیس کی بھی تھی۔ اس فائل کو الماری سے نکال کر وہ اپنی میز تک آیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

فائل میں اظفر اور اس کے ساتھیوں کی پیر آباد روانگی سے لے کر ان کے قتل تک کی تمام ممکنہ معلومات موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک نقشہ بھی موجود تھا۔ یہ نقشہ انہیں اظفر کے سامان سے ملا تھا۔

فائل پڑھتے ہوئے اس نے وہ نقشہ بھی کھول ڈالا۔ جنگل کے بارے میں اس معلوماتی نقشے پر اظفر نے بہت سے نشان لگائے تھے لیکن ان نشانوں میں ایک نشان بہت نمایاں تھا۔ اظفر نے اپنی نوٹ بک میں اعصاب زدہ مقام تک پہنچنے کے لیے عین اسی دن کی تاریخ لکھی تھی جس دن اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا گیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان سب کی لاشیں اس مقام سے بہت دور بالکل مختلف سمت میں ملی تھیں جبکہ اگر لوگ کسی حادثے کا شکار ہوئے بھی تھے تو اصولاً ان کی لاشیں اس مقام کے اطراف میں یا اس کی طرف جانے والے راستے پر ملنی چاہئے تھیں۔ یہ نکتہ شروع ہی سے اس کے ذہن میں کھٹکتا رہا تھا۔ اب ایک بار پھر فائل دیکھنے پر وہ کھٹک بیدار ہو گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی اس سمت میں دوبارہ کام شروع کیا گیا اس نکتے کو سب سے زیادہ اہمیت دینے پر زور دے گا۔

⊛----✪----⊛

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔

یہ ممبئی سے دہلی جانے والی نان اسٹاپ ٹرین تھی اور وہ دونوں فرسٹ کلاس کے کوپے میں بیٹھے اس عجیب بریف صورتِ حال پر حیرت زدہ تھے۔ آج ہی تو وہ دہلی سے اپنی جان بچا کر ممبئی پہنچے تھے لیکن ممبئی کے اسٹیشن پر اُترتے ہی ان کے ساتھ عجیب و غریب واقعات کا آغاز ہو گیا تھا اور واقعات کے اس تسلسل کے نتیجے میں وہ ایک بار پھر دہلی کی طرف جا..... بلکہ بھیجے جا رہے تھے۔

ان کے حساب کتاب کے مطابق اس وقت ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ انسپکٹر پریم ناتھ پر گھات لگا کر اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جاتے اور اس کا دماغ ٹھکانے پر لانے کی تدبیریں کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس نے اچانک یہ ترقی کی راہیں کس طرح طے کیں اور اس میں ڈاکٹر فرحان جمیل والے کیس کا کتنا دخل ہے؟ پریم ناتھ کی ترقی اور فرحان جمیل کے کیس کا آپس میں ربط مل جانے کی صورت میں ان کے لیے انہیں تلاش کرنے میں کچھ آسانی ہو جاتی۔ وہ کوشش کرتے تو شاید یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ فرحان جمیل کو اس کے ننھیالی گاؤں سے اغوا کر کے کس جگہ رکھا گیا ہے۔ کم از کم کوئی کلیو تو مل ہی جاتا۔ لیکن یہاں الٹی ہی کہانی شروع ہو گئی۔ وہ اس عجیب سی رپورٹر لڑکی اندو کی مہربانی سے ممبئی سے واپس دہلی جانے والی ٹرین میں بیٹھے ہوئے تھے اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔

دہلی تک جا کر واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا اور یہ اندیشہ بھی رہتا کہ وہاں پہنچنے کی صورت میں کہیں نادر دادا یا اس کے آدمیوں سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ ناگزیر حالات کے علاوہ وہ کسی بھی شخص سے براہِ راست تصادم کے حق میں نہیں تھے اور اب اس وبال سے نکلنے کی مشترکہ کوشش کر رہے تھے۔

''انہیں ہمارے بریف کیس کھولنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' کوئی موضوعِ گفتگو نہ پا کر سلو نے ایک بار پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔

وہ بہت ایمرجنسی میں بالکل ٹرین کے چلنے کے وقت پر وہاں پہنچے تھے، اس کے باوجود سلو نے کوپے میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنے بریف کیسوں کو چیک کیا تھا اور چیک کرنے کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ بریف کیسوں کو کھولنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم کوشش کرنے والوں کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

بریف کیس ان کے لیے بہت اہم تھے۔ ایک طرف وہ اگر انہیں کاروباری نظر آنے والے معززین شمار کرواتے تھے تو دوسری طرف ان میں ان کا بہت سا اہم سامان موجود تھا۔

''اسے تجسس کے علاوہ کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ اندو صحافی ہے جو کہ فطرتاً ہوتے ہی کھوجی ہیں۔ اور اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ جرائم پیشہ افراد کی آلۂ کار بھی بنی ہوئی ہے۔ ہمارے متعلق جاننے کے شوق نے اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ قدم اُٹھوایا ہوگا لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں رہے ہیں۔'' شہریار نے اپنا خیال پیش کیا۔ اس تیز رفتار ٹرین میں بیٹھ کر وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے؟

''ایک طرح سے یہ اطمینان کی بات ہے بھی اور نہیں بھی۔ اطمینان اس بات کا کہ وہ لوگ بریف کیس میں موجود اشیا کے بارے میں نہیں جان سکے لیکن اگر اندو کی شخصیت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی اس بات پر خاصی بے چین ہوگئی ہوگی کہ عام سے کاروباری افراد کے پاس اس طرح کے بریف کیس کیونکر موجود ہیں جو ایک گینگ کے ماہر غنڈوں سے بھی نہیں کھل پائے۔''

سلّو نے جو تجزیہ پیش کیا، وہ قابلِ غور تھا۔ جرائم کی دنیا سے وابستہ افراد کی حِس کسی گڑبڑ کو محسوس کرنے کے معاملے میں دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے اس لیے بہت ممکن تھا کہ اندو نے ان کی اس کے بارے میں بتائی گئی تفصیلات میں سے کسی پر بھی یقین نہ کیا ہو۔ لیکن اس صورت میں سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس کا اگلا اقدام کیا ہوگا۔ ظاہری طور پر تو اس نے اخلاقی تقاضے پورے کرتے ہوئے ان دونوں کو بھائی کے گرگوں کے چنگل سے چھڑا کر ممبئی سے بحفاظت نکال دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید کی تھی کہ دہلی سے سیدھے اپنے شہر پانی پت چلے جاؤ۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرے رخ سے دیکھا جاتا تو سمجھ آتی کہ اندو کے نزدیک وہ دونوں مشکوک افراد ہیں چنانچہ اس نے کوئی نہ کوئی ایسا انتظام کیا ہوگا کہ ان کے بارے میں حقیقت جان سکے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ دہلی ریلوے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد انہیں ایسے افراد کا سامنا کرنا پڑے جو ان کے بارے میں کھوج لگانے پر مامور ہوں۔ دہلی سے پہلے کوئی ایسا امکان اس لیے نہیں تھا کہ یہ ٹرین نان اسٹاپ دہلی جا رہی تھی۔

''ہمیں اس لڑکی سے اپنا پیچھا چھڑانا ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم دہلی پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی کہیں غائب ہو جائیں اور ٹرین کے بجائے کسی اور ذریعے سے واپس ممبئی پہنچیں۔'' وہ جیسے جیسے غور کر رہا تھا، ذہن میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ اندو نامی وہ لڑکی اتنی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا بہت ضروری تھا۔ ویسے بھی دوبارہ اتنا لمبا سفر طے کر کے دہلی واپس جا پہنچنے کی تو کوئی تک ہی نہیں تھی۔ اندو کے بارے میں اپنی سوچ کو وہ واہمہ بھی قرار دے دیتے، تب بھی ان کے لیے مناسب تو یہی تھا کہ وہ دہلی نہ جائیں اور راستے میں ہی کہیں ڈراپ ہو جائیں۔ مگر کیسے؟..... یہ ایک سوال تھا جو ان کے ذہنوں میں گونج رہا تھا۔ آخر وہ سوچ سمجھ کر ایک منظم منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

شہریار نے گھنٹی کا بٹن دبا کر فرسٹ کلاس میں سروس فراہم کرنے والے بیرے کو اپنے کوپے میں بلوایا۔ جس وقت بیرا کوپے میں آیا، سلّو اوپر کی برتھ پر سینے تک چادر اوڑھے لیٹا تھا اور بہت دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔

''میرے لیے ایک کپ کافی لا دو۔ اگر ہو سکے تو میرے ساتھی کے لیے کوئی پین کلر بھی لے آنا۔ میں گردوں کا مریض ہے اور بدقسمتی سے اس نے اپنی دوائیں ساتھ نہیں رکھی تھیں۔ اب اسے درد شروع ہو گیا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ دہلی تک کس طرح پہنچے گا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جاگ کر اس کے سرہانے ڈیوٹی دینی پڑے گی اسی لیے میں کافی کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''

اس نے بیرے کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کیا جس پر اس کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن

اسے دلاسا دینے کے لیے وہ مسکرایا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

''ڈونٹ وری سر! میں ابھی دونوں چیزیں پہنچاتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ ان کی حالت سنبھل جائے گی۔''

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کی پیالی اور پین کلر سمیت واپس آ گیا۔ اس بار سلّو کی کراہیں کچھ زیادہ بلند ہو گئیں۔ بیرے نے اسے پانی کے ساتھ ہمدردی سے وہ گولی کھلائی اور سہارا دے کر دوبارہ تکیے پر لٹا دیا۔

''اور کوئی کام سر؟'' سلّو کو لٹانے کے بعد وہ شہریار کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہو کر پوچھنے لگا۔

''نہیں تم جاؤ۔ کوئی ضرورت ہوئی تو بتا دیں گے۔''

اس نے جواب دیا تو بیرا باہر نکل گیا۔ لیکن پندرہ منٹ بعد ہی شہریار نے اسے دوبارہ کال کر لیا۔ اس بار سلّو کی کراہیں باقاعدہ چیخوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

''میرے خیال میں میرا ساتھی دہلی تک سفر نہیں کر سکے گا۔ ہمیں راستے میں کہیں اُترنا ہوگا۔'' چہرے پر پناہ پریشانی کے تاثرات سجائے شہریار نے اس سے کہا لیکن خود سلّو کو سنبھالنے میں لگا رہا جو بہترین اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درد سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

''میں اوپر والوں کو انفارم کرتا ہوں۔'' چہرے پر تشویش سجائے بیرا وہاں سے واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دو افراد ان کے کوپے میں موجود تھے۔

''ٹرین رُکوا کر ہمیں کسی نزدیکی شہر میں اُتارا جائے۔'' شہریار نے ان کے سامنے بھی مطالبہ کیا جس پر ان میں سے ایک نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔

''یہ نان اسٹاپ ٹرین ہے۔ اسے درمیان میں روکنا بہت مشکل ہوگا۔''

''ہم کوشش کرتے ہیں کہ مسافروں میں سے کوئی ڈاکٹر مل جائے تو ان کی تکلیف کم کرنے کا بندوبست کیا جا سکے۔'' دوسرے شخص نے تحمل سے کہا لیکن شہریار اس پر چڑھ دوڑا اور بہت سی باتیں سنائیں جن کا لبِ لباب تھا کہ ٹرین کا عملہ غفلت کا مرتکب ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ساتھی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ٹرین میں کسی ڈاکٹر کو تلاش کرنے کے بجائے انہیں قریبی اسٹیشن پر اُتار دیا جائے جہاں سے وہ کسی ہسپتال جا کر علاج کروا سکیں۔

کافی لیت و لعل کے بعد اُن کا یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ کراہتا، نڈھال ہوتا سلّو، شہریار کے سہارے ٹرین سے نیچے اُترا۔ دہلی جانے والی ٹرین کچھ ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد آگے بڑھ گئی جبکہ انہیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ سلّو کی اداکاری کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا۔

''ابھی ایمبولینس آتی ہی ہوگی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے اسے تسلی دینے کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ سلّو بمشکل کرسی پر بیٹھا اور دہرا ہو گیا۔

اسٹیشن کا بوڑھا ماسٹر سلّو کی حالت دیکھ کر خائف ہوا جا رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جلد ہی ایمبولینس پہنچنے کی اطلاع پہنچ گئی۔ شہریار، سلّو کو سہارا دے کر کمرے سے باہر لے گیا اور ایمبولینس میں موجود اسٹریچر پر لٹا دیا۔ ساتھ ہی سائیڈ پر لگی پتلی سی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھی اور اسٹیشن سے باہر نکل کر مختلف راستوں پر دوڑنے لگی۔

''بس دوست! گاڑی روک دو۔ اس سے آگے کا سفر ہم خود کریں گے۔'' گاڑی نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شہریار نے پسٹل نکال کر ڈرائیور کے سر پر رکھ دیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر! پیشنٹ کو ہسپتال پہنچانا ہے۔'' ڈرائیور اس ناگہانی پر بوکھلا گیا لیکن فوراً ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ مریض کی کراہیں سنائی نہیں دے رہیں اور وہ آرام سے اسٹریچر پر بیٹھا ہوا رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ گاڑی روکو اور جیسا ہم کہتے ہیں، کرو۔'' سلّو نے اسے دھمکایا۔

''گاڑی رُکنی نہیں چاہئے ڈرائیور!..... یہ کون ہیں، ان سے یہ ہم خود معلوم کر لیں گے۔'' اچانک ہی کوئی چھلاوا سا سلّو کے اسٹریچر کے نیچے سے برآمد ہوا اور اپنی خوف ناک گن سے بیک وقت ان دونوں کو نشانے پر لیتا ہوا بولا۔

اس کی شکل دیکھ کر وہ دونوں دنگ رہ گئے۔ یہ تو وہی بیرا تھا جو بڑی انکساری سے ٹرین میں ان کی خدمات انجام دیتا رہا تھا۔

''کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کا خیال من میں ہے تو اسے نکال دو۔ اگر تم دونوں نے کسی طرح بھی قابو کر بھی لیا تو ان لوگوں سے نہیں بچ سکو گے جو ساتھ والی گاڑی میں تمہارے لیے ہی موجود ہیں۔'' وہ فوری حیرت کے جھٹکے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس نے انہیں مطلع کیا۔

بے ساختہ ہی ان کی نظریں ایمبولینس کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر گئیں۔ وہاں واقعی ایک ہائی روف نما گاڑی موجود تھی اور اس میں سوار مسلح افراد کے ہتھیاروں کی نالیں یقینی طور پر انہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''دیکھ بھائی! ادھر ہمارا کسی سے کوئی لڑا نہیں ہے۔ ہم اپنے کام سے جا رہے ہیں۔ تُو اپنا راستہ لے۔'' وہ دونوں ہی اسلحہ دیکھ کر ڈر جانے والے نہیں تھے لیکن غیر متوقع مصیبت سر پر ٹوٹ پڑنے پر تھوڑے سے سٹپٹا گئے۔

''مجھے کیا کرنا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔'' ٹرین میں انہیں بڑے ادب سے اپنی خدمات پیش کرنے والا بیرا اس وقت یکسر بدل چکا تھا اور خوفناک تیور پیش آ رہا تھا۔

''اگر تجھے پتہ ہے کہ تجھے کیا کرنا ہے تو ہم کو بھی تو پتہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ تیرے ساتھ جا کر اپنا ٹائم کیوں خراب کریں گے؟''

سلّو پر اس کے خوفناک انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اسے طیش دلا کر ایسا کوئی موقع تلاش کرنا چاہتا تھا جب اس پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔

لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ایمبولینس میں اس بیرے پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ایمبولینس کے ساتھ ساتھ دوڑتی گاڑی میں سوار مسلح افراد کیا کرتے جن کی گنز کے رُخ اُنہی کی طرف تھے۔

ہائی روف میں سوار ان بندوں کا جائزہ لیتے ہوئے اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ ایمبولینس کے ساتھ یہی واحد گاڑی نہیں دوڑ رہی بلکہ پیچھے ایک پولیس جیپ بھی موجود ہے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی اور وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ان سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے جو گاندھی نگر میں اُترتے ہی انہیں پولیس نے گھیر لیا ہے۔ البتہ یہ طے تھا کہ جو بھی گڑبڑ تھی، اس کا آغاز ممبئی سے ہی ہو گیا تھا۔ اور ان کے کوپے میں خدمات فراہم کرنے والے بیرے کو بطورِ خاص ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ بیرا نہیں بلکہ

بیرے کا سوانگ بھر کر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے آتی پولیس جیپ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ کسی وجہ سے وہ قانون کی نظر میں آ گئے ہیں۔

ایمبولینس کے ساتھ چلتی ہائی روف میں سوار مسلح افراد اگرچہ سادہ پوش تھے پھر بھی ان کی وضع قطع دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پولیس کے محکمے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اُنہیں اندو نے ممبئی سے دہلی جانے والی ٹرین کے پہلے سے بُک کوپے میں سوار کروایا تھا اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ بیرا اسی کا آدمی تھا اور ان کے ٹرین سے اترتے ہی خود بھی پیچھے اُتر گیا تھا۔

اگر وہ تنہا ان کے مقابل آتا، تب بھی شہریار اتنی بری طرح نہ چونکتا۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ تھی کہ ایمبولینس کے اسٹیشن پہنچنے کے مختصر عرصے میں نہ صرف اس نے پولیس کی مدد حاصل کر لی تھی بلکہ خود بھی ذاتی طور پر انہی کی ایمبولینس میں گھس بیٹھا تھا۔ اتنی تیزی سے یہ سب کر لینا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اندو نے اپنا تعلق کسی اشوک صاحب کے گینگ سے بتایا تھا لیکن اسے نہیں لگتا تھا کہ ممبئی کے ایک ادارے کی اتنی پہنچ ہو گی کہ وہ وہاں سے اتنی دور گاندھی نگر میں اتنا بہترین انتظام کر سکے۔ اور پھر کسی گینگ سے تعلق رکھنے والے فرد کو اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ایسے گینگ جو بھی قدم اُٹھاتے ہیں، اپنے مفادات کی خاطر اُٹھاتے ہیں اور ظاہر ہے سلّو اور شہریار دونوں کا ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال کسی کوڑیالے سانپ کی طرح سنسنا رہا تھا کہ اندو وہ نہیں جو اس نے خود کو ان کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ وہ شاید کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے آدمیوں کی مدد سے بہت آسانی سے انہیں گھیر لائی تھی۔

''تیری ایسی کی تیسی.....'' وہ ایمبولینس کے ساتھ اور پیچھے دوڑتی گاڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ سلّو نے ایمبولینس کے اندر کارروائی ڈال دی اور جانے کس ترتیب سے اپنے ہر پہلو اور بیرے سے اس کی گن چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ خود شہریار تو بس لمحہ بھر کی ہلچل کو محسوس کرنے کے ساتھ بیرے کے منہ سے نکلنے والی گالی ہی سن سکا اور اب حالات یہ تھے کہ بیرے کی اپنی گن کی نال اس کے سر سے لگی ہوئی تھی۔ سلّو کی اس پھرتی پر جہاں وہ ششدر رہ گیا، وہیں ساتھ دوڑتی ہائی روف میں سوار افراد کے تیور بھی بگڑ گئے۔

''اسے چھوڑ دے۔ ورنہ کتے کی موت مارا جائے گا۔'' ان میں سے ایک نے چیخ کر دھمکی دی۔

''اپنی گاڑیاں یہاں سے دُور لے جاؤ۔ ورنہ میں اس کا بھیجا اُڑا دوں گا۔'' دھمکی سے خائف ہونے کے بجائے سلّو نے جوابی دھمکی دی اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بیرے کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گن کا دباؤ بڑھایا۔ اُس کے اس انداز پر نہ صرف بیرے کا چہرہ متغیر ہوا بلکہ ہائی روف سواروں کے چہروں پر بھی تذبذب کی کیفیت نظر آنے لگی اور یوں محسوس ہوا کہ وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب اُنہیں کیا کرنا چاہئے۔

''یہ تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اگر تم نے مجھے مار بھی دیا تو اس شہر سے باہر نہیں نکل پاؤ گے۔ اس ہر ایگزٹ پر ناکا لگا دے گی۔'' بیرے نے سلّو کو دھمکی آمیز انداز میں سمجھایا۔

شہریار خود بھی کسی حد تک اس سے متفق تھا لیکن اب جبکہ سلّو قدم اٹھا چکا تھا تو اس کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یوں بھی وہ جس صورتِ حال میں گھرے ہوئے تھے ان کے آگے کھائی اور پیچھے کنواں والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاملہ تھا۔ اگر ابھی گرفتار ہو کر پولیس کے کسی ٹھکانے پر پہنچ جاتے تو بھی پولیس نے ان کے ساتھ کوئی مہمانوں والا برتاؤ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے شکنجے سے نکلنے کے لیے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنا پسٹل تو پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھا جسے وہ کچھ دیر قبل ایمبولینس کے ڈرائیور کو دھمکانے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اب دوبارہ اس نے اس سے یہی کام لینا شروع کر دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہیں گاڑی کسی صورت نہیں روکنی ہے۔ اسے چلاتے رہو اور شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف چلو۔

''ٹھیک ہے جناب!'' ڈرائیور گھگھیایا۔ اُدھر سلّو ایمبولینس سے جونک کی طرح چمٹے پولیس اہلکاروں سے نمٹ رہا تھا۔

''دس تک گننے تک اگر تم لوگوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تو میں انجام کا سوچے بغیر اس کا بھیجہ اُڑا دوں گا۔'' دھمکی دینے کے ساتھ ہی وہ بلند آواز میں گنتی گننے لگا۔ ہائی روف، ایمبولینس سے اتنی قریب چل رہی تھی کہ یقیناً اس میں سوار لوگ سلّو کی گنتی کو سن سکتے تھے۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' کنپٹی سے لگی گن کے بڑھتے دباؤ کے ساتھ وہ صرف چھ تک گنتی برداشت کر سکا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

اُس کی چیخ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہائی روف کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس جیپ نے بھی اپنی رفتار گھٹا دی۔ چند منٹوں میں ایمبولینس اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ دونوں گاڑیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس طرف سے تھوڑا اطمینان ہوا تو شہریار پیچھے سے کُود کر اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ ڈرائیور جو پہلے ہی خوف زدہ تھا، اس نے اسے اپنے برابر میں بیٹھا دیکھا تو خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''میں غریب ڈرائیور ہوں صاحب! میرا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ آپ کو جہاں جانا ہے جائیے، مجھے یہیں اتار دو۔''

اس نے تقریباً روتے ہوئے شہریار سے التجا کی تو اُسے اُس پر رحم آ گیا۔ وہ غیر متعلقہ اور بے قصور آدمی تھا اور خوامخواہ اس مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ انہوں نے وقتی طور پر تو بے شک پولیس والوں سے پیچھا چھڑا لیا لیکن کچھ بھروسہ نہیں تھا کہ شہر سے نکلنے کی کوشش میں وہ کسی ناکے پر دھر لیے جاتے۔ نکلتے بھی تو خاصی مار دھاڑ کے بعد اور اس چکر میں اگر وہ بے چارہ ڈرائیور زد میں آ جاتا تو جانے پیچھے اس کے گھر والوں پر کیا گزرتی۔ وطن اور مذہب کی تفریق سے قطع نظر وہ ایک انسان تھا۔ وہ بھی بے قصور و بے ضرر انسان جو جانے کتنے افراد کے کنبے کی کفالت کا ذمے دار تھا۔ اُسے اس شخص کو اس جھگڑے سے الگ کر دینا ہی مناسب معلوم ہوا اور وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''گاڑی روکو۔''

ڈرائیور نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

''نیچے اُتر جاؤ۔'' اس نے دوسرا حکم صادر کیا جس کی ڈرائیور نے پہلے سے بھی زیادہ پھرتی سے تعمیل کی۔ اس کے اُتر کر دروازہ بند کرنے تک شہریار اُس کی جگہ سنبھال چکا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ ایمبولینس ہونے کی وجہ سے اسے بہت اچھے حال میں رکھا گیا تھا اور زیادہ رفتار پر بھی وہ بڑی سبک روی سے چل رہی تھی۔

''تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ہم تمہیں صرف معمول کی پوچھ گچھ کے لیے لے جا رہے تھے لیکن تم نے اپنی حرکتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ تم خطرناک مجرم ہو اور اب میرے ساتھی تم سے سختی کے ساتھ پیش آئیں گے۔'' سلّو کی گن تلے سانس لیتے بیرے نے انہیں دھمکی دی۔

''ہمارے ساتھ جو بھی ہو لیکن اس سے پہلے ہم تجھے نرک (جہنم) میں پہنچا کر چھوڑیں گے۔'' اس کی دھمکی سے خوف زدہ ہوئے بغیر سلّو نے اسے اس کے انجام سے باخبر کیا۔

''ویسے تم جھوٹ خوب بولتے ہو نقلی بیرے صاحب! معمول کی پوچھ گچھ کے لیے اتنا کھٹ راگ کون اپناتا ہے؟ اور تم تو ممبئی سے ہماری نگرانی کر رہے ہو۔ تم تو بس یہ بتاؤ کہ اس جرنلسٹ لڑکی اندو نے ٹپ دے کر تمہیں ہمارے پیچھے لگایا ہے یا وہ خود بھی تمہاری ساتھی یا باس ہے؟'' اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شہریار نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

''سنا نہیں بڑے بھائی نے تجھ سے کیا پوچھا ہے؟'' سلّو نے اُس کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم اتنی آسانی سے مجھ سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں مشکل کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔'' سلّو نے اسے ایک اور ہاتھ دے مارا۔

''ذرا شانتی سے کام لے یار! ابھی اس کی ضرورت ہے۔'' شہریار نے اسے ٹوکا۔ اس بندے کو ساتھ لے کر وہ بس حفاظت سے یہاں سے نکل جانے کا خواہش مند تھا۔ خوامخواہ کی مار دھاڑ اور خون خرابہ بیکار تھا اور وہ اپنی توجہ اصل مقصد، یعنی ڈاکٹر فرحان جمیل کی بازیابی پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ سیدھی سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔ ابھی تک کوئی رکاوٹ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ شہر کے نقشے سے ناواقف تھے لیکن ڈرائیور کو اتارنے سے قبل فرمائش کر چکے تھے کہ شہر سے باہر جانے والے راستے پر چلے۔ ڈرائیور کو اُتارنے کے بعد بھی وہ اسی سمت میں گاڑی دوڑا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے یہ ایک ایسی سڑک تھی جو بالکل سیدھی سیدھی چلتی جا رہی تھی اور ابھی تک اس پر ایسا کوئی مقام نہیں آیا تھا کہ اسے تذبذب کا شکار ہونا پڑتا۔ سڑک کے اطراف میں آبادی بھی نہیں تھی، بس کہیں کہیں کھیت یا باغ نظر آ جاتے تھے ورنہ زیادہ تر زمین ویران پڑی تھی۔ اس ویرانے میں سفر کرتے ہوئے ایک ہی ایمبولینس کو ایک زوردار دھچکا لگا اور فضا کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے گونج اٹھی۔ پہلے دھماکے کے بعد اگلے سیکنڈ میں ہی دوسرا دھماکا بھی سنائی دے گیا اور ایمبولینس بری طرح لہرانے لگی۔ سلّو کی گن بیرے کی کنپٹی سے ہٹ گئی۔ اس نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور نال پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ گن سلّو کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس دھینگا مشتی کے نتیجے میں ایک فائر بھی ہوا لیکن کسی کو بھی نقصان پہنچائے بغیر گولی ایمبولینس کی باڈی میں ہی کہیں پیوست ہو گئی۔ بیرے نے قابل ستائش پھرتی سے کام لیتے ہوئے گن کو سیدھا کیا اور نال سلّو کے پہلو سے لگا دی۔

''بس..... اب تمہارا کھیل ختم۔'' نال کو اُس کے پہلو میں چبھوتے ہوئے وہ بری طرح غرایا۔ اس موقع پر شہریار، سلّو کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے تو وہ پے در پے پھٹنے والے دو ٹائروں کی وجہ سے ڈگمگاتی ایمبولینس کو سنبھالنے میں اُلجھ گیا اور جب اسے روکنے میں کامیاب ہوا تو دس بارہ کے قریب افراد کہیں سے نکل کر اس پر اُمڈ آئے۔ وہ سارے کے سارے مسلح تھے اور انہوں نے پل بھر میں ایمبولینس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم دونوں اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر نیچے اُتر آؤ۔ اگر اب کسی بدمعاشی کی کوشش کی سر سے لے کر پیر تک پورے جسم میں چھید کر دیں گے۔'' مسلح افراد میں سے ایک نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ احکامات جاری کیے۔۔ان کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔خصوصاً اس لیے بھی کہ سلّو کے پہلو سے پہلے ہی ایک گن کی نال لگی ہوئی تھی۔شہریار نے گاڑی سے اُترنے میں پہل کی۔پچھلے حصے میں موجود سلّو اور دا بھی حرکت میں آئے۔ مسلح افراد میں سے ایک نے پہلے ہی پیچھے سے ایمبولینس کا ڈھکن نما دروازہ کھول دیا۔ سلّو جیسے ہی اس کے کنارے پر پہنچا، پیچھے سے بیرے نے اسے ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ اُڑتا ہوا سڑک کے بل سڑک پر جا گرا لیکن کوشش کر کے چہرہ سڑک سے ٹکرانے سے روک لیا۔ پھر بھی اسے کافی چوٹیں برداشت کرنی پڑیں۔ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر سڑک سے لگنے والی رگڑ کے علاوہ بائیں ہتھیلی میں چبھ جانے والی کیل کی نوک نے اسے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ بہرحال وہ سخت جان تھا اس لیے منہ سے کوئی کراہ یا سسکی نہ نکلنے دی اور ضبط سے وہ تکلیف سہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسے چبھنے والی کیل کے علاوہ بھی سڑک پر جابجا بہت سی کیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور یقینی طور پر ایمبولینس کے ٹائروں کو پھاڑنے کا سبب بنی تھیں۔ یہ تو واضح ہی تھا کہ ان کیلوں کو سڑک پر انہی مسلح افراد نے پھیلایا تھا جو اُنہیں گھیرے کھڑے تھے۔ان مسلح افراد میں سے کئی کے جسموں پر پولیس کی یونیفارم موجود تھی اور قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے انہوں نے کچھ دیر پہلے جان چھڑائی تھی۔علاقہ شناس ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت آسانی سے کسی دوسرے راستے سے سامنے آ کر اُنہیں گھیر لیا تھا۔ وہ بھی ایسی کامیابی سے کہ ان دونوں کو ہاتھ پیر ہلانے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' ان دونوں کو حکم دیا گیا اور چند فٹ کا فاصلہ پیدل چلا گیا۔ آگے پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا کہ آگے ایک ذیلی سڑک آ کر اس سڑک سے مل رہی ہے۔ پولیس والوں نے وہیں سے آ کر انہیں سامنے سے گھیرا تھا۔ مقامی ہونے کا اتنا ایڈوانٹیج تو اُنہیں حاصل ہی تھا اور وہ انجان ہونے کی وجہ سے بری طرح پھنس گئے تھے۔ ذیلی سڑک پر پولیس والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اُنہیں ایک گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا اور بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر ایک پھوار سی پڑی۔ وہ کیا شے تھی، اُنہیں سوچنے کی فرصت نہیں ملی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش وحواس سے بیگانے اُن کے جسموں کو کس انجانی جگہ پر منتقل کیا جا رہا تھا، یہ تو شاید اُنہیں آنکھ کھلنے کے بعد بھی مشکل ہی سے پتہ چلتا۔

⊛----✪----⊛

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟.....کون ہو تم اور اس طرح مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟'' عالیہ کو ہوش آیا اور اس نے اپنے سامنے بیٹھے جاوید علی کو گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کروا چکا ہوں۔ یہاں لانے کا مقصد یہ سمجھ لو کہ ہم تمہیں کرنل توحید کے نزدیک لے آئے ہیں۔تم بہت بے چین تھیں نا اُن کے لئے.....تو مجھے تمہاری اس بے قراری پر رحم آ گیا۔'' جاوید علی نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بکواس مت کرو۔ مجھے تمہاری نیت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟'' وہ جاوید علی کی مسکراہٹ سے نروس ضرور ہوئی لیکن کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پا لیا اور ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔

''نیت کی خرابی سے اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے بکاؤ جسم کے چکر میں ہوں تو اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو۔ تمہارے بے شمار بار استعمال شدہ جسم میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اُس نے عالیہ پر صورتِ حال واضح کی۔

''تم پولیس والے بھی نہیں لگتے.....پھر کون ہو؟'' وہ جس کاروبار میں ملوث تھی، اُس میں پولیس سے مستقل واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے اُس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔اس کے بعد ذہن میں ایک ہی خیال رہ جاتا تھا۔ کوئی خفیہ ادارہ.....اور ظاہر ہے، یہ ایک اندوہناک خیال تھا اس لیے وہ اچھی خاصی گھاگ ہونے کے باوجود لرزیدہ تھی۔

''میں جہنم کا داروغہ ہوں اور اس وقت تمہارا اعمال نامہ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا ہوں۔ مساج سینٹر کے نام پر جاری شرم ناک کاروبار کے ساتھ تم جتنی مکاری سے میری قوم کے جوانوں کی رگوں میں زہر اُتار رہی تھیں، وہ قطعی قابلِ معافی نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اپنے لیے ذرا نرم سزا کا انتخاب کرنا چاہتی ہو تو مجھے اپنے کاروبار کی ساری تفصیل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سیدھی طرح یہ بتا دو کہ تمہاری ڈوریاں کس کے ہاتھ میں ہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی کی آلۂ کار نہیں ہوں۔ مساج سینٹر میڈم دیبا کا ہے اور وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتی ہیں۔ میں صرف ایک ملازمہ ہوں اور کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوں۔'' اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں کو زبان پھیر کر تر کرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن تم نے تو خود میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ تم میڈم دیبا کی پارٹنر ہو۔'' جاوید علی نے اسے گھیرا۔

''وہ تو میں نے بس ایسے ہی تمہارے سامنے شو مارنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ پھر بھولی بنی۔

''میرا خیال ہے عالیہ بیگم! کہ تم پر صورتِ حال کو اچھی طرح واضح کر دوں تا کہ تم بے کار جھوٹ بول کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہیں کرو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم پورے آٹھ گھنٹے بعد ہوش میں لائی گئی ہو اور ظاہر ہے ان آٹھ گھنٹوں میں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے تمہارے پورے سینٹر کو ادھیڑ ڈالنے کے ساتھ ساتھ میڈم دیبا کی زبان بھی کھلوا لی ہے۔ سینٹر میں موجود خفیہ کیمرے، مخرب اخلاق فلموں اور نشہ آور ادویات سمیت سب کچھ ہمارے قبضے میں آ چکا ہے۔ میڈم دیبا نے ہمارے سامنے اعتراف کیا ہے کہ مساج کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص تیل تم ہی اُنہیں فراہم کرتی تھیں اور اس تیل کے لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ایک ایسا جز شامل تھا جو مساموں سے جسم میں سرایت کر کے جسم کو سرور کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے تمہارے مساج سینٹر آنے والے گاہک بار بار پلٹ کر تمہاری طرف آتے تھے حالانکہ ان میں سے کئی کو تم لوگ باقاعدہ بلیک میل کر رہے تھے۔ ہماری تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم منشیات کے جس دھندے میں ملوث ہو، میڈم دیبا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسمگلنگ اور بلیک میلنگ کے کاروبار میں تو تمہاری پارٹنر تھی لیکن اس دوسرے دھندے میں تم نے اسے شریک نہیں کیا تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہمیں وہاں سے ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیا کا جو اسٹاک ملا ہے، وہ تمہارے آفس کے خفیہ لاکر میں رکھا ہوا تھا جس کی چابی صرف اور صرف تمہارے ہی پاس ہوتی ہے۔ اب بتاؤ کہ ان حقائق کی موجودگی میں تم انجان یا معصوم بننے کی اداکاری کرنے کی جرأت کرو گی یا سچ بولو گی؟'' عالیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے ہر لفظ کے ساتھ اس کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر تمہارے ذہن میں اب بھی کوئی خوش فہمی ہے کہ تم کوئی جھوٹ بول کر اپنے ان تمام جرائم سے ا
کر سکو گی تو میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ رائے چند جسے تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن فراہم کر
تھیں، یہیں موجود ہے اور تمہاری تمام تر احتیاط کے باوجود تمہاری صورت سے نا آشنا نہیں۔ وہ تمہار
سامنے آ کر تمہارے سارے جرائم گنوا سکتا ہے۔''

اس نے عالیہ کو یہ اطلاع فراہم کر کے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ رائے چند کی
موجودگی کا سن کر وہ بالکل ڈھے گئی اور یک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاوید علی اس صورتِ حال
سٹپٹا گیا۔ اُس کے نزدیک وہ ایک تربیت یافتہ مجرم تھی اور وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس سے حقائق اُگلوانے
اسے خاصی محنت کرنی پڑے گی اور تشدد کا سہارا بھی لینا پڑے گا لیکن اس نے تو کسی عام عورت کی طرح
دھونا شروع کر دیا تھا۔

''او میڈم!..... میرے پاس یہ ٹسوے دیکھنے کا ٹائم نہیں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور میں جو پو
ہوں وہ فٹافٹ بتاؤ۔'' چند لمحے اُس کا رونا برداشت کرنے کے بعد اس نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''میں اپنی بدقسمتی پر رو رہی ہوں۔ یہ میری کالی قسمت ہی ہے جو مجھے جرم کی دنیا تک لے آئی ہے
میرا باپ بہت عزت دار خاندان کا فرد تھا اور میں آج تک اس کے خاندان کی نیک نامی کو قائم رکھنے کے
اپنی عزت کو پامال کر رہی ہوں۔''

جاوید علی کی ڈانٹ سن کر اس نے ہچکیوں پر تو کسی طرح قابو پا لیا لیکن بولی تو آواز بہر حال رُندھی
تھی اور اس رُندھی ہوئی آواز میں اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ بہت مبہم تھا۔

''اگر تم کھل کر سب کچھ بتاؤ تو میں تمہاری بات سمجھ سکتا ہوں ورنہ تو میرا صرف ایک سوال ہے۔ تم
اپنی ڈوریاں ہلانے والے آقاؤں کے نام پتے سے آگاہ کرو۔''

اُس کے الفاظ سے کوئی نتیجہ نہ اخذ کر سکنے کی وجہ سے جاوید علی نے سخت لہجے میں وضاحت چاہی۔ اُ
ایک شک یہ بھی تھا کہ عالیہ کوئی اُلٹی سیدھی کہانی کر اُس کا ذہن بھٹکانا چاہتی ہے، اس لیے عورت
سب سے بڑے ہتھیار کے سامنے بھی نرم نہیں پڑا تھا۔

''میں تمہارے اس سوال کا جواب بہتر طور پر دینے کے لیے اپنی داستان سنانا ضروری سمجھتی ہوں تا کہ
میری پوزیشن کا درست اندازہ لگا سکو۔'' عالیہ نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بولنا شروع کرو۔ میں خود اندازہ لگا لوں گا کہ تمہاری داستان میں کتنی حقیقت ہے اور
افسانہ۔'' آخر کار جاوید علی سننے کے لیے تیار ہو گیا اور ریلیکس موڈ میں بالکل ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ عالیہ کو ہا
پیر باندھ کر اس کے سامنے بٹھایا گیا تھا اس لیے اسے یہ اندیشہ قطعی نہیں تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ کر کے یہاں
نکلنے کی کوشش کر سکے گی۔ یوں بھی اس عمارت سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ یہاں خطرناک مجرموں کو لا
ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے تو سکیورٹی کے انتظامات بھی اسی حساب سے کر رکھے تھے۔

''میری بربادی کی اس داستان کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ ا
سمجھ لو کہ میں نے اپنے والد کے ایک غلط فیصلے کی سزا بھگتی ہے۔ اور وہ غلط فیصلہ تھا، میری ماں سے شا
کرنا۔ میرے والد ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کسی ڈپلومہ کے لیے جاپان گئے تھے۔ وہاں ا
کی، میری ماں سے دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اس حد تک بڑھی کہ دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شادی
کے میری ماں کو اپنے ساتھ پاکستان لائے تو خاندان کے بزرگوں نے اُنہیں بطور بہو قبول نہیں کیا اور ا

صاحب کو جائیداد میں حصہ دینے کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیا۔ دولت اور محبت دونوں پاس تھیں اس لیے
انہوں نے اس مقاطع کی پروا نہیں کی اور اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ میری ماں جاپان میں کسی بہت خوش
حال خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی چنانچہ دولت اور آسائشات کی فراوانی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئی اور ہر
اس بری عادت کو اپنا لیا جسے ایک مہذب خاندان میں کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ نشے کی کثرت،
مردوں سے آزادانہ میل جول، جوا..... بس یہی سب کچھ تھا جو اس کے دل کو بھاتا تھا اور وہ مجھ سمیت پاپا
ابھی فراموش کر چکی تھی۔

پاپا کو اپنی مصروفیات میں اُن کی اس روش کی ذرا دیر سے خبر ہوئی اور جب بعد میں انہوں نے ممی کو
روکنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب جانے یہ محبت کی زیادتی تھی یا پاپا کی بزدلی کہ وہ اس
بگڑی ہوئی عورت کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکے اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے خود کو نشے میں غرق کر لیا۔ ان
حالات میں میری ذات ہی سب سے زیادہ متاثر ہوئی اور میں ماں باپ دونوں ہی کی توجہ سے محروم ہو گئی۔
اگر معاملات صرف یہیں تک رہتے تو بھی شاید اتنی خرابی نہ ہوتی لیکن ہوا یوں کہ آوارہ تتلی کی طرح محفلوں
میں گھومنے والی میری ماں چند ایسے لوگوں کی نظر میں آ گئی جنہوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے
انہیں ایک بہترین ذریعہ سمجھا۔ وہ جانے کن کن دھمکیوں اور سازشوں کے نتیجے میں میری ماں کو اپنے ڈھب
لانے میں کامیاب ہو گئے اور اُنہیں وطن دشمن سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنے لگے۔ ممی کی فطرت میں
ایک عجیب سا چلبلا پن تھا۔ پھر پاکستان اُن کا آبائی وطن بھی نہیں تھا چنانچہ وہ آسانی سے ان لوگوں کے جال
میں پھنس گئیں اور ان کے مفادات کے لیے کام کرنے لگیں۔

ممی ہی کی وجہ سے میں بھی ان کی نظروں میں آ گئی اور انہوں نے صرف سولہ سال کی عمر میں میری
عزت کو پامال کر کے مجھے اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں انکار کرتی تو وہ میری شرم ناک تصویریں
ویڈیو پورے شہر میں پھیلا دینے کی دھمکی دیتے اور میں ایسا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ
پاپا پہلے ہی ممی کی وجہ سے بہت دُکھی ہیں اور اگر میرے حوالے سے ایسی کوئی بات سامنے آئی تو ان کے لیے
یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہو گا۔ بس یوں میں عزت بچانے کے لیے بے عزت ہوتی رہی۔ ممی کی ذہنی حالت
ایسی تھی کہ اُنہیں کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ پاپا کو میں نے خود پتہ نہیں چلنے دیا اور چپ چاپ اذیت سے
گزرتی رہی۔

جب میری عمر بیس سال تھی تو ممی نشے کی زیادہ مقدار لینے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔
ان کے چند دن بعد پاپا کے روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جانے سے ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی بے وفا بیوی سے
سچی محبت کرتے تھے۔ بہر حال، ان دونوں کی زندگی کا قصہ تو ختم ہو گیا لیکن میں جس دلدل میں پھنس چکی
تھی، اس سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دی۔ مدد مانگتی بھی تو کس سے؟ ماں باپ اپنی اپنی زندگیاں گزار کر
اس سے جا چکے تھے اور جو خاندان تھا، وہاں جانے کی ہمت میں کر نہیں سکتی تھی کہ میرے صیاد مجھ سے پہلے
میری ذلت کی داستان ان لوگوں تک پہنچا دیتے۔ تم خود ہی سوچو کہ وہ خاندان جس نے ایک غیر ملک اور
اجنبی کی عورت کو قبول نہیں کیا تھا، اس عورت کی داغ دار بیٹی کو کیسے قبول کرتا؟ بس یوں میں ان لوگوں کے
ہاتھوں پر ناچتی چلی گئی۔

دیبا مساج سینٹر میں میری شراکت بھی انہی لوگوں کا فیصلہ تھا۔ میڈم دیبا لالچی عورت ہے۔ اپنے مساج
سینٹر سے وہ پہلے ہی فحاشی کے اڈے کا کام لے رہی تھی، میری شمولیت سے یہ کام ذرا جدید انداز پر ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلیک میلنگ کے دھندے کے علاوہ وہ بہت سے حقائق سے واقف نہیں تھی۔ میں
ذریعے مختلف پارٹیوں کو ہیروئن کی سپلائی کا تو اسے قطعی علم نہیں تھا لیکن بہرحال وہ کوئی شریف عورت نہیں
اور اس کی وجہ سے کئی لڑکیاں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ تم مجھے میرے جرائم کی جو بھی
دو، مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی میں تم سے یہ بھی کہوں گی کہ میڈم دیبا کو بھی کسی صورت
نہیں ملنی چاہئے۔''

وہ سب کہہ چکی تو خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے ان لوگوں کے نام پتے لکھواؤ جنہوں نے تمہیں اس دھندے میں پھنسایا۔ اس کے علاوہ ان
بارے میں بھی بتاؤ جنہیں تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی رہی ہو؟'' اُس کی داستانِ حیات پر
تبصرہ کیے بغیر جاوید علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جواب میں اُس نے ایک طویل فہرست لکھوا ڈالی۔ فہرست میں کئی نام ایسے تھے جو معززینِ شہر میں
ہوتے تھے اور جن کے بارے میں گمان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوں گے۔

''تم نے مجھ سے کرنل توحید کے بارے میں جاننے کی کوشش کیوں کی تھی؟'' فہرست مکمل ہو گئی
جاوید علی نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔

''مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ اگر کوئی ایسا گاہک ملے جو میرے اندازے کے مطابق آرمی میں
روابط رکھتا ہو تو میں اس کے ذریعے کرنل توحید کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔''

''یہ تو بڑے مبہم امکان پر کام کرنے والی بات ہے۔ میرے حساب سے تو اس بات کا ایک فیصد سے
کم امکان تھا کہ تمہیں ایسا کوئی کسٹمر ٹکرا جاتا۔'' اس کا جواب سن کر وہ حیران ہوا۔

''یہ ہدایات حاصل کرنے والی میں کوئی واحد لڑکی نہیں ہوں گی۔ بلکہ اس شہر بلکہ پورے ملک میں
بے شمار ایسی لڑکیاں ہیں جنہیں انہوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور ان کی مدد سے ایسے کام لیتے رہے
ہیں۔ خود مجھے حکم ہے کہ اپنے مساج سینٹر پر آنے والے گاہکوں پر گہری نظر رکھوں اور جو بھی کام کا بندہ
آئے، اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اوپر والوں کو آگاہ کروں۔''

''یعنی تم ان کے لیے مخبر کا کام کرتی رہیں۔ یقینی طور پر تمہارے گاہکوں میں کئی ایسے سرکاری افسران
رہے ہوں گے جن سے تم کئی اہم ملکی راز حاصل کر کے ملک دشمنوں کو فراہم کرتی رہی ہو گی؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مجھے جان سے مار
میں اُف تک نہیں کروں گی۔ بس میرا نام پبلک کے سامنے نہیں آنے دینا ورنہ میرے مرے ہوئے باپ کی
رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔ اپنے بھیانک جرائم کے باوجود
نے اس تعاون کی وجہ سے اپنے لیے کچھ آسانی پیدا کر لی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری خواہش کا
رکھا جا سکے۔'' جاوید علی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر تم ایسا کر سکے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔ باقی تو میرے لیے کسی چیز کی کوئی اہمیت ہی
رہی ہے۔ میں اپنی اس زندگی سے اوب چکی ہوں۔ خودکشی کی ہمت نہیں تھی ورنہ اب تک خود ہی
حاصل کر چکی ہوتی۔ شاید تم یہ بات سمجھ نہ سکو لیکن حقیقتاً میرے لیے یہ احساس بڑا کرب ناک ہے کہ میں
تھالی میں کھاتی ہوں، اسی میں چھید کرتی رہی ہوں۔'' اپنے الفاظ سے اس نے جاوید علی کے دل میں کچھ

پیدا کی۔

حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر دلدل میں جا پھنسنے والی اس لڑکی کو کم از کم اتنا تو احساس تھا کہ ارضِ
کو نقصان پہنچا کر وہ کوئی جرم کر رہی ہے۔ ورنہ یہاں تو بڑے بڑے نام نہاد سیاست دان، بیوروکریٹس اور
کارکن دن رات جانوروں کی طرح اس وطن کو بھنبھوڑ رہے تھے اور نام کو بھی شرمندہ نہیں تھے بلکہ بڑی
سے اپنی حُبّ الوطنی کے راگ الاپتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پہلے رائے چند غائب ہوا اور اب عالیہ..... اور
حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں ہی پولیس کی کارروائی کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں۔ اتنے سالوں سے
کامیابی کے ساتھ اپنا سیٹ اپ چلا رہے تھے۔ پولیس کے ساتھ بھی اچھی سیٹنگ تھی پھر اچانک کیا ہوا
پولیس ان کی دشمن بن گئی اور آگے پیچھے دونوں کو نشانہ بنا لیا؟'' سنتھیا کراچی سے لاہور آئی ہوئی تھی اور
کے سامنے بیٹھی حالات کی اس نئی کروٹ پر جلبلا رہی تھی۔

''میں خود پریشان ہوں۔ دونوں پولیس کے ریڈ کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں لیکن دونوں ہی کا کسی
پولیس اسٹیشن سے کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ رائے چند کے بارے میں تو پھر بھی اتنا پتہ چلا ہے کہ گرفتاری کے چند
گھنٹوں میں ہی اس نے تھانے دار سے مُک مُکا کر کے وہاں سے اپنی جان چھڑا لی تھی لیکن پھر اس کے بعد
اپنے گھر پہنچا، نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر ملی۔ جبکہ عالیہ کی گرفتاری کا تو سرے سے کوئی ریکارڈ ہی
نہیں ہے۔ مساج سینٹر سے میڈم دیبا سمیت کئی ورکرز کو گرفتار کیا گیا ہے لیکن گرفتار ہونے والوں میں عالیہ کا
نام شامل نہیں ہے۔ میں نے کئی ذرائع سے پولیس والوں کو کھنگالا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی عالیہ کے
بارے میں نہیں جانتا اور ایسا لگتا ہے کہ ریڈ کے وقت وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ لیکن میری معلومات کے
مطابق اس روز عالیہ وہیں تھی اور شاید ریڈ کے وقت کسی طرح وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔''

''ایسی صورت میں اسے کسی سے رابطہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ تو اپنے اپارٹمنٹ بھی نہیں پہنچی۔'' سنتھیا
نے تیز لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''شاید وہ موقع پا کر بھاگ نکلی ہے۔'' پانڈے نے کہا تو سنتھیا نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

''نہیں پانڈے! مجھے یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔ کوئی تھرڈ پارٹی ہے جو یہ سارا چکر چلا رہی ہے اور اس نے
پولیس کو کور کے طور پر فرنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ تم اور میں ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کبھی بھی
پر سے دباؤ پڑے بغیر کسی ایسی جگہ ریڈ نہیں کر سکتے جہاں سے انہیں پابندی سے بھتا ملتا ہو۔ تم رائے چند اور
عالیہ دونوں کے غائب ہونے پر غور کرو۔ دونوں معاملات میں کتنی خوب صورتی سے پولیس کو الگ کر دیا گیا
ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں لازماً کسی خفیہ ایجنسی کی تحویل میں ہیں اور یہ بات ہمارے لیے خاصی
خطرناک ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے خود بھی اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا اسی لیے پہلے ہی ان سارے لوگوں
انڈر گراؤنڈ ہونے کا حکم دے چکا ہوں جن کے بارے میں عالیہ جانتی ہے۔ رائے چند سے تو خیر ایسا
کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ وہ ڈائریکٹ کسی سے رابطے میں نہیں رہتا تھا اس لیے کسی کے بارے میں کچھ بتا بھی
نہیں سکتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور مجھے لگتا ہے کہ عالیہ اسی کی وجہ سے پھنسی ہے۔'' سنتھیا زیرِ لب بڑبڑائی۔ عہدے میں پانڈے سے نیچے ہونے کے باوجود اس کا ذہن زیادہ تیز تھا اور وہ حالات کا درست تجزیہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی تھی اور ایسا اس لیے تھا کہ وہ ''را'' کے علاوہ ''موساد'' کی بھی تربیت یافتہ تھی جب ہی تو اتنے برسوں سے کامیابی سے اپنا کردار ادا کر رہی تھی اور کسی کو اس کے ڈبل ایجنٹ ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ پانڈے کو اس کا سینئر بنا بیٹھا تھا، بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کی ناک کے عین نیچے سنتھیا منشیات کا دھندا بھی چلا رہی ہے اور عالیہ کو فحاشی اور جاسوسی کے علاوہ اس مقصد کے لیے بھی استعمال کرتی رہی ہے۔

''کیا کہا؟..... میں نے سنا نہیں۔'' پانڈے نے اس کی بڑبڑاہٹ کو سمجھ نہ سکنے پر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ پے در پے خود کو پہنچنے والے نقصانات کا جواب کیسے دوں؟'' پانڈے کو یہ جواب دیتے ہوئے اس کے ذہن میں بلتستان میں مرنے والی اپنی ایجنٹ کا خیال بھی موجود تھا۔ اس ایجنٹ کے پاس موجود خفیہ آلات کی وجہ سے وہ وہاں کی صورتِ حال سے تو بے شک پوری طرح واقف ہو گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ مرنے والی وہ ایجنٹ ''را'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی لیکن ''موساد'' کا سرمایہ تھی اس لیے اس کی جان جانے کا اسے زیادہ قلق تھا۔

''جواب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے خودکش حملہ آوروں کی جو فوج تیار کی ہے، اسے اس موقع پر کام میں لاؤ اور کراچی اور لاہور میں قیامت برپا کر دو۔ یہ ہنگامہ کھڑا ہو گا تو ایجنسیاں اس چکر میں پھنس جائیں گی اور ہم اپنے مہروں کو بچانے کی مہلت حاصل کر لیں گے۔''

پانڈے نے مکاری سے مشورہ دیا جو سنتھیا کو بھی مناسب لگا۔ اُس نے ''را'' کے ساتھ مل کر معصوم ذہنوں کی برین واشنگ کی اس سازش کے لیے برسوں محنت کی تھی اور نتیجے میں ان کے پاس ایسے نوجوانوں اور بچوں کی ایک بڑی کھیپ موجود تھی، جسے وہ آسانی سے اس آگ میں جھونک سکتے تھے۔ ان کے پتھر دلوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی بربریت کا نشانہ بن جانے والے ان معصوموں کی مائیں ہر پل اپنے لختِ جگر کی واپسی کی آس لگائے رو رو کر اپنی آنکھوں کی روشنی گنوا رہی ہیں۔ ان کے نزدیک تو اپنے وطن اور قوم کی خاطر سب کچھ کرنا جائز بلکہ باعثِ فخر تھا اور اس فخر کو قائم رکھنے کے لیے وہ ہر سنگدلانہ فیصلہ بڑی آسانی سے کر ڈالتے تھے۔ اس بار بھی کراچی اور لاہور کی تقدیر کا فیصلہ بنا کسی حیل و حجت کے کر دیا گیا۔ نتیجے میں اگلے چند دن تک دونوں شہروں خصوصاً کراچی میں کھیلے جانے والے آگ اور خون کے کھیل نے انسانیت کو خون کے آنسو رُلا ڈالا۔

⊛----✪----⊛

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ کتنی دیر بے ہوش رہے اور کتنا سفر کر کے کہاں پہنچا دیئے گئے۔ بس آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو ایسی تاریک جگہ پر پایا جہاں پر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور ایسی خاموشی تھی، گویا انہیں دنیا سے کاٹ کر زندہ ہی کسی تاریک قبر میں اتار دیا گیا ہو۔

انہیں یہاں ڈالنے والوں نے بس اتنی مہربانی کی تھی کہ اس قبر میں ان کے ہاتھ پیر آزاد رہنے دیے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کافی دیر تک اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت میں لانے کے لیے ہلاتے جلاتے رہے جو شاید بے ہوشی کی کسی دوا کی وجہ سے یا بہت دیر تک بے حس و حرکت پڑے رہنے کے باعث سُن ہو گئے تھے۔

''میں نے کہا بھائی جی! ہم زندہ تو ہیں نا؟ یا سالوں نے ایک ہی قبر میں گاڑ دیا ہے؟'' جسم کو حرکت میں لانے کی کوشش میں وہ دونوں ہی اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ اس تاریک جگہ پر انہیں اکٹھا رکھا گیا ہے۔ شہریار نے سلّو نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''ایہہ تو مینوں نہیں ملوم پر یاد رکھ کہ تیرے سالوں کی اس بدتمیزی پر میں انہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اِبھی گیا ہوں تو بھوت بن کر بدلہ لوں گا۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے شہریار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ایک طرح سے یہ سلّو کے لیے اشارہ تھا کہ کچھ بھی بولتے وقت محتاط رہے۔ انہیں اس انداز سے گاندھی نگر میں گھیرا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے کسی غنڈہ گروپ کا نہیں بلکہ حکومتی ادارے کا تعلق ہے اور ایسی صورت میں انہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ بلکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہیں یہاں قید کرنے والوں نے ان کی گفتگو سننے کا کوئی خفیہ انتظام کر رکھا ہو۔

''ایسی بڑھکیں نہ مارو بھائی جی! اگر میری گھر والی نے سن لیا تو مینوں چھڈے گی نہیں۔ بوہت مارے گی۔ تیرے بھرا نے ایسی گل کی کیسے؟ ہور تُو نے سنی کیوں؟'' سلّو اس کا اشارہ سمجھ گیا اور یونہی ہانکنے لگا۔

''تُو تو بڑا زن مرید نکلا۔ زنانی سے اتنا ڈرا تو جیے گا کیسے؟'' ہاتھ پیروں کو حرکت کے قابل پا کر کھڑے ہوتے ہوئے شہریار نے اس کی فضول گوئی میں اس کا ساتھ دیا۔

''ویسے ہی جیسے تسی جیتے ہو۔ تسی بھی تو بھابو سے وڈا ڈرتے ہونا۔'' سلّو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی کھڑا ہوا اور شریر لہجے میں جواب دیا۔

''چل اوئے بکواس نہ کر۔ چپکا پڑا رہ۔'' شہریار نے اسے ڈپٹا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے حرکت کرنے لگا۔ یہ شاید کسی دوا کا ہی اثر تھا کہ اب بھی چلتے ہوئے اسے اپنے پیروں میں بھاری پن کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سلّو کی بھی تھی لیکن وہ بھی اسی کی طرح ہر طرح کے حالات میں جدوجہد کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا چنانچہ حرکت میں آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دس بارہ فٹ کے اس کمرے کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے اچھی طرح ٹٹول چکے تھے جس کے نتیجے میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ کمرے کی دیواریں بالکل ٹھوس ہیں اور ان میں کہیں بھی کوئی کھڑکی یا دروازہ موجود نہیں ہے۔ اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ انہیں کسی تہ خانے میں رکھا گیا ہے جس کا داخلی راستہ یقینی طور پر چھت پر رکھا گیا تھا اور چھت اتنی اُونچی تھی کہ سلّو نے شہریار کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے اس تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کی، تب بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس صورتِ حال میں وہ دم بخود رہ گئے۔ قید کرنے والوں نے انہیں ایسی جگہ قید کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر نکلنے کی جدوجہد بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب صرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ اپنے صیاد کا انتظار کریں۔ تہ خانے کے ننگے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے انہوں نے یہ انتظار شروع کر دیا۔ انہیں بہت دیر اس حالت سے نہیں گزرنا پڑا پھر بھی خاصی کوفت محسوس ہوئی۔ آپس میں اُلٹی سیدھی ہانکنے کا موڈ بھی صورتِ حال کی اس سنگینی نے ختم کر دیا تھا۔ کوئی سنجیدہ بات اس ڈر سے نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں کسی خفیہ مائیک کے ذریعے ان کی یہاں کی ہوئی بات چیت سنی نہ جا رہی ہو۔

انتظار کی یہ کوفت بھری گھڑیاں بہت عجیب انداز میں ختم ہوئیں۔ بیٹھے بیٹھے انہیں یہ محسوس ہوا کہ اوپر چھت کی طرف ہلچل سی ہوئی ہے لیکن بس صرف حرکت کا احساس تھا۔ روشنی بالکل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھ پاتے۔

اور جب روشنی ہوئی تو اتنی تیز کہ کافی عرصے سے اندھیرے میں ڈوبی ان کی بصارت چندھیا سی گئی۔ کچھ پل بعد وہ دیکھنے کے لائق ہوئے تو تہ خانے کا منظر سامنے تھا۔ وہ ایک سپاٹ دیواروں والا کمرہ تھا جو اس وقت پوری طرح روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ان روشنیوں کا منبع چھت پر نصب طاقتور لائٹس تھیں لیکن اس وقت ان کی توجہ کا اصل مرکز وہ شیشے کی کیپسول نما لفٹ تھی جس سے کئی مسلح نفوس نکل کر ان کے آس پاس پھیل گئے تھے۔ اور ظاہر ہے، ان کے ہاتھوں میں موجود ہتھیاروں کا رخ ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

مسلح افراد کے درمیان اندو کو دیکھ کر انہیں بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جن حالات سے گزر رہے تھے، پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کے پیچھے اندو ہی کا ہاتھ ہے۔ چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس اندو نے فوری طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ لفٹ کی طرف کر کے کوئی بٹن دبایا تو لفٹ واپس جانے لگی۔ یہ عجیب طریقے سے کام کرنے والی لفٹ تھی اور بالکل اس انداز میں کام کر رہی تھی جیسے کسی ٹوکری کو رسی سے لٹکا کر اوپر عمارت سے پھینکا اور واپس کھینچا جاتا ہے۔ لفٹ واپس چلی گئی تو چھت میں بننے والا گول خلا بھی بند ہو گیا۔

''ہاں تو مسٹر جگدیش اور مسٹر رویندر!..... آپ کی سواد مصالحہ کمپنی کا کام کیسا چل رہا ہے؟ گاندھی نگر میں آپ کو کچھ نیا بزنس ملا یا نہیں؟''

لفٹ واپس جانے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہوتے ہوئے بہت طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں یہاں لانے کا کارن بتاؤ؟'' شہریار نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کارن تو تم بتاؤ گے کہ تم ممبئی سے دہلی جاتے ہوئے جھوٹا بہانہ کر کے گاندھی نگر میں کیوں اُترے تھے؟''

''ہم دہلی واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ہمیں ممبئی میں امپورٹنٹ بزنس ڈیل کرنی تھی لیکن تم نے ہمارا ایک نہ سنی اور زور زبردستی سے دہلی جانے والی ٹرین میں بٹھا دیا۔ ایسے میں ہمیں جو سوجھا، ہم کر گزرے۔'' شہریار نے محتاط انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بکواس مت کرو اور جھوٹ بولتے سے یاد رکھو کہ میرا ایک آدمی ٹرین میں تمہاری نگرانی کرتا رہا ہے۔ ویسے بھی میں یہ بات پہلے سے جانتی ہوں کہ تم کوئی بزنس مین نہیں ہو۔ کسی بزنس مین کے پاس ایسے برانڈڈ کیس نہیں ہوتے جنہیں کھولنا ماہر قفل سازوں کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔ ہم نے تمہارے بریف کیسوں کو ایکسرے مشین سے گزار کر دیکھا تھا جس سے یہ بات بھی سامنے آ گئی تھی کہ ان میں خطرناک گنیں موجود ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کسی بزنس مین کو ایسی گنیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ انہیں تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''گنیں ہم نے اپنی سیفٹی کے لیے رکھی تھیں ہم ممبئی میں ہونے والی لوٹ مار سے خوف زدہ تھے اس لیے اپنی اور اپنی چیزوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے چلے تھے۔''

''اوکے، ایسا ہے تو مجھے ان دونوں بریف کیسوں کو کھولنے کا کوڈ بتاؤ۔ میں انہیں کھول کر اپنی تسلی کر لوں گی کہ ان میں کوئی ایسی چیز تو موجود نہیں جو تمہیں بزنس مین کے بجائے کچھ اور ثابت کر دے۔'' اس کے معنی خیز لہجے میں شہریار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی مسلح افراد میں سے ایک نے دونوں بریف کیس لا کر اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔

''کیوں، کیا تم پولیس والی ہو جو تمہاری تسلی کروانا ضروری ہے؟..... جاؤ نہیں بتاتا میں تمہیں کوڈ۔'' شہریار نے اڑیل پن کا مظاہرہ کیا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف موقع تلاش کر رہا تھا کہ کسی طرح صورتِ حال اپنے حق میں کر سکے لیکن انہیں اپنی زد میں لیے کھڑے مسلح افراد اتنے چوکس تھے کہ کسی بھی غیر معمولی حرکت پر انہیں گولیوں سے بھون کر رکھ سکتے تھے۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی زندگی بچا کر ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔

''تم مجھے پولیس والی ہی سمجھ لو لیکن یاد رکھو کہ میری بات مانے بغیر تم تو کیا، تمہاری آتما بھی اس جگہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔'' اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

''لاک نہیں کھل رہا تو اسے توڑ دو یا بریف کیس کو کاٹ کر اس کے اندر کا راز جان لو۔ میں بہر حال تمہیں کوڈ نہیں بتاؤں گا۔'' شہریار نے تمسخرانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''ہم ان ترکیبوں پر عمل کر سکتے تھے اگر یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں کھولنے والا مواد ہوا کے سے نہیں اُڑ جائے گا۔'' اندو کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ہاہاہا..... تم کیا ہمیں کسی جاسوسی فلم کا کردار سمجھ رہی ہو جو ایسی خوفناک باتیں سوچ رہی ہو؟'' شہریار نے اس کا مذاق اُڑایا۔

''میں تمہیں جاسوسی فلم کا کردار نہیں بلکہ سچ مچ کا جاسوس سمجھ رہی ہوں اور ایک بار پھر وشواس دلاتی ہوں کہ تم اپنی اصلیت اُگلے بغیر مجھ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے۔'' وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''اوہ..... تو اندو جی جو ایک جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اشوک صاحب کے گینگ کی ہمدرد ہونے کی اداکار تھیں، اب اچانک دیش بھگت بن بیٹھی ہیں۔'' شہریار نے اس پر طنز کیا۔

''میں کیا ہوں اور کیا نہیں، اس کو جانے دو۔ لیکن اب تمہیں بتانا ہو گا کہ تم کون ہو؟'' وہ خوفناک لہجے میں بولی اور ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ چھت کی طرف کر کے کوئی بٹن دبا ڈالا۔ اچانک ہی چھت سے شیشے کا ایک کیس سا نمودار ہوا اور ان دونوں پر آ گرا۔ اب وہ دونوں اس باکس میں قید تھے اور صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ان پر افتاد آ پڑی تھی۔ باکس میں قید ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی انہیں اندازہ ہونے لگا کہ انہیں سانس لینے میں زبردست دشواری ہو رہی ہے۔

''یہ باکس آکسیجن سے بالکل خالی ہے اور اس میں امونیا گیس بھری ہوئی ہے۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو یہی باکس تمہاری قبر بن جائے گا۔'' اندو کی آواز نے انہیں اپنے گھٹتے ہوئے سانس اور تیز ہوتی ہوئی بُو کے راز سے آگاہ کیا۔ یہ واقعی بڑا زبردست ٹارچر تھا۔ کہنے کو اس نے انہیں انگلی بھی نہیں لگائی تھی لیکن شدید عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

''میں تمہیں کوڈ بتاؤں گا اور اپنی حقیقت بھی۔'' چند لمحے اور گزرے تو سلّو نے حوصلہ ہار دیا اور زور سے چلایا۔ اُس کی اس حرکت پر شہریار چونک گیا۔ سلّو نے اس مشن میں اس کے ساتھ شریک ہوتے وقت ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ جذبۂ حُبّ الوطنی کے باعث نہیں بلکہ ذاتی انتقام کی آگ بجھانے اور پُرکشش معاوضے کی خاطر اس کے ساتھ شریک ہو رہا ہے اور ظاہر ہے، انتقام اور پیسے میں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی جان دینے پر راضی ہو جاتا۔

وہ سلّو کو اس حرکت پر باز رکھنے کے لیے اس کی طرف لپکا لیکن اس سے قبل ہی شیشے کا وہ باکس ان پر گر چکا تھا اور ابھی اس کا ہاتھ سلّو کے کالر تک ہی پہنچا تھا کہ تین مسلح افراد بیک وقت اس پر پل پڑے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہریار کے لیے اس وقت سلّو کو روکنا زندگی اور موت کے مسئلے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج اگر دونوں جان سے بھی چلے گئے تو کل ان کے مشن کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور میدان میں اُتر جائے گا۔ اگر ان کا مشن سامنے آ گیا تو ڈاکٹر فرحان جمیل کو تلاش کر کے وطن پہنچانا پہلے سے بھی زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ اُنہیں قیدی بنا کر رکھنے والے مزید محتاط ہو جائیں گے اور ان پر اتنے پہرے لگا دیں گے کہ ان تک رسائی ناممکن ہو جائے گی۔

اپنی اس سوچ کے تحت اس نے خود پر حملہ آور ہونے والوں کے پاس موجود اسلحے کا بھی خیال نہیں کیا۔ بیک وقت ایک کو گھونسا اور دوسرے کو لات رسید کی۔

جواب میں اُسے بھی اُن کی گنز کی آہنی ضربات برداشت کرنی پڑیں۔ اُس نے ان ضربات کی پروا نہ کی اور ان میں سے ایک کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر دو پر دے مارا۔

اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ کمرے میں موجود چوتھا مسلح شخص اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہتا۔ شہریار کو دھمکانا تو اس لیے بے کار تھا کہ وہ اپنے مقابلے پر آنے والے تینوں افراد میں سے ایک کو دو بار گرفت میں لے چکا تھا اور اس پر گولی چلانے میں یہ احتمال تھا کہ گولی شہریار کے بجائے اس کے ساتھی کو لگ جائے گی۔ وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کی مدد کو لپکا لیکن درمیان میں ہی سلّو کی ٹانگ چل گئی اور وہ اپنی گن سمیت زمین بوس ہو گیا۔

اس اثنا میں گرنے والے دونوں افراد سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں سیدھی کیں اور سلّو کی طرف رخ کر کے فائر کر دیا۔ سلّو کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا چنانچہ اس نے چھلاوے کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دی اور اُچھل کر اس جانب پہنچ گیا جہاں اندو ریموٹ ہاتھ میں لیے انگشت بدنداں کھڑی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ کوئی اتنا بے خوف بھی ہو سکتا ہے کہ چار عدد خطرناک گنز کی موجودگی میں مقابلہ کرنے کی احمقانہ جرأت کر سکے۔ لیکن وہ دونوں یہ کر چکے تھے اور لمحوں میں نہ صرف پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا بلکہ کوئین یعنی وہ خود ان کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ سلّو فائرنگ سے بچنے کے بعد اس تک پہنچا تھا تو اس کی کوشش کی تھی کہ اسے جوڈو کا کوئی کمال دکھا سکے لیکن وہ اس سے زیادہ باکمال نکلا اور اس کا وار روکنے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تھام کر بازو کو اتنی بری طرح پیچھے کی طرف موڑا کہ وہ کراہ کر رہ گئی۔

''اگر کسی نے اب کوئی حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' اندو کی نازک سی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ کر اس نے اس کے ساتھیوں کو دھمکی دی۔ ان چاروں میں سے ایک تو پہلے ہی شہریار کی گرفت میں تھا، باقی تین بھی اس کی دھمکی سن کر ٹھٹک گئے۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ اپنی ہاں جکڑے ہونے کی وجہ سے عملاً کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

''اپنی گنز پھینک کر ہاتھ سر پر رکھ لو۔'' سلّو نے دوسرا حکم جاری کیا۔

''تم بہت بھیانک غلطی کر رہے ہو۔ ہمیں قابو میں کرنے کے بعد بھی تم اس عمارت سے نہیں نکل سکو گے۔'' گلے پر دباؤ کے باعث اندو نے پھنسی پھنسی آواز میں اسے خبردار کیا۔

''وہ ہمارا پرابلم ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو سمجھاؤ کہ گنز پھینک دیں ورنہ تمہاری یہ نازک سی گردن ٹوٹ جائے گی۔'' سلّو غرایا اور اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا جس کے نتیجے میں اس کے حلق سے خرخراہٹ سی برآمد ہوئی۔ خرخراہٹ کی اس آواز کو سن کر اب تک تذبذب کی کیفیت میں کھڑے اس کے ساتھیوں نے گنز دُور پھینک دیں اور ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ شہریار جو چند لمحے قبل سلّو کی طرف سے بدگمان ہو چکا

اس کے کارنامے پر کھل اُٹھا اور اپنے بازو میں جکڑے شخص کو کھڑی ہتھیلی کے ایک وار سے انٹاغفیل کرنے کے بعد لپک کر دور پڑی گنز کی طرف لپکا۔

''اب تم تینوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے ہوش و حواس میں موجود ان تینوں افراد کو حکم دیا۔

اُنہیں ناچار اس حکم کی پیروی کرنا پڑی کہ اسلحے سے محرومی اور باس کی خطرے میں پڑی زندگی ان کی مجبوری بن چکی تھی۔

شہریار دونوں ہاتھوں میں گنز سنبھالے محتاط قدموں سے ان کے عقب میں پہنچا اور بائیں ہاتھ میں تھامی گن کو نال سے تھام کر اس کا دستہ ایک کے سر پر بجا ڈالا۔ وہ فوراً ہی تیورا کر گر پڑا۔ دوسرے شخص کے سر پر لگنے والی ضرب بھی جچی تلی اور کارآمد تھی لیکن اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے مختصر سے دورانیے میں تیسرے کو یکدم ہی جوش آ گیا اور وہ تیزی سے پلٹ کر شہریار پر حملہ آور ہوا۔ اس بار شہریار نے کسی قسم کی رعایت میں وقت ضائع کرنے کی زحمت نہیں کی اور دائیں ہاتھ میں موجود گن کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں برآمد ہوئیں۔ اتفاق سے اس شخص کا چہرہ زد میں تھا۔ گولیوں نے اس کا ہر نقش اُڑا ڈالا اور اعضاء کے چیتھڑوں کے ساتھ خون کے چھینٹے دور تک پھیل گئے۔

''تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ اب سب کو مار کر بھی تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔'' اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اندو کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے فق ہوا اور اس نے ایک بار پھر اپنی دھمکی دہرائی۔

''ہم تمہارے جیسے تھرڈ کلاس لوگ نہیں ہیں جو سستی حرکتیں کرتے پھریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ہر حرکت بہت مہنگی ہے۔ تم بار بار یاد دلا کر اپنا ٹائم برباد مت کرو۔''

سلّو نے اسے تلخی سے جواب دیا اور بلا تکلف منہ پر ایک تھپڑ دے مارا۔ اُس کے مارے گئے تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ نہ صرف اندو کے رخسار پر اُنگلیوں کے نشان چھپ گئے بلکہ گال اندر سے پھٹ جانے کے باعث باچھوں سے خون بہہ نکلا۔

''یُو سن آف بچ۔ تم اپنے بارے میں نہ بھی بتاؤ تو میں پہچان چکی ہوں کہ تم بلڈی ایڈیٹس پاکستانی ایجنٹ ہو اور یہاں کسی خاص مشن پر آئے ہو۔'' تھپڑ کھا کر اندو پھٹ پڑی اور نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

''اور تم ہو ''را'' کی نمک خوار جو شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر یُو سونگھتی پھرتی ہو۔'' شہریار جو اس کے ریموٹ کنٹرول کو اپنے قابو میں لے چکا تھا، اس سے بھی زیادہ نفرت سے بولا۔

''مجھے گرو (فخر) ہے کہ میں اپنے دیش کی خاطر تم جیسے آتنک وادیوں کو ان کے انت (انجام) تک پہنچاتی ہوں۔ اب بھی چاہے تم میری جان لے لو لیکن یہاں سے بچ نہ سکو گے۔''

اس نے اپنی وہی دھمکی دہرائی جس نے انہیں سوچ میں ڈال دیا کہ یقیناً وہ کسی ایسی عمارت میں ہیں جہاں سکیورٹی کا زبردست انتظام رکھا گیا ہو گا اور اس تہ خانے میں موجود افراد کے علاوہ بھی اوپر کئی افراد موجود ہوں گے۔ وہاں تک کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ تہ خانہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔

''تمہیں ہم پر شک کیسے ہوا؟'' اپنے اندیشوں اور سوچوں کو فی الحال ذہن سے جھٹکتے ہوئے شہریار نے اس سے پوچھا۔

''تمہاری شامت تمہیں مجھ تک لے آئی۔'' وہ تمسخر سے مسکرائی۔ تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کے باعث

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے خود کو بہت تیزی سے اپنے ساتھی کی کراہت آمیز موت کے جھٹکے سے سنبھال لیا تھا۔

''بکواس نہیں۔ سیدھی طرح جواب دو۔'' اُس کا جواب سن کر سلّو غرّایا اور اس کے کان کو پکڑ کر اس طرح موڑا کہ وہ چیخ اُٹھی۔

اُس کے چیخنے کے باوجود سلّو نے اس کے کان پر سے اپنی گرفت ہلکی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی شدت سے زور لگایا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ذرا پروا نہیں تھی کہ وہ ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں شہریار کے لیے شاید ایسا کرنا مشکل ہوتا۔

''اے جانور کی اولاد!..... مجھے چھوڑ دے۔'' دردناک چیخوں کے درمیان اس نے بلبلاتے ہوئے سلّو سے کہا اور کوشش کی کہ اپنی ٹانگ سے اُس پر وار کر سکے۔

سلّو پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کی ٹانگ کے خود سے ٹکرانے سے پہلے اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور اتنی زوردار ضرب لگائی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''تم خوامخواہ کی زور آزمائی کر رہی ہو۔ یہ شخص تمہیں ذرا رعایت نہیں دے گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے ہمارے سوالوں کے جواب دیتی چلی جاؤ۔'' ریموٹ کے فنکشنز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار نے اسے تنبیہہ کی۔

''میں نے کہا نا کہ تمہیں تمہاری شامت مجھ تک لے آئی تھی ورنہ میں تو سچ مچ صرف بھائی جی کے آدمی سے بچنے کے لیے تمہاری ٹیکسی میں بیٹھی تھی اور بعد میں بھی صرف انسانیت کے ناتے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعد میں تمہارے بریف کیسوں کی وجہ سے تمہاری طرف سے شک میں پڑ گئی اور بیرے کے روپ میں اپنا ایک آدمی تمہارے پیچھے لگا دیا۔ وہ تم دونوں کی باتیں سنتا رہا اس لیے جب تم نے سیدھے دلی جانے کے بجائے گاندھی نگر پر اُترنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مجھے انفارم کر دیا اور ہم نے وہاں کی لوکل پولیس کے ساتھ مل کر تمہیں اریسٹ کرنے کا پورا انتظام کر لیا۔ میں نے سنا تھا کہ اریسٹ ہونے سے پہلے بھی تم دونوں نے خاصی مارا ماری کی تھی لیکن پھر بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ یہاں اس جگہ تم اتنی آسانی سے میرے آدمیوں کو زیر کر لو گے۔'' انہیں پہلی بار اندو کی آواز میں مایوسی محسوس ہوئی۔ شاید اسی مایوسی کی وجہ سے اس نے سچ اُگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

''اوپر کتنے آدمی موجود ہیں؟'' اس کے بیان پر کوئی تبصرہ کیے بغیر شہریار نے اس سے اگلا سوال کیا۔

''مجھے ان کی گنتی یاد نہیں لیکن وہ کئی ہیں اور پوری طرح ہتھیار بند ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لفٹ کو نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''گرین بٹن۔'' اس کا جواب بے حد مختصر تھا جسے سن کر شہریار نے سلّو کو اشارہ کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں چل پڑے۔

''سچ بول کُتیا! ورنہ تیرے سگوں کو یہاں سے تیری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔'' وہ اسے اتنی بری طرح مار رہا تھا کہ فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود شہریار کو اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹنے کا یقین ہو گیا۔

''بلیو بٹن دباؤ..... بلیو بٹن۔ لفٹ نیچے آ جائے گی۔'' اس نے مار کھاتے کھاتے گویا ہار مان لی اور ہانپتی ہوئی آواز میں چیخی۔

''یہ کسی لومڑی کی طرح مکار ہے۔ میں اس کی کسی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔ کوئی اور کوشش کرنا ہوگی۔''

شہریار نے اس کا جواب سن کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا تو اندو کی آنکھوں میں مایوسی اُتر آئی جس نے واضح کر دیا کہ مشکل میں ہونے کے باوجود وہ مسلسل اُنہیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ جب یہ ہمارے کام کی نہیں تو میں اسے ٹپکا دیتا ہوں۔'' سلّو نے سفاکی سے کہا اور اس کی گردن پر دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالنے لگا۔ اندو ایک بار پھر بری طرح تڑپنے لگی۔

''ریڈ بٹن..... ریڈ بٹن پش کرنے سے لفٹ نیچے آ جائے گی۔''

اپنی بچت کے لیے اس نے ایک اور آپشن پیش کیا لیکن اُس کی ہر بات ناقابلِ یقین ہو چکی تھی چنانچہ سلّو نے ڈراپ سین کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

''ان میں سے کسی کو ہوش میں لاؤ۔'' اندو سے فارغ ہونے والے سلّو کو شہریار نے حکم دیا تو وہ کسی ڈھول کی طرح حرکت میں آ گیا اور بے ہوش افراد میں سے ایک کے پہلو میں دو تین زوردار ٹھوکریں جمائیں۔ تکلیف کے باعث وہ کراہتا ہوا ہوش میں آ گیا۔

''لفٹ نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' اسے سوچنے کی مہلت دیئے بغیر شہریار نے گن کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''ریڈ بٹن۔'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ اس بے ساختگی میں سچائی تھی اور شاید اس لیے تھی کہ وہ ابھی پوری طرح حواسوں میں نہیں لوٹا تھا۔

اس کا جواب سن کر شہریار نے اللہ کا نام لیتے ہوئے سرخ بٹن دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہیں اس قبر نما تہ خانے سے بہرصورت نکلنا تھا اس لیے رِسک لینا ناگزیر تھا۔ خیر گزری کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں بہتر ثابت ہوا اور وہی کیپسول نما لفٹ نیچے آ گئی۔

اس بندے کو سلّو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس نے آگے بڑھ کر لفٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں ایک سوئچ پینل موجود تھا جس پر اسے آپریٹ کرنے کے لیے واضح اشارے موجود تھے ورنہ جو ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا، اس میں مختلف رنگ کے بٹنوں کے علاوہ کوئی اشارہ ہی نہیں دیا ہوا تھا اور وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر اندو کی بات مان کر وہ اس کی مرضی سے کوئی بٹن دبا دیتا تو لفٹ نیچے آنے کے بجائے چھت سے کوئی زہریلا مادہ برسنا شروع ہو جاتا یا اوپر کی عمارت میں خطرے کا کوئی الارم بجنے لگتا اور ان کے فرار کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جاتیں۔

''اسے آف کرو اور بریف کیس لے کر لفٹ میں آ جاؤ۔'' لفٹ آپریٹ کرنے کا سسٹم اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس نے سلّو سے کہا تو اس نے خاموشی سے ہوش میں آنے والے شخص کی تقدیر کا فیصلہ کیا اور بریف کیس سمیٹ کر اس کے ساتھ لفٹ میں آ کھڑا ہوا۔

''آج تم نے ثابت کر دیا کہ اس مشن پر تمہیں اپنے ساتھ لانے کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔'' لفٹ کا دروازہ بند کر کے اوپر جانے کے لیے بٹن دبانے سے پہلے شہریار نے اس سے کہا۔

''کچھ دیر پہلے شاید تمہاری رائے کچھ اور تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں تم مجھے جان سے مار دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' سلّو نے ناراض لہجے میں اسے جواب دیا تو اس کے چہرے پر حقیقی شرمندگی کے تاثرات ابھر آئے۔

''آئی ایم ویری سوری یار! اس وقت میں سچ مچ سمجھا تھا کہ تم اپنی جان بچانے کے لیے اندو کو کوڈ بتانے لگے ہو۔'' اس نے زبان سے اعتراف اور معذرت کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون سا کوڈ؟..... میں صرف اپنے بریف کیس کو کھولنے کا کوڈ جانتا ہوں اور اس میں ایک گن کے علاوہ کوئی کام کی چیز موجود نہیں ہے۔'' سلّو نے نروٹھے پن سے جواب دیا تو وہ پہلے مسکرایا پھر اپنے بریف کیس کو کوڈ کی مدد سے کھول کر اس میں رکھے سامان کو آگے پیچھے کرنے کے بعد اس میں سے ایک لفافہ برآمد کر کے اسے تھماتے ہوئے بولا۔

''یہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں اس وقت دکھاؤں گا جب تم پر اعتماد کرنے لگوں گا۔''

''شکریہ اتنی جلدی اعتماد کرنے کا۔'' سلّو نے طنز سے کہتے ہوئے لفافہ کھول کر اس میں موجود شے نکالی۔ وہ ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر تھی۔

''یہ کیا.....؟'' تصویر دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''ہم اس شخص کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ رازداری کے خیال سے میں نے تمہیں کچھ باتوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ فی الحال تم اس تصویر کو اپنے ذہن میں نقش کر لو۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہیں اس کی تفصیلات سے بھی آگاہ کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ لی تصویر۔ آگے کیا کرنا ہے؟'' سلّو کے لہجے میں بظاہر بے نیازی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے کسی ایکسرے مشین کی طرح تصویر کا جائزہ لیا تھا۔

''اسے پھاڑ دو۔ اب بس یہ ہمارے ذہنوں میں ہی رہے گی۔ میں مزید اس تصویر کو اپنے پاس رکھ کر خطرہ نہیں مول لے سکتا۔ ورنہ کسی نہ کسی اسٹیج پر ہماری یہاں آمد کا مقصد سامنے آ جائے گا۔''

شہریار نے اسے ہدایت دیتے ہوئے پینٹل پر موجود ایک بٹن دبا دیا۔ اس دوران سلّو نے اس کی ہدایت سمجھتے ہوئے تصویر کے اتنے پُرزے کر دیئے تھے کہ کوئی اُنہیں جوڑنا بھی چاہتا تو نہیں جوڑ سکتا تھا۔

''اپنے بریف کیس کو یہیں چھوڑ دو۔ اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا بیکار ہوگا۔'' وہ بریف کیس میں موجود اپنی اپنی گنز پہلے ہی نکال چکے تھے۔ شہریار نے پلاسٹک کا ایک لفافہ اپنے ٹراؤزر کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے سلّو کو ہدایت کی لیکن خود اپنا بریف کیس ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سلّو نے بنا حیل و حجت اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور وہ لفٹ سے باہر آ گئے۔

لفٹ نے اُنہیں جس کمرے میں پہنچایا تھا، وہ بڑا عجیب و غریب تھا اور پورے فرش پر مختلف قسم کی مشینیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ یہاں انہوں نے شیشے کا وہ باکس بھی دیکھا جس میں کچھ دیر رہ کر انہوں نے آکسیجن کی محرومی اور امونیا کی موجودگی کی چبھن کو محسوس کیا تھا۔ انہیں سمجھ آ گیا کہ نیچے موجود سپاٹ تہ خانے میں ہونے والی ساری کارروائیوں کا حقیقی انتظام اس کمرے میں ہے اور اس تہ خانے میں اس ریموٹ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا جو انہوں نے اندو سے حاصل کیا تھا۔

اس کمرے کو دیکھ کر انہیں اور بھی زیادہ شدت سے احساس ہوا کہ یہاں بہت احتیاط اور حاضر دماغی سے کام لینا پڑے گا کیونکہ جس عمارت میں اتنے انتظامات تھے، وہ کوئی عام جگہ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اندو ایک طرح سے یہ اعتراف کر چکی تھی کہ اس کا تعلق ''را'' سے ہے اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ وہ ''را'' کے کسی ٹھکانے پر موجود ہیں۔

''میں آگے چلوں گا، تم مجھے کور دینا۔'' کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سرگوشی میں سلّو سے کہا اور پھر دروازے کو بے آواز کھول کر پھرتی سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک لمبا کوریڈور تھا جو

وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ کوریڈور میں اور بھی کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔

سلّو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور پہلے پڑنے والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر جھکتے ہوئے کی ہول سے کمرے کے اندر جھانکا۔ اس کی نظروں نے فوراً ہی کمرے میں نصب کمپیوٹرز، دفتری سامان اور ایک دُبلی پتلی سی لڑکی کا احاطہ کر لیا۔ لڑکی کی عمر پچیس کے آس پاس تھی اور شکل کے اعتبار سے وہ قبول صورت کہلائی جا سکتی تھی۔ البتہ اس کے اسمارٹ جسم پر جینز اور ٹی شرٹ جچ رہے تھے۔ وہ ریوالونگ چیئر پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور دیوار کے ساتھ نصب کمپیوٹرز کی اسکرینز پشت پر چلی گئی تھیں۔ شہریار کی ہول سے کان لگا کر اندر کی سُن گُن لینے لگا جبکہ سلّو چوکس کھڑا گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

''میری مجبوری کو سمجھو شیکھر! میں ابھی تم سے ملنے نہیں آ سکتی۔ میں نے اس ٹائم چھٹی مانگی تو میری جاب ختم ہو جائے گی۔'' وہ بڑے میٹھے لہجے میں اپنے کان سے لگے موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

''جاب تم سے بڑھ کر نہیں ہے۔ لیکن اس پر ہمارا فیوچر بنتا ہے۔ اچھی اِنکم کے بنا ہم ایک اچھی لائف کیسے گزار سکیں گے؟'' دوسری طرف سے شاید اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا جواب اس نے قدرے جھنجلاہٹ آمیز دلیل کے ساتھ دیا تھا۔

''ہم نیکسٹ ویک کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ساتھ لنچ کر لیں گے۔ بلکہ میں ایسا کروں گی کہ آفس سے چھٹی لے لوں گی پھر ہم پورا دن ساتھ گزاریں گے۔'' اُس کی گفتگو سے دوسری طرف موجود شخص سے اس کے تعلق کی نوعیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ موبائل فون پر شیکھر نامی جس شخص سے بات کر رہی تھی، وہ یقینی طور پر اس کا محبوب یا منگیتر رہا ہوگا جو دفتری اوقات میں اسے ڈسٹرب کر کے پیشہ ورانہ فرائض میں کوتاہی کا سبب بن رہا تھا۔

''ابھی میں فون بند کر رہی ہوں۔ تمہاری ناراضگی جب میں ملنے آؤں گی، تب دُور کر دوں گی۔''

اگلا بندہ شاید کسی طرح قائل نہیں ہو رہا تھا چنانچہ اس نے یکدم ہی فون بند کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کال منقطع کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اس طرح سر تھام کر بیٹھ گئی کہ اس کا موبائل فون سر اور ہاتھ کے درمیان میں دبا ہوا تھا۔

شہریار کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے ہینڈل دبا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور برق رفتاری سے اندر داخل ہو گیا۔

سلّو نے بھی اس کی تقلید کی۔ کیونکہ کوریڈور میں اس طرح منہ اٹھائے کھڑے رہنا خطرناک تھا۔ اچانک ہی کوئی بھی کسی کمرے سے باہر نکل کر اسے وہاں کھڑا دیکھ سکتا تھا۔

''کک..... کون ہو تم؟'' ان دونوں کے اس طرح اچانک کمرے میں داخل ہونے پر لڑکی بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور پھر یکدم ہی اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہو گئے جیسے اس نے اپنے سامنے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

''تم لوگ تہ خانے سے باہر کیسے نکلے؟'' لمحہ بھر میں پہچان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

یقینی طور پر وہ تہ خانے میں ان دونوں کی موجودگی سے باخبر تھی اور اس کے حساب سے یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ کوئی اپنی مرضی سے تہ خانے سے باہر نکل سکے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہم لفٹ سے اوپر آئے ہیں۔'' شہریار نے نہایت سادگی سے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں عمارت کے بیرونی حصے، مختلف زاویوں سے دکھائی دے رہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عمارت ایک ایسے علاقے میں موجود ہے جہاں بہت کم عمارتیں موجود ہیں اور اردگرد کا زیادہ تر علاقہ خالی پڑا ہوا ہے۔

عمارت کے دروازے پر دو سکیورٹی گارڈز چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے جبکہ چار دیواری خاصی بلند ہونے کے ساتھ اس پر خاردار تار بھی بچھے ہوئے تھے۔ شہریار کو یقین تھا کہ ان تاروں میں برقی رو دوڑانے کا انتظام بھی موجود ہوگا۔

''اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں؟'' اس کا جواب سن کر لڑکی نے ایک اور سوال داغا اور آہستہ سے اپنا بایاں ہاتھ پشت کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ موبائل فون اس کے دائیں ہاتھ میں موجود تھا اور وہ اس نے بالکل سامنے رکھا ہوا تھا۔

''اپنا ہاتھ سامنے کرو ورنہ اس گن سے نکلنے والی گولیاں تمہارے کلیجے میں گھس جائیں گی اور تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں۔'' شہریار نے سخت لہجے میں اسے دھمکایا تو اس نے بے بسی کے عالم میں اپنا ہاتھ سامنے کر لیا۔

اسی وقت سلو آگے بڑھا اور اسے اتنی زور سے جھٹکا دے کر واپس کرسی پر بٹھایا کہ اس کا موبائل اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ فرش پر نرم و ملائم کارپٹ بچھا تھا جس کی وجہ سے موبائل نیچے گرنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

''چھوڑو مجھے..... کیا کر رہے ہو؟'' لڑکی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اچانک پڑنے والی اس افتاد پر اچھی خاصی خوف زدہ ہو گئی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرے کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔

شاید وہ فیلڈ میں رہ کر کام کرنے کے بجائے دفتر تک محدود رہ کر کام کرنے کی عادی تھی اور اسے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر ضرورت سے زیادہ گھبرا گئی ہو کہ جو لوگ اندو اور اس کے مسلح ساتھیوں کو زیر کر کے تہ خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ خاصے خطرناک ہوں گے۔

''آواز نکالے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہو ورنہ گردن کی ہڈی توڑ کر ایسے جان نکالوں گا کہ تمہارے فرشتوں کو بھی تمہارے مرنے کی خبر نہیں ہوگی۔''

سلو نے غرا کر اسے دھمکی دی لیکن اس کی آواز بس اتنی تھی کہ کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کمرے کے علاوہ بھی وہاں بہت سے کمرے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کس کس کمرے میں کتنے افراد موجود ہیں جو آواز سن کر اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ تم بس اس کا منہ بند رکھو۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' شہریار اُس کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ فوراً ہی اس کی نظر میں کی پیڈ سے ہٹ کر لگا ایک بٹن آ گیا۔ لڑکی نے شاید ہاتھ پیچھے لے جا کر اسی بٹن کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بٹن کسی الارم وغیرہ سے منسلک ہے۔

اس بٹن سے صرفِ نظر کرتا ہوا وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ذرا ہی دیر میں اسے اپنی کوشش میں کامیابی

حاصل ہوئی اور اسکرین پر موجود مناظر تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ اب وہ بیرونی مناظر کے بجائے عمارت کے اندرونی حصے کے مناظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

عمارت میں تقریباً بارہ کے قریب کمرے موجود تھے جن میں تہ خانے کے اوپر والے کمرے کے علاوہ وہ کمرہ بھی شامل تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھے۔ باقی کے دس کمروں میں سے دو گیسٹ روم کے انداز میں سجے ہوئے تھے جبکہ ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر سیٹ تھا۔ ان تینوں کمروں میں کوئی ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ایک طویل ہال نما کمرے میں چھ افراد ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان افراد کے علاوہ عمارت کے دیگر کمروں میں مزید پانچ افراد اور بھی موجود تھے جن میں سے تین تو ایک جگہ بیٹھے آپس میں کوئی گفتگو کر رہے تھے جبکہ دو دفتری نوعیت کا کوئی کام کر رہے تھے۔

شہریار نے مزید بٹن دبائے تو اسکرین پر تہ خانے کا منظر بھی نظر آنے لگا۔ وہاں اندو اور اس کے ساتھی فرش پر بے دست و پا پڑے بہ زبانِ خاموشی اپنی شکست اور ریزہ ریزہ غرور کی داستان سنا رہے تھے۔ شہریار نے سلو کو اشارہ کیا تو اس نے لڑکی کی کرسی کو گھما کر اس کا رخ اسکرین کی طرف کر دیا۔ وہاں موجود منظر کو دیکھ کر اس کا چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔

''پلیز! مجھے کچھ مت کہنا۔ میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ میں نے اور شیکھر نے ایک ساتھ جیون بتانے کے اتنے سپنے دیکھے ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو شیکھر صدمے سے پاگل ہو جائے گا۔'' اس نے عجیب معصومانہ لہجے میں شہریار سے التجا کی اور یک دم ہی بری طرح سسکنے لگی۔

''اس انجام کے لیے تو تمہیں اسی وقت سے تیار رہنا چاہئے تھا جب تم نے ''را'' کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا۔'' شہریار نے سپاٹ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں مجبور تھی۔ میرے پاس یہ چوائس نہیں تھی کہ میں اُنہیں انکار کر سکوں۔'' اس نے اسی طرح سسکتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟..... کیا ''را'' جیسے اداروں میں بھی جبری بھرتیاں ہوتی ہیں؟'' شہریار حیران ہوا۔

''دوسروں کا مجھے نہیں پتہ لیکن میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ میری بیڈ لک تھی کہ میں نے ایم سی ایس کے ایگزامز میں ٹاپ کیا اور یک دم ہی بہت سے لوگوں کی نظروں میں آ گئی۔ ان دنوں میں اپنی اس مشہوری کے لیے بہت خوش تھی۔ میں نے اور میرے ٹیچرز نے نیوز رپورٹرز کو بڑھ چڑھ کر بتایا کہ کمپیوٹر کی دنیا میں، میں کتنی جانکاری رکھتی ہوں اور کیسے کیسے کارنامے انجام دے سکتی ہوں۔ مجھے فوراً ہی کئی جگہ سے جاب کی آفرز آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنے پیرنٹس اور شیکھر سے رائے لے کر گورنمنٹ سیکٹر کی طرف سے ملنے والے سب سے اٹریکٹو آفر کو ایکسیپٹ کر لیا۔ وہاں تین مہینے تک مجھے پرکھا گیا اور پھر یہاں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ تمہیں معلوم ہے، یہ لوگ مجھ سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کمپیوٹر ایکسپرٹ سے زیادہ ایک ہیکر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میں ان کے لیے اپنی ہی گورنمنٹ کے کئی آفیسرز اور نیتاؤں کے راز چوری کرتی ہوں۔ میں نے ان کے لیے کئی دولت مندوں کے اکاؤنٹس صاف کیے ہیں اور آگے بھی جانے یہ مجھ سے کیا کیا کام لینے والے ہیں۔ میں یہ جاب چھوڑ دینا چاہتی ہوں لیکن نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے منگیتر شیکھر سے ملنے کی پرمیشن بھی بہت مشکل سے ملتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک آدمی سارا ٹائم ہماری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ میرے موبائل سے ہونے والی ہر کال کا ریکارڈ یہ لوگ چیک کرتے ہیں اور میں کسی سے اپنے من کی بات نہیں کر سکتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن یہ لوگ میرے پیرنٹس کی طرح شیکھر کی بھی جان نہ لے لیں۔ اس لیے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود بھی جان کر اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ میری سنتا ہی نہیں ہے۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں انہیں ایک عجیب سی داستان سناتی چلی گئی۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ تمہارے پیرنٹس کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے؟'' شہریار کا لہجہ خود بخود ہی اس کے لیے نرم پڑ گیا۔

''مجھ سے اپنے مطلب کے کام لینے سے پہلے مجھ پر زور دیا جا رہا تھا کہ میں چوبیس گھنٹے یہیں رہا کروں اور صرف وِیک اینڈ پر اپنے پیرنٹس سے ملنے کے لیے جایا کروں۔ میں اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہوں اس لیے انہیں اور مجھے دونوں کو ہی یہ بات منظور نہیں تھی۔ میرے انکار پر پہلے تو مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا لیکن جب میں نے جاب چھوڑنے کی دھمکی دی تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر ٹھیک ایک مہینے بعد میرے پیرنٹس ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کے مرنے کے بعد شیکھر فوری طور پر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے دفتر کی طرف سے بتایا گیا کہ ایگریمنٹ کے مطابق میں پانچ سال تک نہ تو جاب چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی شادی کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ یہ شرطیں کب اور کیسے ایگریمنٹ میں شامل کی گئیں لیکن چونکہ اس پر میرے دستخط موجود تھے، اس لیے میں اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے پانچ سال جیل میں کاٹنے پڑتے۔ میں مجبور ہو کر چوبیس گھنٹے کے لیے یہاں رہنے پر راضی ہو گئی اور اب ان کے اشاروں پر ناچ رہی ہوں۔ یہ آفس میرا نہیں ہے۔ میں صرف کھانے کے وقفے میں یہاں بیٹھتی ہوں ورنہ میرے کام کا کمرہ دوسرا ہے جہاں میں ان کی مرضی کے کام کرتی ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں میرا یہ سوچنا غلط تو نہیں ہے کہ انہی لوگوں نے میرے پیرنٹس کو جان بوجھ کر حادثے کا نشانہ بنایا تھا۔'' اس کا لہجہ نفرت اور دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

شہریار کو اس کی داستان سن کر دلی دکھ ہوا۔ آج تک تو وہ اپنے ہی ملک میں ''را'' کی ریشہ دوانیوں سے خار کھاتا تھا لیکن یہاں تو انہوں نے اپنوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ بہرحال، اس وقت اُسے اس لڑکی کے حالات پر کُڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ لوگ خود مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے اور انہیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا چنانچہ اپنی توجہ اسی طرف مبذول رکھی اور سلّو سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میرے خیال میں تم بنا ہتھیار کے خاموشی سے ان دو افراد کو تو آرام سے آف کر سکتے ہو۔''

''بالکل۔'' سلّو نے جواب دیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہریار اُسے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ پہلے نزدیک ترین کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے نہایت آہستگی سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اگر موجود شخص کو فوری طور پر اس کی آمد کا احساس نہیں ہوا اور جب ہوا تو مصیبت اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھنے اور دراز کھول کر شاید کوئی ہتھیار نکالنے کی بیک وقت کوشش کی لیکن دونوں ہی مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور سلّو نے اسے چھاپ لیا۔

معلوم نہیں وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی تھا یا نہیں لیکن حقیقتاً اس پر اتنی اچانک یہ افتاد ٹوٹی تھی کہ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے باعث چند لمحوں میں ہی اپنی زندگی سے محروم ہو گیا۔

اس شخص کو اپنے انجام تک پہنچانے کے بعد سلّو نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ وہ چونکہ اسکرین پر دیکھ کر عمارت کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس لیے حرکت کرنے میں کوئی دُشواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ادھر شہریار نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنے ساتھ موجود اس کمپیوٹر ایکسپرٹ لڑکی کی کرسی کا رخ اسکرین کی طرف سے

ہٹا دیا تھا تاکہ وہ یہ سب نہ دیکھ سکے۔

''را'' کے ٹھکانے پر موجود ہونے کے باوجود اسے وہ لڑکی خاصی ڈرپوک لگی تھی اس لیے یہ احتیاط برتی تھی کہ کہیں وہ کوئی اندوہناک منظر دیکھ کر اضطراری طور پر چیخ ہی نہ پڑے۔ لڑکی کی گردن سے گن کی نال لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے وہ اسکرین پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے کمرے میں داخل ہونے والے سلّو کو اس دفعہ کچھ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہاں موجود شخص نے اسے دیکھ لیا اور پھرتی سے اپنا پسٹل نکال لیا۔

اس موقع پر سلّو نے عجیب جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود گن اس کے پسٹل والے ہاتھ پر دے ماری۔ اس کا نشانہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا اور گن سمیت فاصلے پر جا گرا۔

سلّو نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی پینٹ میں اڑسی ہوئی دوسری گن نکال کر اس کا رخ آدمی کی طرف کر دیا تو شہریار کو اس کے آرام سے گن دے مارنے کی وجہ سمجھ آئی۔ اس کے پاس اپنی ذاتی گن کے علاوہ اندو کے ساتھی سے چھینی گئی گن بھی موجود تھی جس کی وجہ سے اس نے نہایت ذہانت اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے حق میں کر لیا تھا۔

شہریار اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا لیکن دیکھنے سے اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اس نے اس درمیانی عمر کے گنجے آدمی کو ہاتھ اوپر اٹھا کر میز کے پیچھے سے نکلنے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم پر وہ آدمی کچھ بولا ضرور لیکن سلّو کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے اسے انکار کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ میز کے پیچھے سے نکل کر دیوار کی طرف بڑھ گیا اور اپنا رخ اس طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔

سلّو محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھا اور اپنا گن والا ہاتھ اوپر اٹھا کر پشت پر سے اسے ضرب لگائی لیکن وہ شخص اس کی توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور یک دم ہی پلٹ کر اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اچانک لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے سلّو کے ہاتھ سے گن نکل کر دُور جا گری۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے گن کے گرنے کی آواز پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں دوسرے دو کمروں میں موجود افراد شاید اب تک اس طرف متوجہ ہو چکے ہوتے۔

گن ہاتھ سے نکل جانے پر سلّو نے جھنجلا کر اپنی لات چلائی جو مقابل کے پہلو میں لگی اور جواباً اس نے بھی سلّو کے منہ پر ایک گھونسہ دے مارا۔ اس گھونسے کے جواب میں سلّو نے ایک بار پھر اپنی ٹانگ کا استعمال کیا اور دونوں رانوں کے بیچ میں نازک جگہ کو نشانہ بنایا۔ وہ شخص بلبلا اُٹھا۔ لیکن آدمی جی دار تھا اس لیے منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر مقابلے پر ڈٹا رہا اور سلّو کی گردن کو کھڑی ہتھیلی کے وار کا نشانہ بنانا چاہا۔ سلّو نے ایک دم جھکائی دے کر نہ صرف خود کو اس کے وار سے بچایا بلکہ اس کے پیٹ میں اپنے سر سے زوردار ٹکر دے ماری۔ یقیناً یہ ایک زوردار ضرب تھی لیکن وہ شخص اسے جھیل گیا اور سلّو کے بالوں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ دونوں قالین پر گرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔

شہریار کے لیے یہ بڑے نازک اور صبر آزما لمحات تھے۔ اُس نے ذہنی طور پر خود کو تیار کر لیا کہ اگر سلّو اس آدمی پر قابو حاصل نہیں کر پایا تو اسے خود ایکشن میں آنا ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں دوسرے افراد کا بھی الرٹ ہو جانا لازمی تھا اس لیے اس کے لیے صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہو جاتی۔ فی الحال تو قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ گفتگو اور کھانے میں مصروف آدمیوں کے دونوں ہی گروہوں کو اپنے اردگرد کی بھنک نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑ سکی تھی اور وہ ہنوز اپنی مصروفیت میں مشغول تھے۔

سلّو اور اُس کا مقابل آپس میں بدستور اُلجھے ہوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مقابل کو لڑنے کے ہنر میں ماہر ہے۔ البتہ سلّو کو اس پر یہ برتری حاصل تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں جوان اور زیادہ توانا جسم کا مالک تھا۔ آخر کار اُس کی اس برتری نے مقابلے کا فیصلہ کر دیا۔ سلّو نے اچانک ہی اپنے مقابل کے دونوں کانوں کو مضبوطی سے گرفت میں لیا اور اس کا سر پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ ٹکر اتنی زوردار تھی کہ اس کے مقابل کی بالوں سے محروم کھوپڑی چیخ کر رہ گئی اور وہ کسی مُردہ چھپکلی کی طرح نیچے گرا۔ ایسی حالت میں قالین پر لمبا لیٹا نظر آنے لگا کہ اُس کے سر سے نکلنے والا خون تیزی سے قالین کو بھگو رہا تھا۔ اُس کی حالت سے بے نیاز سلّو اطمینان سے اُسے چھوڑ کر کمرے کے ان حصوں کی طرف متوجہ ہوا جہاں اس کی دونوں گنز گری تھیں۔ گنز اپنے قبضے میں کرنے کے بعد وہ متوازن چال چلتا ہوا شہریار کے پاس واپس آ گیا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اندر گھستے ہی اس نے شہریار سے پوچھا اور یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اس کے لباس پر نظر آنے والے خون کے چھینٹوں نے لڑکی کے خوف زدہ چہرے کی زردی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ خون اس گنجے کا تھا جس کا سر اُس نے دیوار سے ٹکرا کر اس کی زندگی کا قصہ تمام کیا تھا۔

''اب ہمیں ان تینوں گروپس سے نمٹنا ہوگا۔'' اس کا اشارہ ڈائننگ ہال اور لیونگ روم کے علاوہ گیٹ پر موجود گارڈز کی طرف تھا۔ وہ کُل ملا کر گیارہ افراد تھے جن سے ان دونوں کو بیک وقت نمٹنا تھا۔ کرنے کو تو یہ بھی کر سکتے تھے کہ اپنے ساتھ موجود لڑکی کو بے ہوش کرتے اور گیٹ چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔ لیکن شہریار کے نزدیک وہ اس کے وطن کے بدترین دشمن تھے چنانچہ وہ انہیں ان کے انجام تک پہنچائے بغیر وہاں سے فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''اتنے افراد سے اکٹھا نمٹنے کے لیے ہمیں لازماً گنز کا استعمال کرنا پڑے گا اور ہم صرف دو ہیں۔ یعنی بیک وقت حملہ کرنے کی صورت میں ہمیں کسی نہ کسی ایک گروپ کو نظر انداز کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے اس گروپ کے افراد فائرنگ کی آواز سن کر ہمارے مقابلے پر آ جائیں گے۔'' سلّو نے سنجیدگی سے صورتِ حال کا احاطہ کیا جس پر لڑکی نے ایک بار پھر سسکنا شروع کر دیا۔

''پہلے اس کا منہ تو بند کراؤ۔ پھر کچھ کرتے ہیں۔'' سلّو بیزاری سے بولا جس پر شہریار نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سر پر ایک جچی تلی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ بے شک وہ مظلوم تھی لیکن تھی تو دشمن کے کیمپ کا حصہ اس لیے وہ اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔

''میں ڈائننگ ہال میں جاتا ہوں، تم لیونگ روم میں جاؤ۔ یہ لوگ اپنی مصروفیت میں مگن ہیں۔ ہم بیک وقت فائرنگ کریں گے تو کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ جب تک گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر اندر رخ کریں گے، ہمارا کام ختم ہو چکا ہوگا اور ہم اُنہیں سنبھال لیں گے۔

لڑکی کو بے ہوش کر کے شہریار نے فوری طور پر اسے اگلے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ڈائننگ ہال میں موجود افراد کھانے کے اختتامی مراحل میں ہیں اس لیے ان پر فوری ایکشن میں آنا ضروری تھا۔ اگر دیر ہو جاتی تو وہ چھ افراد تتر بتر ہو جاتے اور ایسی صورت میں ان پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔

سلّو بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اپنے ٹارگٹ

کی پہنچے اور پھرتی سے دروازہ کھول کر دونوں ہاتھوں میں موجود گنز سے ایک ساتھ فائرنگ شروع کر دی۔ گنز کے دہانوں سے نکلتی گولیوں نے انسانی جسموں کو بے دردی سے چھیدنا شروع کر دیا۔ سلّو کے سامنے پانچ افراد تھے۔ وہ تینوں ہی لمحوں میں گولیاں کھا کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

البتہ ڈائننگ ہال میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ دو گنز سے بیک وقت فائر کرنے کے باوجود شہریار کی چھ کے چھ افراد کو ایک ساتھ نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور ان میں سے دو افراد نے نیچے بیٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کو الٹ کر خود کو اس کے پیچھے چھپا لیا۔ ڈائننگ ٹیبل کے اُلٹنے کے نتیجے میں اس پر موجود برتن اور خورد و نوش کی اشیا نیچے گر کر بکھر گئیں اور گولیاں کھا کر فرش پر گرنے والے اسی کھانے میں لوٹ پوٹ ہونے لگے جسے کچھ دیر پہلے مزے سے کھا رہے تھے۔

یہ ساری سیکنڈوں کی کہانی تھی اور اگر شہریار نے خود کو یک دم ہی نیچے نہ گرا لیا ہوتا تو اس گولی کا نشانہ بن جاتا جو ڈائننگ ٹیبل کی آڑ میں چھپنے والوں میں سے ایک نے چلائی تھی۔ گولی ریوالور سے چلائی گئی تھی اور کھلے دروازے سے گزر کر کوریڈور میں سامنے والے کمرے کی دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔

شہریار نے نیچے گرتے ہی ڈائننگ ٹیبل پر ایک برسٹ مارا۔ وہ مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی ٹیبل تھی پھر بھی گولیوں نے اس میں کئی چھید کر ڈالے۔ ساتھ ہی ایک زوردار سسکاری بھی سنائی دی جو یقیناً ان دو میں سے کسی ایک کے زخمی ہونے کی نشانی تھی۔

برسٹ مارنے کے بعد شہریار ایک لمحہ بھی اپنی جگہ پر نہیں ٹھہرا اور فوراً ہی پوزیشن بدل لی۔ یہ چیز اس کے لیے سود مند ثابت ہوئی اور وہ ایک بار پھر اس فائر سے بچ گیا جو ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے سے ریوالور ہی سے کیا گیا تھا۔ اس فائر نے اسے دو اہم حقائق سے آگاہ کیا۔ اوّل یہ کہ ان دونوں میں سے صرف ایک شخص مسلح تھا۔ دوسرے اُس کے پاس بھی محض ریوالور ہی تھا۔ ظاہر ہے اپنے تئیں وہ لوگ اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر بیٹھے پُرتکلف کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس لیے اسلحہ ساتھ رکھنا غیر ضروری سمجھا ہوگا اور کسی ایک شخص کے پاس یہ ریوالور بھی بس اتفاقاً ہی موجود ہوگا۔

اسلحے کے معاملے میں اپنی برتری کو محسوس کر کے اس نے فرش پر پڑے پڑے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں خطرناک گنز کے دہانوں سے نکلنے والی دہکتے انگاروں جیسی گولیوں نے سیکنڈوں میں ہی فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنی فتح کو محسوس کر کے کھڑی ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے جھانکا تو اسے دو نفوس اپنے ہی خون میں لت پت آخری سانسیں گنتے دکھائی دیئے۔

ایک نظر میں ان چھ کے چھ کی موت کا یقین کر لینے کے بعد وہ باہر کی طرف لپکا تو اسے سلّو کوریڈور کے آخری سرے پر موجود سیڑھیوں سے نیچے اُترتا دکھائی دیا۔

اپنے شکاروں سے نمٹتے ہوئے اس نے باہر سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں چنانچہ جب سلّو کے تلخ مندی سے چمکتے چہرے کو دیکھا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے شکاروں سے نمٹنے کے بعد چھت پر چلا گیا ہوگا۔ مین گیٹ سے مرکزی عمارت ذرا فاصلے پر تھی چنانچہ جب گارڈز نے فائرنگ کی آواز سن کر اندر کا رخ کیا ہوگا تو انہیں کچھ وقت لگا ہوگا۔ اتنی ہمت چیتے کی سی پھرتی رکھنے والے سلّو کے لیے کافی تھی۔ اس نے چھت پر سے ہی ان دونوں کو نشانہ بنا کر ان کا کام تمام کر دیا ہوگا۔

''اب یہاں سے نکلنا چاہئے۔ ورنہ فائرنگ کی آوازیں سن کر کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر دے دے گا۔'' اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سلّو نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں چلتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ اس بے ہوش لڑکی کو لے کر کسی ایک گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے سلّو کو ہدایت دی تو وہ منہ بناتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں صاف ستھرے طریقے سے مرنے والے شخص کی لاش پڑی تھی۔ اپنی خون آلود قمیض کی جگہ اس کی قمیض پہن کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ اسے کندھے پر ڈال کر وہ واپس آیا تو شہریار دکھائی نہیں دیا۔ اس کی فکر میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

باہر تین عدد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے سیاہ شیشوں والی سرخ گاڑی کا انتخاب کیا اور لڑکی کو اس کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کی کاریگری نے چند لمحوں کے اندر بغیر چابی کے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ وہ اسے چلاتا ہوا عمارت کے مین گیٹ تک پہنچا۔ بڑے سے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا جو یقیناً باہر موجود گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر بوکھلاہٹ میں کھلا چھوڑ آئے تھے۔

اس نے انجن کو اسٹارٹ چھوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ سے اُتر کر گیٹ کو چوپٹ کھول دیا۔ اسی وقت شہریار اندر سے دوڑ کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پہنچنے سے قبل وہ ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ شہریار نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ابھی دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ سلّو گاڑی کو گولی کی طرح نکال کر باہر لے گیا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر بھی اسے عقب نما آئینے میں عمارت سے بلند ہوتے شعلے نظر آ گئے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''شارٹ سرکٹ۔'' شہریار نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''را'' والوں سے اس کی نفرت کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔ انہوں نے اسے نجی اور قومی دونوں اعتبار سے شدید نقصان پہنچایا تھا۔ وہ نہ تو معصوم شینا کی دردناک موت بھول سکا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں جیسے بھائی سجاد رانا کا قتل۔ وطن کے خلاف کی جانے والی سازشیں اور ناقابلِ معافی جرائم اپنی جگہ تھے اسی لیے موقع ملنے پر ان کی ایک بڑی افرادی قوت کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ اس نے انہیں زبردست مالی نقصان پہنچانے کا موقع بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اس عمارت میں موجود بہترین انتظامات دیکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ''را'' کا کوئی اہم ٹھکانہ تھی اور اب وہ لوگ اس ٹھکانے سے محروم ہو گئے تھے۔

''ہم اس گاڑی میں زیادہ دیر تک سفر نہیں کر سکتے۔ یہ گاڑی فوراً ٹریس ہو جائے گی۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سلّو نے کوئی غیر ضروری بات کرنے کے بجائے خود بھی بے حد سنجیدگی سے ایک اہم نکتے کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''ہوں..... ٹھیک ہے۔ ابھی تو چلتے رہو۔ ہم آگے چل کر یہ گاڑی چھوڑ دیں گے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا اور برابر میں بے ہوش پڑی لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے وہ پچھلی نشست پر بیٹھا ہی اس لیے تھا کہ لڑکی کا کوئی بندوبست کر سکے۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' ہوش میں آنے پر خود کو گاڑی میں دیکھ کر اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم تمہیں کہیں نہیں لے جا رہے۔ بس یوں سمجھو کہ تمہاری مظلومیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے تمہاری جان بخشی کر دی ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ جب تم سے تفتیش کی جائے تو کہہ دینا آج تم

کال پر تھیں اس لیے کچھ نہیں جانتیں۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں لڑکی کے سوال کا جواب دیا اور پھر سلّو سے بولا۔ ''گاڑی یہیں روک دو۔''

سلّو نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور مصروف سڑک پر نظر آنے والے بس اسٹاپ کے قریب گاڑی روک دی۔

''اُترو اور اپنے گھر جا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔'' شہریار نے لڑکی سے کہا تو وہ یوں تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اُتری کہ ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو گئی تو وہ لوگ اپنا فیصلہ بدل لیں گے۔

اُس کی بے یقینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے نیچے اُترنے کے بعد اپنے پیچھے گاڑی کا دروازہ تک بند کرنے کی زحمت نہیں کی اور بجائے بس اسٹاپ پر رُکنے کے سڑک پار کر کے تیزی سے دوسری طرف جانے لگی۔

شہریار نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور سلّو ایک بار پھر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ لیکن ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ وہاں ایک عجیب سا شور سنائی دیا۔ شہریار نے بے ساختہ ہی گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ان کے پیچھے ٹریفک رکنے لگا تھا اور لوگ دوڑ کر سڑک پر ایک جانب جا رہے تھے۔

''وہ مر گئی۔ ہیوی ٹرک نے اسے روند ڈالا۔'' سلّو بیک ویو مرر میں پہلے ہی لڑکی کو دیکھ رہا تھا اس لیے اور سے بولتے ہوئے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اس انکشاف کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ ابھی چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے جب اس نے لڑکی کو اس کی جان بخشی کا مژدہ سنایا تھا لیکن وہ جو کاتبِ تقدیر تھا، اس نے اس کے فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر کر انسان کی بے بسی اور بے اختیاری کو ثابت کر دیا تھا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ مر گئی ہے؟ ہو سکتا ہے معمولی سا حادثہ ہوا ہو؟'' وہ جیسے یقین کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''میں نے خود اُسے ٹرک کے نیچے آتے دیکھا ہے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی معجزہ نہ ہوا ہو تو وہ فوراً ہی اپنی جان سے چلی گئی ہو گی یا کم سے کم بھی اتنی شدید زخمی ہوئی ہو گی کہ عمر بھر کے لیے معذور تو ضرور ہو گئی ہو گی۔''

سلّو نے بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ وہ اتنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا کہ وہ لمحوں میں ہی جائے حادثہ سے کافی دور نکل گئے تھے اور اب اس کی کوشش تھی کہ مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر کم ٹریفک والے راستوں کا رخ کرے کیونکہ ابھی انہیں اس گاڑی سے بھی نجات حاصل کرنی تھی۔

''بہت بدنصیب نکلی بے چاری۔ میں نے تو اس کی مظلومیت سے متاثر ہو کر اسے زندہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن جو اللہ کو منظور۔'' شہریار ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اللہ نے ہمارے اور اس کے حق میں بہت بہتر فیصلہ کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر وہ تفتیش کے دوران وہ کہتی جو تم نے اس سے کہا تھا تو کیا وہ لوگ یقین کر لیتے؟ وہ حقیقت جاننے کے لیے اسے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اور ظاہر ہے، یہ ہمارے اور اس کے دونوں کے لیے بُرا ہوتا۔ اس لیے سمجھو کہ جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو یوں بھی اسے زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تم باس ہو، اس لیے اعتراض نہیں کیا۔''

سلّو بولنے پر آیا تو تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا۔ اُس کے لہجے کی تلخی کے باوجود شہریار نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ کمزور لڑکی ''را'' کے بھیڑیوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی اور نتیجے میں وہ ان کے حلیوں سمیت اس سے ہر ممکنہ معلومات اُگلوا لیتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں گاڑی اس شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں روک دیتا ہوں۔ وہاں سے پھر ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔" جائے حادثہ سے دور نکلنے کے بعد سلّو نے گاڑی کی رفتار نارمل کر لی تھی اور مستقل اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک مصروف شاپنگ سینٹر نظر آنے پر اس نے شہریار سے کہا تھا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے منظوری دے دی۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد انہوں نے گلوز اپنے لباس میں چھپایا اور اس طرح باہر نکلے جیسے دو دوست خوش گوار موڈ میں خریداری کے لیے وہاں آئے ہوں لیکن پارکنگ سے نکل کر انہوں نے شاپنگ سینٹر کی عمارت کی طرف رخ کرنے کی زحمت نہیں کی اور ٹہلتے ہوئے دوبارہ سڑک پر آ گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد اُنہیں ایک آٹو رکشہ مل گیا۔ رکشے والے کو ایک قریبی علاقے کا پتہ بتا کر وہ اس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے وہ کوئی دوسری پھر آگے تیسری سواری کر لیتے، تب کہیں جا کر کسی محفوظ ٹھکانے تک محفوظ طریقے سے پہنچنے میں کامیاب ہو پاتے۔

⊛----✪----⊛

وہ چاروں میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان آئندہ کی منصوبہ بندی سے متعلق ایک اہم میٹنگ اپنے اختتامی مراحل میں تھی اور دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کی پیش کردہ تجاویز میں سے چند کو باہمی اتفاق سے منظور کر لیا تھا۔

ان دو گروپوں میں سے ایک "موساد" کے اسپیشل ایجنٹس لِنڈا اور ڈیوڈ پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے گروپ میں الفا اور بیٹا کہلانے والے ہیروئن کے وہ بین الاقوامی بیوپاری شامل تھے جو "موساد" کے تحت اسرائیل کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔

"خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ اتحاد بہت سودمند ثابت ہوا ہے اور ہم چند مشکلات کے باوجود اپنے کام کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی ہم اپنے منصوبوں پر کامیابی سے عمل کرتے رہیں گے۔"

بیٹا نے میز پر رکھی پرانی اور نادر شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا تو باقی افراد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس میٹنگ میں ڈیوڈ اور لِنڈا کی حیثیت مہمانوں کی تھی اور بیٹا میزبان ہونے کا حق ادا کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے جام تیار کر رہا تھا۔

لِنڈا اور ڈیوڈ کے "موساد" سے متعلق ہونے کی وجہ سے میٹنگ کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ وہاں کسی خدمت گار کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی اور شراب کے علاوہ کسی اور تکلف کی بھی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

"میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں مسٹر بیٹا! اور مجھے یہاں طے ہونے والی ہر بات سے مکمل اتفاق ہے۔ لیکن اس وقت میں ایک ایسی بات بھی آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں جو ہماری میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس پر آج ہی بات کر لی جائے۔" لِنڈا نے اس کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے اپنی اسی مسکراہٹ سے نوازا جس کے سامنے بڑے بڑے ڈھے جاتے تھے اور اس سے اختلاف کی ہمت کھو دیتے تھے۔

"کیوں نہیں مس لِنڈا! تم اگر ایسا سمجھتی ہو تو ضرور بات کرو۔" بیٹا نے فراخ دلی سے اسے اجازت دی۔ اس دوران وہ باقی دونوں افراد کو بھی تیار شدہ جام تھما چکا تھا اور اب اپنے لیے جام تیار کر رہا تھا۔

"مسئلہ ہے پاکستان سے تعلق رکھنے والے چودھری افتخار عالم شاہ کا۔ ہم نے اُس بندے کو ٹریپ کر کے آپ کے حوالے کیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے آپ پاکستان میں کس قدر اہم کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگوں کی طرف سے اس بندے کو مناسب طریقے سے ٹریٹ نہیں کیا جا رہا۔" اس نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

"تم یہ نہیں کہہ سکتیں مس لِنڈا! وہ فیوڈل لارڈ کتے کی دُم ہے جسے میں بالکل صحیح طریقے سے ٹریٹ کر رہا ہوں۔ اگر تمہارے کہنے پر میں نے اسے ڈھیل دی تو وہ ہمارے سر چڑھ جائے گا۔" بیٹا کے بجائے الفا نے تلخی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"میں آپ کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتی مسٹر الفا! لیکن آپ مشرق کے فیوڈل لارڈز کی نفسیات کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ وہ وقتی طور پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے آپ کے پریشر میں آ گیا ہے لیکن کسی بھی دن اس کی کچلی ہوئی انا اچانک ہی پوری طاقت سے بیدار ہو جائے گی اور نتیجہ ہماری بربادی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ اس نے افیون کے کھیتوں کے علاوہ وہاں کتنے کام سنبھال رکھے تھے۔ اب اگر وہ کچھ نہ کرے اور صرف ان کھیتوں کے متعلق ہی اپنی گورنمنٹ کو بتا دے تو ہماری کتنی محنت اور سرمایہ ضائع چلا جائے گا۔" لِنڈا نے لہجے کو مہذبانہ رکھا لیکن الفا سے دبے بغیر اپنی بات کہتی چلی گئی۔

"وہ لالچی بڈھا مر کر بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔" الفا نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کے پاس ایسی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اپنی کچلی ہوئی انا کو بحال کرنے کے لیے وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" لِنڈا نے بیٹا جھجک اس سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا ڈیوڈ البتہ بالکل خاموش تھا۔ یہاں آنے سے قبل ہی ان کے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ لِنڈا اس معاملے کو میٹنگ کے اختتام پر اٹھائے گی لیکن وہ اس بحث میں حصہ نہیں لے گا۔

"تمہاری ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اُس ڈرٹی مین کو اپنے سر پر بٹھا لوں؟" یہ بات پوچھتے ہوئے الفا کے لہجے میں چودھری کے لیے بے پناہ حقارت تھی۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ اسے بہتر طور پر ٹریٹ کیا جائے۔"

"تم اپنی بات کی ذرا وضاحت کرو۔" اس بار بیٹا نے مداخلت کرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ وقتاً فوقتاً چودھری سے ایسے کام لیے جاتے رہیں جن کی وجہ سے اُسے یہ احساس ہو کہ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو اسے دی جانے والی رقم میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔ ہمارے لیے کام کرنے میں اس کے لیے سب سے بڑی کشش ہی یہ تھی کہ ہم اسے ایک کافی بڑی رقم دے رہے تھے۔ لالچی آدمی کو دولت سے دُور کر دو تو وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کام کرنے کا اہل نہیں رہتا۔" الفا کے بُرے بُرے منہ بنانے کے باوجود اس نے اپنی بات مکمل کی اور کہیں بھی اپنے لہجے میں تلخی یا تندی نہ آنے دی۔

منشیات کے اسمگلرز بے شک موساد کے تحت کام کرتے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے لوگوں کے بے شمار روابط ہوتے ہیں اور موساد سے بگڑنے کی صورت میں وہ کہیں اور کا بھی رُخ کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تو ان کا گاڈ فادر امریکہ ہی تھا جس سے تمام تر مراعات حاصل کرنے کے باوجود وہ بہت چالاکی سے امریکیوں کو نشے کی لت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

"مس لِنڈا کی بات معقول ہے۔ واقعی وہ شخص ہمارے لیے اہم ہے۔ کوشش کرو کہ اس سے بگاڑ پیدا نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو۔ معاوضے کی ادائیگی کے لیے تو میں ابھی منظوری دے دیتا ہوں، باقی تم سوچ لو کہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' بیٹا نے اپنے ساتھ بیٹھے الفا سے کہا تو وہ اپنی جگہ پر پہلو بدلنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔ عہدے کے اعتبار سے برابر ہونے کے باوجود بیٹا کو اس کے مقابلے میں تنظیم سے پرانی وابستگی کی وجہ سے ذرا زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے وہ اس سے اختلاف کو غیر مناسب سمجھتا تھا۔

''ایسا کرو، اسے انڈیا بھیج دو۔ ممبئی میں ایک گینگسٹر اشوک سے ہمیں کاروباری معاملات طے کرنے ہیں۔ وہ معاملات چودھری کے ذریعے طے ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کیوں لنڈا! تمہارے خیال میں چودھری اس بات سے خوش ہوگا یا نہیں؟'' الفا کو مشورہ دیتے ہوئے بیٹا نے اچانک ہی لنڈا کو مخاطب کیا۔

''بالکل خوش ہوگا۔ اگر اسے رقم کے علاوہ ممبئی فلم انڈسٹری کی چند پریوں کا جلوہ بھی دکھا دیا جائے تو...'' لنڈا نے اپنی بات کے اختتام پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس نے خود اپنے حسن کے زور پر ہی اب تک چودھری کو قابو میں رکھا ہوا تھا اس لیے یہ بات وثوق سے کہنے میں حق بجانب تھی کہ چودھری کو حسین چہروں اور جسموں کے ذریعے خوش کیا جا سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کا بندوبست تو اشوک آرام سے کر دے گا۔'' بیٹا نے یقین دلایا تو الفا کے دل میں موجود تکدر کے باوجود اُن کی یہ میٹنگ خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوگئی۔

لنڈا، ڈیوڈ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے لیے چودھری اہم نہیں تھا لیکن الفا جیسے لوگوں کو کبھی کبھی یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وہ کتنے ہی اہم سہی، اُنہیں موساد کی برتری کو تسلیم کرنا ہوگا۔ آگے الفا، چودھری سے کس طرح کام لیتا، یہ اس کا مسئلہ تھا۔ خود اس کے لیے تو بس اپنی اتنی ہی کامیابی کافی تھی۔

⊛----✪----⊛

عمیر نے سرسری نظروں سے اپنے ملاقاتی کا جائزہ لیا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کا ذرا درشت چہرے والا آدمی تھا لیکن اس کے سامنے مؤدب بیٹھا رہا تھا۔

''تو تم میرے لیے کیا کچھ کر سکتے ہو مسٹر جگو؟''

''جو آپ حکم کریں سر! میں اپنے گھر والوں سے ملنے پنڈ آیا ہوا تھا۔ ذیشان صاحب سے میری بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہاں ہوں تو آپ سے مل لوں۔ آپ کو کسی معاملے میں میرے جیسے آدمی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کو شہریار صاحب کی جگہ ہی سمجھوں اس لیے اب آپ مجھے اپنا خادم سمجھ لیں۔ شہریار صاحب نے ایک واری میرے اکلوتے پتر کی حیاتی بچائی تھی۔ میں نے اس احسان کے بدلے اپنی پوری حیاتی ان کے نام لکھ دی۔ ہور جب کبھی بھی انہوں نے مجھے کسی کام سے پکارا، فوراً خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اللہ انہیں صحت تندرستی دے۔ سچ پوچھیں تو ان کی حالت کا سوچ کر بڑا دل کڑھتا ہے۔'' اس کے مختصر سوال کا طویل جواب دیتے ہوئے جگو آخر میں آزردہ ہوگیا۔

اس نے اپنی ساری زندگی ایک با اثر سیاست دان کے لیے غنڈہ گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن شہریار کو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا اس لیے اس سے خصوصی محبت رکھتا تھا۔ ساری دنیا کی طرح اسے بھی یہی معلوم تھا کہ ایک حادثے کا شکار ہونے کے بعد شہریار ہسپتال میں کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ شہریار کی مستقبل کے لیے کی گئی پیش بندی تھی کہ اس نے پہلے ہی جگو کو ذیشان سے متعارف کروا کر اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ

بوقتِ ضرورت ذیشان کی مدد کرے۔ اب تک ایسی نوبت نہیں آئی تھی لیکن چودھری کے ہاتھوں ہونے والے طوائف کے قتل کی تفتیش کرتے ہوئے عمیر کو کسی مددگار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

مشاہرم خان ہوتا تو کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں تھی لیکن موجودہ حالات میں اسے فی الحال انڈر گراؤنڈ ہی رکھا جا رہا تھا۔ شہریار کی ٹیم میں شامل دوسرا مخلص بندہ عبدالمنان تھا لیکن وہ دفتری امور کی حد تک ہی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ لڑنے بھڑنے والے معاملات میں مدد کرنا اس شریف آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک تیسرا شخص جو ماضی میں شہریار کا ساتھ دیتا رہا تھا، وہ ڈی ایس پی منظور تھا لیکن اس کے تعاون کے پیچھے ترقی کا جذبہ زیادہ کارفرما رہا تھا اس لیے اب بھی اس پر بس ایک حد تک ہی اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اب جگو یہاں تھا اور اسے عمیر کی مدد کرنا تھی۔

''شہریار صاحب جیسے مخلص آدمی کی حالت پر تو مجھے بھی دلی افسوس ہے لیکن جب میں ان کے تم جیسے چاہنے والے دیکھتا ہوں تو یقین ہونے لگتا ہے کہ انشاء اللہ وہ ایک دن ضرور کومے سے باہر آ جائیں گے۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک نہیں، بے شمار دعائیں ہیں۔'' اس نے جگو کی تائید میں خود بھی چند جملے ادا کیے پھر کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کام کی بات چھیڑی۔

''میجر ذیشان کا کہنا ہے کہ شہریار صاحب نے جس جنگ میں خود کو ملوث کر رکھا تھا، تم بھی اس کا ایک حصہ تھے اس لیے اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ جن لوگوں سے یہ جنگ لڑی جا رہی تھی، اس میں ایک فرد چودھری افتخار عالم شاہ بھی ہے۔''

''بالکل سر! بلکہ شہریار صاحب کے کہنے پر میں نے کئی بار چودھری کو اچھا خاصا سبق بھی سکھایا تھا۔'' جگو فوراً بول پڑا۔

''چودھری بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ چھوٹے موٹے سبق اس پر اثر نہیں کرتے۔ دولت اور طاقت کے نشے میں وہ دوسروں کو انسان سمجھنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے۔ اب بھی اس نے ایک طوائف پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ وہ بے چاری جوان عورت تھی اور چودھری نے بلاوجہ ہی اسے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ عین اس روز پیش آیا جب پیر آباد میں عرس منایا گیا تھا اور حویلی کی روایات کے مطابق چودھری نے اپنی اور اپنے خاص مہمانوں کی دل بستگی کے لیے جو اس رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے، طوائفوں کے ایک گروپ کو وہاں بلا رکھا تھا۔ موت کا شکار ہونے والی لڑکی کو چودھری کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور حتمی طور پر وہ اسی کے تشدد کا شکار ہو کر اپنی جان سے گئی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ چودھری نے نائیکہ کے ساتھ ساز باز کر لی اور قتل کے کیس کو دبا دیا گیا۔ میں نے کافی کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا ہے کہ مرنے والی طوائف کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو کوٹھے پر مختلف خدمات انجام دیتا ہے۔ اگر کسی طرح اس لڑکے کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کے خلاف رپورٹ درج کروائے اور اس کی قبر کشائی کر کے پوسٹ مارٹم کی درخواست کرے تو ہمارے لیے چودھری پر دباؤ ڈالنا آسان ہو جائے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں خود اس معاملے میں سامنے نہیں آنا چاہتا اور خود چودھری سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہوں اس لیے اس لڑکے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی مدد درکار ہے جسے میرے حوالے سے شناخت نہ کیا جا سکے۔ اور وہ اتنا جی دار ہو کہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود کوٹھے پر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ میجر ذیشان کے مطابق تم اس کام کے لیے ایک موزوں آدمی ہو۔ وہ لڑکا ہم تک پہنچ گیا تو تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور ہم ایک این جی او کی مدد سے باقی کا سارا کام کروائیں گے۔'' عمیر نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر ایسا ہے تو میں سیدھا سیدھا اس لڑکے کو اغوا کروا لیتا ہوں۔ میں کہوں گا تو میرے آدمی اُسے اٹھا دہاڑے بھی کوٹھے سے اٹھا کر لے آئیں گے۔'' جگو نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ نائیکہ شور مچا دے گی اور کیس بھی بے جان ہو جائے گا، کیونکہ وہ لوگ یہی کہیں گے کہ لڑکے کو زبردستی یہ سب کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ وہ لڑکا راضی خوشی تمہارے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کے لیے تمہیں اس شہر جانا پڑے گا جہاں اس طوائف کا کوٹھا ہے۔ تم کوٹھے پر دو تین بار جا کر محفلوں میں شرکت کرو اور کوشش کرو کہ لڑکا تمہاری صورت سے آشنا ہو جائے۔ اس کے بعد کوٹھے کی نگرانی کروانا اور لڑکے کے کسی کام سے باہر نکلنے کی صورت میں اس سے اچانک کہیں مل بیٹھنا۔ یہی وہ مناسب وقت ہوگا جب تم اسے ٹٹول بھی سکو گے اور اپنے ساتھ راضی خوشی چلنے پر آمادہ کر لو گے۔'' جگو کی تجویز کو رد کرتے ہوئے اُس نے اُسے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ مجھے کوٹھے کا پتہ اور لڑکے کا نام وغیرہ بتا دیں۔ باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔'' جگو فوراً اس کی بات سمجھ گیا تو وہ اسے ان تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا جو اس کام کے لیے اسے درکار تھیں۔ جگو کی توجہ اور انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یہ کام بخوبی انجام دے ڈالے گا۔

⊛----✪----⊛

وہ تینوں جاگنگ سوٹس میں ملبوس تھے اور جاگنگ ٹریک سے ہٹ کر گھاس کے ایک قطعے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے جاگنگ کر کے تھک چکے ہوں اور کچھ دیر یونہی بیٹھ کر سستاتے ہوئے گپ شپ لگا رہے ہوں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی۔ اس وقت وہ تینوں ایک نہایت اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے یکجا ہوئے تھے اور میٹنگ کے لیے پارک کے اس سنسان گوشے کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ کسی ہوٹل کے بند کمرے میں ہونے والی گفتگو کے لیک آؤٹ ہو جانے کا نسبتاً زیادہ امکان ہوتا ہے۔

ان تین افراد میں سے دو تو شہریار اور سلّو تھے جبکہ تیسرا مقامی ایجنٹ کلام تھا۔ شہریار اور سلّو کے حلیے گزشتہ روز کے مقابلے میں خاصے مختلف تھے اور اس تبدیلی کے لیے اُنہیں کسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے سے پہلے خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے شہر کی تین مختلف بار برشاپس سے کام نکالا تھا۔ ان کے حلیوں میں بالوں کی رنگت اور اسٹائل کی تبدیلی کے علاوہ بڑھے ہوئے شیو کو فرنچ کٹ میں تبدیل کر دینے سے خاصا فرق پڑا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک جگہ سے کانٹیکٹ لینز خرید کر وہ بھی آنکھوں میں لگا لیے تھے اور ذرا مشکل تھا کہ کوئی پہلی نظر میں انہیں اس حیثیت سے شناخت کر پاتا کہ وہ وہی ہیں جو ''را'' کے ایک ٹھکانے پر قید تھے۔

حلیوں کی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے ایک پی او بکس میں رکھے ہوئے نئے شناختی کاغذات بھی حاصل کر لیے تھے اور اپنے لیے نئے لباس اور جوتے بھی۔ اس سلسلے میں دہلی میں ملنے والے ان کے مددگاروں کے فراہم کردہ کریڈٹ کارڈ نے بہت مدد دی تھی اور وہ آرام سے خرچ کرتے چلے گئے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا تھا اور وہاں رات آرام سے گزارنے کے علاوہ اس بات کا بھی بندوبست کر لیا تھا کہ کلام سے ایک ملاقات ہو جائے۔

''آپ لوگ کہاں غائب تھے؟ میں انتظار کرتا رہا کہ آپ لوگ مجھ سے رابطہ کریں گے لیکن آپ کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ آپ نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ لوگ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں اس لیے میں اپنے طور پر بھی آپ کی کوئی خیر خبر نہیں لے سکا اور آج انتہائی خراب حالات کے باوجود آپ سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔'' گفتگو کا آغاز کلام نے کیا۔

''ہم ایک ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے تھے دوست!..... لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے حالات کی خرابی کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہم صبح ہوٹل سے اخبار دیکھ کر نکلے تھے اور اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شہر کے حالات خراب ہیں۔'' اسے جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی جبکہ سلّو مزید بے فکرے پن کا مظاہرہ کرنے کے لیے گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔

''حالات عام لوگوں کے لیے ٹھیک ہیں لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے تشویش ناک۔ آپ نے اخبار میں ماڈل ٹاؤن کے علاقے میں ایک سرکاری عمارت کے جلنے کی خبر تو ضرور پڑھی ہوگی؟''

''ہاں پڑھی تھی۔ خبر کے مطابق آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی جس کے نتیجے میں دفتر کا سارا عملہ اور سامان جل کر راکھ ہو گیا۔'' کلام کی بات نے اسے تھوڑا سا چونکایا ضرور تھا لیکن اس نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''یہ صرف میڈیا کو دی جانے والی بریفنگ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عمارت کسی عام سرکاری دفتر کی نہیں بلکہ ''را'' کی ملکیت تھی اور کل وہاں سے فائرنگ کی خاصی آوازیں سنی گئی تھیں۔ وہاں جتنی ہلاکتیں ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی آگ میں جلنے کی وجہ سے نہیں ہوئی وہ سارے کے سارے پہلے ہی کسی نہ کسی طور ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ بعد میں ان کی لاشیں جل کر خاک ہو گئیں۔ مجھے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق اس وقت عمارت میں موجود افراد میں سے صرف ایک میناکشی نامی لڑکی وہاں نہیں مری بلکہ کچھ دیر بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماری گئی۔ اس حادثے کے عینی شاہدین کے مطابق میناکشی کو حادثے سے کچھ دیر پہلے ایک سرخ گاڑی سے بس اسٹاپ پر اُترتے دیکھا گیا تھا اور اہم بات یہ ہے کہ وہ سرخ گاڑی ''را'' ہی کی ملکیت تھی جسے فائرنگ کے بعد آگ پھیلنے سے کوئی لمحہ بھر قبل اس عمارت سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ کار کے شیشے سیاہ تھے اس لیے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان میں کون اور کتنے لوگ سوار ہیں۔ وہ گاڑی بھی بعد میں ایک شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں کھڑی مل گئی تھی لیکن وہاں نصب کیمروں نے صرف اتنا دکھایا کہ اس میں دو افراد سوار تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان افراد کی واضح تصویر نہیں آ سکی۔ البتہ مجھ تک اُڑتے اُڑتے اتنی خبر ضرور پہنچی ہے کہ جلنے والے ''را'' کے اس ٹھکانے پر کچھ قیدی لائے گئے تھے اور یہ سارا اُنہی کا کیا دھرا ہے۔ اب آپ لوگ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ''را'' والے اس وقت کتنی بری طرح بلبلائے ہوں گے۔ ایک طرف ان کے قیدی نکل بھاگے اور دوسری طرف وہ اپنی بڑی افرادی قوت کے ساتھ ساتھ ایک اہم ٹھکانے سے بھی محروم ہو گئے۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ''را'' کے گُرگے سارے شہر میں ان دونوں افراد کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کو بھی ٹٹولا جا رہا ہوگا جو ان کے خیال میں ان کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ میری ذات آج تک بظاہر شک و شبہے سے پاک رہی ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں کب ان کی نظروں میں آ جاؤں۔ اسی لیے حالات کے پیشِ نظر آج محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن آپ سے ملاقات سے انکار ممکن نہیں تھا، چنانچہ آگے پیچھے تھوڑا دیکھ بھال کر یہاں چلا آیا۔'' اس نے پوری صورتِ حال ان کے گوش گزار کی جو خود اس صورتِ حال کے ذمے دار تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ویری گڈ کلام! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم اتنے ایکٹیو ہو کہ اتنے مختصر وقت میں اتنی ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' صورتِ حال پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے شہریار نے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

''ہم یہاں ہیں ہی اس لئے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو شہریار مسکرا دیا پھر سرسری لہجے میں بولا۔

''تمہارے خیال میں ان حالات میں پریم ناتھ کو اغوا کرنا کیسا رہے گا؟''

''میرے حساب سے تو یہ وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔ دو چار دن بعد کارروائی کریں گے تو بہتر رہے گا۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''کیسا تضاد ہے؟ ادھر ہمارے ملک میں یہ لوگ دن رات خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ یہاں کا میڈیا بھی مسلسل خبریں دیتا رہتا ہے کہ کراچی اور لاہور میں کس دن کتنے بم بلاسٹ ہوئے لیکن خود اپنے گھر میں جب اس آگ کی ذرا سی تپش پہنچی ہے تو یہ بلبلا اُٹھے ہیں۔'' شہریار نے افسوس کا اظہار کیا۔

''یہ تضاد ہمارے اپنوں کی کرم فرمائیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمارے لوگوں میں آدھے لوگ کرپٹ اور آدھے نااہل ہیں۔ مخلص لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔ ایسی صورت میں ملک کا یہ حال تو ہونا ہی تھا۔'' اس نے بھی تاسف بھرے لہجے میں شہریار کے دکھ میں ساتھ دیا۔ اس کا یہ افسوس اور دکھ لفاظی نہیں تھا۔ وطن سے دُور، اپنوں کی جدائی برداشت کر کے وطن کی خدمت کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر سرگرداں رہنے والے شخص کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان حالات پر جلے کڑھے۔

''نااہلوں اور بے ایمانوں کو جانے دو کلام! مجھے یقین ہے کہ ہم چند مخلص لوگ مل کر بھی وطن دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہیں گے اور اُنہیں ایسی ہی ضربیں لگاتے رہیں گے جو کل انہوں نے سہی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ''را'' کے اُس ٹھکانے کو کس نے تباہ کیا ہے؟'' اس کی تسلی کو سن کر کلام بری طرح چونکا۔

''ہاں، وہ ہمارا ہی کارنامہ تھا۔'' اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''او مائی گاڈ.....!'' کلام نے اپنا سر تھام لیا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دونوں اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد یوں آزادانہ گھومتے پھر رہے ہیں۔''

''تمہارے پاس اس واقعے کے بارے میں اتنی معلومات ہیں تو یقیناً ان دو افراد کے حلیے بھی تمہارے علم میں آئے ہوں گے جنہیں اس کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ہمیں دیکھو، ہم دونوں میں سے کوئی اس حلیے پر پورا اُترتا نظر آ رہا ہے کیا؟''

''نہیں۔ واقعی آپ کو دیکھ کر میرا دھیان بالکل بھی آپ کی طرف نہیں گیا تھا لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج میں آپ دونوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اگر پہلے سے دیکھ رکھا ہوتا تو شاید اندازہ ہو جاتا۔ بہرحال، میرا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ دونوں کو سخت احتیاط کرنی چاہئے۔'' اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی اس نے مشورے سے بھی نوازا۔

''ہم بھی خوامخواہ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے لیکن ایک حد تک ہی محتاط رہتے ہیں۔ ہمارے جیسے کام کرنے والے لوگوں کو اپنا دل مضبوط کرنا ہی پڑتا ہے۔'' شہریار نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر سلو پر ڈالی۔ نیم دراز تو وہ پہلے ہی تھا، اب آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اور ظاہری طور پر اردگرد سے بالکل بے نیاز محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟'' اس سے اتفاق کرتے ہوئے کلام نے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا۔ جواب میں اس نے اسے اسٹیشن پر پہلی بار اندو سے واسطہ پڑنے سے لے کر اپنی گرفتاری اور پھر فرار تک کی ساری داستان سنا ڈالی۔

''امیزنگ..... آپ دونوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ صرف دو افراد کا اتنے سارے مسلح افراد سے نمٹنا اور سیکیورٹی کے سارے انتظامات توڑ کر بھاگ نکلنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ ''را'' والے تو حقیقتاً بھنا کر رہ گئے ہیں۔'' اس نے پُرستائش لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''انہیں تو ابھی ہم سے اور بھی بہت چوٹیں کھانی ہیں۔ لیکن مجھے اصل سکون اس وقت ملے گا جب ہم ڈاکٹر فرحان جمیل کو ان کے قبضے سے نکال کر لے جائیں گے۔''

''یہ بھی اِن شاء اللہ ہو جائے گا۔ بس ذرا پریم ناتھ ہاتھ آ جائے تو اس سے ایسی معلومات حاصل ہو جائیں گی جو ڈاکٹر صاحب تک پہنچنے کے لیے ہمیں درکار ہیں۔'' کلام نے اسے تسلی دی۔

''تم یہ بتاؤ کہ یہ بھائی جی اور اشوک صاحب کا کیا چکر ہے؟ وہ ''را'' کی ایجنٹ لڑکی اندو ایک طرف تو اشوک کے گینگ کا حصہ بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف بھائی جی کے بارے میں جاسوسی کرتی پھر رہی تھی۔''

''یہ دونوں ممبئی کے دو بڑے غنڈے ہیں۔ اشوک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو انتہا پسند ہے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہاں تک کہ یہاں کی ہندو انتہا پسند مذہبی جماعتیں نازک مواقع پر اس کی خدمات حاصل کرتی ہیں اور اس کے گینگ کے لوگ چند گھنٹوں میں ہی مسلمانوں کو ہلا دیتے ہیں۔ منشیات، اسلحہ، جسم فروشی، نائٹ کلبز، جوئے کے اڈے، سارے دھندے کرتا ہے اور اس کے ''را'' کے افسران سے مراسم کی بھی سن گن ملی ہے۔ اس کے مقابلے میں بھائی جی مسلمان ہونے کے ناتے یہاں کی مسلمان آبادی سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان پر کوئی برا وقت پڑنے کی صورت میں اس کے آدمی مسلمانوں کی مدد کے لیے میدان میں اُتر آتے ہیں۔ دو تین بار اشوک اور بھائی جی کے آدمیوں کے درمیان اچھا خاصا تصادم ہو چکا ہے لیکن پھر اسٹیبلشمنٹ ہی ہر بار دونوں کے درمیان صلح صفائی کروا دیتی ہے۔

دھندے وہ بھی سارے اشوک والے کرتا ہے لیکن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تو ہیروئن کے دھندے میں نہیں پڑتا، دوسرے اس کے لیے کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کسی کو بھی جبراً اس دھندے میں نہیں لایا جاتا۔ میری اس سے کبھی براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی لیکن میرے ایک ساتھی کے اس سے مراسم ہیں جس کی وجہ میں یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود وہ پاکستانیوں کے لیے اپنے دل میں خاصا نرم گوشہ رکھتا ہے۔ شاید اس کی اسی ادا کی وجہ سے اندو نامی ''را'' کی ایجنٹ اس کے بارے میں سن گن لیتی پھر رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اشوک کے گینگ میں شمولیت اس لیے اختیار کی ہوگی کہ اگر بھائی جی کے خاص آدمی سے مراسم بڑھا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں کبھی اس کی ذات شک کی زد میں آ بھی جائے تو وہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسے اشوک گروپ کی جاسوس سمجھیں اور اس کی اصلیت چھپ جائے۔'' کلام کا تجزیہ پُردلیل تھا اس لیے اُسے اُس سے اتفاق کرنا پڑا۔

''واقعی وہ بڑی عیار تھی اور بہت خوبی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔''

''لیکن آپ کے سامنے تو اس کی ساری عیاری دھری رہ گئی اور دنیا سے جاتے جاتے وہ اپنے کئی ساتھیوں کی جانیں بھی ساتھ لے گئی۔'' کلام نے برجستگی سے تبصرہ کیا تو وہ فقط مسکرا کر رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجئے۔ معمول کے مطابق میں پریم ناتھ پر نظر رکھوں گا اور اس کے اغوا کی کارروائی اسی طرح کی جائے گی جیسے ہم پہلے طے کر چکے ہیں۔ بس نئی تاریخ کا تعین ہم حالات کو دیکھنے کے بعد کریں گے۔'' اُس نے ان لوگوں سے رخصت چاہی۔

''ذرا ایک نظر اُس مچھر پر بھی ڈال لینا جو تمہارے ہاتھ لگ کر یہاں تک آیا ہے۔'' پوری گفتگو کے دوران مداخلت نہ کرنے والے سلّو نے اچانک آنکھیں کھول کر کہا تو کلام بری طرح اُچھل پڑا۔

''کون..... کون میرے پیچھے آیا ہے؟''

''وہ جو ادھر بینچ پر بیٹھا بظاہر اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہا ہے لیکن اصل میں ہماری نگرانی کر رہا ہے۔'' سلّو نے اسی طرح لیٹے لیٹے انگوٹھے سے خفیف سا اشارہ کیا تو کلام نے چور نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اسے وہ چہرہ کچھ شناسا محسوس ہوا اور پھر فوراً ہی یاد آ گیا کہ آج صبح ہی اس نے اس شخص کو اس بیکری میں دیکھا تھا جہاں سے وہ اپنے لیے ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن وغیرہ خریدتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ البتہ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''میں نے اسے تمہارے پیچھے ہی پارک میں آتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تمہیں فالو کر رہا ہے لیکن اب کافی دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے کئی بار اسے جیب سے موبائل نکال کر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھا لیکن کسی وجہ سے اس کی بات نہیں ہو سکی ہے۔ ایک بار یہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا بھی ہوا تھا اور مجھے لگا تھا کہ باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔''

سلّو کی باتیں سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی گفتگو کے دوران بظاہر آنکھیں موند کر پڑا سلّو کیسے اہم کام میں مصروف تھا۔

''مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ شخص میری نگرانی کر رہا ہے۔ میں جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتا ہوں، یہ بھی شاید اسی میں رہتا ہے لیکن میری اس سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی بلکہ سامنا بھی ایک آدھ بار ہوا ہوگا۔ آج صبح یہ مجھے بلڈنگ کے سامنے موجود بیکری میں نظر آیا تھا۔'' کلام نے ایسے لہجے میں یہ سب کہا جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔

''اِٹس اوکے۔ ہم اس سے ابھی نمٹ لیں گے۔'' شہریار نے اس کے شانے کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

''تم بالکل اس طرح یہاں سے جاؤ جیسے تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کیسے ہو؟''

''میرے پاس کار ہے۔'' اس نے بتایا۔

''دیٹس گڈ۔ بس تم آگے چلو۔ ہم بھی پیچھے آ رہے ہیں۔'' شہریار نے اس سے کہا اور پھر ان تینوں نے آپس میں اس انداز میں مصافحہ کیا جیسے ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہوں۔ بینچ پر بیٹھا مونچھوں والا آدمی بھی پرندوں میں اپنے انہماک کو بھول کر کھڑا ہو گیا اور ان سے پہلے ہی پارک سے باہر نکل گیا۔ ان تینوں میں سے کلام پہلے نکلا اور چند لمحوں کے وقفے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہ اس پارک سے نزدیک تھا۔ اس لیے انہوں نے کسی سواری کو استعمال کرنے کے بجائے یہاں تک پیدل آنا پسند کیا تھا۔ پارک سے باہر نکلتے ہی انہوں نے اس حصے کا جا

جہاں لوگوں نے اپنی گاڑیاں پارک کر رکھی تھیں۔ فوراً ہی کلام اور وہ مونچھوں والا ان کی نظروں میں آ گئے۔

کلام اپنی گاڑی کا لاک کھول کر اس میں بیٹھ رہا تھا جبکہ مونچھل بائیک پر بیٹھا اس طرح کِک لگا رہا تھا اس کی کوشش کے باوجود بائیک اسٹارٹ ہو کر نہ دے رہی ہو۔ ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا اور اس کی طرف بڑھ گئے۔

''کیا بات ہے بھائی! بائیک خراب ہو گئی ہے کیا؟'' شہریار نے آگے بڑھ کر بڑے دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... بس کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔'' ایک تو وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے، اس پر سے براہِ راست مخاطب بھی تھے اس لیے وہ کچھ گھبرا گیا۔

''تو ایسا کریں، اسے یہیں چھوڑ دیں۔ ہم آپ کو اپنی گاڑی میں لفٹ دے دیتے ہیں۔'' شہریار کی یہ پیشکش اس کے لیے مزید بوکھلاہٹ کا سبب بنی۔

''نہیں جناب! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔''

''لیکن ہمیں تو تمہاری ضرورت ہے نا، اس لیے اب تم وہیں جاؤ گے جہاں ہم تمہیں لے جائیں گے۔'' اس بار سلّو اُس سے مخاطب ہوا۔ اُس کے لہجے کی کاٹ کے ساتھ مونچھل نے اپنے پہلو میں لوہے کی چبھن بھی محسوس کی اور سخت سراسیمہ ہو گیا۔

''یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔''

''جان پہچان بھی ہو جائے گی۔ ہم، تم سے اچھی طرح اپنا تعارف کروائیں گے۔ تم بس ہمارے ساتھ چلو۔'' سلّو نے ایسے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالا جیسے وہ اس کا کوئی دیرینہ دوست ہو اور اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔'' وہ بری طرح بدکا۔

''اگر ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے تو پھر اوپر جاؤ گے۔'' اس کے پہلو پر نال کا دباؤ کچھ اور بڑھاتے ہوئے اس نے بڑے فلسفیانہ لہجے میں اعلان کیا جسے سن کر مونچھل کا چہرہ بالکل ہی تاریک پڑ گیا۔

''اب اور دیر مت کرو۔ میرا یہ ساتھی کریک ہے اور گولی چلانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا۔'' اس بار شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔

لحہ بہ لحہ زرد پڑتی رنگت کے ساتھ وہ شخص بائیک سے نیچے اُتر آیا اور اس کے اشارے پر اس طرح کلام کی گاڑی کی طرف بڑھا جیسے اسے ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ کلام گاڑی اسٹارٹ کیے ان کا منتظر تھا۔ اس شخص کو ان کے ساتھ آتا دیکھ کر اس نے پھرتی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیئے۔ وہ دونوں اس کے درمیان میں رکھتے ہوئے پچھلی نشست پر سوار ہو گئے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میں ایک شریف اور غریب آدمی ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی میرے بدلے میں کوئی تمہیں بھاری تاوان دے سکتا ہے۔'' گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے اپنی مدافعت میں صفائی دینے کی کوشش کی۔

''اس کا منہ بند کرو یار! میں سارے راستے یہ بکواس نہیں سن سکتا۔'' شہریار نے ناگواری سے کہا تو سلّو نے اس کے سر پر آہنی دستہ جما کر اسے بے ہوش کرنے میں لحہ بھر بھی نہیں لگایا۔

''اسے کہاں لے کر چلنا ہے سر؟'' کلام نے گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پر ڈال دی تھی اور اب شہریار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پوچھ رہا تھا۔ اُس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس ساری صورتِ حال پر تھوڑا سا نروس ہے۔

''کسی ایسی جگہ جہاں ہم اس سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کر سکیں۔ اور ظاہر ہے ایسی جگہ تم ہی ہمیں پہنچا سکتے ہو۔'' شہریار نے کچھ سرد مہری سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ گردن سیدھی کر کے پورے انہماک سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد گاڑی ممبئی کے ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جہاں غربت اور غلاظت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تنگ و تاریک گلیوں میں اُڑتا کچرا، گندے پانی کی نالیاں اور ننگ دھڑنگ بچے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ بھارت کے معاشی دارالخلافہ ممبئی کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کی گاڑی وہاں داخل ہوئی تو کئی بچے اس طرف متوجہ ہوئے لیکن کوئی قریب نہیں آیا۔

''یہ جگہ تو کچھ نامناسب لگتی ہے۔ یہاں تو ہم کئی لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔'' شہریار کو وہاں کا ماحول دیکھ کر تشویش ہوئی۔

''اس بندے کو ہوش میں لے آئیں۔ یہ اپنے پیروں پر چل کر مکان میں داخل ہو گا تو کوئی توجہ نہیں دے گا۔ ویسے آپ کے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دوں کہ اس علاقے میں رہنے والے بیشتر افراد کسی نہ کسی طور غیر قانونی کام میں ملوث رہتے ہیں۔ جیب کترے، منشیات فروش، چور، نوسر باز سب آپ کو اس علاقے میں ملیں گے۔ لیکن یہ سب چھوٹے مجرم ہیں، اس لیے اپنی غربت سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی تھوڑا بہت زیادہ کما بھی لیتا ہے تو اس روپے کو شراب اور بازاری عورتوں کے چکر میں گنوا دیتا ہے۔ اس قسم کی آبادی ہونے کی وجہ سے یہاں مکان حاصل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مالک مکان کو کرائے کے علاوہ کسی بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں نے بھی یہاں فرضی نام سے ایک مکان حاصل کر رکھا ہے جو زیادہ تر بند ہی پڑا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کسی کو یہاں ہم پر کوئی شک گزرا، تب بھی وہ پولیس کو اطلاع دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ خود مجرم ہیں اس لیے پولیس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالفرض اگر کسی نے بعد میں کچھ بتا بھی دیا تو ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ یہاں کسی کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میری اس گاڑی کی نمبر پلیٹ جعلی ہے اس لیے پولیس کے لیے مجھے ٹریس کرنا آسان نہیں ہو گا۔''

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا چنانچہ پورے اعتماد سے بولا اور گاڑی ایک چھوٹے سے بوسیدہ گھر کے سامنے روک دی۔ اس دوران سلّو بے ہوش آدمی کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کر چکا تھا کہ وہ ہوش میں آ گیا تھا اور اب آنکھیں پھاڑے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بنا آواز نکالے گاڑی سے باہر نکلو۔'' سلّو نے اس کے پہلو میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں حکم دیا تو اس کو تعمیل کرنی پڑی۔ کلام پہلے ہی گاڑی سے اُتر چکا تھا اور مکان پر لگا تالا کھول دیا تھا۔ وہ اپنے قیدی سمیت تیزی سے مکان میں داخل ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ باہر گلی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی اس دوران ان کا اتنی اچھی طرح جائزہ نہیں لے سکا ہو گا کہ پوچھنے پر تفصیلی حلیہ بیان کر سکے۔

''تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں پھر میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟'' مکان نیم تاریک سا تھا اور وہاں عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ ان کے قیدی نے اندر پہنچتے ہی سراسیمہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی جس پر ظاہر ہے، ان میں سے کسی نے کان نہیں دھرے۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' تفتیش کا آغاز شہریار نے کیا جبکہ کلام انہیں وہاں چھوڑ کر خود دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''ونود۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔

''کہاں رہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کیا جس کے جواب میں اس نے اس بلڈنگ کا نام بتا دیا جہاں کلام کی رہائش تھی۔

''کلام کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' شہریار نے اُس سے تیسرا سوال کیا جس پر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے گھبراہٹ کا تاثر اُبھرا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''اگر یہ غلط فہمی ہے تو تم اپنی رہائش گاہ سے اتنی دور اس پارک میں کیا کر رہے تھے؟'' شہریار نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''وہ تو میں بس ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔'' اس کا لہجہ ہی گواہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ شہریار نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔

''جھوٹ بولو گے تو اپنے لیے مشکلات کھڑی کر لو گے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر تم نے مجھ پر تشدد کی کوشش کی تو میں چیخ چیخ کر لوگوں کو یہاں جمع کر لوں گا۔'' اپنا گال سہلاتے ہوئے اس نے دھمکی دی۔

''تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہمارے پاس اس کا معقول انتظام ہے۔'' کلام اسی وقت کمرے میں داخل ہوا اور اس کی دھمکی کے جواب میں بولتے ہوئے ہاتھ میں موجود سامان زمین پر رکھ کر خود ایک جانب بڑھ گیا۔ وہاں ایک اسٹیریو رکھا ہوا تھا جس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے نتیجے میں کمرہ تیز موسیقی کی آواز سے گونج اُٹھا۔ معلوم نہیں کلام اس مکان کو کن مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ طے تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہو گا، وہ اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو گا اسی لیے معمولی فرنیچر والے دُھول مٹی سے اٹے اس گھر میں یہ اسٹیریو موجود تھا۔ بلند موسیقی کی آوازیں اندر ہونے والی گفتگو کو باہر جانے سے روکنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ تھیں۔

موسیقی کی آواز بلند ہوتے ہی سلّو اور کلام نے مل کر ونود کو رسیوں میں جکڑ دیا اور ساتھ ہی اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی بولتی بھی بند کر دی۔

''اب تم مجھے شرافت سے میرے ہر سوال کا صحیح جواب دو گے ورنہ یہ دونوں تمہاری دُرگت بنا کر رکھ دیں گے۔ اور یہ تو اب تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا، نہ ہی تم کسی کو بلا سکو گے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو مارتے ہیں اور بندے کو رونے بھی نہیں دیتے۔ تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا اب اسی وقت باہر آئے گا جب تم سچ اُگلنے کے لیے تیار ہو گے۔''

ونود کے تمام تر احتجاج کے باوجود نہ صرف اسے رسّی سے باندھ دیا گیا تھا بلکہ منہ میں کپڑا ٹھونس کر احتجاج سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

اس بند منہ کے ساتھ اس پر کتنا ہی تشدد کر لیا جاتا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں حکمتِ عملی کا نتیجہ سامنے آ گیا اور ونود نے ہار مان کر اشارے سے سچ بتانے کا عندیہ دے دیا۔ فوراً ہی اس کے منہ کو آزاد کر دیا گیا اور خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کے لیے پانی پلایا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے اعترافی بیان میں اس نے جو کچھ بتایا، اس کے مطابق وہ ایک چھوٹا موٹا جرائم پیشہ تھا جس کے پولیس سے معاندانہ کے بجائے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ وقتِ ضرورت پولیس کے لیے مخبر کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ اس کام کو انجام دیتے ہوئے اسے اردگرد پر کڑی نظر رکھنے کی عادت ہوگئی تھی اور وہ لوگ جو اس کے رہتے تھے، اس کی توجہ کا خصوصی مرکز ہوتے تھے۔ کلام پر بھی وہ اسی حوالے سے کڑی نظر رکھتا تھا لیکن اسے مشکوک سمجھنے کے باوجود اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جس کی بنیاد پر پولیس میں اس کی مخبری ہو سکے۔ بس ایک اُمید کے سہارے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھا بہت غیر محسوس انداز میں۔ احتیاط کے سبب اس نے کلام سے راہ و رسم بڑھانے یا اس کے سامنے زیادہ آنے سے بھی گریز کیا تھا اسی لیے کلام اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔

اُس نے آج پہلے کلام کو بیکری پر دیکھا تھا لیکن یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ جب وہ اسے جاگنگ سوٹ میں پارکنگ کی طرف جاتا نظر آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے عرصے سے اس پر نظر رکھنے کے باعث اسے معلوم تھا کہ کلام جاگنگ کرنے کا عادی نہیں ہے۔ چنانچہ اس تبدیلی کی وجہ جاننے کے لیے اس نے کلام کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس پارک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جہاں وہ سلّو اور شہریار سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔

اسے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر اسے لگا کہ ہو نہ ہو، دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرتا تھا لیکن اتفاق سے اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ کلام کے ملاقاتیوں کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔

کلام پارک سے نکلا تو وہ خود بھی اس خیال سے باہر نکل گیا کہ اس کے ساتھی بھی کسی نہ کسی سواری پر وہاں آئے ہوں گے اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر ان کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن قسمت کی خرابی سے وہ خود ان لوگوں کی نظروں میں آ گیا اور وہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

''تم نے کبھی کسی پولیس والے کے سامنے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تم کلام کو مشکوک شخص سمجھتے ہو؟'' اس سے ساری معلومات اُگلوانے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''خاص طور پر نہیں لیکن میں نے اپنی بلڈنگ میں اکیلے رہنے والے جن افراد کی لسٹ پولیس کو دی تھی اس میں کلام کا نام بھی شامل تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اوکے۔ اس کا منہ دوبارہ بند کر دو۔ پھر سوچتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔'' شہریار نے سلّو کو اشارہ کیا۔

''بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کے سامنے بھی تم لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ تم کہو گے تو شہر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن تم مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ایک مخبر تھا اس لیے حالات کی سنگینی کو بھانپ سکتا تھا اسے اپنا انجام اچھا نظر نہیں آ رہا تھا، سو منتوں پر اُتر آیا تھا۔

شہریار نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سلّو نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی۔ یہ سب چیزیں اُنہیں اسی گھر سے کلام نے مہیا کی تھیں۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' شہریار اشارے سے کلام کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس سے مشورہ چاہا۔

''ہمارے لیے اتنا خطرناک آدمی نہیں ہے لیکن خطرناک ضرور ہو گیا ہے۔ اگر ہم اسے یہاں سے زندہ جانے دیتے ہیں تو یہ ہمارے، خصوصاً میرے لیے بڑی مشکلیں کھڑی کر دے گا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں خود کو بچانے کے لیے اسے آف کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ سوچو کہ طریقِ کار کیا ہوگا؟ اگر یہ کوئی عام جگہ ہوتی تو ہم اسے قتل کر کے یہیں چھوڑ جاتے لیکن یہ تمہارا ایک ٹھکانہ ہے اس سے محروم ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر ہم اسے گولی مار کر لاش اپنے ساتھ گاڑی میں لے جاتے ہیں، تب بھی پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ کہیں کسی ناکے پر پولیس والوں نے روک کر چیکنگ کر لی تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔'' اس سے اتفاق کرنے کے ساتھ شہریار نے آگے کے حالات کا بھی تجزیہ کیا۔

''لاش کو ٹھکانے لگانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں سے سمندر نزدیک ہے اور سمندر کی طرف جاتے ہوئے کئی ایسے سنسان مقامات آتے ہیں جہاں ہم لاش پھینک سکتے ہیں۔ میں ایسے راستوں سے واقف ہوں جہاں ہمارا پولیس سے واسطہ نہیں پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔'' شہریار نے اس سے اتفاق کر لیا۔

''لیکن یہاں میرے پاس ایسا انتظام نہیں ہے کہ لاش کو چھپا کر لے جا سکوں۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے کوئی بڑا سوٹ کیس وغیرہ خرید کر لانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سوٹ کیس لے آؤ۔ ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔'' شہریار نے اس کو اجازت دی اور طے پایا کہ ونود کو سائلنسر لگے ریوالور سے قتل کرنے کا کام سلّو انجام دے گا۔ سائلنسر لگا ریوالور کلام نے فراہم کر دیا اور خود فوراً سوٹ کیس کی خریداری کے لیے روانہ ہو گیا۔

''ایسی موت جانے کب ہمارا مقدر بن جائے کچھ معلوم نہیں ہے۔'' ونود کو عین دل کے مقام پر گولی مار کر ہمیشہ کی نیند سلانے کے بعد سلّو نے تبصرہ کیا تو شہریار اس سے اختلاف نہیں کر سکا۔

''خیر میں ان باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ان سالے بھارتیوں نے اپنی ٹریننگ ہی ایسی کی ہے کہ مرنا اور مارنا دونوں مشکل نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ رہ کر وطن پرستی وغیرہ کا بھی تھوڑا سا سبق پڑھ لیا ہے۔ اور یہ بھی اطمینان ہے کہ ادھر میں مروں گا تو اُدھر تم لوگ میرے ماں باپ کا خیال رکھو گے۔ بس وہ میری بے چاری منگیتر خوار ہو جائے گی۔ بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے لیکن پیار کا کیا ہے؟ کوئی اور مجھ سے اچھا مل گیا تو اس سے بھی کرنے لگے گی۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہا تھا لیکن شہریار سمجھ گیا کہ ایک انسانی جان لینے کا ڈپریشن اس کے حواسوں پر چھا رہا ہے۔ گزشتہ روز ''را'' کے ایک ٹھکانے پر بھی انہوں نے کئی لوگوں کو موت کی نیند سلایا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچا کر بھاگنے کے چکر میں تھے اس لیے وہ قتل و غارت گری لازمی تھی۔ اس وقت اس شخص کو ہلاک کیا تھا، وہ ایک چھوٹا مجرم تھا۔ شاید اسی لیے اسے مار کر وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

''اتنی ٹینشن مت لو۔ اگر ہم اس شخص کو چھوڑ دیتے تو کل یہ ہمارے لیے موت کا پروانہ بن جاتا۔ یہ کلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ظاہر ہے کلام کے ذریعے ہمارا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے ختم کرنا ہماری مجبوری تھی۔'' شہریار نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

''میں ٹینشن وینشن لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ بس ایسے ہی ایک بات بول دی تھی۔'' وہ فوراً ہی طرح دے گیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے کلام بھیا کی چوائس بھی ایویں ہے۔ اتنے بور گانے لگا کر گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، کوئی اچھے گانے والوں کا کلیکشن بھی ہے یا نہیں اس کے پاس۔'' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیوار گیر ریک میں رکھا کلیکشن چیک کرنے لگا۔ پھر شاید اپنے مطلب کا کوئی ریکارڈ مل گیا تو اسٹیریو آف کر کے اسے تبدیل کرنے لگا۔

خاموشی کے اس قلیل سے وقفے میں انہوں نے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنے۔ دونوں ہی بری طرح چونک گئے۔ آوازیں زیادہ دُور سے نہیں آ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ گاڑیوں کا رخ اسی طرف ہے۔ دم سادھے ان آوازوں کو سننے لگے جو چند لمحوں میں ہی اتنی قریب آ گئی تھیں کہ انہیں اپنے کان سنسناتے محسوس ہو رہے تھے۔

ان دونوں ہی نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر کئی سوال تھے۔ کیا کسی کو ان کے بارے میں کوئی سُن گُن مل گئی تھی؟..... کیا کسی نے ونود کا قتل ہوتے دیکھ لیا تھا؟ کیا ونود نے ان سے غلط بیانی کی تھی اور ان کی گرفت میں آنے سے قبل وہ کسی کو ان کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا؟..... کلام جو سوٹ کیس خریدنے گیا تھا، اب تک واپس کیوں نہیں پہنچا تھا؟

فی الحال ان کے ذہنوں میں موجود ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور پولیس موبائلوں کے سائرن تھے کہ چیخے چلے جا رہے تھے۔ اب تو وہ یقین سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ گاڑیاں اسی گلی میں یا اس کے کارنر پر موجود ہیں۔ شہریار نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اس کے پٹ کو بس اتنا کھولا کہ ذرا سی جھری بن جائے۔ اس جھری سے اس نے جو پہلا چہرہ دیکھا، وہ ایک مسلح پولیس اہلکار کا تھا۔ اس کے بعد اسے مزید کئی پولیس والے وہاں دکھائی دے گئے۔

''دونوں قاتلوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر مکان سے باہر آ جاؤ ورنہ پولیس مکان کا دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گی۔''

گلی کے کونے پر کھڑی پولیس وین سے میگا فون کے ذریعے اعلان کیا گیا تو ان دونوں کا خون رگوں میں اُچھل پڑا۔ اور بے ساختہ ہی ان کی نظریں ونود کی لاش کی طرف گئیں۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کے حلق سے اپنی زندگی کی آخری چیخ بھی برآمد نہیں ہو سکی تھی لیکن موت کی دہشت اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی خوف زدہ بے نور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ ''مجھے قتل کر کے تم خود کیسے بچ سکو گے؟''

وہ بڑی نازک صورتِ حال میں پھنسے ہوئے تھے۔

باہر پولیس کی خاصی بڑی نفری موجود تھی اور وقفے وقفے سے قاتلوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ باہر نکل کر گرفتاری دینا ان کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ باہر نہ نکلے تو پولیس ان کو انہیں گرفتار کرنے کے لیے اندر گھس آئے گی اور ایک عدد لاش کی موجودگی کے باعث وہ کسی صورت صحتِ جرم سے انکار نہیں کر سکیں گے۔

لاش بھی کسی ایسے ویسے بندے کی نہیں تھی۔ ونود پولیس مخبر تھا اور جب وہ گرفتار کر لیے جاتے تو لازماً پولیس کھوج لگاتے ہوئے کلام تک پہنچ جاتی۔ ایک دفعہ ان کے ہاتھ سرا آ جاتا تو پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ جان لیتے کہ ان سب کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے ساتھ سلّو بھی تھا جسے کئی برس تک ''را'' والوں نے تربیت دی تھی۔ فی الحال تو وہ اپنے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن جب انہیں گرفتار کیا جاتا تو جلد یا بدیر یہ راز بھی کھل جاتا کہ پاکستان کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کے لیے تیار کیا جانے والا سلّو اب انڈیا کے خلاف کام کر رہا ہے۔

''را'' والے تھے بھی بہت مکار اور چالباز۔ وہ یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کرتے کہ سلّو کو انہوں نے دہشت گردی کی تربیت دی ہے لیکن اُلٹا یہ الزام لگا دیتے کہ سلّو پاکستان کا ایجنٹ ہے جو برسوں پہلے بھی دہشت گردی کے لیے بھارت میں داخل ہوا تھا لیکن گرفتار ہو جانے کے باعث کچھ نہیں کر سکا اور اب پاکستان نے دوبارہ اسے دہشت گردی پھیلانے کے لیے بھارت بھیج دیا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے شور مچاتے کہ دیکھو ہم تو اتنے اچھے ہیں کہ جس پر جاسوسی کا شک تھا، اسے خیر سگالی کے طور پر رہا کر دیا لیکن پاکستان ایسا دہشت معاش ہے کہ ہمارے اس جذبے کی قدر نہیں کی اور ایک بار پھر ایسے خطرناک بندے کو ہمارے ملک میں بھیج دیا۔ اپنے مشن کی ناکامی کے ساتھ وطن کی بدنامی شہریار کو کسی صورت منظور نہیں تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی صورت بھی گرفتار نہیں ہونا ہے۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے تیز سرگوشی میں سلّو سے کہا اور مکان کے مختصر صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود نہیں تھیں لیکن چھت اتنی بلند بھی نہیں تھی کہ اس تک رسائی ممکن نہ ہو۔ اس نے ایک کمرے کی سلاخ دار کھڑکی پر پاؤں جمائے اور لمحوں میں کھڑکی پر بنے چھجے پر پیر رکھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ سلّو نے بھی اس کی پیروی کی۔

چھت پر پہنچ کر وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ یہ مکان گلی کے تقریباً وسط میں تھا اس لیے اس کے دائیں بائیں مکانات موجود تھے۔ اتفاق سے دونوں اطراف بنے مکانات اس مکان کے مقابلے میں خاصے اونچے تھے اور وہ دونوں میں سے کسی تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ کوئی ساز و سامان بھی نہیں تھا ورنہ کمند ڈال کر کسی ایک مکان تک پہنچ جانا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

''پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔'' سلّو نے سرگوشی میں کہا اور رینگتا ہوا چھت کی پچھلی طرف چلا گیا۔ دائیں بائیں بلند مکانات کی وجہ سے دیوار اُٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی لیکن آگے اور پیچھے کی طرف ڈھائی تین فٹ اونچی دیواریں موجود تھیں۔ انہوں نے پیچھے والی دیوار تک پہنچ کر احتیاط سے جھانکا۔ وہ ایک تنگ سی گندی گلی تھی جس میں اتنا کیچڑ پڑا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں چھلانگ لگا دیتے تو چوٹ لگنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن وہ چھلانگ لگا ہی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے ایک ہی منظر میں گندی گلی کے دونوں سروں پر چوکس کھڑے مسلح پولیس اہلکاروں کو دیکھ لیا تھا۔ لگتا تھا پولیس والے پوری طرح منصوبہ بندی کر کے یہاں پہنچے تھے کہ کسی صورت اپنے شکار کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

''ادھر سے نکلنا تو مشکل ہے۔'' پولیس والوں کے چہرے دیکھ کر سلّو نے قدرے مایوسی سے کہا۔

''مشکل ہے، ناممکن تو نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دونوں اطراف میں کُل پانچ چھ افراد ہی موجود ہوں گے۔ ہم احتیاط اور پھرتی سے کام لے کر ان افراد سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ ہتھیار تو ہیں نا ہمارے پاس۔'' یہ شہریار بھی سمجھتا تھا کہ وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا لیکن ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔

''او کے باس! جیسا تم کہو۔'' شیر دل سلّو نے انکار نہیں کیا۔

''باہر کودتے ہی تم رائٹ والوں کو سنبھالنا، میں لیفٹ والوں کو دیکھ لوں گا۔ چاہے اندھا دھند فائرنگ کرنی پڑے لیکن ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کسی کو یرغمال بنا سکے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔'' وہ جانتا تھا کہ اس ایکشن کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن رِسک لیے بغیر بھی گزارہ نہیں تھا۔ ان کے درمیان طے ہوا کہ وہ تین تک گنتی گنے گا اور تین کہتے ہی وہ دونوں بیک وقت نیچے کود جائیں گے۔

''ایک..... دو.....'' اس نے گنتی گننی شروع کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی دو منہ میں ہی تھا کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور پھر تو گویا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند ایک گولیاں ان کے قریب سے بھی گزریں۔ دونوں فوراً لیٹ گئے۔ فائرنگ کی آوازوں اور سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے فوراً جان لیا کہ یہ گولیاں ان پر نہیں برسائی جا رہیں۔ نہ ہی یہ یکطرفہ فائرنگ ہے۔ یہ دو گروپ تھے جو آپس میں متصادم تھے۔ ایک کے بارے میں تو انہیں پتہ تھا کہ وہ پولیس والے ہیں لیکن دوسرے کے بارے میں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہاں ان کے کسی ہمدرد کے آنے کا تو امکان نہیں تھا۔ ہمدرد کا خیال آنے پر ذہن خود بخود کلام کی طرف چلا گیا۔ وہ کافی دیر پہلے سوٹ کیس خریدنے کے لیے وہاں سے نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

ایک دفعہ تو یہ بات ذہن میں آتی تھی کہ شاید پولیس سے مقابلہ کرنے والے وہ اور اس کے آدمی ہوں لیکن یہ زیادہ قرین از قیاس نہیں لگتا تھا۔ کلام اور اس کے دیگر ساتھی جس حیثیت اور مقصد کے تحت یہاں مقیم تھے، اس میں پولیس سے اس قسم کے مسلح تصادم کی گنجائش مشکل سے ہی نکلتی تھی۔ عقل نے فوراً ہی انکار کیا۔ نہیں..... یہ کلام نہیں ہو سکتا تھا۔

''نیچے چلتے ہیں۔ یہاں خوامخواہ ہی کسی گولی کی زد میں آ جائیں گے۔'' سلّو نے مشورہ دیا تو اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ نیچے چلے جائیں۔

اِردگرد برستی گولیوں کی وجہ سے کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں سینے کے بل رینگتے ہوئے چھت کے اس حصے تک پہنچے جہاں سے صحن میں اُترا جا سکتا تھا۔ صحن میں اُترنے کے بعد وہ سیدھے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں ونود کی لاش ہنوز اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

''یہ کلام پتہ نہیں کہاں ہے؟'' شہریار نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے موبائل فون نکالا لیکن اس پر سگنل نہیں آ رہے تھے۔

''شٹ..... یہ تو کام ہی نہیں کر رہا۔'' وہ جھنجلایا۔

''پولیس نے ریڈ کرنے سے پہلے موبائل سروس جام کر دی ہو گی۔''

سلّو نے خیال ظاہر کیا تو اسے اتفاق کرنا پڑا۔ باہر فائرنگ، بھاگ دوڑ اور لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں ہنوز اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔

''لگتا ہے پولیس کسی اور چکر میں یہاں آئی ہے۔'' سلّو نے اپنی پہلی والی جگہ سنبھالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ اس علاقے میں جرائم پیشہ افراد کی اکثریت ہے۔ پولیس نے یقیناً کسی کی اطلاع پر یہاں کارروائی کی ہے اور وہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کر رہے ہیں۔ اگر پولیس کا نشانہ ہم ہوتے تو ان کے لیے اس گھر کے دروازے کو توڑ کر اندر گھس آنا بالکل مشکل نہیں تھا۔'' ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ حالات کا درست تجزیہ کر سکیں۔

''ہمیں اس لاش کو کہیں چھپا دینا چاہیے۔ اگر پولیس ان لوگوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ اردگرد کے گھروں کی تلاشی بھی لے۔ اس صورت میں یہ لاش ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔'' سلّو کی بات دل کو لگنے والی تھی۔

انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ لاش کو فی الحال کسی ترکیب سے انڈر گراؤنڈ ٹینک میں اس طرح اُتار دیا جائے کہ پہلی نظر میں کسی کو دکھائی نہ دے لیکن وہ خود اسے آسانی سے وہاں سے نکال سکیں۔ ترکیب پہلے سلّو کو سجھائی دی اور وہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری سامان کے ساتھ ٹینک کا ڈھکن کھول کر

اندر اُتر گیا۔

ٹینک کا نصف حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی یقیناً کئی دنوں سے ٹینک میں مستقل موجود تھا اس لیے اس سے ہلکی سی ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔ سلّو کو وہاں جو کام انجام دینا تھا، اس کے لیے پانی میں اُترنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ٹینک میں اُترنے کے لیے بنائی گئی سیڑھیوں میں سے پہلی سیڑھی پر ہی رُک گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔

مشکل سے دو منٹ کے وقت میں اس نے کام مکمل کر لیا اور اس طرح ٹینک سے باہر آیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں رسّی دبی ہوئی تھی اور رسّی کے دونوں سرے ٹینک کے اندر تھے۔ اصل میں وہ ٹینک کے اندر گیا ہی اس لیے تھا کہ رسّی کے دونوں سروں کو ٹینک کی چھت پر اندر کی طرف سے ٹھونک سکے۔ ٹھونکا پیٹی کی آواز باہر جاری فائرنگ کی آوازوں میں دب گئی تھی اور وہ دونوں مطمئن تھے کہ باہر کسی کو اس مکان میں جاری غیر معمولی سرگرمیوں کا علم نہیں ہو سکا ہو گا۔

سلّو کے ٹینک سے باہر آنے کے بعد وہ دونوں کمرے میں گئے اور ونود کی لاش کو وہاں سے اُٹھا کر صحن میں لے آئے۔ ونود یوں تو زیادہ بھاری بدن کا نہیں تھا لیکن لاش میں تبدیل ہونے کے باعث خاصا بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے اس کی لاش ٹینک کے ڈھکن کے قریب رکھی اور پھر رسّی کا پھندا سا بنا کر اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے ونود کی لاش کو احتیاط کے ساتھ ٹینک میں اتار دیا۔ یہ کام ذرا مشکل اور محنت طلب ثابت ہوا کیونکہ کسی زندہ شخص کے مقابلے میں لاش کو ٹینک میں اُتارنا بڑا ٹیکنیکل کام تھا۔ لیکن بہرحال انہوں نے اسے انجام دے ڈالا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ لاش رسّی سے بندھی تاریک ٹینک کی تہ میں اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ کوئی ٹینک کا ڈھکن ہٹا کر جھانکتا تو اسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن وہ جب چاہتے رسّی کھینچ کر لاش کو باہر نکال سکتے تھے۔ سلّو نے رسّی لٹکائی بھی ڈھکن سے کافی اندر کی طرف تھی اس لیے ڈھکن کھول کر ایک نظر میں اس کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

خود کو کافی مطمئن محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ٹینک کے ڈھکن کو ایک بار پھر اس کی جگہ پر لگا دیا۔ ڈھکن لگا کر ابھی وہ پلٹے بھی نہیں تھے کہ انہیں اپنے پیچھے ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہی بیک وقت چونک کر پھرتی سے آواز کی سمت پلٹے۔ ان کے سامنے ایک دُبلا پتلا، لمبا سا آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موجود خطرناک گن کا رخ انہی کی طرف تھا جبکہ وہ خود ونود کو محفوظ جگہ پر چھپانے کے چکر میں اپنے ہتھیار ایک طرف رکھ چکے تھے۔ ہتھیاروں کے بارے میں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر پولیس نے اس گھر کا رخ کیا تو دونوں میں سے ایک پولیس والوں کو دروازے پر کچھ دیر روکنے کی کوشش کرے گا جبکہ دوسرا ہتھیاروں کو بھی ٹینک کی تہ میں پہنچا دے گا۔ یہاں انہیں کوئی پوزیشن نہیں مل سکی تھی چنانچہ ہنگامی حالت میں ہی کھلے ہتھیاروں کو ٹینک میں پھینک کر ان کے ناکارہ ہونے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔ بہرحال ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے مقابل ایک مسلح شخص آن کھڑا ہوا تھا۔

''اپن کی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے پر اپن چاہتا ہے کہ تم اپن کے ساتھ کوآپریٹ کرو۔'' ان دونوں میں سے کسی کے کچھ بولنے سے قبل گن بردار شخص نے لب کشائی کی۔

''گن تو تم نے دشمنوں کی طرح ہی اُٹھا رکھی ہے۔'' شہریار نے محسوس کر لیا تھا کہ اس شخص کا لہجہ نرم ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لیے کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

''یہ اپن کی مجبوری ہے۔ اگر اپن کے ہاتھ میں یہ گن نہیں ہوتی تو تم بات سننے کے بجائے ابھی ہم پر چڑھ دوڑتے۔'' وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے ہاتھ میں موجود ہلاکت خیز گن ہی تھی جس نے ان دونوں کے قدموں کو باندھ دیا تھا اور وہ بنا سوچے سمجھے اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہارے ساتھ کوآپریٹ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی بات سن لینا ہی مناسب سمجھا۔

''یہ تم نے عقل کی بات کی ہے۔ چلو کمرے کے اندر چلتے ہیں پھر بات ہوگی۔'' اس نے تجویز پیش کی جو معقول ہی تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو فی الحال وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

''یہ جو فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہو، اس کی وجہ جانتے ہو؟'' کمرے میں پہنچ کر اس نے سوال کیا۔ جواب میں بے ساختہ ان دونوں کے سر نفی میں ہل گئے۔

''یہ سالا سارا ارجن اور لکھن کا پھیلایا ہوا لفڑا ہے۔ اشوک صاحب کے بندوں سے ان دونوں بھائیوں کا کوئی لفڑا چل رہا تھا۔ سالوں نے باہر معاملہ نمٹانے کے بجائے دو بندوں کو اغوا کیا اور ادھر اپنے ٹھکانے پر لا کر ان سے پوچھ تاچھ کرنے کے لیے اتنا مارا کوٹا کہ وہ جان سے چلے گئے۔ اب اپن کا اندازہ یہ ہے کہ ادھر ان کے بندوں میں اشوک صاحب کا بھی کوئی آدمی تھا جس نے اپنے ساتھیوں کے مرنے کی مخبری کر دی۔ حرام کا جنا اشوک بڑا چالاک بندہ ہے۔ اس نے خود سامنے آنے کے بجائے پولیس کو اس طرف دوڑا دیا۔ ممبئی کی پولیس میں ایسے کئی حرام کے جنے ہیں جو اشوک کے تلوے چاٹتے ہیں۔ اپنے مالک کے حکم پر وہ ادھر چڑھ دوڑے۔ اب یہ اپن کی قسمت تھی کہ اپن بھائی جی کے حکم پر ارجن سے دھندے کی بات کرنے ادھر آیا ہوا تھا اس لیے فائرنگ شروع ہوئی تو پھنس گیا۔ ارجن اور لکھن اپنے بندوں کے ساتھ مل کر پولیس کا مقابلہ کر رہے تھے لیکن اپن جانتا ہے کہ وہ چوہے دان میں پھنس گئے ہیں اور اپن ان کے ساتھ پھنسنا نہیں چاہتا اس لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں سے نکل پڑا۔ یہاں سے چوتھا مکان ہے ارجن کا اور اپن گولیوں کی برسات میں چھتیں پھلانگتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ گولی مولی لگ کر مر جاتا تو خیر تھی لیکن زندہ گرفتار ہو کر بھائی جی کو تو مشکل میں ڈالنے کا تو نہیں تھا نا۔''

وہ جو کہانی اُنہیں سنا رہا تھا، اس میں اشوک صاحب اور بھائی جی کے نام ان کے لیے جانے پہچانے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو ممبئی میں داخل ہوتے ہی انہیں اندو نامی لڑکی کی وجہ سے ان دو ناموں سے واقفیت حاصل ہوئی تھی اور اب پھر یہ دونوں نام سامنے آ گئے تھے۔ باہر جاری فائرنگ میں ممبئی کے ان دونوں غنڈوں کا نام سننا زیادہ عجیب بھی نہیں لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اتنی کہانی تو ہمیں سمجھ میں آ گئی لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ ہم تم سے کیا کوآپریٹ کر سکتے ہیں؟ باہر جو ہنگامہ جاری ہے اس میں تو ہم خود بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے اس لیے تمہاری مدد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ہمیشہ کی طرح گفتگو کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی تھی اور سلو اس معاملے سے بے نیاز نظر آ رہا تھا لیکن شہریار جانتا تھا کہ حقیقت میں وہ پوری طرح چوکنا ہے اور ضرورت پڑنے پر فوری طور پر ایکشن میں بھی آ سکتا ہے۔

''نکلنے کا راستہ ہوتا تو اپن خود نکل جاتا۔ ابھی تو اپن یہاں چھپنے کی جگہ مانگتا ہے۔ فائرنگ کی آواز کو غور

سے سنو تو سمجھ جاؤ گے کہ بس اب کھیل ختم ہی ہونے والا ہے۔ پولیس والے اس لفڑے میں جیتیں گے اور ارجن کے گھر کے ساتھ ساتھ آس پاس کے مکانوں کی بھی تلاشی لیں گے۔ اس ٹیم (وقت) تمہیں اپن کو چھپانا ہوگا۔'' اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''لیکن ہم تمہیں چھپائیں گے کہاں؟ اس گھر میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔'' شہریار نے پہلو بچانا چاہا۔

''اُدھر ہی چھپانا جدھر تم نے وہ لاش چھپایا ہے۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو شہریار بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ یقیناً جب وہ شخص چھت پر تھا تو اس نے ونود کی لاش کو ٹینک میں اتارے جانے کا منظر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

''وہاں تم کیسے چھپو گے؟ ٹینک میں پانی بھرا ہوا ہے۔''

''کتنا پانی ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''تقریباً آدھا ٹینک۔''

''پھر کوئی پرابلم نہیں۔ اپن سیڑھی پر کھڑا ہو جائے گا۔ پولیس والا سالا ڈھکن اُٹھانے لگے تو تم اشارہ کر دینا۔ اپن پانی میں کُود جائے گا۔ پانی کے اندر تین منٹ کے لیے سانس روک لینا اپن کے لیے کوئی مشکل نہیں۔'' اس نے خود ہی سارا منصوبہ ترتیب دے دیا۔

اُن کے لیے اس منصوبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے تعاون نہیں کرتے اور وہ گرفتار ہو جاتا تو لازماً ٹینک میں چھپی لاش کی نشاندہی کر دیتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اسے بھی ونود کے پاس پہنچا دیتے۔ لیکن بے وجہ انسانی خون سے ہاتھ رنگنے کی بھی کوئی تک نہیں بنتی تھی البتہ یہ ممکن تھا کہ اس تعاون کے بدلے وہ اس شخص کی ہمدردی حاصل کر لیتے اور وہ کبھی نہ کبھی ان کے کام آ جاتا۔ ویسے بھی بھائی جی کے بارے میں اُنہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ مسلمانوں اور پاکستانیوں کا ہمدرد تھا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟'' شہریار نے اس سے دریافت کیا۔ اس گفت و شنید کے دوران وہ فائرنگ کی آوازوں پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ فائرنگ کی شدت میں کمی آ گئی تھی اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایک گروپ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

''عبدالرحمٰن..... پر ادھر سارا لوگ اپن کو عبدل بھائی بولتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''ٹھیک ہے عبدالرحمٰن!..... ہم تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر پولیس نے گھر گھر تلاشی لینا شروع کی اور اس مکان تک پہنچی تو تم وہی کرنا جو سوچ رکھا ہے۔ آگے قسمت کی بات ہوگی کہ تم اور ہم بچ پاتے ہیں یا نہیں۔'' آخر کار شہریار نے اسے تعاون کی یقین دہانی کروا ہی دی۔

''قسمت کی تم فکر نہ کرو۔ قسمت کا اپن دھنی ہے۔ پہلے بھی کئی بار موت کے منہ میں سے نکلا ہے۔ اب بھی انشاء اللہ نکل جائے گا۔'' اس نے یقین سے کہا اور پھر یکدم ہی موضوعِ گفتگو بدل ڈالا۔

''سالا تم لوگ تو بتاؤ کہ تم کون ہے؟ اپن کو تو اس بستی کا رہنے والا نہیں لگتا۔'' اس کی چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں بہت غور سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ہم جو بھی ہیں تمہارے لیے جاننا ضروری نہیں۔ ابھی ہم اپنی مجبوری کی وجہ سے ایک دوسرے سے کوآپریٹ کرنے پر مجبور ہیں لیکن ایک دوسرے سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپس میں اپنے بارے میں گفتگو کریں۔ ہاں تم اپنی سہولت کے لیے ہمیں نوشاد اور قمرو کہہ سکتے ہو۔'' شہریار نے اسے ذرا بے مروّتی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا اور خود اُٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جہاں سے باہر گلی میں جھانکا جا سکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے ہی کی طرح بے حد احتیاط سے کھڑکی کے پٹ میں جھری بنائی اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ فائرنگ کا سلسلہ اب تقریباً رک چکا تھا اور گلی میں کئی پولیس والے دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''میرے خیال میں اب تمہیں ٹینک میں چھپ جانا چاہئے۔ پولیس نے اپنی ابتدائی کارروائی مکمل کر لی ہے اور اب یقیناً وہ لوگ کسی بھی وقت اردگرد کے گھروں کی تلاشی لینا شروع کر سکتے ہیں۔'' کچھ دیر باہر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے عبدالرحمٰن عرف عبدل کی طرف پلٹتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن ٹینک کا ڈھکن اس وقت تک کھلا رکھنا جب تک پولیس والے دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔ اس دوران میں پوری طرح ہوشیار رہوں گا۔'' اس نے اپنی گن کو اس طرح تھپتھپایا جیسے انہیں دھمکی دے رہا ہو۔ وہ خاصا ہوشیار آدمی تھا اور اس مکان میں وارد ہونے کے بعد ایک بار بھی اس نے ان دونوں کو اپنی گن کی زد سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اب بھی وہ پوری طرح محتاط نظر آ رہا تھا۔

''جیسا چاہتے ہو کرو۔ بہرحال ہمارا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' شہریار نے لاپروا انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر عبدل نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت پھرتی سے ان کے ہتھیاروں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ہتھیار وہ خود ونود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کمرے میں ایک جانب ڈال کر چلے گئے تھے۔ عبدل کی تمام تر ہوشیاری کے باوجود ان کے پاس گنجائش تھی کہ وہ ان ہتھیاروں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع نکال لیں۔ لیکن ان دونوں ہی کے نزدیک موجودہ صورتِ حال میں ہتھیار بے کار تھے اس لیے ان کے حصول کے لیے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ عبدل کا معاملہ البتہ الگ تھا۔ وہ غول سے بچھڑے ہوئے کسی جانور کی طرح وحشت زدہ تھا اور ہر ممکنہ احتیاط کر رہا تھا۔ اُلٹے قدموں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے خود ہی صحن میں موجود واٹر ٹینک کا ڈھکن ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔

شہریار اور سلّو نے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی جگہ پر موجود رہ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ونود کو عین دل کے مقام پر گولی ماری گئی تھی اور فوری موت واقع ہو جانے کی وجہ سے بہت زیادہ خون نہیں بہا تھا۔ جو خون نکلا تھا، اس کو بھی انہوں نے اس کے سینے پر موٹا کپڑا رکھ کر اِدھر اُدھر بہنے سے روک دیا تھا چنانچہ کمرہ تقریباً صاف تھا۔ بس چند ایک ہی خون کے قطرے پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان قطروں کو شہریار نے خود آگے بڑھ کر صاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گئے۔ پولیس تلاشی کے لیے اس مکان تک آتی یا نہ آتی، وہ بہرحال ابھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر نکلتے تو فوراً پولیس والوں کی نظر میں آ جاتے۔

شہریار نے انتظار کے جاں گسل لمحات کو گزارتے ہوئے ایک بار پھر اپنا موبائل نکال کر چیک کیا۔ اس پر ابھی تک سگنل نہیں آ رہے تھے چنانچہ وہ کلام سمیت کہیں کسی شخص سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً کلام کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ سوٹ کیس خریدنے کے بعد واپس پلٹا ہوگا تو علاقے میں پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر دُور ہی رُک گیا ہوگا اور موبائل سگنلز بند ہونے کی وجہ سے ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکا ہوگا۔

اللہ اللہ کر کے انتظار کے لمحات ختم ہوئے اور دروازے پر پولیس والوں کی مخصوص زوردار دستک سنائی دی۔ دستک کی آواز سن کر سلّو نے خود کار انداز میں صحن کا رخ کیا جبکہ شہریار دروازہ کھولنے کے لیے آگے

بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں اتنا وقت لگایا کہ سلّو ٹینک کا ڈھکن لگا کر خود وہاں سے ہٹ جائے۔ معمولی سی تاخیر بھی پولیس والوں پر گراں گزری اور انہوں نے بری طرح دروازے کو پیٹ ڈالا۔

''اتنی دیر کیوں لگائی دروازہ کھولنے میں سالے! ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں جو باہر انتظار میں کھڑے رہیں؟'' جونہی اس نے دروازہ کھولا، دو پولیس والے اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بدزبانی کرنے لگے۔ حالات کی وجہ سے شہریار نے اُن کی اس بدزبانی کو خاموشی سے برداشت کر لیا اور خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''سوری سر! ہم باہر کی سچویشن کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اس لیے تھوڑا ٹائم لگایا۔'' پولیس کا معمولی سپاہی اپنے لیے ''سر'' کا لفظ سن کر پھول کر کپا ہو گیا اور مزید نخوت سے بولا۔

''بکواس نہ کراوئے۔ اور یہ بتا کہ یہاں کوئی فراری بندہ تو نہیں آیا؟''

''یہاں ہم دونوں بھائیوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔'' اس کی بدتمیزی کے باوجود شہریار نے اسے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو ہم لیں گے ہی۔ پر تُو بتا کہ تُو کون ہے؟'' اُس کی اکڑ کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی۔

''میں جگدیش ہوں اور یہ میرا چھوٹا بھائی رویندر ہے۔ یہ گھر ہمارے دوست مترا کا ہے۔ وہ ہمیں جاگنگ کے بعد پارک سے اپنے گھر میں لے آیا تھا اور ہمارے لیے باہر سے ناشتہ لینے گیا تھا کہ آپ لوگوں نے یہاں آپریشن شروع کر دیا۔ ہم لوگ یہاں پھنس گئے اور مترا بھی واپس نہیں آ سکا۔'' اس نے پولیس والے کو پہلے سے سوچی ہوئی کہانی سنا دی جو ان کے جسم پر موجود جاگنگ کے لباس کی وجہ سے حقیقت کے قریب معلوم ہوتی تھی۔

''زیادہ بھولا نہ بن اوئے۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ ادھر اس علاقے میں کوئی شریف بندہ نہیں رہتا۔ پر اس سے ہمیں کسی اور سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم بس ارجن کے ساتھیوں کو تلاش کر رہے ہیں۔'' وہ پولیس والا تھا اس لیے اس کے انداز سے دھوکا کھانے کو تیار نہیں ہوا اور بُری طرح لتاڑ کر رکھ دیا۔

''چلو بھئی، تلاشی شروع کرو۔'' اس بار اس کا مخاطب اس کا اپنا ساتھی تھا جو فوراً ہی حرکت میں آ گیا۔ چھوٹے سے تقریباً خالی پڑے مکان کی تلاشی لینا کیا مشکل تھا۔ دونوں نے لمحوں میں کام نمٹا لیا۔ شہریار کے خدشات کے برعکس اُنہیں انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں جھانکنے کا خیال بھی نہیں آیا اور وہ اپنا کام بھگتا کر روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے البتہ انہوں نے ان دونوں کو یہ ضرور جتایا تھا کہ وہ دونوں انہیں شکل سے چار سو بیس لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت چونکہ وہ محدود آپریشن کر رہے ہیں اس لیے ان جیسے کئی بدمعاشوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہیں۔

آسانی سے جان چھوٹ جانے پر انہوں نے پولیس والوں کی اس بکواس کو میٹھے شربت کے گھونٹ کی طرح پی لیا اور دروازے کو ایک بار پھر اندر سے بند کرنے کے بعد سلّو نے جا کر ٹینک کا ڈھکن ہٹا دیا۔ عبدل پلک جھپکتے میں باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنی گن سمیت ان دونوں کے ہتھیار بھی موجود تھے۔ وہ جرم کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے ہتھیار کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے یقیناً پہلے سے ہتھیاروں کو پانی میں پھینکنا دانش مندی نہیں سمجھی ہوگی اور یہ طے کیا ہوگا کہ ناگزیر حالات میں ہی ان کارآمد چیزوں کا نقصان برداشت کرے گا۔ خوش قسمتی سے اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور اس نے اپنے ساتھ ان دونوں کے ہتھیار بھی ضائع ہونے سے بچا لیے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ٹینک سے باہر نکلا تو وہ لوگ دوبارہ اسی کمرے میں جا بیٹھے۔ یہاں آ کر شہریار نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا۔ ابھی تک اس پر سگنلز موصول نہیں ہو رہے تھے۔ یقیناً پولیس اپنی کارروائی مکمل ہونے سے قبل موبائل سروس بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات میں انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ونود کی لاش کو انہوں نے جان بوجھ کر ابھی ٹینک سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اب وہ یہ کام کلام کے واپس آنے کے بعد ہی کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کا ہتھیاروں سے لیس عبدالرحمٰن کو بھی چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ان کا حریف نہیں تھا، بس اپنی جان کی حفاظت کے لیے احتیاطاً ہتھیار سنبھال کر بیٹھا ہوا تھا اور باہر کے حالات موافق ہوتے ہی یہاں سے نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایسے میں اس سے خوامخواہ بھڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر کیا جانے والا انتظار ایک گھنٹے کی مدت پر جا کر ختم ہوا اور باہر کی سُن گُن لینے پر انہیں اندازہ ہو گیا کہ پولیس اب اس علاقے سے نکل رہی ہے۔ ساتھ ہی موبائل فونز کے سگنل بھی جاگ گئے۔ شہریار کی طرح عبدالرحمٰن بھی بار بار اپنا موبائل چیک کر رہا تھا۔ سگنلز کھلے تو اس نے فوراً کوئی نمبر ملا کر موبائل کان سے لگا لیا۔ اس کی کال فوراً ریسیو کی گئی۔

''ہاں چھوٹے، اپن ٹھیک ہے۔ تُو فکر نہ کر..... بس اب تھوڑی دیر میں نکلتا ہے۔'' وہ اُن پر نظریں رکھے ہوئے کسی سے بات کرنے لگا۔

''ابھی فون پر ہی ساری تفصیل کر لے گا کیا؟..... اپن کو ادھر سے نکلنے دے، پھر آرام سے سب سن لینا۔'' دوسری طرف موجود شخص نے یقیناً کوئی استفسار کیا تھا جس پر اس نے بھڑکنے والے انداز میں جواب دیا پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

''یہ تو تُو نے بہت اچھا کیا اوئے۔ بس وہیں رُکا رہ۔ اپن پیدل ہی ادھر تک آ جائے گا۔ اپن کی گاڑی کا حال احوال بعد میں معلوم کرنا۔ ادھر ارجن کے اڈے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ فائرنگ میں اس کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہو گا۔ کیا پتہ پولیس والے ساتھ اُٹھوا کر لے گئے ہوں۔'' اس کا آدمی یقیناً قرب و جوار میں ہی کہیں موجود تھا چنانچہ اس نے خود وہاں تک پہنچنے کا عندیہ دیا اور کال ختم کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اوکے یارو!..... اپن چلتا ہے۔ تمہاری آج کی مدد اپن کو ساری زندگی یاد رہے گی۔ اپنا تجربہ بتاتا ہے کہ سالا تم دونوں بھی مار دھاڑ کرنے والا آدمی ہے۔ پر اپن سے نہیں بھڑا تو اچھا کیا۔ اکھا (سارا) ممبئی عبدالرحمٰن کو جانتا ہے۔ اپن بھائی جی کا خاص آدمی ہے۔ اگر تم کو کبھی مدد کی ضرورت پڑے تو سیدھے اپن کے پاس آ جانا۔ اپن تمہارا آج کا احسان ضرور اُتارے گا۔''

اس نے شاہانہ انداز میں کہا اور ان کے ہتھیار ذرا فاصلے سے دیوار کے ساتھ ڈال کر آگے بڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سیدھا باہر نکل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور باہر نکلنے سے قبل اس نے شہریار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

شہریار نے خاموشی سے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عبدالرحمٰن نے خاصی طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو جکڑ کر مصافحہ کیا۔ شہریار کی جگہ کوئی عام شخص ہوتا تو اس کی گرفت کی سختی پر تڑپ جاتا لیکن وہ نارمل رہا اور جوابی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ کی گرفت نرم ہی رکھی۔ عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سلّو سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ بھی اس نے شہریار والی حرکت ہی کی۔ جواباً سلّو نے شہریار جیسے رویے کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اتنی ہی قوت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ عبدالرحمٰن

بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

''جان دار آدمی ہو، پر اس جیسے عقلمند نہیں۔'' شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا اور جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز پر سلّو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بلا ضرورت طاقت کا مظاہرہ کرنا عقلمندی نہیں ہوتی۔'' شہریار نے اسے سمجھایا۔

''وہ خود ایسا نہیں کر رہا تھا کیا؟'' سلّو نے چڑ کر کہا۔

''نہیں، اس کا عمل بلا ضرورت نہیں تھا۔ وہ ہمیں جانچ رہا تھا۔'' شہریار نے رسان سے جواب دیا اور اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس پر کوئی کال آ رہی تھی۔

''تھینک گاڈ، آپ لوگ ٹھیک ہیں۔ میں بہت دیر سے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب بس میں وہاں پہنچ ہی رہا ہوں۔'' اس کی آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کلام بولتا ہی چلا گیا اور کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کلام آ رہا ہے، چلو ہم ٹینک سے ونود کی لاش باہر نکال لیتے ہیں۔ زیادہ دیر پانی میں پڑی رہنے سے اس کا پھول جائے گی اور کلام کو اسے یہاں سے ہٹانا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔'' فون بند ہوتے ہی اس نے سلّو سے کہا جو ہمیشہ کی طرح فوراً عمل کے لیے تیار ہو گیا۔

لاش کو ٹینک سے باہر نکالنا اندر ڈالنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ثابت ہوا۔ انہوں نے کپڑوں سمیت لاش کو اندر لا ڈالا تھا اور اب اس کے کپڑے پانی سے شرابور ہو گئے تھے۔ دونوں نے مل کر بہ مشکل اسے باہر نکال کر صحن کے فرش پر رکھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔

''میں دیکھتا ہوں۔ کلام ہو گا۔'' سلّو ٹینک کے اندر تھا اس لیے اس کا حال زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شہریار کے کپڑے زیادہ نہیں بھیگے تھے چنانچہ وہ ہی دروازہ کھولنے گیا۔ حسبِ توقع وہاں کلام ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوٹ کیس تھام رکھا تھا۔

''سوری، آپ لوگوں کو یقیناً پریشانی اُٹھانی پڑی ہو گی۔ میں خریداری کر کے واپس آ رہا تھا تو پتہ چلا کہ اس علاقے میں پولیس کا آپریشن جاری ہے۔ موبائل پر بھی رابطہ نہیں ہوا لیکن میرے پاس پریشان ہونے اور انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' وہ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر کھولتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

''اِٹس اوکے۔ مجھے تمہاری پوزیشن کا اندازہ ہے۔'' شہریار نے اسے اطمینان دلایا۔

''میں نے اندازے سے آپ دونوں کے لیے کپڑے بھی خرید لیے ہیں۔ جاگنگ سوٹ کے بجائے آپ ان کپڑوں میں یہاں سے نکلیں تو بہتر رہے گا۔'' سوٹ کیس میں سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ بولا۔ خود اس کے اپنے جسم پر بھی اب جاگنگ سوٹ کے بجائے عام پینٹ شرٹ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے کپڑے خریدنے کے بعد شاپنگ سینٹر میں ہی بدل ڈالے تھے۔ شہریار کی تیز نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوٹ کیس میں ایک بڑے سائز کا پولی تھین بیگ رکھا ہوا ہے۔ وہ اس کا مصرف اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

''کپڑے لا کر تم نے اچھا کیا۔ ونود کی لاش کو چھپانے کے چکر میں ہمارے کپڑے خاصے خراب ہو گئے تھے۔'' اس نے شاپنگ بیگ میں سے کپڑے نکال کر ان کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ اس کے اور سلّو کے لیے مناسب رہتے۔

''لاش کہاں چھپائی آپ لوگوں نے؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ پیچھے والے کمرے میں پڑا ہو گا۔'' کلام جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوٹ کیس سے پولی تھین نکال کر کھڑا ہو رہا تھا، بری طرح چونکا۔

''تمہارے پیچھے یہاں بہت کچھ ہوا ہے۔ نہایت سنگین حالات میں اگر ہم تمہیں یہاں صحیح سلامت نظر آ رہے ہیں تو اسے خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' وہ مختصراً اسے اس عرصے میں گزرنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

''اوہ مائی گاڈ!..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے پیچھے آپ کا عبدل بھائی سے واسطہ پڑا ہوگا۔ آپ واقعی خوش قسمت ہیں کہ وہ یہاں سے خوش ہو کر گیا ہے اور اس نے وقت پڑنے پر آپ کے کام آنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اب آپ زندگی میں کبھی بھی اُسے اُس کا یہ وعدہ یاد دلائیں گے تو وہ مکرے گا نہیں اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی آپ کا ساتھ دے گا۔''

''لگتا ہے تمہاری بڑی اچھی جان پہچان ہے عبدل بھائی سے۔'' سلّو جو کمرے میں آ چکا تھا، اس کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں کیا، اس کے بارے میں ممبئی کے وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے کبھی اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت پھرتیلا، لڑنے بڑھنے کا ماہر اور ہتھیار شناس آدمی ہے۔ اپنے دشمنوں کے لیے سفاک تو دوستوں کے لیے جان لٹا دینے والا ہے۔ بھائی جی کے سر چڑھے لوگوں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔'' سلّو کے طنزیہ لہجے کو نوٹ کیے بغیر وہ سادگی سے دیگر تفصیلات بتانے لگا۔

''چلو ٹھیک ہے، کبھی ضرورت پڑی تو اسے آزما دیکھیں گے۔ ابھی تو ونود کی لاش کا بندوبست کرو تاکہ ہمیں یہاں سے خلاصی ملے۔'' شہریار نے درمیان میں دخل اندازی کر کے موضوعِ گفتگو ختم کیا تو وہ تینوں صحن میں پڑی ونود کی لاش کے پاس پہنچے اور اسے بڑی صفائی سے پولی تھین بیگ میں لپیٹ کر سوٹ کیس میں منتقل کر دیا۔

''اُس مردود کی وجہ سے اب مجھے ٹینک کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔'' سوٹ کیس بند کرتے ہوئے کلام بڑبڑایا۔

''وہ تمہیں ویسے بھی کرنی چاہیے۔ سڑے ہوئے گٹر کے پانی جیسی بدبو آ رہی ہے اس میں سے۔'' سلّو نے ناک چڑھا کر کہا۔ دونوں دفعہ ٹینک میں اُترنے کا فریضہ اسی نے انجام دیا تھا اس لیے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھا۔

''اصل میں میرا یہاں بہت دنوں بعد آنا ہوتا ہے اس لیے یہ نوبت آ جاتی ہے۔''

کلام نے کھسیائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی جس پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر وہ دونوں کپڑے تبدیل کرنے چلے گئے۔ ان کا یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔ کلام سوٹ کیس میں بند لاش کو کس طرح ٹھکانے لگاتا، یہ اس کی دردسری نہیں تھی۔

⊛----✪----⊛

جگو نے چمچماتی ہوئی کار عین اپنی مطلوبہ عمارت کے نیچے روکی اور کار ہی کی طرح چمچماتے نئے کپڑوں میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

یہ وہ محلّہ تھا جہاں ہر سمت سے سُر سنگیت اور گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دیتی تھی اور آنے والا

راتوں کا رات کے پُراسرار ماحول میں استقبال ہوتا تھا۔ یہاں آنے کے لیے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ گاڑی سے لے کر پیر میں موجود جوتوں تک ہر شے کا انتخاب لاجواب تھا۔

اپنے اس محتاط انتخاب کی وجہ سے وہ کسی غنڈے کے بجائے رئیس ابن رئیس لگ رہا تھا اور یہاں ایسا لگنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے کا رواج تھا۔ اس کا بھی چندا بائی کے کوٹھے پر پُرجوش استقبال ہوا۔ ڈیوڑھی میں موجود بوڑھے لیکن گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے ملازم نے خوشامدانہ لہجے میں اسے سلام کیا اور بڑی عزت سے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے گیا۔

کئی جگہ سے ٹوٹ جانے والی تنگ و تاریک سیڑھیوں سے گزر کر جگو اوپر پہنچا تو وہاں آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی پھیلی تھی۔ بڑے سے ہال میں پھیلی اس روشنی میں کچھ دخل تو جھالردار فانوس اور فینسی لائٹوں کا تھا لیکن اصل کمال حُسن کی ان دیویوں کا تھا جو برق کی طرح کوند کر جملہ حاضرین کے حواسوں پر گر رہی تھیں۔ سُر اور سنگیت کی لے پر ناچتی یہ پریاں جگو کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ جس سیاست دان کے لیے خدمات انجام دیتا تھا وہ کئی بار رات کی تاریکی میں ایسی محفلوں میں شرکت کے لیے بطور باڈی گارڈ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اپنے آقا کے ساتھ ہونے کے باعث وہ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تماش بین نہیں کہلاتا تھا اور ایک طرف چوکس کھڑا خود کو ہر شے سے بے نیاز ظاہر کرتا تھا۔ لیکن آج وہ خود تماش بین بن کر آیا تھا اور ہونے والی آؤ بھگت سے لطف اندوز ہوتا ہوا ان تھرکتی بجلیوں کو داد دے رہا تھا۔

اس شغل کے دوران اس نے اپنی یہاں آمد کے اصل مقصود کو فراموش نہیں کیا تھا اور نگاہیں مسلسل گوہرِ مقصود کی متلاشی تھیں۔ آخر کار اس کی یہ تلاش ختم ہوئی۔ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کی بجی سنوری گڑیا سی لڑکی تھی۔ قدرے جھجکتے ہوئے محفل میں وارد ہوئی تھی۔ جھجکتے ہوئے قدموں، جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ حرکت میں آئی تو محفل کا رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی پیش رووں کی طرح نہ تو بازار کی جملہ اداؤں کی مالک تھی، نہ تماش بینوں کو لبھانے کے لیے تیکھے چتون سے کام لے رہی تھی۔ پھر بھی ہر ایک اس پر مرمٹنے کو تیار نظر آ رہا تھا۔ کئی نے یہ بھی کوشش کی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے آغوش میں لے لیں لیکن وہ چکنی مچھلی کی طرح ہر ایک کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

بے تاب دلوں نے اس کے قدموں میں نوٹوں کے ڈھیر لگا دیئے اور وہ جو خود بکاؤ تھی، کاغذ کے ان ٹکڑوں کو بے نیازی سے اپنے نرم و نازک تلوؤں تلے روندتی رہی۔ بالآخر محفل ختم ہوئی اور منچلے سحرزدہ سے وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ رخصت ہونے والوں میں جگو شامل نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنی جگہ جم کر بیٹھا تھا۔

''کیا خدمت انجام دوں سرکار کی؟'' ادھیڑ عمر نائیکہ چندا بائی نے جو اسے اپنی جگہ جمے دیکھا تو کوٹھے کے آداب کے مطابق مہذبانہ دریافت کیا۔

''آں..... کیا کہا تم نے؟'' جگو نے ایسی اداکاری کی جیسے کسی گہرے خیال سے واپس پلٹا ہو۔

''میں نے کہا سرکار! محفل تو کب کی ختم ہو گئی اگر آپ کو مجھ سے کوئی اور خدمت درکار ہو تو ارشاد فرمایئے؟'' بائی نے بہت نرمی سے اسے ابھی تک وہاں بیٹھے رہنے کا احساس دلایا تو اس نے اپنے لبوں سے ایک گہری سرد سانس خارج کی اور کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''محفل کب ختم ہوئی، مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میری نظروں کے سامنے تو وہ اب بھی رقص کرتی ہر سُو اداؤں کو بکھیر رہی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ آپ کس کو عزت بخش رہے ہیں سرکار! کچھ اُس کا حال حلیہ تو بتائیے؟'' بائی نے اس کی
پوشاک سے لے کر ہاتھوں میں پہنی نایاب پتھروں والی انگوٹھیوں تک کا ایک ہی نظر میں جائزہ لے
خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہی جو سب سے آخر میں سفید لباس پہنے آئی تھی اور سب کچھ ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں ڈبو دیا تھا۔''
گو کہ دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھتا تھا لیکن شہر میں قیام اور فلموں کے چسکے کی وجہ سے ان محفلوں میں
کے طریقے سے خوب واقف تھا۔

''بہت خوب سرکار! نام تو آپ نے خود بتا دیا اس کا۔ وہ واقعی چاندنی ہے۔ میرے کوٹھے کا سب
خوب صورت اور نایاب موتی۔''

چندا بائی کوٹھے کی پیداوار تھی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچنے سے لے کر نائیکہ کی گدی سنبھالنے تک
نے اس کاروبار کے بہت سے اسرار و رموز سیکھے تھے چنانچہ چاندنی میں اس کی دلچسپی محسوس کر کے پہلے ہی
کے بھاؤ بڑھانے کی تدبیر کرنے لگی۔

''میں اس موتی کو ایک رات کے لیے اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' جگو نے بے تابی سے
خواہش بیان کی۔

''پہلے اپنا کچھ تعارف تو کروائیے۔ پہلی بار آپ کو اپنے کوٹھے پر دیکھا ہے۔ ذرا معلوم تو ہو کہ میری
چاندنی کو مانگنے والا اس کی صحیح قدر دانی بھی کر سکے گا یا نہیں؟''

وہ گھاگ کاروباری عورت تھی، سو یہ ممکن نہیں تھا کہ اگلے کی مالی حیثیت کا درست تخمینہ لگائے بغیر
سے معاملات طے کر لیتی۔

''میرا نام ملک ممتاز ہے۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہماری فرم ممتاز ٹریڈرز کے نام سے مختلف کاروبار
کرتی ہے جن میں مصالحہ جات کی امپورٹ ایکسپورٹ کے علاوہ ووڈ گڈز اور کیمیکلز وغیرہ کے کاروبار بھی
شامل ہیں۔ آپ کے شہر میں بھی میں کاروبار کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ سُر سنگیت کا شوقین ہوں اس لیے جہاں
بھی جاؤں، اپنے مطلب کی جگہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ چندا بائی کے کوٹھے سے بہتر محفل
کہیں اور نہیں سجائی جاتی اس لیے سیدھا یہیں چلا آیا اور اب اعتراف ہے کہ بتانے والے نے ٹھیک بتایا تھا
آپ تو بڑے انمول موتی اپنے دامن میں جمع کیے بیٹھی ہیں اور میں ان سے ایک موتی کے لیے بس چند گھنٹوں
کے واسطے درخواست گزار ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے جو کہ ظاہر ہے سراسر جھوٹ پر مبنی تھا
ایک بار پھر اپنی خواہش دہرائی۔

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ اصل میں بے بی کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے اور وہ محفل میں حاضر
دینے پر بھی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔'' اپنے گھٹنوں پر ہاتھ جما کر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاؤ بڑھانے
کے لیے بائی نے ایک اور کاروباری حربہ استعمال کیا۔

''میں آپ کو اسے رضامند کرنے کے لیے منہ مانگا نذرانہ دوں گا۔ بس آج کی رات کے چند گھنٹے
میرے نام کر دے۔ میں اتنا اصرار اس لیے کر رہا ہوں کہ میں آج رات ہی یہاں ہوں۔ کل شام تک مجھے
حال میں لاہور واپس جانا ہوگا ورنہ بہت بڑا مالی نقصان ہو جائے گا۔''

بائی کے حربوں کو سمجھنے کے باوجود اس نے عاجزی سے اس سے اصرار کیا۔ رقم کی اسے اس لیے
نہیں تھی کہ عمیر آفندی نے اسے فری ہینڈ دے دیا تھا۔ اتنا عقلمند تو وہ بھی تھا کہ سمجھ سکے کہ جب کوٹھے والیوں

سے معاملات طے کرنے ہوں تو رقم سب سے پہلے تیار رکھنا پڑتی ہے۔

''آپ کے کاروبار کا معاملہ ہے تو میں ابھی بے بی کو سمجھا بجھا کر راضی کرتی ہوں۔ آپ کا نقصان تو ہم
کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے۔''

اس ادھیڑ عمر نائیکہ سے وقت نے حُسن کی دولت کو یکسر چھین لیا تھا لیکن اداؤں سے کام لینا وہ اب بھی
نہیں بھولی تھی۔ کھڑے ہونے کے بعد اس نے زور دار تالی بجائی اور اس کا ردِعمل سامنے نہ آنے پر بُری
طرح دھاڑی۔

''شاہدے!..... او شاہدے!..... کدھر مر گیا ہے تُو؟'' اُس کی دھاڑ پر سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا یوں
سست قدموں سے اندر داخل ہوا جیسے بادلِ ناخواستہ آنا پڑا ہو۔

''صاحب کو اوپر کمرے میں پہنچا دو۔ اور ہاں، ان سے نذرانہ لینا مت بھولنا۔'' بائی نے سخت لہجے میں
لڑکے کو احکامات دیئے اور خود ہال سے نکل گئی۔

''آیئے صاحب!'' لڑکے کے الفاظ مہذبانہ لیکن لہجہ کاٹ دار تھا۔ جگو نے اس کے لہجے کی پروا نہیں کی
اور دزدیدہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ دُبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھوں اور سانولی رنگت والا وہ لڑکا سولہ سترہ سال
کا تھا اور اُسے لگ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی تلاش میں اس کوٹھے تک آیا ہے۔ اسے براہِ راست لڑکے
کو چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اسی طریقِ کار پر عمل کرے گا جو پہلے سے سوچ کر آیا
ہے۔ تیکھے چتونوں والی، منجھی ہوئی اداؤں سے بھرپور رقاصاؤں کے مقابلے میں اس نے شب بسری کے لیے
چاندنی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ اس ماحول میں نوآموز اور کچھ ان فٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کے
خیال کے مطابق منجھی ہوئی طوائفوں کے مقابلے میں وہ اس کم سن لڑکی سے زیادہ آسانی سے اپنی مطلوبہ
معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

''لائیے، نذرانہ عطا فرمائیے۔'' اسے خواب گاہ کے انداز میں سجائے گئے ایک کمرے میں پہنچا کر لڑکے
نے چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے ہوئے مطالبہ کیا۔

جواب میں جگو نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی تھما دی۔ یہ اچھی خاصی
بھاری رقم تھی۔ چندا بائی نے اس سے چاندنی کی کوئی قیمت طے نہیں کی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ
اس کے مطلب کی رقم ادا نہیں کرے گا، وہ چاندنی کو اس کمرے تک ہرگز نہیں پہنچائے گی اس لیے عقل مندی
کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی اتنی رقم دے دی کہ اس کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس سے
نوٹوں کی موٹی گڈی وصول کرنے کے بعد لڑکے نے اسے لمحہ بھر کے لیے کینہ توز نظروں سے گھورا اور پھر ایک
جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔

اب جگو کمرے میں تنہا تھا اور اسے چاندنی کا انتظار کرنا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور
گھنگھروؤں کی چھن چھن کے ساتھ وہ اسی سفید لباس میں نمودار ہوئی جس میں اس نے محفل میں جلوہ دکھایا
تھا۔ تھم تھم کر آگے بڑھتے اُس کے قدموں نے جگو کو احساس دلایا کہ اس کے انداز میں جو جھجک اور ہچکچاہٹ
اس نے محفل میں محسوس کی تھی، وہ اب بھی برقرار ہے۔

''آداب۔'' اُس کے تجزیوں سے بے خبر چاندنی نے دھیمے لہجے میں ماتھے تک ہاتھ لے جاتے
ہوئے کہا۔

''تشریف لائیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ میری خواہش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے احترام میں یہاں تک چلی آئیں۔'' جگو نے بڑی تہذیب سے اس کا استقبال کیا۔ اس لب و لہجے اور انداز کو برقرار رکھنے کے لیے اسے بڑی محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا کیونکہ جو زندگی وہ گزار رہا تھا، اس میں تو الگ ہی زبان میں گفتگو ہوتی تھی۔

''شکریے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی جیب میں اتنی طاقت تھی کہ میں بسترِ مرگ پر بھی ہوتی تو آپ کے سامنے حاضر ہو جاتی۔'' اس کی دھیمی اور سریلی آواز میں حالات کی تلخی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''آپ تو ناراض معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اطمینان رکھیے آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' اس کی تلخی کو محسوس کرنے کے باوجود جگو نے نرمی سے کہا۔ جواب میں اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ جگو اسے مزید کسی قسم کی یقین دہانی کرواتا، دروازے پر دستک کی آواز اُبھری۔ وہ سہج سہج کر چلتی دروازے تک پہنچی اور دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا۔ اس کے باوجود جگو باہر اس لڑکے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جسے چندا بائی نے ''شاہدے'' کہہ کر پکارا تھا۔

''تُو یہاں کیوں آیا ہے؟'' چاندنی نے دبی آواز میں اس سے پوچھا۔

''بائی جی نے یہ تیرے کمرے میں پہنچانے کو کہا تھا۔'' جگو کے تیز کانوں نے شاہدے کی دھیمی لیکن تلخ آواز سنی۔

''وہ کمینی جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ لا، یہ مجھے دے اور خود کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جا۔ ورنہ وہ تجھے ایسے ہی تنگ کرتی رہے گی۔''

چاندنی نے بڑبڑاتے ہوئے غصے سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شاہدے کی لائی ہوئی سوغات وصول کر لی۔ جگو نے دیکھا کہ وہ امپورٹڈ شراب کی بوتل ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ چاندنی کی ایک رات کے بدلے اس نے چندا بائی کو جو موٹی رقم بھجوائی تھی، اس کے بعد وہ اس خاطر مدارات کا حق دار تھا۔

''معافی چاہتی ہوں، ہمارے یہاں آئے ہوئے مہمانوں کو اس طرح ڈسٹرب کرنے کا رواج تو نہیں ہے لیکن پتہ نہیں کیوں بائی جی اکثر میرے ساتھ ایسی بھول کر جاتی ہیں۔'' وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹی اور ایک تپائی پر جہاں پہلے ہی بلوریں جام رکھے ہوئے تھے، بوتل دھرتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے برا نہیں لگا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اور بائی جی کے درمیان کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔'' جگو نے ہوشیاری سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''ہمارا جھگڑا تو ہمیشہ چلتا ہے۔ میں گھر سے سوچ کر نکلی تھی کہ فلمی ہیروئن بنوں گی لیکن پھنس گئی اس بائی کے چکر میں۔ اس نے عزت دار گھرانے کی لڑکی کو طوائف بنا ڈالا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی بے بسی کے ساتھ اس سے نفرت بھی نہ کروں تو کیا کروں؟''

اُس کی مختصر سی وضاحت میں اُس کی پوری کہانی سامنے آ گئی تھی۔ وہی لڑکیوں کا اسکرین پر ناچتی تھرکتی پریوں کو دیکھ کر ان جیسا بن جانے کی خواہش میں ماں باپ کے گھر کی محفوظ و مامون چار دیواری کو چھوڑ کر آدمی نظر آنے والے درندوں کے چنگل میں پھنس جانا اور اندھی خواہش کی تکمیل کے بجائے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھنا۔ چاندنی کی کہانی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو وہ اس سے تفصیلات جاننے کی خواہش کرتا۔ اگر کچھ محسوس ہوا تو اس کا اور شاہدے کا تعلق۔ اس نے شاہدے کی نظروں میں اپنے لیے نفرت بھی دیکھی تھی اور کچھ دیر قبل دروازے پر ہونے والی ان دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے۔

''تمہاری کہانی جان کر افسوس ہوا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ماں باپ کی عزت کی پروا کیے بغیر گھر کی دہلیز پار کر جانے والیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم تو پھر بھی خوش قسمت ہو کہ یہاں اس ماحول میں تمہیں شاہدے جیسا ہمدرد ملا ہوا ہے جو تمہارے لیے کچھ نہ بھی کر سکے لیکن تمہارے ساتھ تمہارا غم تو بانٹتا ہی ہے۔'' اپنے قائم کیے ہوئے اندازے کی بنیاد پر کہی جانے والی بات کا ردِعمل اس نے چاندنی پر پوری طرح محسوس کیا۔ وہ جو جام تیار کرنے کے لیے روم ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی اور آئس کیوبز نکال رہی تھی، چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہاں شاہد میرا ہمدرد ہے؟''

''یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس کی نظروں میں اپنے لیے نفرت دیکھی تھی اور ظاہر ہے وہ اس لیے تھی کہ میں تمہارا کسٹمر ہوں۔'' اس نے بغیر لاگ لپٹ کے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' وہ ریفریجریٹر کے پاس سے ہٹ کر تپائی تک آ گئی اور مہارت سے جام تیار کرنے لگی۔ کوٹھے پر ملنے والی تربیت میں یقیناً اسے یہ کام بھی سکھایا گیا تھا۔

''میری طرح شاہد بھی اس کوٹھے کی پیداوار نہیں ہے۔ اسے اور اس کی بڑی بہن کو چند غنڈوں نے بہن میں اغوا کر کے بائی جی کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ بائی نے اس کی بہن کو طوائف بنا ڈالا اور اسے کوٹھے کا خدمت گار۔ یہ طبلہ وغیرہ اچھا بجا لیتا ہے لیکن ہے تھوڑا اڑیل۔ کبھی بجانے پر راضی نہ ہو تو بائی جی بھی اس کو رام نہیں کر پاتی۔ جب سے اس کی بہن مری ہے، اس نے طبلے کو ہاتھ لگانا بالکل چھوڑ دیا ہے اور بس اوپر کے کام کر دیتا ہے۔''

اسے جام پیش کر کے وہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی جسے سن کر جگو کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اس لڑکی کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے لیے اس حد تک کارآمد ثابت ہو گی۔ بس ایک اندازہ تھا کہ وہ اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور کہیں باہر سے لائی گئی ہے اس لیے اس سے کچھ اُگلوانا آسان ثابت ہو گا۔

''اس کی بہن وہی ہے نا جو پیر آباد کے چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں مری تھی؟'' اس نے اچانک یہ سوال داغا جس پر چاندنی نے بے اختیار ہی اثبات میں سر ہلا دیا پھر گھبرا کر خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے تم ایک ہمدرد سمجھ لو۔ میں جانتا ہوں کہ چودھری کی حویلی میں شاہد کی بہن حادثاتی موت نہیں مری بلکہ اُسے قتل کیا گیا تھا۔ قتل کرنے والا با اختیار اور دولت مند تھا اس لیے اُس نے چندا بائی کا منہ نوٹوں سے بھر کر اسے خاموش کروا دیا۔ لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا شاہد بھی اس قتل پر خاموش رہے گا؟..... کیا اس کے دل میں خواہش نہیں ہے کہ اپنی بہن کے قاتل کو اس کے کیے کی سزا دلوائے؟''

''وہ اپنی بہن کی موت پر بہت دُکھی ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ قاتل انجام کو پہنچے لیکن ایک طاقتور اور اختیار و ڈیرے کے مقابلے میں اُس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ اس کوٹھے پر پلا بڑھا ہے اور یہاں سے باہر کی دنیا کو بہت کم جانتا ہے۔ تھانے کچہری تک اس بے چارے کی پہنچ ہی کہاں ہے جو انصاف حاصل کرنے کے لیے کچھ کر سکے۔ اگر فرض کریں کہ وہ وہاں تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے گواہی کون دے گا؟ یہاں سب بائی سے ڈرتے ہیں اور اس کے ڈر سے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔'' چاندنی نے اسے ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حقائق سے آگاہ کیا جن سے وہ بہ خوبی واقف تھا۔

''کیا تم بھی شاہد کی خاطر گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہو گی؟ وہ تمہیں اتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ تمہارے لیے آنے والے گاہکوں سے نفرت محسوس کرتا ہے۔ جواب میں تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی کیا؟'' جگو نے اس سے ذرا کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

''میں ایسا کر کے خود کہاں جاؤں گی؟ میرے پاس بھی تو اس کوٹھے کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

''اور اگر ہم تمہیں وہ ٹھکانا فراہم کر دیں پھر؟''

''ہم..... یعنی کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں؟'' وہ اس کی بات سن کر چونکی۔

''ہاں۔ بلکہ سمجھو کہ اس کے پیچھے اصل لوگ کوئی اور ہیں۔ میں تو صرف ان کے لیے کام کر رہا ہوں۔'' جگو نے اعتراف کرنے میں حرج نہ سمجھا۔

''کیا وہ چودھری کے مخالف وڈیرے ہیں؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''نہیں۔ وہ قانون کے محافظ ہیں اور تمہیں اور شاہد کو تحفظ دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔''

''اُف میرے اللہ! آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ قانون کب چودھری جیسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے؟'' وہ بے یقینی کا شکار ہوئی۔

''ہر جگہ کچھ اچھے اور ایمان دار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ میں تمہیں اور شاہد کو ایسے ہی لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' جگو نے اسے سمجھایا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس کیس میں تمہاری مدد حاصل کرنے کے علاوہ وہ لوگ دونوں کے مستقبل کے لیے بھی کوئی اچھا انتظام کر دیں گے۔ کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ تم دونوں اس گند سے دُور کسی پُرسکون گھر میں ساتھ رہو؟''

''آپ تو حسین خواب دکھا رہے ہیں۔ مجھ سے زیادہ شاہد ان باتوں کو سن کر خوش ہو گا۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہاں سے نکل سکے۔ مینا کے مرنے کے بعد تو وہ مجھ سے مسلسل اسی خواہش کا اظہار کرتا رہا ہے۔ کہتا ہے بہن کے بعد تمہیں نہیں کھونا چاہتا لیکن یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا نا۔ ابھی وہ خاصا کم عمر ہے۔ آپ کو معلوم ہے، وہ عمر میں مجھ سے ایک دو سال چھوٹا ہی ہے لیکن بس یہ اندھی محبت ہے، اس فرق کو نہیں دیکھتی۔ یہاں کوٹھے پر سب جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اسی لیے کمبخت چنداول اُسے اذیت دینے کے لیے خاص طور پر میرے کسٹمرز کی خدمت سونپ دیتی ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اسے بتاتی چلی گئی۔

''بس تو تھوڑی سی ہمت کرو اور کل دوپہر میں تم دونوں کسی بہانے سے یہاں سے نکل کر محلے کے بعد پڑنے والے پہلے چوک تک پہنچ جاؤ۔ میں گاڑی لے کر وہاں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔'' لوہا گرم دیکھ کر جگو نے فوراً چوٹ لگائی۔

''نہیں، چوک پر نہیں۔ وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں محلے کا کوئی بھی فرد ہمیں آپ کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ میں ایسا کروں گی کہ کل شاہد کے ساتھ خریداری کے بہانے مارکیٹ آ جاؤں گی۔ آپ ٹھیک چار بجے بوچاٹ والے کے اسٹال پر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ اور ہاں، مجھے اپنا موبائل نمبر بھی دے دیں اگر کسی وجہ سے کل ہم وہاں نہ پہنچ سکے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں گی۔'' چاندنی نے کہا تو جگو نے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے اپنا موبائل نمبر نوٹ کروا دیا۔ وہ خوش تھا کہ عمیر آفندی نے اسے جو کام

سونپا تھا، اسے خوش اسلوبی سے انجام دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

⊛----✪----⊛

''تم نے جن لوگوں کے نام پتے مجھے لکھوائے تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی منظر پر موجود نہیں ہے۔ کوئی دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا ہوا ہے، کوئی بیرونِ ملک طبّی معائنے کے لیے اور کوئی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے۔ کسی کی گاؤں میں بیٹھی ماں بیمار ہو گئی ہے تو کسی کی بیوہ بہن کو بھائی کی اشد ضرورت ہے۔ کچھ کے گھر والوں نے مکمل لاعلمی ظاہر کی ہے کہ وہ نہیں جانتے ہمارا مطلوبہ شخص کہاں ہے۔ جن کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان حالات میں تمہاری مہیا کردہ فہرست تو بالکل بیکار ہو گئی ہے۔'' جاوید علی، عالیہ کے روبرو بیٹھا اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کر رہا تھا۔

''لیکن اس سے یہ تو تصدیق ہو جاتی ہے نا کہ میں نے تمہیں جو نام، پتے دیے تھے، وہ کتنے اہم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پُراسرار طور پر غائب ہو جانے کی وجہ سے اُن لوگوں کو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہو گا اس لیے کہ اُنہیں ڈر ہو گا کہ میں کسی کے ہتھے لگ چکی ہوں اور ذرا سے تشدد سے اور زور زبردستی کے نتیجے میں سب اُگل سکتی ہوں۔'' عالیہ نے بڑا مدلل جواب دیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں دوبارہ ان کے منظر پر آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں فوری طور پر ان ملک دشمنوں کو نیست و نابود کر دوں۔''

اسے معلوم تھا کہ کسی کے لیے بھی ساری زندگی انڈر گراؤنڈ ہو کر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بس موقع بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر دوبارہ منظر پر آ جاتے ہیں۔ عالیہ کی فراہم کردہ فہرست میں تو کئی نام ایسے تھے جن کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ بھلا کب تک چھپ کر بیٹھتے۔ انہیں ایک دن سامنے تو آنا ہی تھا لیکن اس کے بھڑکتے جذبات اس انتظار کے متحمل نہیں تھے۔

''اس سلسلے میں میرے پاس ایک کلیو ہے۔ معلوم نہیں کام آتا بھی ہے یا نہیں لیکن پھر بھی ایک شخص اشفاق رانا کے بارے میں مجھے اندازہ ہے کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کا وہ ٹھکانہ اتفاق سے میری نظروں میں آ گیا تھا۔ میری ایک دوست صبا ہے جو میری ہی طرح تنہا ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں پرسنل سیکرٹری کی جاب کرتی ہے اور شام ڈھلے ہی وہاں سے واپس آتی ہے۔ کبھی کبھی نہیں بھی آ پاتی۔ میری مصروفیت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی اس لیے ہم کم کم ہی ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے اکٹھے ہو پاتے تھے۔ ایک دن صبا فارغ تھی تو اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں انوائٹ کر لیا اور یہ اتفاق تھا کہ میں نے اس کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں اشفاق رانا کو ایک خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ صبا سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک ایئر ہوسٹس ہے اور وہاں تنہا رہتی ہے لیکن اشفاق رانا کا وہاں کثرت سے آنا جانا ہے۔ اکثر رات کے اوقات میں بھی وہ وہاں ٹھہرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے ایئر ہوسٹس سے خفیہ شادی کر رکھی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ شہر سے باہر نہیں نکلا ہے تو پھر اسی ایئر ہوسٹس کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرا ہو گا کیونکہ اس کی دانست میں اُس کے اس ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں ہے۔''

''یہ تو تم نے بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ اشفاق رانا اگر وہاں نہیں چھپا ہوا، تب بھی اس کی چہیتی کو معلوم ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم اُس سے اُگلوا لیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالیہ کی فراہم کردہ معلومات پر وہ کھل اُٹھا اور اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھانے کے لیے اس سے سوالات کر کے مزید معلومات حاصل کرنے لگا۔

کام کی تمام باتیں معلوم کر لینے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر لائحہ عمل طے کیا اور ذیشان سے اجازت طلب کرنے کے بعد وہ لوگ ضروری تیاریوں کے بعد اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس جس کا نام عالیہ نے شاہین بتایا تھا، اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے کے لیے انہوں نے سوئی گیس کمپنی کے نمائندوں کا بھیس اپنایا تھا۔ بلڈنگ کے چوکیدار کو انہوں نے یہی بتایا کہ فلیٹ C-30 سے ان کی کمپنی کو کمپلین موصول ہوئی ہے کہ اپارٹمنٹ میں کسی مقام سے گیس لیک ہو رہی ہے اس لیے وہ کمپنی کی طرف سے چیک کرنے آئے ہیں کہ لیکج کس جگہ سے ہو رہی ہے۔ اس وضاحت کے بعد چوکیدار نے ان کے اندر جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

C-30 سیکنڈ فلور پر تھا۔ جاوید علی اور اس کا ساتھی لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہ اپارٹمنٹ پروجیکٹ اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ ہر بلاک کے ایک فلور پر صرف دو ہی اپارٹمنٹ تھے۔ ان کے مطلوبہ اپارٹمنٹ C-30 کے مقابل موجود C-29 عالیہ کی دوست صبا کا تھا جو مبینہ طور پر اس وقت اپنی جاب پر گئی ہوئی تھی اس لیے انہیں اپنی کارروائی انجام دینے میں کسی ڈر اور جھجک کا سامنا نہیں تھا۔

C-30 کے سامنے پہنچ کر جاوید علی کے ساتھی نے ڈور بیل بجائی جس کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور مجبوراً اسے دوسری دفعہ بیل بجانی پڑی۔ اس بار قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز نے غنودہ سی آواز میں دریافت کیا کہ دروازے پر کون ہے۔

وہ لوگ صبح سویرے نہیں پہنچے تھے لیکن آواز سے ظاہر تھا کہ اسے گہری نیند سے جگایا گیا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ فلائٹ سے واپس آ کر اپنی نیند پوری کر رہی تھی یا پھر گزری شب کسی اور وجہ سے جاگنے کے باعث اس وقت سو رہی تھی۔

''میں نے ایسی کوئی کمپلین نہیں کروائی۔ میرے اپارٹمنٹ میں گیس کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' ان کی طرف سے آمد کی وجہ بتائے جانے پر اس نے جواب دیا۔

''آپ معلوم کر لیں میڈم! ہو سکتا ہے گھر کے کسی اور فرد نے کمپلین لکھوائی ہو۔'' جاوید علی نے مہذبانہ لہجے میں اس سے درخواست کی۔

''یہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ اس لیے کسی اور کے کمپلین کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ان پیپرز پر سائن کر دیں تاکہ ہمارے پاس ریکارڈ رہے کہ ہم کمپلین پر یہاں آئے تھے۔'' جاوید علی نے کسی ایسے ملازم کے لہجے میں ہی اس سے التجا کی جسے واپس جا کر اوپر والوں کو رپورٹ دینی ہو۔

''اوکے، میں کر دیتی ہوں۔'' اس نے بیزار سے لہجے میں کہا اور ان کے تیز کانوں نے لاک ہٹائے جانے کی آواز سنی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چوکنے ہو گئے۔

''عجیب ملک ہے۔ جب کمپلین کرواؤ تو کوئی آتا نہیں اور اب بغیر کمپلین کے ہی سر پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔'' اس نے بڑبڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا۔ لیکن اگلے لمحے ہکا بکا رہ گئی جب وہ اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اس سے قبل کہ وہ چیخنے کے لیے منہ کھولتی، جاوید علی نے اس کا منہ آہنی ہاتھ میں جکڑ کر بند کر

دیا۔ دوسری طرف اس کے ساتھی نے اس دوران دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب اگر باہر سے کوئی گزرتا بھی تو اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی محسوس ہوتا۔

''اندر چیک کرو۔'' جاوید علی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چوڑا ٹیپ نکال کر مہارت سے شاہین کے ہونٹوں پر چپکاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ جبکہ جاوید علی نے اس جگہ کھڑے کھڑے بری طرح مچلتی شاہین کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس کی کلائیوں کو آپس میں ملا کر ان پر ٹیپ لپیٹ دیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔

اچھے خاصے کشادہ لاؤنج میں کھلنے والے پہلے دروازے سے ہی اسے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی جسے سن کر اس کا دل اُچھل پڑا۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود ہے جسے وہ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کیے بغیر سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ شاہین سمیت اس کمرے میں داخل ہو کر جب اس نے بدن پر صرف ایک جانگیا پہنے کھڑے شخص کو دیکھا تو کھل اٹھا۔

اشفاق رانا ایک نامور وکیل تھا جو حقوقِ نسواں کے لیے کام کرنے والی ایک این جی او کے ساتھ منسلک تھا۔ جاوید علی نے ٹی وی اور اخبارات میں اس کے بیانات سنے اور پڑھے تھے۔ اس کی باتوں کو سن کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ عورتوں کی حمایت میں اس قدر بولنے والا شخص حقیقت میں کیا تھا۔ حقیقت تو وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ عورتوں کا حمایتی ایک خوب صورت لڑکی کی خواب گاہ میں نیم برہنہ حالت میں کھڑا تھا اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس کی خفیہ بیوی ہی تھی یا کوئی داشتہ۔ بہرحال وہ اس وقت تو اس بات پر خوش تھا کہ عالیہ کا دیا کلیو بیکار نہیں گیا تھا اور وہ لوگ اشفاق رانا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟..... اگر روپیہ اور زیور چاہتے ہو تو سب لے جاؤ لیکن ہم لوگوں کو کچھ مت کہنا۔'' اپنی محبوبہ کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ویسے گھبرا تو وہ پہلے ہی گیا تھا کہ ایک خوف ناک پسٹل کی نال اس کی طرف اُٹھی تھی اور اس نے یہی گمان کیا تھا کہ دن دہاڑے وہاں ڈاکو گھس آئے ہیں۔

''بکواس بند کرو۔ ہمیں یہاں سے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ اپنی حرام کی دولت تم اپنی داشتاؤں کو خوش رکھنے کے لیے سنبھال کر رکھو۔ ہمیں اپنی خون پسینے کی کمائی کافی ہے۔''

جاوید علی نے غرا کر کہا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ آنے والے ڈاکو ہوتے تو وہ دھن دولت دے کر بچ جاتا لیکن یہاں تو تیور بتا رہے تھے کہ یہ وہی ہیں جن سے بچ کر چھپنے کی تاکید کی گئی تھی اور اپنے تئیں وہ سب سے خفیہ ٹھکانے پر آ گیا تھا جہاں وہ اپنی روپوشی کے ایام رنگینی سے گزار سکتا تھا لیکن معاملہ بہت جلد رنگین سے سنگین ہو گیا تھا۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں ایک معزز آدمی ہوں اور اس شہر میں میری بہت عزت ہے۔''

''عزت دار آدمی اس طرح منہ چھپا کر عورتوں کی آغوش میں نہیں آ بیٹھتے جیسے تُو آ بیٹھا ہے۔'' جاوید علی نے نفرت سے کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

''تمہیں میرے ساتھ یہ سلوک بہت مہنگا پڑے گا۔ میرا اس شہر میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ میری ایک پکار پر ساری وکیل برادری تمہارے خلاف اُٹھ کھڑی ہو گی۔'' وہ تھپڑ کے زور سے ہل کر رہ گیا تھا۔ اس نے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اسے دھمکی دی۔

''ہم تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نکلنے دیں گے تب نا۔ تمہاری وکیل برادری کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ وہ جو عزت مآب اشفاق رانا صاحب ہوا کرتے تھے، انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔'' وہ بھلا کہاں اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا تھا۔ نہایت طنز سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر نہایت آسانی سے بڑی بڑی باتیں بنانے والے طرم خان کو قابو کر کے اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔

محترمہ شاہین تو پہلے ہی اپنی پرواز بھول کر ایک طرف سہمی کھڑی تھیں۔ جاوید کے ساتھی فیصل نے اشفاق رانا کو مناسب طریقے سے بٹھانے میں اس کی مدد کی۔ اب اشفاق رانا کے صرف منہ پر ٹیپ نہیں چپکا ہوا تھا بلکہ ہاتھ پاؤں بھی اسی ٹیپ میں لپٹ کر بے بس ہو گئے تھے۔ وہ صرف ایک عدد جانگیے میں فرش پر اکڑوں بیٹھا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

''ایسا کرو کہ ان خاتون کے بھی پاؤں باندھ کر انہیں دوسرے کمرے میں پہنچا دو کیونکہ اب اس کمرے میں جو کچھ ہوگا، یہ شاید اسے برداشت نہ کر سکیں۔'' اس نے سرد لہجے میں فیصل کو حکم دیا جس نے فوراً ہی خوف سے پھٹ جانے والی آنکھوں کے ساتھ مہین سے شب خوابی کے لباس میں صاف دِکھتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بنی شاہین کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔

اس کام کو انجام دیتے ہوئے اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ وہ کسی طور اس قابل نہ رہے کہ باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلا سکے۔ باہر سے کسی سُن گُن لینے کا اس لیے سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ فلور پر موجود واحد فلیٹ میں کوئی موجود نہیں تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے جن کی وجہ سے کسی کے دُور سے بھی کچھ دیکھ لینے کا امکان نہیں تھا۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ واپس خواب گاہ میں آیا تو جاوید علی اپنی کارروائی شروع کر چکا تھا۔ اس کی جارحیت کے باعث تڑپتا، لوٹ پوٹ ہوتا اشفاق رانا بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں لیکن منہ پر ٹیپ لگا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلا نہیں سکتا تھا۔

''بتاؤ وہ کون لوگ ہیں جنہیں تم معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر پیش کرتے ہو اور وہ لڑکیاں ساری زندگی کے لیے اپنی اصل شخصیت کو کھو کر ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں؟''

اس کے قہرناک لہجے میں کیے گئے سوال کے جواب میں اشفاق رانا نے سر کو دائیں بائیں اس طرح جنبش دی جیسے خود پر لگائے جانے والی فردِ جرم سے انکار کر رہا ہو۔

''تمہارے پاس جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے رانا! تمہیں صرف سچ بولنا ہے۔ کیونکہ دیبا مساج سینٹر میں کام کرنے والی تمہاری آلۂ کار عالیہ ہمارے قبضے میں ہے اور ہم اس سے بہت کچھ اُگلوا چکے ہیں۔''

اُس نے اس انداز میں اشفاق رانا کو یہ حقیقت بتائی جیسے عالیہ سے حقائق معلوم کرنے کے لیے اُنہیں اُس پر خاصا تشدد کرنا پڑا ہو۔ اپنے الفاظ کا ردِعمل اس نے اشفاق رانا کے چہرے پر دیکھا جو زرد پڑ گیا تھا۔

''اچھی طرح سوچ لو رانا! ہم نے عالیہ کو عورت ہونے کی رعایت نہیں دی تو تم جیسے سانڈ کو کیسے معاف کر سکتے ہیں؟''

اشفاق رانا کو دباؤ میں آتا محسوس کر کے اس نے مزید سنگین لہجے میں اسے دھمکایا۔ جواب میں اس نے سر کو یوں جنبش دی جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو

جاوید نے فیصل کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے منہ پر سے ٹیپ ہٹا دے۔

''تم نے عالیہ کے ساتھ کیا، کیا؟'' ٹیپ ہٹتے ہی اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اُسے پار لگا دیا۔'' جاوید علی نے سفاک انداز میں جواب دیا۔

''لیکن کیوں؟..... جب اس نے تمہیں ساری معلومات فراہم کر دی تھیں تو پھر تم نے اسے کیوں مارا؟ ہمارے ساتھ بھی تم ایسا ہی کرو گے؟'' اس کے لہجے میں احتجاج، خوف اور شک سب تھا۔

''اس نے بتانے میں بہت دیر لگائی تھی۔ اس دوران اس کے جسم پر اتنے زخم لگ چکے تھے کہ وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مر گئی۔'' اس نے بے نیازی سے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر لہجے کو مزید خوفناک بناتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے بھی دیر کی تو تمہاری جان بھی اسی طرح جا سکتی ہے۔''

''نہیں پلیز۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' اشفاق رانا کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی ہو چکی تھی، عالیہ کا انجام سن کر وہ مزید ڈھیلا پڑ گیا۔ اپنی کیٹگری سے تعلق رکھنے والے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی فطرتاً بزدل تھا اس لیے ایک حد تک ہی دباؤ برداشت کر سکا اور فرفر بولنا شروع ہو گیا۔

''مجھے اس کام کے لیے پامیلا نامی ایک عورت نے راضی کیا تھا۔ لگ بھگ پندرہ سال قبل وہ مجھے ایک پارٹی میں ملی تھی۔ اس پارٹی میں وہ کسی سرکاری افسر کے ساتھ بطور پرسنل سیکرٹری شریک ہوئی تھی۔ ہاں سب اسے مس پامیلا کہہ کر پکار رہے تھے لیکن بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی کنواری لڑکی نہیں بلکہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ بہرحال پارٹی میں تو ہماری بس ایک خوشگوار ملاقات ہی ہوئی تھی اور ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ فون نمبرز کے تبادلے کر لیے تھے۔ کچھ دن بعد پامیلا نے خود مجھ سے رابطہ کر کے کہیں ملاقات کرنے کی فرمائش کی۔ اس ملاقات میں وہ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے میری سماجی خدمات کو سراہا اور پھر نہایت خوب صورتی سے گفتگو کو اس ڈھب پر لے آئی کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے سب معلوم تھا کہ میری این جی او کو کہاں سے فنڈز ملتے ہیں اور میں کس کے کہنے پر زیادہ تر ایسے کیسز پر کام کرتا ہوں جن کی مدد سے پاکستان کا نام بدنام کیا جا سکے۔

میں اس کام میں ماہر تھا کہ کیسے عورت کے ساتھ ہونے والی چھوٹی سی زیادتی کو بہت بڑا ایشو بنا کر دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میرے میڈیا میں بھی گہرے روابط تھے جن کی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ کہیں سے کوئی چٹ پٹی خبر مل جائے جس کی بنیاد پر وہ اپنے ناظرین کو متوجہ کر سکیں۔ پامیلا نے مجھ سے کہا کہ اپنا یہ دھندا جاری رکھوں اُسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ایک بڑی رقم کے عوض مجھ سے ایسی لڑکیاں فراہم کرنے کی فرمائش بھی کی جن کا آگے پیچھے کوئی پوچھنے والا نہ ہو اور وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکے۔ بس اس دن کے بعد سے میں اس کا بزنس پارٹنر بن گیا۔ وہ میرے اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقوم ٹرانسفر کرتی رہی اور میں اس کی فرمائش کے مطابق لڑکیاں فراہم کرتا رہا۔ عالیہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔'' وہ سر جھکا کر ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

جاوید علی کا دل چاہا کہ کسی دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر توڑ دے لیکن خود پر ضبط کر گیا کہ ابھی اسے اس سے مزید معلومات حاصل کرنا تھیں۔

''پامیلا ہمیں کہاں مل سکتی ہے؟'' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب تک وہ جوان تھی، ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے لیکن پھر میرے لیے اس کی کشش ختم ہو گئی۔ اصل میں جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، تب بھی وہ کوئی ایسی جوان نہیں تھی۔ پینتیس سے تو اوپر ہی کی ہو گی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ لیکن ظاہر ہے، عمر کب تک چھپتی ہے۔ پتہ چلنے لگا کہ وہ کوئی جوان لڑکی نہیں بلکہ ڈھلتی عمر کی عورت ہے۔ اس نے خود بھی پارٹیز میں شرکت کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھی اس لیے میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔"

"جھوٹ بولتا ہے اُلو کی دُم۔" اُس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتا اور پرکھتا جاوید علی آخری جملوں سن کر طیش میں آیا اور اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کا گال اندر سے پھٹ گیا اور ساتھ ہی ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے بے ساختہ ایک زوردار چیخ مارنی چاہی لیکن قریب ہی کھڑے فیصل نے اس کا منہ زور سے دبوچ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

"اگر تجھے اُس کا پتہ ٹھکانہ معلوم نہیں ہے تو پھر تُو لڑکیاں پھانسنے کے بعد اُنہیں سپلائی کیسے کرتا ہے؟" جاوید علی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک تھپڑ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنا بھاری بوٹ والا پیر اس کے بندھے ہوئے پیروں کے یکجا پنجوں پر اس طرح رکھ دیا کہ پورا وزن ڈال دیا اور اس کے کھڑے پنجے بری طرح مڑ گئے اور وہ یوں تڑپ اُٹھا جیسے کوئی ہڈی چیخ گئی ہو لیکن اس بار بھی اس کی چیخ کو منہ سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں دیا گیا۔

"یاد رکھ رانا!..... تُو نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دیا تو اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔" اس نے وحشت بھرے انداز میں اس طرح دھمکی دی کہ رانا کی رہی سہی ہمت ختم ہوگئی اور وہ سر کو یوں حرکت دینے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

جاوید علی نے ایک لمحے کو اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پیلے پڑ جانے والے رخساروں کو تکلیف کی شدت سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں نے تر کر دیا تھا۔ وہ کہیں سے وہ شخص نہیں لگ رہا تھا جسے سونڈ بونڈ ٹی وی اسکرین پر بولتے دیکھ کر لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔ اس نے فیصل کو اس کے منہ سے ہاتھ ہٹانے کا اشارہ کیا۔

"پپ..... پانی..... مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔" اس نے بھیک مانگنے والوں کی طرح عاجزی سے درخواست کی۔

اُس کی درخواست پر جاوید علی خود آگے بڑھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیل کر اس کے قریب آیا۔ یہ صرف ایک گھونٹ پانی تھا جسے پی کر رانا کسی کتے کی طرح ہانپنے لگا اور نہایت لجاجت سے مزید پانی پلانے کی درخواست کی۔

"مزید پانی تمہیں اس وقت ملے گا، جب تم مجھے پامیلا کے بارے میں معلومات فراہم کرو گے۔" جاوید علی نے اٹل لہجے میں شرط عائد کی۔

"اُس کا پتہ واقعی مجھے نہیں معلوم ہے۔ لیکن ایک فون نمبر ہے جس پر میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ رابطہ ہونے پر وہ لڑکی کے بارے میں جو ہدایات دیتی ہے، میں ان پر عمل کرتا ہوں۔"

"فون نمبر بتاؤ۔" جاوید علی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"وہ میرے موبائل میں پامیلا کے نام سے فیڈ ہے۔" اس نے شرافت سے بتایا تو جاوید علی نے فیصل کو اشارہ کیا۔ رانا اور شاہین دونوں کے ہی موبائل فون اس کے قبضے میں تھے۔ فیصل نے فوراً رانا کا موبائل چیک کرنا شروع کر دیا۔

"اس میں پامیلا کے نام سے ون اور ٹو کر کے دو نمبر فیڈ ہیں۔" فون کا بک لاگ چیک کر کے فیصل نے فوراً ہی بتایا۔

"پامیلا ٹو والا نمبر اس کے استعمال میں ہے۔ پامیلا ون ایک پی ٹی سی ایل نمبر ہے جو کبھی اس میرے بیورو میں ہوتا تھا جس کی آڑ میں وہ اپنی لڑکیوں سے دھندا کرواتی تھی۔ بعد میں وہ میرج بیورو بند کر کے منہ

سے بالکل غائب ہوگئی تھی۔"

"میرج بیورو کا پتہ اور پامیلا کا حلیہ دونوں بتاؤ۔ اور یہ بھی کہ اُسے میرج بیورو بند کیے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" جاوید علی نے دریافت کیا۔

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے، پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔"

"نہیں، پہلے میرے سوالوں کے جواب دو۔" اس نے قطعی جواب دیا اور کرید کرید کر مزید تفصیلات معلوم کرنے لگا۔

رانا کو مجبوراً اس کے سوالوں کے جوابات دینے پڑے۔ جب جاوید علی کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں رہا ہے تو اس نے سوالات کا سلسلہ روک دیا اور گلاس بھر کر پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بے تابی سے پورا پانی پی گیا۔

"اُمید ہے تمہاری پیاس بجھ گئی ہوگی۔ ہم اتنے بے رحم بھی نہیں کہ مرنے والے کی آخری خواہش بھی پوری نہ کریں۔"

سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کمرے کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ رانا کے کچھ سمجھنے سے قبل فیصل نے اس کے ہونٹوں پر دوبارہ ٹیپ چپکا دیا اور اپنی جیب سے بے آواز پسٹل نکال کر اس کی کھوپڑی میں دو گولیاں اُتار دیں۔

شیطانی دماغ رکھنے والا جو بہت بڑی بڑی باتیں کرتا تھا، نہایت خاموشی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

جاوید علی کو معلوم تھا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہوگا اس لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ رانا جیسے غدار اور بدکردار لوگ اس کے لیے اتنے قابلِ نفرت تھے کہ وہ بلا ضرورت ان جیسوں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

"ہم تمہارے پیر کھول کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے جو کر سکتی ہو، کر لینا۔" اس کے حکم پر فیصل نے برابر والے کمرے میں بند شاہین کے پیروں کو آزاد کیا اور دروازہ بند کر کے جاوید علی کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔

لفٹ میں پہنچ کر ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود باریک دستانے اُتار کر واپس جیبوں میں ٹھونسے اور گراؤنڈ فلور پر لفٹ پہنچنے پر اطمینان سے باہر نکل کر چوکیدار کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس گاڑی میں جا بیٹھے جس پر گیس کمپنی کا لوگو بڑا واضح بنا ہوا تھا۔

ان کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ ساتھ ہی وہ تینوں اپنے حلیے میں تبدیلی لانے کے لیے استعمال کی جانے والی چیزیں ایک ایک کر کے خود سے الگ کرتے چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ پیر آزاد ہونے کے باوجود شاہین کو اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے اور کسی کو متوجہ کرنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا اور جب وہ اور بلڈنگ کا چوکیدار وہاں آنے والے افراد کے حلیے پولیس کو بتائیں گے تو انہیں ان حلیوں کے افراد پورے شہر میں کہیں نہیں ملیں گے۔

⊛----✪----⊛

"کیا بوریت ہے باس!..... ایسے پڑے پڑے تو ہم کو زنگ لگ جائے گا۔" سلّو نے شہریار سے شکوہ کیا۔ شہر میں سکیورٹی ہائی الرٹ ہونے کی وجہ سے کلام نے فی الحال کوئی بھی کارروائی کرنے سے منع کیا تھا اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے وہ تقریباً ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ کوئی مصروفیت تھی تو بس یہ کہ صبح جاگنگ کے لیے قریبی پارک میں چلے جاتے یا دن میں کسی وقت شہر کی تفریح گاہوں کا رخ کرتے۔ کیونکہ مستقل ہوٹل کے کمرے میں ٹھہرے رہنا بھی انہیں انتظامیہ کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا تھا۔

جاگنگ کرتے ہوئے دو بار کلام بھی ان سے آملا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ونود کی تلاش کو کامیابی سے ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور بلڈنگ میں ابھی تک کسی کو اس کے غیاب پر تشویش نہیں ہے۔ اس کی وجہ اُس کا طرزِ زندگی تھا۔ ایک تو وہ اکیلا رہتا تھا، دوسرے بنا کسی سے ذکر کیے اس طرح کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جانا اس کا معمول تھا اس لیے کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ دوسری طرف کلام، پریم ناتھ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے مطابق آج کل پریم ناتھ خود گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ''را'' نے اس کے محکمے والوں کا جینا مشکل کیا ہوا تھا اور وہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہی ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ اس کے گھر جانے کے اوقات مخصوص نہیں رہے تھے۔ ان حالات میں نائٹ کلبز اور ڈسکو میں جا کر تفریح کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اپنی یہ جھنجلاہٹ وہ اس طرح نکال رہا تھا کہ بے قصور شہریوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے نام پر اُنہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان بے قصور افراد کو چھوڑنے کے لیے ان کے گھر والوں سے بڑی رقوم بھی وصول کی جا رہی تھیں۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ پولیس والوں کے سائے سے بھی بھڑکنے لگے تھے۔ کلام کی فراہم کردہ ان معلومات کی تصدیق نیوز چینلز بھی کر رہے تھے اور اب حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ شہری پولیس کے رویے کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میڈیا اُن کا ساتھ دے رہا تھا اور مبصرین صاف لفظوں میں اس اندھیر پر مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ حکام کو آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ شہریار بہت غور سے اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا اس لیے سلّو کا شکوہ سن کر مسکرایا اور بولا۔

''ذرا صبر کرو شہزادے! اب جلد ہی یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا اور ہم ہاتھ پیر چلانے کے لیے آزاد ہوں گے۔''

اُس کی یہ بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ دو دن بعد ہی کلام نے اُنہیں اطلاع دی کہ حالات سازگار ہیں اور پریم ناتھ اپنے سابقہ معمول پر واپس لوٹ چکا ہے۔ انہوں نے پہلے ہی خاصا انتظار کر لیا تھا اس لیے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی رات کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔

کلام کا آدمی ہنوز پریم ناتھ کی نگرانی کر رہا تھا اس لیے انہیں سادہ سی پلاننگ پر عمل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ کارروائی کے لیے انہوں نے ایک ایسی سڑک کا انتخاب کیا جہاں کلام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دن کے وقت بھی بہت کم گاڑیاں گزرتی تھیں اور رات میں تو مشکل سے ہی اِکا دُکا گاڑیوں کا گزر ہوتا تھا۔

اصل میں اس سڑک پر کچھ عرصہ قبل راہزنوں نے بڑی لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ وہ اچانک ہی اطراف کی جھاڑیوں سے نکل کر کسی گاڑی کو روک لیتے تھے اور گاڑی والوں کا سارا مال ہتھیا لیتے تھے۔ ایک آدھ بار وہ جوان عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور بعد میں ان عورتوں کی لاشیں ہی ملی تھیں۔ چنانچہ لوگوں نے ڈر کے مارے اس راستے پر سے گزرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راہزنوں کے اس چالاک گروہ نے بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر کہیں اور کا رُخ کر لیا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں موجود خوف ہنوز باقی تھا۔ چنانچہ رات کے وقت تو خصوصاً اس سڑک پر سفر کرنے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ پریم ناتھ چونکہ پولیس والا تھا اور اپنے ساتھ ایک گن

ھی رکھتا تھا اس لیے بلا خوف و خطر اس سڑک کا استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس سڑک کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کرنے کی صورت میں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔

انہوں نے پریم ناتھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اسی سڑک کا انتخاب کیا اور جب اس کے تعاقب میں آتے کلام نے انہیں اطلاع دی کہ وہ لوگ اس سڑک پر پہنچنے والے ہیں تو اپنا کام شروع کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس چوری کی دو عدد گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کو انہوں نے اس انداز میں سڑک پر کھڑا کر دیا کہ یہ دونوں گاڑیاں کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہوں۔ پھر خود آستینیں چڑھا کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے۔

ظاہر ہے، پریم ناتھ کی گاڑی وہاں پہنچی تو اس نے دور سے ہی یہ سارا منظر دیکھ لیا۔ پولیس والا ہونے کی وجہ سے اس کے لیے اس منظر کو نظر انداز کر کے گزر جانا ممکن نہیں تھا اور بالفرض وہ گزرنا بھی چاہتا تو دونوں گاڑیاں سڑک پر اس انداز میں کھڑی کی گئی تھیں کہ اس گاڑی کے لیے گزرنے کا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس کی گاڑی عین ان دونوں کے سامنے آ کر رک گئی۔

''اوئے، یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے؟'' پریم ناتھ کا گن مین اپنی گن لہراتا ہوا گاڑی سے برآمد ہوا اور رعب سے انہیں ڈپٹتے ہوئے بولا۔ پریم ناتھ نے البتہ گاڑی سے نیچے اُتر کر صورتِ حال کا جائزہ لینا اپنی افسرانہ شان کے خلاف سمجھا تھا۔

''دیکھیں سر! اس نے میری گاڑی کو سائیڈ ماری ہے۔ میں اس سے نقصان بھرنے کو کہہ رہا ہوں تو یہ اُلٹا مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

گن مین کی للکار سن کر پہلے تو وہ دونوں اس طرح چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہوئے جیسے اب تک انہیں سڑک پر کسی دوسری گاڑی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ پھر شہریار نے لہجے میں مظلومیت بھرتے ہوئے اس سے شکایت کی۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ سالا نشے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جھونک میں میری گاڑی کو سائیڈ مار بیٹھا۔ آپ قریب آ کر دیکھیں، اس کے منہ سے شراب کی کتنی گندی بُو آ رہی ہے۔ سالے ٹھرکی نے میری گاڑی کی ایسی تیسی کر دی۔ یہ دیکھیں کیا حشر ہو گیا ہے گاڑی کا۔''

شہریار کے عاجزانہ لہجے کے مقابلے میں سلّو کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا اور وہ بہت غصے سے گن مین کو گویا اصل صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

دونوں کے بیانات سن کر تذبذب میں پڑ جانے والے گن مین نے خود گاڑیوں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور چند قدم آگے بڑھ کر ذرا جھک کر دیکھنا چاہا کہ کون سی گاڑی کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔

سلّو اور شہریار کو ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ سلّو قیامت بن کر اس کے سر پر ٹوٹ پڑا جبکہ شہریار نے اپنی گن کا رخ گاڑی میں بیٹھے پریم ناتھ کی طرف کر دیا۔

اس سارے منظر کو کسی تماشے کی طرح دیکھتے پریم ناتھ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال اس طرح پلٹ جائے گی۔ اس نے بے ساختہ ہی ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ایک گن کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی۔ یہ کلام تھا جو اس کی گاڑی کا تعاقب کرتا رہا اور کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر پیدل نہایت خاموشی سے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔'' اس نے غرّا کر پریم ناتھ کو دھمکایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون ہو تم لوگ؟'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

''جلد جان جاؤ گے۔ ابھی تو گاڑی سے نیچے اُترو۔'' کلام نے سابقہ لہجے میں اسے جواب دیا جس پر وہ کسی مزاحمت کے بغیر گاڑی سے اُتر آیا۔ مزاحمت کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اسے سامنے ہی اپنی گن مین سڑک پر چت لیٹا نظر آ رہا تھا اور وہ خود خالی ہاتھ تین مسلح افراد کے نرغے میں تھا۔

''اگر تم کوئی لٹیرے ہو تو تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور مجھے نقصان پہنچا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔''

شاید اسے اچانک ہی وہ راہزن یاد آ گئے تھے جن کی اس سڑک پر لوٹ مار کرنے کی کہانیاں عام تھیں اس لیے ذرا سا سنبھالا لے کر انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔

''اپنا منہ بند رکھو۔ ہم نے تمہارا سب آگا پیچھا معلوم کر کے ہی تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' شہریار جو اس دوران ان کے نزدیک آ چکا تھا، سخت لہجے میں بولا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔

پریم ناتھ کے لیے یہ صورتِ حال بڑی گمبھیر تھی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح اُسے گھیرنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ وہ کوئی اچھا ریکارڈ رکھنے والا پولیس افسر نہیں تھا۔ جہاں بھی رہا تھا، لوگوں پر ظلم و ستم ہی ڈھائے تھے جس کی حالیہ مثال بے گناہوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کی رہائی کے بدلے ان کے اعزا سے خطیر رقوم وصول کرنا تھا۔

''آگے بڑھو۔'' اُسے گم صم کھڑا دیکھ کر شہریار نے گن سے ٹہوکا دیا۔ اس کا رخ کچھ فاصلے پر کھڑی کلام کی گاڑی کی طرف تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر شہریار نے اپنی جیب سے کلوروفام میں ڈوبا رومال نکالا اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر پریم ناتھ کی ناک پر رکھ دیا۔

اس اچانک حملے پر وہ ذرا سا مچلا لیکن پھر ہاتھ پیر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی شہریار نے اسے سنبھال لیا۔ اس دوران کلام تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کی ڈکی کھول چکا تھا۔ ڈکی میں وہی ایک سوٹ کیس رکھا تھا جو چند دن قبل اس نے دنود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ڈکی میں رکھے ہی اس نے سوٹ کیس کو کھولا اور تینوں نے مل کر پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کو اس میں منتقل کر دیا۔ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ مناسب مقدار میں آکسیجن اندر جاتی رہے۔

ڈکی بند کرنے کے بعد ان تینوں نے گاڑی میں اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کلام بیٹھا تھا جس نے گاڑی ریورس کر کے سڑک پر واپس موڑ لی۔ آگے ان کی دو گاڑیوں اور پریم ناتھ کی گاڑی نے مل کر سڑک بلاک کر دی تھی اس لیے اس سڑک پر آگے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاڑیاں چوری کی ہونے کی وجہ سے انہیں ان کی کوئی فکر نہیں تھی۔

ساری کارروائی کے دوران انہوں نے اپنے ہاتھوں پر ربڑ کے پتلے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے پریشانی بھی نہیں تھی کہ پولیس کو ان کے فنگر پرنٹس مل جائیں گے۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر بہت کامیابی سے پریم ناتھ کو اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ ان کی منزل کلام کا وہ فلیٹ تھا جو اس نے اسی قسم کی کارروائی کے لیے ایک نئے پروجیکٹ میں لے رکھا تھا۔

پروجیکٹ نیا ہونے کی وجہ سے ابھی وہاں بہت کم فلیٹ آباد ہوئے تھے اور کلام کا فلیٹ تو تھا بھی ٹاپ

فلور پر جہاں اس کے سوا ابھی تک کوئی دوسری فیملی نہیں آئی تھی۔ وہ خود بھی وہاں کبھی کبھی ہی جاتا تھا اور بلڈنگ کے چوکیدار کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص وہاں اس کا چہرہ شناس تھا۔

اب بھی وہ گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو چوکیدار نے اسے پہچان کر گاڑی کو کھلے دروازے سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ کلام نے گاڑی پارکنگ میں لے جا کر روکی اور پھر اس نے اور سلّو نے مل کر سوٹ کیس ڈکی سے باہر نکالا۔ سوٹ کیس پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس میں وِیل لگے ہوئے تھے اس لیے اسے ڈکی سے نکالنے کے بعد انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور اکیلا سلّو ہی اسے دھکیلتا ہوا کلام کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ شہریار بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

وہاں اوپر جانے کے لیے لفٹ موجود تھی۔ وہ تینوں سوٹ کیس سمیت لفٹ میں سوار ہوئے اور ایک بٹن دباتے ہی لفٹ نے انہیں چند لمحوں میں ٹاپ فلور پر پہنچا دیا۔ یوں پریم ناتھ بغیر کسی ہنگامے اور شور شرابے کے کلام کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

یہ لگژری فلیٹ تھا جو بناوٹ کے اعتبار سے تقریباً ساؤنڈ پروف تھا اور انہیں مزید سہولت یہ حاصل تھی کہ اس پڑوس میں کوئی آباد بھی نہیں تھا اس لیے وہ اپنی ساری کارروائی اطمینان سے انجام دے سکتے تھے۔ فلیٹ میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے سوٹ کیس کھولا۔ اور پریم ناتھ پسینے میں شرابور پڑا اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہا تھا۔ سوٹ کیس کو ڈکی سے نکال کر اوپر لانے کے لیے انہیں اس کا ڈھکن صحیح طور پر بند کرنا پڑا تھا اس لیے اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ سوٹ کیس کھلنے کے نتیجے میں اُسے وافر آکسیجن ملی تو وہ گہرے گہرے سانس لے کر کمی پوری کرنے لگا۔

''اسے ہوش آنے والا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے باہر نکال کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔'' اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اپنا خیال ظاہر کیا تو کلام اور سلّو فوراً ہی حرکت میں آ گئے۔ دونوں کے کام مکمل ہونے تک پریم ناتھ کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ غائب دماغی کی کیفیت میں ایک سمت تکے جا رہا تھا۔ شہریار کمرے کے ساتھ منسلک باتھ روم سے ایک مگ میں پانی بھر لایا اور اس کے منہ پر اُنڈیل دیا۔ چہرے پر پانی پڑنے پر اس نے جھرجھری سی لی اور پھر اس کی آنکھوں کا رنگ بدلتا نظر آیا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ غائب دماغی کی کیفیت سے باہر نکل رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اس کے منہ سے نکلنے والے سوال نے ثابت کر دیا کہ وہ حواسوں میں لوٹ چکا ہے۔

''ہم حرام کے اس مال میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جو تم نے بے گناہ شہریوں کو گرفتار کر کے ان کی رہائی کے بدلے میں رشوت کے طور پر وصول کیا ہے۔'' شہریار نے نہایت سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تو تم نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے؟'' پریم ناتھ کے چہرے پر ذرا سا اطمینان اُترا۔

''ہاں۔ تاوان تو تمہیں ادا کرنا ہو گا۔'' اُسے یہ جواب دیتے ہوئے شہریار کی نظروں میں ڈاکٹر فرحان اسمٰعیل کی خوب صورت تصویر تھی۔ ایسے شاندار شخص کو پھنسانے میں کلیدی کردار ادا کرنے والے شخص کو وہ سچ مچ بھاری تاوان کی ادائیگی کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ تاوان کے طور پر اسے شاید اپنی جان ہی گنوانی پڑتی۔

''دیکھو، میں تمہیں جھٹلاؤں گا نہیں۔ رشوت میں نے سچ مچ لی ہے۔ لیکن میرا وشواس کرو کہ وہ سارے پیسے اکیلے میری جیب میں نہیں گئے۔ اوپر نیچے والوں کو حصہ دینے کے بعد میرے حصے میں بہت تھوڑی رقم آئی ہے۔ تم اسی حساب سے مجھ سے مانگو گے تو میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن میری حیثیت سے بڑھ کر ڈیمانڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرو گے تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' ان کی طرف سے کوئی مطالبہ سامنے آنے سے پہلے اس نے بارگیننگ شروع کر دی۔

''حیثیت تو تمہاری بڑی اونچی ہے پریم ناتھ!..... اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک چھوٹے سے گاؤں سے اُٹھ کر ممبئی جیسے شہر میں نہ آ گئے ہوتے۔ بتاؤ کیا قیمت لی تھی تم نے ڈاکٹر فرحان جمیل کو ''را'' کے ہاتھوں میں پہنچانے کی؟..... تمہیں تو دو طرف سے حصہ ملا ہوگا۔ ایک طرف سے فرحان جمیل کے دشمن خاندان والوں نے نوازا ہوگا تو دوسری طرف سے ''را'' نے اتنا اہم شخص پکڑوانے پر تم پر نوازشات کی بارش کر دی ہوگی۔ تمہارے یہ ٹھاٹھ باٹھ ایسے ہی تو نہیں ہیں۔ سیدھے طریقے سے کام کرتے تو تم مرتے دم تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے جس کے مزے آج لوٹ رہے ہو۔''

اس کے ہر لفظ کے ساتھ پریم ناتھ کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا اور اب وہ کسی اور نظر سے اپنے سامنے موجود افراد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پولیس کی نوکری میں ایک عرصہ گزارا تھا اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ ''را'' کی گرفت میں موجود ایک پاکستانی سائنس دان کی تلاش میں اس طرح پہنچنے والوں کا تعلق بھارت کی سرزمین سے تو ہو نہیں سکتا۔ وہ یقیناً ڈاکٹر فرحان کے ہم وطن تھے جو اپنے ملک کے ایک قیمتی سرمائے کو واپس لینے یہاں تک آ پہنچے تھے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا ''را'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک چھوٹا افسر ہوں اور ''را'' والے مجھ جیسوں کو منہ نہیں لگاتے۔'' آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

''را'' سے تیرا تعلق ہے یا نہیں، یہ تو ہم بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تُو یہ قبول کر کہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے ڈاکٹر فرحان جمیل کو تُو نے گرفتار کیا تھا یا نہیں؟''

''میں نے اپنی سروس کے دوران درجنوں افراد کو گرفتار کیا ہے۔ اب مجھے ان سب کے نام تو یاد ہونے سے رہے۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جس پر شہریار کا پارا چڑھ گیا اور اس نے بے دریغ اسے لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ مارتے ہوئے اُس نے اس بات کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا کہ اس کے پیر پریم ناتھ کے جسم کے کس حصے پر پڑ رہے ہیں۔ دو تین لاتیں تو اس [illegible] اس کے منہ پر بھی دے ماریں جس کے نتیجے میں اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور دائیں جبڑے کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ چوٹیں کھا کر وہ بری طرح چیخنے لگا جس پر کلام نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آوازوں کا گلا گھونٹ ڈالا۔

''تم تو بڑے بودے نکلے پریم ناتھ!..... صرف ٹریلر پر ہی تمہارا یہ حال ہو گیا۔ ابھی تو ہم تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کریں گے۔ تمہیں تو اچھا خاصا تجربہ ہوگا کہ کیسے تشدد پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تم تو اپنے علاقے میں بڑے سفاک پولیس والے مشہور تھے۔ سنا ہے تم نے ڈاکٹر فرحان پر بھی بے تحاشا تشدد کیا تھا اور ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہیں۔ ہم تمہارے سامنے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔ اب بتا کہ تُو ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

اس نے فرش پر پڑے پریم ناتھ پر جھک کر اس کے چہرے کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ پریم ناتھ کو اس کی انگلیاں اندر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اذیت اور نفرت سے اس کے جسم کے خدوخال بگڑ گئے لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلّا کر اظہار نہ کر سکا۔

''پلاس سے اس کے سارے ناخن ایک ایک کر کے اُکھاڑ ڈالو اور خبردار..... اس وقت تک اپنا ہاتھ مت روکنا جب تک یہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے رضامندی نہ ظاہر کر دے۔''

حکم جاری کر کے وہ خود ایک کرسی پر جا بیٹھا اور سلّو حکم کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

''میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔'' سلّو نے ابھی پریم ناتھ کی پہلی انگلی کو ہی اپنی گرفت میں لیا تھا کہ کلام کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی پریم ناتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن اُکھڑ کر پلاس کی گرفت میں نظر آنے لگا۔ ناخن اُکھیڑے جانے کی اذیت سے پریم ناتھ کا جسم بری طرح سے پھڑکا اور بننے والے زخم سے تیزی سے خون بہنے لگا۔

سلّو نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا ہاتھ روکا نہیں اور پریم ناتھ کی شدید مزاحمت کے باوجود اس کی دوسری انگلی کا ناخن بھی اُکھاڑ ڈالا۔ اس بار وہ اذیت برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

''جانے دو۔ تھوڑی دیر کے لیے چائے کا وقفہ کر لیتے ہیں، پھر اس سے نمٹیں گے۔'' پریم ناتھ کے بے ہوش ہونے پر سلّو نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بے نیازی سے کہا۔

اسی وقت کلام ٹرے میں چائے کے کپ رکھے واپس آ گیا۔ ٹرے میں چائے کے کپ کے علاوہ ایک چھوٹی پلیٹ میں چاکلیٹ کوکیز بھی رکھے ہوئے تھے۔

''یہاں میرا کبھی کبھار ہی آنا ہوتا ہے اس لیے خورونوش کی اشیاء میں چائے، کافی کے علاوہ بس بسکٹ ہی مل سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ بغیر فریج کے بھی لمبے عرصے کے لیے محفوظ رہ سکتے ہیں۔'' اُس نے کسی ایسے میزبان کی طرح، جو آنے والے مہمانوں کی خاطر خواہ مدارت نہ کر پا رہا ہو، شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی۔

''یہ بھی بہت ہے۔ ہم یہاں دعوت میں نہیں آئے ہیں جو خاطریں کرواتے پھریں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرے میں سے چائے کا کپ اُٹھا لیا۔ سلّو نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور بلا ضرورت کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔

''اس کی کھال مجھے کافی موٹی لگتی ہے۔ یہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا۔'' چائے پیتے ہوئے فرش پر بے ہوش پڑے پریم ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کلام نے تبصرہ کیا۔

''مجھے ہر حال میں اُس سے سچ اُگلوانا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اس کا پورا جسم ہی کیوں نہ چھیدنا پڑ جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ذرا سے لالچ کے پیچھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ وہ بے چارے نہ جانے اتنے عرصے میں کتنی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں اور کس حال میں ہیں؟ اس شخص کے لیے میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔''

یہ وہی شہریار تھا جو اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود نچلے طبقے کے مظلوم و مجبور افراد کی پریشانیاں بہت ہمدردی سے سنتا تھا لیکن ایک ملک دشمن کے لیے اس کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ کلام بھی اندر سے لرز اُٹھا۔ سلّو البتہ نارمل تھا۔ جس نہج پر اس کی تربیت ہوئی تھی، اس میں کسی پر تشدد کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دوسرے اتنے دنوں کے ساتھ میں اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ملک دشمنوں کے حق میں شہریار کتنا سخت اور بے لچک آدمی ہے۔

''تم شاید اپنا موبائل کچن میں چھوڑ آئے ہو۔ وہاں سے اس کی ٹون سنائی دے رہی ہے۔'' کچن کی طرف سے آتی بہت دھیمی سی آواز پر شہریار کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے کلام کو آگاہ کیا۔

''اوہ.....'' کلام تیزی سے کچن کی طرف گیا اور جب فون کان سے لگائے واپس آیا تو چہرے کے تاثرات لحہ بہ لحہ رنگ بدل رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہمیں یہاں سے فوری طور پر روانہ ہونا ہوگا۔ میرے ایک آدمی کی کال آئی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ اسے اطلاع ملی ہے کہ جس بلڈنگ میں ہم موجود ہیں، اس پر ریڈ کرنے کے لیے ایک پولیس پارٹی روانہ ہو چکی ہے۔ ابتدائی معلومات کے مطابق پولیس کو یہاں کچھ جرائم پیشہ افراد کی موجودگی کی خبر ملی ہے اس لیے ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

جلدی جلدی انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوا کلام افراتفری کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس وقت پولیس کے ایک مغوی افسر کے ساتھ یہاں موجود تھے اور پکڑے جانے کی صورت میں بہت برے انجام سے دوچار ہو سکتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے حالات سخت مخدوش تھے۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے اسے دوبارہ سوٹ کیس میں پیک کرو پھر نکلتے ہیں۔'' چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ کر شہریار نے فیصلہ سنایا اور فوری طور پر حرکت میں آ گیا۔

کلام کے تاثرات سے ایسا لگا کہ وہ اس کام میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور فوری طور پر نکلنے کا خواہش مند ہے لیکن شہریار کا اٹل انداز دیکھتے ہوئے اسے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور خود بھی ان دونوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

اب ایک بار پھر بے ہوش پریم ناتھ سوٹ کیس میں منتقل ہو چکا تھا اور وہ لوگ لفٹ کے ذریعے اسے نیچے لے جا رہے تھے۔

سوٹ کیس کو ڈکی میں ڈال کر خود گاڑی میں بیٹھنے تک انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ پروجیکٹ نیا ہونے کی وجہ سے زیادہ آباد نہیں تھا اور یہ ماحول ان جیسے افراد کے علاوہ جرائم پیشہ لوگوں کے لیے بھی سازگار تھا کیونکہ یہاں ان کی حرکات وسکنات کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہیں ہوتا تھا۔

کلام نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی ہی تھی کہ اُنہیں پولیس کی ایک جیپ دکھائی دی۔ خلافِ معمول پولیس والے ہوٹرز بجاتے ہوئے آنے کے بجائے خاموشی سے وہاں آئے تھے۔ ان کی گاڑی کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر انہیں دور سے ہی رکنے کا اشارہ کیا گیا لیکن ظاہر ہے ان کے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ کلام نے ایکسلریٹر پر دباؤ کچھ اور بھی بڑھا دیا اور اس کی گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ لازمی ردِعمل کے طور پر پولیس کی گاڑی بھی ان کے پیچھے آئی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کلام کی کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے تعاقب میں آنے والی پولیس جیپ سے پیچھا چھڑا لے۔ لیکن پولیس والے بھی ان کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''گاڑی کی اسپیڈ تھوڑی کم کرو۔ میں انہیں روکنے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' سلّو نے کلام سے کہا اور خود اپنی گن سنبھال کر بیٹھ گیا۔

اُس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کلام نے آہستہ آہستہ رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ ان کی گاڑی کی رفتار کم ہوتی دیکھ کر پولیس جیپ کا ڈرائیور جوش میں آ گیا اور جیپ کی رفتار مزید بڑھا دی۔

اُس کی اس حرکت نے گاڑی اور جیپ کا درمیانی فاصلہ مزید کم کر دیا اور سلّو کے لیے جیپ کے اگلے ٹائر کو نشانہ بنانا اور بھی آسان ہو گیا۔ اگلے ٹائر میں گولی لگتے ہی فضا میں زوردار آواز گونجی اور تیز رفتار پولیس جیپ اس بری طرح لہرائی کہ ڈرائیور کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ کلام نے فوراً ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

اس وقت وہ ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جس کے دونوں اطراف درختوں کے گھنے جھنڈ موجود

ے۔ عرصے سے ممبئی میں رہنے والا کلام یہاں کے راستوں اور جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھا لیکن یہ الیت کسی ناگہانی کو تو نہیں ٹال سکتی تھی۔ جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے تعاقب میں وہی واحد جیپ نہیں آ رہی تھی جس کے ٹائر کو نشانہ بنا کر سلّو نے اسے ناکارہ کر دیا تھا۔ وہاں کچھ اور بھی ہیڈ لائٹس تھیں جو تیزی سے دوڑتی چلی آ رہی تھیں۔

''ہمارے سامنے سے بھی کچھ گاڑیاں آ رہی ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے وائرلیس پر رابطہ کر کے اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا ہے۔'' اچانک ہی کلام نے متوحش لہجے میں انہیں مطلع کیا۔ یہ ون وے روڈ تھا اس پر سامنے سے گاڑیاں آنے کا مطلب تھا کہ انہیں دونوں جانب سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

''بچاؤ کا کیا راستہ ہے؟'' شہریار نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''ہمیں گاڑی چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ میں گھسنا ہوگا۔''

یہ جواب سن کر شہریار نے ہونٹ بھینچ لئے۔ گاڑی چھوڑنے کا مطلب تھا کہ انہیں پریم ناتھ کو بھی چھوڑنا پڑتا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ پریم ناتھ سمیت پکڑے جاتے تو خلاصی کی کوئی صورت نہیں نکلتی البتہ بچ نکلنے کی صورت میں دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا۔

''اوکے۔''

''ہم رائٹ سائیڈ پر جائیں گے۔'' اس کی ایک لفظی رضامندی سن کر کلام نے بتایا۔ اس صورتِ حال میں سب سے زیادہ اسے ہی نقصان پہنچنے والا تھا۔ اس کی گاڑی سے پریم ناتھ کے ملنے کا مطلب تھا کہ وہ پوری طرح ایکسپوز ہو جائے گا اور اسے اپنا برسوں کا بنا بنایا سیٹ اپ ختم کر کے نئے سرے سے قدم جمانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے یہاں سے باہر نکل جانا پڑتا۔ کیونکہ ایک سرا ہاتھ میں آنے کے بعد یہاں کی ایجنسیاں اسے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ وہ تو کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھتی پھرتیں۔

فکروں اور پریشانیوں کے باوجود اس نے بہت مہارت سے گاڑی روکی اور وہ تینوں پھرتی سے باہر نکل کر دائیں طرف کے جھنڈ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے بھی انہیں جھنڈ میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہو اور خود بھی ان کے تعاقب میں وہاں چلے آئیں۔ پولیس والوں کی عددی برتری اس صورت میں ان کے لیے مسئلہ بن سکتی تھی لیکن اس کے سوا فی الحال ان کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''ہمیں یہاں سے شمال کی طرف بھاگنا ہے۔ وہاں سے ایک ریلوے لائن گزرتی ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم وہاں سے گزرنے والی کسی گاڑی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

بھاگتے بھاگتے کلام نے انہیں آگاہ کیا تو انہیں سمجھ آیا کہ اس نے خصوصیت سے دائیں طرف کے جھنڈ میں گھسنے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ وہ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اس لیے سارے حواس کسی وحشی جانور کی طرح چوکنے تھے۔ ان چوکنے حواسوں کے ساتھ انہوں نے پہلے گاڑیوں کے بریک لگنے کی آوازیں سنیں اور پھر ان آوازوں پر ٹرین کی تیز وِسل حاوی ہوتی چلی گئی۔

''جلدی کریں، کوئی گاڑی جنکشن کو چھوڑ کر اس طرف آنے والی ہے۔ اس وقت اس کی رفتار تیز نہیں ہو گی اس لیے ہم اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' کلام نے چیخ کر انہیں آگاہ کیا اور اپنی رفتار کو کچھ اور بڑھا دیا۔

ان دونوں نے بھی یہی کیا اور عین اس وقت تک ریلوے لائن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھیمی رفتار میں وہاں سے گزر رہی تھی۔

ان کے اندازوں کے برعکس وہ کوئی مسافر ریل گاڑی نہیں تھی بلکہ مال گاڑی تھی۔ یہاں وہ ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور اپنی اپنی مہارت اور پھرتی سے کام لے کر اپنے طور پر اس مال گاڑی پر چڑھنا تھا۔

تینوں نے اللہ کا نام لیا اور چھلانگ لگا دی۔ تینوں ہی تربیت یافتہ تھے اس لیے ذرا سی مشکل سے سہی، اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

مال گاڑی پر چڑھنے کے لیے انہوں نے دو ڈبوں کے درمیان چھوڑی جانے والی وسیع جگہ کا انتخاب کیا تھا اس لیے فوراً ہی فرش سے چپک کر لیٹ گئے۔ بیٹھنے یا کھڑے رہنے کی صورت میں دُور سے انہیں دیکھ لیے جانے کا امکان تھا۔ ان تینوں کے اضافے سے بے نیاز مال گاڑی اپنے سفر پر گامزن رہی۔ اپنی جگہ لیٹے لیٹے بھی وہ دیکھ سکتے تھے کہ جھنڈ میں کئی ٹارچوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ یہ جگنو انہیں تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو لحہ بہ لحہ رفتار پکڑتی مال گاڑی کے ساتھ ان کی پہنچ سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ پناہ گاہ عارضی ہے اور اب نہ جانے انہیں کب تک اور کتنا بھاگنا ہے۔

⊛----✪----⊛

''میں نے تمہاری فراہم کردہ معلومات کے متعلق اچھی طرح چھان بین کروائی ہے۔ اشفاق رانا نے تمہیں پامیلا نامی جس عورت کے بارے میں بتایا تھا، کچھ حوالوں کے باعث ہم اس کی اصلیت تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ سب سے اہم حوالہ میرج بیورو کا تھا۔ کچھ عرصہ قبل شہر میں ہونے والے بم دھماکوں کا سراغ لگاتے ہوئے پولیس اس میرج بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن انہیں وہاں تک پہنچنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی اور یہ عورت وہاں سے اپنا سیٹ اپ ختم کر کے فرار ہونے میں کامیاب رہی تھی۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ کچھ عرصہ شہریار عادل کی بیوی بن کر رہنے والی ڈاکٹر ماریہ نے اپنے آخری بیان میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اور اس کی ماں ''را'' اور ''موساد'' کی ڈبل ایجنٹ ہیں اور پامیلا بن کر امراء کے طبقے میں گردش کرنے والی عورت دراصل ڈاکٹر ماریہ کی ماں سنتھیا جوزف ہی تھی۔ بیٹی کی موت کے بعد وہ مسلسل منظر سے غائب ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی لاش وصول کرنے کے لیے بھی کسی قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کچھ اس قسم کے ثبوت بھی ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنتھیا کے ریاض انور سے بھی تعلقات تھے لیکن ظاہر ہے اب ریاض انور مر چکا ہے اس لیے ہم اس سے کچھ بھی نہیں معلوم کر سکتے۔''

ذیشان نے اپنی طرف آس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جاوید علی کو سنجیدگی سے ان تفصیلات سے آگاہ کیا جو اس نے اشفاق رانا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں جمع کی تھیں۔

''میں نے آپ کو رانا سے حاصل ہونے والا ایک نمبر بھی تو دیا تھا، اس سے کوئی سراغ نہیں ملا؟'' جاوید علی کے پاس ابھی ایک اُمید باقی تھی۔

''تم نے شاید اس نمبر پر غور نہیں کیا۔ وہ بڑا عجیب نمبر ہے اور ہمارے ملک میں استعمال ہونے والی کسی بھی موبائل سروس سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے اس نمبر پر کال کر کے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن بیل جانے کے باوجود کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ رانا کے موبائل سے کال کر کے دیکھتے۔ ہوسکتا ہے وہ اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہ کرتا ہو۔'' اس نے تیزی سے مشورہ دیا۔

''پہلے میں نے رانا کا نمبر استعمال کیا تھا لیکن اس کے باوجود کال ریسیو نہیں کی گئی اور اب تو اس کی موت کی خبر منظر عام پر آ گئی ہے۔ اس ایئر ہوسٹس شاہین نے پولیس اور میڈیا والوں کو سب بتا دیا ہے کہ کس طرح دو افراد نے زبردستی اس کے فلیٹ میں گھس کر اسے اور رانا کو بے بس کیا اور پھر اسے علیحدہ کمرے میں بند کر کے رانا سے تنہائی میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ ان حالات میں اب ہمارے لیے کسی طور رانا کا نمبر استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارا دشمن جتنی جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہے، کچھ بعید نہیں کہ اسے ٹریس کرنے کے چکر میں ہم خود پھنس جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ سنتھیا کے موبائل پر یہ سہولت بھی موجود ہو کہ وہ کال کرنے والے کی لوکیشن سے آگاہ ہو سکے۔'' اس نے جاوید علی کو صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی۔

''اشفاق رانا کا موبائل ریکارڈ..... اس سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوا کیا؟''

''نہیں۔'' ذیشان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''وہ جس موبائل کمپنی کی سروسز استعمال کر رہا ہے اس نے ہمیں اس کا پورا ڈیٹا فراہم کر دیا ہے لیکن اس مخصوص نمبر سے آنے یا اس پر کی جانے والی کالز کے متعلق اس کے پاس کسی قسم کا ڈیٹا نہیں ہے۔''

''یعنی ہم ایک بار پھر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔'' پُرجوش سے جاوید علی کو مایوسی نے آ گھیرا۔

''بی بریو جوان! ہمارے پروفیشن میں بہت بار ایسا مقام آتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے لیکن ہم اپنی ہمت ٹوٹنے نہیں دیتے اور اس اندھیرے میں ہی اپنے لیے روشنی کی کوئی کرن ڈھونڈ نکالتے ہیں۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی۔ جسے اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا اور اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی فی الحال تو اسے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری محنت اکارت چلی گئی ہو۔ اس گم سم سی کیفیت میں وہ اس کمرے میں جا پہنچا جہاں آج کل عالیہ کا قیام تھا۔ ابتدا میں عالیہ کے بارے میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ اسے وہ لوگ اس طرح استعمال کریں جیسے دوسرے ملکوں کی سیکرٹ سروسز عورتوں کو استعمال کرتی ہیں۔ عورت نامی نرم و نازک ہتھیار کے ذریعے وہ بڑے بڑے سورماؤں کو زیر کر لینے کے ہنر سے واقف تھے۔

عالیہ جیسی تجربہ کار عورت یہ کام بہت خوبی سے انجام دے سکتی تھی لیکن ذیشان سمیت کسی نے بھی اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ ایک تو وہ عورت کے اس استعمال سے ہی متفق نہیں تھے، دوسرے مجبوری میں گناہوں کی دلدل میں پھنس جانے والی عالیہ کو اگر وہ بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرنے لگتے تو یہ اس کے ساتھ سخت زیادتی ہوتی۔ چنانچہ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ ہونے تک فی الحال اسے یہیں رکھا گیا تھا۔ ویسے بھی ابھی اس کا باہر نکلنا اس کے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔

''کیا بات ہے..... بڑے اُداس لگ رہے ہو؟'' اسے اپنے سامنے پا کر عالیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں دریافت کیا۔

''ناکامی، اُداسی ہی لاتی ہے۔ تم سے ملنے والا اشفاق رانا کا کلیو بھی ہمارے کسی کام نہیں آ سکا۔ اس سے سب کچھ اُگلوانے کے باوجود ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے تھے۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اسے خود بخود ہی ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔

چند روز قبل قابلِ نفرت ٹھہرنے والی عالیہ سے اس عرصے میں اسے کچھ اُنسیت ہو چلی تھی اور اب وہ پہلے جتنی بری نہیں لگتی تھی بلکہ وہ اس کی مجبوریوں کو سمجھنے لگا تھا۔ بنیادی طور پر وہ بری لڑکی نہیں تھی، بس حالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے اسے برا بنا دیا تھا اور اب موقع ملا تھا تو واقعی شریف زادیوں کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یہاں اتنی بڑی تعداد میں موجود مردوں میں سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی لیکن اب تک ایسی کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔

''ہوں.....تو یہ بات ہے۔ غلطی تم میں سے کسی کی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں ہر کام کا ایک طریقہ مقرر ہے۔ ہوسکتا ہے رانا سے تمہیں جو نمبر ملا ہے، اس پر رابطے کے لیے بھی کوئی طریقِ کار مقرر ہوتا کہ کوئی غیر متعلق شخص مداخلت نہ کر سکے۔ یہ طریقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کال سے پہلے کوئی مخصوص کوڈ ایس ایم ایس کرنا یا مقررہ تعداد میں مس کال دینا وغیرہ۔ اور ظاہر ہے، یہ بات وہی شخص جانتا ہوگا جسے یہ نمبر فراہم کیا گیا ہے۔''

''تمہارے پاس بھی تو ایمرجنسی میں رابطے کے لیے کوئی صورت ہوگی۔'' جاوید علی کے دل میں اُمید کی کرن جاگی۔

''میرے پاس صرف ایک صورت ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر کبھی مجھے روپوش ہونے کی ضرورت پیش آئے تو میں انگریزی کے اخبارات کے کلاسیفائیڈ پیج پر ایک مخصوص اشتہار مسلسل تین دن تک چھپواؤں اور اس اشتہار کے ساتھ اپنا رابطہ نمبر بھی دوں۔ اس طرح وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ خود مجھ تک پہنچ کر میری مدد کی کوشش کریں گے۔'' اس کے سوال پر عالیہ نے اسے آگاہ کیا۔

''یہ تو بہت عجیب طریقِ کار ہے۔ اس طریقے سے تو کبھی تمہاری فوری مدد نہیں ہوسکتی۔'' اس کی بات سن کر جاوید علی نے اعتراض کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ میں اور مجھ جیسی دوسری لڑکیاں ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے فکرمند ہوں۔ میں اگر اپنی جان سے بھی چلی جاؤں گی تو کیا ہوگا؟ وہ میری جگہ کوئی دوسری لے آئیں گے۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تلخ حقیقت بیان کی۔

''یعنی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اشتہار کے جواب میں ان کی طرف سے کوئی رسپانس نہ آئے۔'' جاوید علی پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''ہوتو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں ہوگا نہیں۔ اُنہیں تجسّس ہوگا کہ میرے اتنے دن کے غیاب کے بارے میں جان سکیں۔ اگر وہ یہ سمجھ بھی گئے کہ میں نے یہ اشتہار اُن کے مخالفین کی مدد کے لیے دیا ہے تو بھی وہ میرے ذریعے آپ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ میری حیثیت تو دونوں طرف کے لوگوں کے لیے چارے کی سی ہے جس کے ذریعے اپنا اپنا شکار کھیلنے کی کوشش کی جائے گی۔'' وہ یک دم ہی اُداس ہوگئی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو عالیہ! کم از کم ہمارے لوگ اتنے خودغرض نہیں ہیں کہ تمہارے تحفظ کا خیال رکھے بغیر تمہیں استعمال کریں۔ اشتہار دینے یا نہ دینے کے سلسلے میں تم مکمل آزاد ہو۔ ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرے گا۔ البتہ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اشتہار میں تمہارا جو رابطہ نمبر دیا جائے گا، وہ کسی ایسی جگہ کا ہوگا جہاں تم موجود نہیں ہوگی۔ تم یہیں بیٹھے بیٹھے اس نمبر پر آنے والی کالز ریسیو کرو گی اور اتنی سمجھ دار تو تم ہو کہ یہ سمجھ سکو کہ ہم اپنے اتنے اہم ٹھکانے کا پتہ کسی دشمن کی نظر میں نہیں آنے دے سکتے۔'' جاوید علی کو اس کی بات نے صدمہ پہنچایا تھا اس لیے وہ ذرا جذباتی لہجے میں اسے وضاحت دینے لگا۔

''سوری جاوید! میں نے تمہارا دل دُکھایا۔ لیکن تم بھی میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب تک کی

زندگی میں میرا جن لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، وہ سب ایسے تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے میرا انسانوں کے خلوص پر سے اعتماد ختم ہوگیا ہے۔ اس اعتماد کو بحال ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔'' عالیہ زمانہ شناس لڑکی تھی اس لیے اس کی کیفیت کو فوراً بھانپ گئی۔

''ہمارے ساتھ رہو گی تو انشاء اللہ جلد یہ اعتماد بحال ہو جائے گا۔'' جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا تو عالیہ اس کے سادہ سے چہرے پر پھیلی شفاف مسکراہٹ کو دیکھتی رہ گئی۔ اتنا تجربہ تو وہ رکھتی تھی کہ جان سکے کہ ایسی شفاف مسکراہٹ انہی چہروں پر بکھرتی ہے جو بے ریا دل رکھتے تھے۔

⊛----✪----⊛

''آپ کمال کے میزبان ہیں اشوک صاحب! آپ نے تو دو راتوں میں ہی میرا دل خوش کر دیا ہے۔ آپ کی یہ میزبانی مجھے ساری عمر یاد رہے گی۔ میری طرف سے آپ کو دعوت ہے کہ آپ بھی پاکستان آئیں۔ ہم نے بھی آپ کی میزبانی کا حق نہ ادا کر دیا تو بولیے گا۔''

چودھری کی پچھلی رات بالی وڈ کی ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ گزری تھی اس لیے وہ بہت ہی ترنگ میں تھا۔ بھارت کا یہ دورہ اس کے لیے ہر اعتبار سے خوش کن ثابت ہوا تھا۔

پہلی خوشی تو اسے اس وقت حاصل ہوئی تھی جب لِنڈا نے اسے اطلاع دی تھی کہ تنظیم اسے اہم میٹنگ کے سلسلے میں بھارت کے دورے پر بھیج رہی ہے۔ اس اطلاع نے اس کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کو بحال کر دیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ تنظیم نے بالآخر اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

بھارت پہنچنے پر اشوک کی طرف سے اُس کا پُرجوش استقبال ہوا تھا اور ان دو دنوں میں اس نے دل کھول کر اس کی خاطر مدارات کی تھی۔ اس وقت بھی وہ لوازمات سے بھری ناشتے کی ٹیبل پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے اور خوشی چودھری کے بشرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''دھنّے واد چودھری صاحب! کبھی یہاں کے دھندوں سے مہلت ملی تو آپ کے نیوتے کو ضرور یاد رکھوں گا۔ ابھی تو آپ ہماری میزبانی کا مزہ لیجئے اور جو من چاہے بس اس چیز کی طرف اشارہ کر دیجئے۔ بالی وڈ کی کوئی ہیروئن ایسی نہیں جسے ہماری طرف سے سندیش ملے اور وہ آنے سے انکار کر دے۔ ہمارے حکم پر تو سالی کسبیاں شوٹنگ چھوڑ کر بھی آنے پر مجبور ہیں۔''

اشوک نے شاہانہ انداز میں اسے پیشکش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ چودھری کو اپنے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن جن لوگوں کی طرف سے اسے بھیجا گیا تھا، ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھا۔ چودھری کی بڑھ چڑھ کر کی جانے والی مہمان نوازی میں بھی جہاں ایک طرف اوپر والوں کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا، وہیں وہ چودھری کو خود سے متاثر کر کے مرعوب کرنا چاہتا تھا اور چودھری کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہے۔

اس کی شخصیت بھی اپنی جگہ بارعب اور متاثر کُن تھی۔ وہ لگ بھگ پینتالیس سال کا مضبوط جسم رکھنے والا مرد تھا جو ہمیشہ قیمتی ٹو پیس سوٹ زیبِ تن کرتا تھا۔ اس کے گلے میں کافی بھاری سونے کی زنجیر رہتی تھی اور بائیں ہاتھ کی کلائی میں ننھے ننھے ہیرے جڑا موٹا سا سونے کا کڑا موجود تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے جو کہ ایک اسٹائل سے پائپ پیتے ہوئے اور بھی نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ پائپ میں جو تمباکو استعمال کرتا تھا، اس کی مہک خود اس کے امپورٹڈ ہونے کا اعلان کرتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ شہر کے کی ہوٹلوں اور سپر مارکیٹس کا مالک تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا بزنس دبئی تک پھیلا ہوا ہے اور فلم انڈسٹری میں بھی اس کا کثیر سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ٹاپ ہیرو ہیروئن سے لے کر پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز اور ڈسٹری بیوٹرز تک سب جھک کر اسے نمسکار کہتے تھے اور وہ مزے سے سب پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ اس کے اصل دھندوں کو بھی سب جانتے تھے لیکن کوئی نہیں تھا جو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکے۔ پولیس اہلکاروں سے لے کر بڑے بڑے عہدے داروں اور وزراء سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ وہ سب کو خوش رکھتا تھا اور سب اس سے صرف نظر کرتے تھے۔

''کاروباری معاملات تو ہمارے درمیان تقریباً طے ہی ہو گئے ہیں۔ اب آپ حکم فرمائیے کہ آج کے دن آپ نے میرے لیے کیا پروگرام طے کیا ہے؟'' جوس کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے چودھری نے خوشگوار موڈ میں بے تکلفی سے دریافت کیا۔

دوپہر کے بعد میں آپ کو اس جگہ لے چلوں گا جہاں آپ کا مال پیکنگ کے لیے تیار ہے۔ آپ مال کو ایک نظر دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیجئے گا پھر میں اس کی پیکنگ شروع کروا دوں گا۔ دوپہر تک آپ فارغ ہوں گے۔ چاہیں تو یہیں ٹھہر کر آرام کریں یا اگر کچھ اور خواہش ہو تو اس آدمی کو بتا دیں جسے میں نے آپ کی خدمت کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔ میں البتہ اس دوران یہاں موجود نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پولیس آفیسر کو دیکھنے ہسپتال بھی جانا ہے۔ کل رات اس بے چارے کو اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی نکلی کہ اتفاقاً ایک پولیس پارٹی کے ہاتھ لگ گیا۔ سنا ہے سالا خاصا زخمی ہوا ہے اس لیے اسے دیکھنے جانا ضروری ہے۔'' اشوک نے اس کے سامنے اپنا پورا پروگرام رکھ دیا۔

''ایسا کرتا ہوں کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہسپتال چلتا ہوں۔ اس کے بعد وہیں سے کہیں گھومنے پھرنے نکل جاؤں گا۔ آپ آگے اپنے کام نمٹا لیجئے گا۔ دوپہر کے کھانے پر ہم دوبارہ یہاں اکٹھے ہو جائیں گے۔'' چودھری نے اپنا پروگرام بتایا جس سے اشوک نے اتفاق کیا۔

دس منٹ بعد وہ اشوک کے محل نما مکان سے روانہ ہوئے تو جس بڑی سی گاڑی میں وہ دونوں سوار تھے، اس کے علاوہ بھی دو گاڑیاں ان کے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں اشوک کے ذاتی محافظ سوار تھے جبکہ دوسری گاڑی باوردی ڈرائیور اور گارڈ سمیت چودھری کے لیے مخصوص تھی تاکہ وہ ہسپتال سے جہاں جانا چاہے، جا سکے۔

ہسپتال میں انہیں جس کمرے میں جانا تھا، اس کے دروازے پر باوردی پولیس اہلکار تعینات تھے لیکن انہوں نے اشوک سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے ادب سے نمسکار کرنے کے ساتھ ہی پھرتی سے اس کے لیے دروازہ بھی کھول دیا۔

اشوک اپنے محافظوں کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے چودھری سمیت کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ایک خوب صورت سی نرس ڈیوٹی پر موجود تھی جو اشوک کو دیکھ کر یوں اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

''باہر جاؤ بے بی! جب تک ہم ادھر ہیں، تمہاری چھٹی ہے۔'' اشوک نے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''نمسکار اشوک صاحب! آپ نے مجھے بڑا مان دیا کہ میری خاطر یہاں تک چلے آئے۔'' بستر پر دراز

مریض بھی اس دوران اُٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے کہنے لگا۔

''ہم اپنے دوستوں کا پورا خیال رکھتے ہیں پریم ناتھ! تم ہماری اتنی سیوا کرتے ہو، ہم کیسے تمہیں دیکھنے یہاں نہ آتے؟'' اشوک نے باوقار لہجے میں جواب دیا۔

جواب دینے سے قبل وہ چودھری کو لے کر اس نرم و گداز صوفے پر بیٹھ چکا تھا جو ہسپتال کے اس وی آئی پی روم میں آنے والے خاص مہمانوں کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔'' پریم ناتھ نے اس خوشامدی کتے کی طرح کہا جو ہڈیوں اور چھیچھڑوں کے لیے اپنے مالک کے تلوے چاٹتا ہے۔

''یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حال کس نے کیا؟ کہیں یہ بھائی جی کے غنڈے تو نہیں تھے جنہوں نے ہمارے ایک وفادار پر ہاتھ ڈال کر ہمیں چھیڑنے کی کوشش کی ہو؟'' اشوک نے گمبھیر لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''نہیں اشوک صاحب! یہ دوسرا قصہ ہے۔'' پریم ناتھ نے اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اس کے ساتھ بیٹھے چودھری کی طرف دیکھا۔

''اوہ..... ہم ان سے تمہارا تعارف تو کروانا بھول ہی گئے۔ یہ ہمارے ایک پاکستانی دوست چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔ انہیں پتہ چلا کہ ہم اپنے ایک زخمی دوست کو دیکھنے ہسپتال جا رہے ہیں تو یہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ گئے۔''

اشوک نے اس کی نظروں کا زاویہ دیکھتے ہوئے چودھری کا تعارف کروایا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر چودھری کو نمستے کہا اور پھر عاجزی سے بولا۔

''بہت بہت دھنے واد چودھری صاحب! کہ آپ نے میری اتنی پروا کی۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اشوک صاحب کے دوست ہیں تو پھر میرے بھی دوست ہی ہوئے۔'' چودھری نے بڑے تدبر سے اسے جواب دیا۔

''ہاں تو پریم ناتھ! تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا اور کس نے تمہاری یہ حالت بنائی؟'' اشوک نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار پریم ناتھ نے ذرا تذبذب کے عالم میں چودھری کی طرف دیکھا۔

''ان سے کوئی پردے داری نہیں ہے پریم ناتھ!..... یہ ہمارے دوست ہیں۔'' اشوک نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی تو اسے چار و ناچار زبان کھولنی پڑی۔ کیونکہ اشوک کی حکم عدولی کرنا بھی اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

''یہ قصہ میرے ممبئی آنے سے پہلے شروع ہوا تھا۔ میں نے ایک زمیندار کے کہنے پر اس کے پاکستان سے آئے ہوئے بھانجے کو ایک کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ مار پیٹ کے دوران اُس نے یہ اُگل دیا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جو حیاتیاتی ہتھیاروں پر ریسرچ کر رہا ہے۔ مجھے وہ کام کا بندہ لگا اور میں نے فوراً ''را'' والوں سے سودے بازی کر کے اسے ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس کا کیا، کیا؟ اس کی تو مجھے جانکاری نہیں لیکن مجھے یہاں ممبئی میں میری مرضی کی پوسٹنگ مل گئی۔ کل رات جب میں اپنے گھر سے نکل کر کلب جا رہا تھا تو راستے میں کچھ لوگوں نے میری گاڑی کو گھیر کر میرے گارڈ کو زخمی کر دیا اور مجھے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں اور ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنایا لیکن اتفاق سے اسی وقت اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپارٹمنٹ بلڈنگ پر پولیس نے بھائی جی کے چند ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر ریڈ کر دیا۔ وہ لوگ مجھ سمیت افراتفری میں بھاگے لیکن پولیس ان کے پیچھے لگ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ گاڑی میں فرار مشکل ہے تو ایک جگہ گاڑی روک کر درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے اور وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس نے ان کی چھوڑی ہوئی گاڑی کی تلاشی لی تو ڈکی میں سے ایک سوٹ کیس میں، میں بند زخمی حالت میں مل گیا اور انہوں نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔ اسی لیے میں اس سے آپ کے سامنے زندہ بیٹھا ہوں۔ ورنہ یا تو دم گھٹنے سے مر جاتا یا ابھی تک ان کا ٹارچر سہہ رہا ہوتا۔'' پریم ناتھ نے اختصار کے ساتھ پوری کہانی سنا ڈالی۔

''ہوں..... تو یہ چکر تھا۔ ورنہ کل رات تو بھائی جی کا وہ پٹھا عبدل پکڑا ہی جاتا۔ میرے آدمیوں نے ہی پولیس کو خبر دی تھی کہ عبدل اس بلڈنگ میں موجود ہے جو ایک پارٹی کے ساتھ اسلحے کی بڑی ڈیلنگ کر رہا ہے۔'' اس کی کہانی سن کر اشوک نے گویا کوئی گتھی سلجھائی۔

''چکر تو یہی ہے اشوک صاحب! لیکن میں بڑے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ وہ تینوں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور دوبارہ کبھی بھی مجھ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' پریم ناتھ کچھ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

''فکر نہ کرو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے اپنے کچھ بندے بھیج دوں گا۔ پھر تمہارا پولیس ڈیپارٹمنٹ بھی تو ہے نا۔ کیا انہوں نے اتنی دیر میں کڈنیپرز کا اتا پتہ معلوم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا؟''

''پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ جس گاڑی سے مجھے نکالا گیا تھا، اس کے مالک کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس کا نام کلام تھا اور وہ ایک فلیٹ میں اکیلا کرائے پر رہتا ہے۔ مجھے جہاں لے جایا گیا تھا، وہ اپارٹمنٹ بھی اسی کی ملکیت ہے لیکن وہ کل سے غائب ہے۔ میرے محکمے کے لوگ اس کے بارے میں مزید انفارمیشن اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں اس بات کا وشواس ہو گیا ہے کہ وہ کوئی پاکستانی جاسوس تھا جو یہاں رہ رہا تھا۔'' اس نے اشوک کی بات کا جواب دیا۔

''او کے، یہ تم لوگوں کا پرابلم ہے کہ ان مجرموں کی گرفتاری کے لیے تمہارا ڈیپارٹمنٹ کیا کرتا ہے۔ مجھے تو بس اسی بات کا دکھ ہے کہ بھائی جی کی ناک کا بال عبدل پھر بچ نکلا۔ لگانے کو تو میرے آدمی بھی اسے ٹھکانے لگا دیں لیکن پولیس کے ہاتھ لگ کر اس کی جو رُسوائی ہو گی، اس کا مزہ ہی الگ ہے۔ خیر..... ابھی نہیں تو پھر کبھی وہ سالا چھری تلے آئے گا تو ضرور پھر ہم گن گن کر اپنے بدلے لیں گے۔''

وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تو چودھری نے بھی اس کی پیروی کی۔ پریم ناتھ بھی اپنے زخموں کو بھول کر بستر سے نیچے اُتر آیا۔

''ہم جا رہے ہیں۔ تم آرام کرو۔'' اشوک نے پریم ناتھ سے کہا اور شاہانہ انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری بھی اس کے ساتھ تھا۔ اشوک کے ان ٹھاٹھ باٹھ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے اپنے سامنے بھی جھکنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی لیکن اشوک کی بات ہی الگ تھی۔ نہ اس کی دولت کا شمار تھا اور نہ اختیارات کی حد۔ وہ یہاں رہ کر اشوک کی ایک ایک حرکت اور انداز کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ طے کرتا جا رہا تھا کہ واپس جا کر خود اسے کیا کیا اقدامات اُٹھانے ہوں گے جن سے اس کا اسٹیٹس اور بھی بلند ہو سکے۔

⊛----✪----⊛

حسبِ پروگرام جگو بازار میں بوچاٹ والے کے اسٹال پر چاندنی اور شاہد سے ملا اور انہیں اپنی کار میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس موقع پر چاندنی کچھ سہمی ہوئی تھی جبکہ شاہد بے یقینی کا شکار نظر آتا تھا۔ اس نے راستے میں جگو سے کئی ایسے سوال کیے جن سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگو کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہے۔ جواب میں جگو نے صرف اتنا کہا کہ وہ انہیں جہاں لے جا رہا ہے، وہاں پہنچ کر ان پر اس کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر یوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا ہو۔

جگو نے راستے میں عمیر کو اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کیا اور اس کی ہدایت پر انہیں دفتر کے بجائے اس کے بنگلے پر لے گیا۔ یہ بنگلہ اب بھی اسی طرح سجا ہوا تھا جیسے شہریار کے دور میں تھا۔ اگرچہ شہریار نے اپنے ذاتی خرچے پر بنگلے کو آراستہ کیا تھا لیکن لیاقت رانا نے وہاں سے کسی بھی شے کو ہٹانا پسند نہیں کیا تھا۔ عمیر یہاں آیا تو اسے نفاست اور سادگی سے کی ہوئی یہ سیٹنگ بہت پسند آئی لہٰذا اس نے یہاں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عمیر نے بنگلے کے لاؤنج میں ان تینوں کا استقبال کیا۔

''آپ لوگوں کو سفر میں کوئی پریشانی تو پیش نہیں آئی؟'' شاہد سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے با اخلاق لہجے میں دریافت کیا۔

''نو سر! ہم بہت آرام سے یہاں پہنچے ہیں۔'' شاہد نے مرعوبیت سے جواب دیا۔ اتنا پڑھا لکھا تو وہ بہر حال تھا کہ بنگلے کے باہر لگی تختی پڑھ کر یہ جان سکے کہ لانے والے نے ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا ہے۔

''گڈ۔ اب آپ لوگ چاہیں تو فریش ہو جائیں۔ بیس منٹ بعد کھانا لگ جائے گا۔ کھانے کے بعد ہم آپس میں بات چیت کریں گے۔'' نرمی سے نپے تلے لہجے میں بولتا ہوا وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

دوبارہ ان کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تو عمیر نے دیکھا کہ اگرچہ انہوں نے منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لیے تھے لیکن جسم پر کپڑے وہی تھے جو پہن کر وہ یہاں آئے تھے۔ یکدم ہی اسے اپنی غفلت کا احساس ہوا۔ وہ دونوں یہاں خالی ہاتھ آئے تھے۔ انہیں جس انداز میں فرار ہو کر یہاں آنا پڑا تھا، اس میں کپڑے ساتھ لانے کی گنجائش کہاں تھی؟ ہاں، یہ ممکن تھا کہ لڑکی اپنے پرس میں تھوڑی بہت نقدی یا زیورات لے آئی ہو۔ بہر حال اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''اس وقت تو یہاں کا بازار بند ہو چکا ہو گا، کل ڈرائیور کے ساتھ جا کر تم دونوں اپنے کپڑوں اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی خریداری کر لینا۔'' کھانے کے دوران اس نے ان سے یہ مختصر بات کی جس میں آپ جناب کا تکلف ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس سے اتنے چھوٹے تھے کہ اس تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''ہم اپنا سامان اس لیے ساتھ نہیں لائے کہ پھر بائی جی کو ہم پر شک ہو جائے گا لیکن رقم ہے ہمارے پاس۔ ہم اپنی ضرورت کا سامان خود خرید لیں گے۔'' چاندنی نے اپنی بے سروسامانی کی وضاحت پیش کرتے ہوئے خودداری کا علم بلند رکھنا چاہا۔

''اپنے پاس موجود رقم تم سنبھال کر رکھو۔ بعد میں کام آئے گی۔ تم دونوں مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔ اور یہ طے ہے کہ جب تک تم دونوں یہاں ہو، تمہارے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔'' عمیر نے نہایت رسان سے لیکن فیصلہ کن لہجے میں اپنا حکم سنایا جس کے بعد ان دونوں کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی اور وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

کھانے کے بعد عمیر انہیں اپنے ساتھ اسٹڈی میں لے گیا۔ کسی اہم گفتگو کے لیے وہ جگہ خاصی مناسب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ جگو ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اسے لاہور واپس جانے کی جلدی تھی اس لیے اس نے کھانے میں شرکت سے معذرت ظاہر کر کے اجازت لے لی تھی چنانچہ اس وقت اسٹڈی میں بس وہ تین افراد ہی تھے۔

''چودھری افتخار عالم شاہ بارسوخ آدمی ہے اور دوسرے بارسوخ افراد کی طرح قانون شکنی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ ہم کافی عرصے سے کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے گرد دائرہ تنگ کر سکیں لیکن ہر بار ہی وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلتا ہے۔ مینا کا کیس سامنے آنے کے بعد ہم نے اس کے ورثا کو اس لیے تلاش کیا ہے کہ ان کی مدعیت میں چودھری کے خلاف کیس درج کیا جا سکے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں شاہد کی صورت میں ایک وارث کے علاوہ گواہ کی حیثیت سے تم بھی مل گئی ہو اور یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ جان لو کہ یہ کیس اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا سا رُکا اور ان دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

''تم دونوں بس آج رات ہی میرے مہمان رہو گے۔ کل صبح تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے بعد تم دونوں کو ایک دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کسی قسم کا تعلق ظاہر نہ ہو۔ آج کے بعد تم دونوں سے بس ایک وکیل ہی رابطہ رکھے گا۔ اس وکیل کی فیس وغیرہ میرے ذمے ہو گی اور تم لوگوں کے ضروری اخراجات بھی۔ کسی انتہائی ضرورت کے تحت ہی تم دونوں میں سے کوئی مجھ سے رابطہ کرنے کا حق دار ہو گا، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مجھ سے براہِ راست رابطہ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کے سامنے میرا ذکر کرنا۔'' عمیر نے بولتے بولتے پہلو بدلا اور ذرا سا توقف کے بعد گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

''میرا جو آدمی تم دونوں کو لے کر یہاں آیا ہے، اس نے مجھے تمہارے بارے میں پہلے ہی سے معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تم دونوں نے کوٹھے پر پرورش ضرور پائی ہے لیکن ابھی بہت کم عمر اور ناتجربہ کار ہو اس لیے میں تمہیں اس کیس کی بعض نزاکتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہیں دو طرح کے دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک چندا بائی کے کوٹھے سے بھاگ کر تم نے اسے ویسے ہی نقصان سے دوچار کیا ہے، اوپر سے جب یہ کیس کھلے گا تو اس پر بھی لالچ کے باعث قتل کو چھپانے کا الزام عائد ہو گا۔ دوسری طرف چودھری کی بھی کوشش ہو گی کہ مدعی اور گواہ دونوں پر دباؤ ڈال سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ دھمکیوں سے لے کر قاتلانہ حملے تک کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے۔ دشمنوں کی طرف سے ایک اوچھا ہتھکنڈا یہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُلٹا تم دونوں کو حدود کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کریں۔ اس وار سے بچنے کا سیدھا سادھا اور پیشگی حل یہ ہے کہ فوری طور پر تم دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ رضامند نہ ہونے کی صورت میں، میں تم دونوں کے لیے الگ الگ قیام گاہوں کے بندوبست کی کوشش کروں گا۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تمہارا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ مل جل کر ایک دوسرے کی حفاظت کر سکو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس بار اس کا رُوئے سخن شاہد کی طرف تھا۔

''میں آپ کی ساری باتوں سے متفق ہوں سر!..... اگر چاندنی کو اعتراض نہ ہو تو میں پہلی فرصت میں اس سے نکاح کے لیے راضی ہوں۔'' شاہد نے پہلی بار اس کے سامنے لب کشائی کی۔

''میں راضی ہوں سر!'' چاندنی کی طرف سے دھیمی آواز میں فوراً جواب آیا۔ عمر میں شاہد سے ایک ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے باوجود اس وقت وہ کسی عام گھریلو لڑکی کی طرح شرمائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، یہ کام تو کل تمہارے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے انجام پا جائے گا لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کہیں کسی دباؤ سے گھبرا کر تم لوگ اس کیس سے بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟'' عمیر نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر! کئی دن کانٹوں پر گزارنے کے بعد مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اپنی بہن کے قاتل کو انجام تک پہنچانے کے لیے کچھ کر سکوں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں خود کو اس کیس سے علیحدہ کر سکوں۔'' شاہد نے بڑے عزم سے جواب دیا۔

''مجھے ہر قدم پر آپ شاہد کے ساتھ ہی کھڑا پائیں گے۔'' عمیر کی سوالیہ نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے چاندنی نے بھی یقین دہانی کروائی۔

''گڈ..... یہی اسپرٹ باقی رہی تو چودھری اپنے انجام تک ضرور پہنچے گا لیکن فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ چودھری پاکستان میں موجود نہیں ہے اور سیر و سیاحت کے ویزے پر بھارت گیا ہوا ہے۔ ہم کارروائی تو کل ہی سے شروع کر دیں گے لیکن ظاہر ہے اصل میں اس کیس میں گرما گرمی اس وقت آئے گی جب چودھری واپس پاکستان پہنچے گا۔ میری کوشش ہو گی کہ یہ بات لیک آؤٹ نہ ہونے پائے کہ یہاں اس پر مینا کے قتل کا کیس چلانے کی تیاری ہو چکی ہے۔ میرے کچھ روابط ایسے ہیں جن کے ذریعے ہمیں چودھری کی بھارت سے روانگی کی خبر مل سکتی ہے۔ خبر مل گئی تو ہم اسے ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کروا دیں گے۔ پھر انشاء اللہ! چودھری کو قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر اس کیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چودھری کی واپسی تک تم لوگ تقریباً فارغ ہی رہو گے، سو اس عرصے میں اطمینان سے ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے کرنا۔''

اس نے جان بوجھ کر آخر میں ایک شوخ جملہ بول کر ماحول پر چھائے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی شرمیلی سی مسکراہٹ نے بتایا کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام نہیں رہا ہے۔ دل ہی دل میں اُس کی اس مسکراہٹ کے قائم رہنے کی دعا کرتے ہوئے وہ محفل برخاست ہونے کا اعلان کر کے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

⊛----✪----⊛

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ تم اکیلی چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاؤ لیکن مجبوری یہ ہے کہ آج میرا اسٹور پر رہنا ضروری ہے۔ مصطفیٰ بھائی آج کل سائٹ پر ہیں ورنہ وہ ہوتے تو مجھے چھٹی کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

ناشتہ کرتے ہوئے اسلم نے کوئی دسویں بار اپنی پریشانی اور مجبوری کا اظہار کیا تو ماہ بانو اُس کی اتنی فکرمندی پر مسکرا دی۔ اس لیے اُس کی محبت میں اسے کبھی کوئی شک وشبہ نہیں ہو رہا تھا لیکن آج کل تو وہ اس کا اتنا خیال رکھ رہا تھا کہ اسے خود پر کانچ کی گڑیا کا گمان ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ دنیا کی چند خوش قسمت عورتوں میں سے ہے جس کا شوہر اس حالت میں اس کا اتنا خیال رکھ رہا ہے۔ ورنہ وہ جس ماحول میں پروان چڑھی تھی، وہاں اس بات کو اتنی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور مرد کہتے تھے کہ اگر کوئی عورت بچہ پیدا کر رہی ہے تو یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔ دنیا کی ساری عورتیں ہی یہ کام کرتی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک عورت بچے پیدا کرنے والی مشین تھی جسے ہر حال میں اپنا کام کرنا تھا۔

''آپ اتنی فکر کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے روٹین کے چیک اپ کے لیے ہی تو جانا ہے اس کے لیے میں آرام سے بلقیس باجی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ بلکہ اگر آپ کہیں تو میں کلینک سے اسٹور آ جاتی ہوں، آپ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ بٹا دوں گی۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دیتے ہوئے پیشکش کی۔

''بالکل نہیں، آج تمہاری چھٹی ہے اور کلینک سے فارغ ہونے کے بعد تم گھر آ کر مکمل آرام کرو گی۔'' اسلم نے فوراً انکار کر دیا۔

''تو ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ آپ بھی میری بات مانیں اور بالکل پریشان نہ ہوں کیونکہ یہ کوئی پریشانی کی بات ہے ہی نہیں۔'' اس کے سامنے گرم چائے کا کپ رکھتے ہوئے ماہ بانو نے شرما عائد کی۔

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' وہ بے چارگی سے بولا تو وہ ہنس پڑی پھر ذرا چھیڑنے کے لیے بولی۔

''یہ اتنی فکرمندی میرے لیے ہے یا اپنے ہونے والے بچے کے لئے؟''

''دونوں کے لئے۔ تم مجھے عزیز ہو اور تمہارے بطن میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ بھی مجھے پیارا ہے۔ میں دونوں میں سے کسی کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر تم مجھے ہر حال میں زندہ سلامت اور صحت مند چاہئے ہو۔'' اس نے جذباتی ہو کر ماہ بانو کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں جانتی ہوں، بس ایسے ہی آپ کو چھیڑ رہی تھی۔'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''میرے جذبات کی گہرائی کو جانتے ہوئے تمہیں یہ زیادتی نہیں کرنی چاہئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تمہاری ذات میں میرے لیے دنیا کے سارے رشتے سمٹ کر آ گئے ہیں۔ میرا پیار کہیں بٹا ہوا نہیں ہے، میرے لیے بس تم، تم اور تم ہی ہو۔ تم سے جدائی کا تصور بھی کروں تو میری سانسیں اُکھڑنے لگتی ہیں۔'' وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

''اچھا بابا! معاف کر دیں۔ میں اپنے کان پکڑتی ہوں، میری توبہ جو آئندہ ایسی گستاخی کی ہو۔'' اس نے سچ مچ اپنے دونوں کان پکڑ لیے تو اسلم ہنس پڑا پھر جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے اسٹور جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ کام کی وجہ سے آج وہ معمول سے کچھ پہلے ہی وہاں جا رہا تھا۔

''پتہ نہیں کیوں آج تمہیں چھوڑ کر جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔'' دروازے سے نکلتے نکلتے بھی وہ اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

''وہ تو جناب کا کبھی بھی نہیں چاہتا۔ لیکن بس اب جائیے۔ آپ کو دیر ہو جائے گی اور میرے کام بھی نہیں سمٹ سکیں گے۔'' ماہ بانو نے اسے باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''کیا کرتے ہیں، کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ محجوب ہوئی۔

''یہاں دیکھنے کے لیے اُڑتے پرندوں اور پھول پودوں کے سوا ہے ہی کون؟'' اس نے بولتے ہوئے ایک اور گستاخی کی اور اس سے قبل کہ وہ اسے دھکا دے دیتی، اپنی گرفت سے آزاد کر کے ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ماہ بانو اندر آ گئی اور گھر کے مختلف کام نمٹانے لگی۔ ان کاموں کو نمٹانے کے ساتھ ساتھ وہ کھانا بنانے کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ ابھی اُس کے پاس ہسپتال کے لیے روانہ ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج کے کھانے میں وہ اسپیشلی اسلم کی پسندیدہ ڈش بریانی بنانا چاہتی تھی۔ روزانہ تو وہ خود بھی اسلم کے ساتھ اسٹور جاتی تھی اس لیے اتنی فرصت سے کچھ پکانے کا موقع نہیں ملتا تھا اور وہ سادہ سا کھانا کھانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ چھٹی والے دن بھی اسلم اسے زیادہ دیر کچن میں کھڑا رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس لیے آج وہ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا

رہی تھی۔

اس کا ارادہ یہ تھا کہ بریانی کے لیے یخنی تیار کر کے رکھ دے گی اور شام میں اسلم کے واپس آنے کے وقت چاول اُبال کر تہ لگا دے گی۔ ایک چولہے پر بریانی کے لیے یخنی تیار کرتے ہوئے اس نے دوسرے پر کسٹرڈ بھی بنانا شروع کر دیا۔ جلدی سے تیار ہونے والی اس سویٹ ڈش کو ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھنے کے بعد وہ اس کی سجاوٹ بعد میں کر سکتی تھی۔ تیزی سے ان کاموں کو نمٹاتے ہوئے اس نے اپنی جانے کی تیاری بھی کر ڈالی۔ چنانچہ جب مصطفیٰ خان کی بیوی بلقیس اپنی چلبلی سی بیٹی طوبیٰ کا ہاتھ تھامے وہاں آئی تو وہ پوری طرح تیار تھی۔

''اوہو، بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ صبح صبح کیا پکا ڈالا؟'' بلقیس نے ناک سکیڑ کر خوشبو کو اندر اُتارتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں استفسار کیا۔

''شام میں بریانی پکانے کا ارادہ ہے۔ اسی کے لیے یخنی تیار کی ہے۔'' اس نے پرس اٹھا کر شانے سے لٹکاتے ہوئے بتایا تو طوبیٰ مچل گئی۔

''آنٹی! میں بھی بریانی کھاؤں گی۔''

''کیوں نہیں بیٹا! آپ کی اور آپ کی ممی کی بھی بریانی کی دعوت ہے۔'' اس نے طوبیٰ کے رخسار کو تھپتھپایا۔

''بری بات ہے طوبیٰ!.....ایسے زبردستی کسی سے دعوت نہیں لیتے۔'' بلقیس نے بیٹی کو گھرکا۔

''زبردستی کیسی۔ طوبیٰ نہ بھی کہتی تو میں خود آپ کو انوائٹ کرتی۔ مصطفیٰ بھائی تو ویسے بھی آج نہیں آئیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اکیلے ڈنر کرنے کے بجائے ہمیں جوائن کر لیں۔'' ماہ بانو نے لگاوٹ سے کہا تو بلقیس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''ٹھیک ہے بھئی، جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن بس اب فوراً نکل پڑو۔ تمہیں کلینک چھوڑ کر ہم ماں بیٹی شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے اور واپسی میں دوبارہ پک کر لیں گے۔'' بلقیس نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم آرام سے اندر جا کر چیک اپ کرواؤ۔ ہم آدھ پون گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔'' کلینک کے سامنے اسے اتار کر بلقیس نے محبت سے کہا اور خود اپنی چھوٹی سی کار دوڑاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اسے جس شاپنگ سینٹر سے خریداری کرنی تھی، وہ یہاں سے دس بارہ منٹ کی ڈرائیو پر ہی تھا۔ پھر بھی وہ راستے میں ماہ بانو کو ہدایت دے چکی تھی کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو اسے کال کر کے جلدی بھی بلا سکتی ہے۔

پارکنگ ایریا میں پہنچ کر اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور طوبیٰ کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی۔ اندر جا کر اس نے اپنی ضرورت کی اشیا اُٹھا اُٹھا کر ٹرالی میں رکھنا شروع کر دیں۔ ان اشیا کو وہ لسٹ دے کر اسلم سے بھی منگوا سکتی تھی۔ لیکن خواتین کے ازلی شاپنگ کے شوق سے مجبور ہو کر خود ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اپنی اس مصروفیت میں وہ اتنی مگن تھی کہ چالیس منٹ کا وقت گزرنے پر بھی کوئی احساس نہیں ہوا۔ چونکی تو اس وقت جب اس کے پیچھے پیچھے چلتی طوبیٰ نے شاید اپنی شمولیت کے لیے ایک ریک میں ایک دوسرے کے اوپر رکھے خشک دودھ کے ڈبوں میں سے ایک نکال کر ٹرالی میں ڈالنا چاہا لیکن نتیجے میں سارے ڈبے نیچے آ گرے۔ ان ڈبوں میں سے ایک اس کے سر سے ٹکرایا جبکہ دوسرا پیر کے انگوٹھے پر آ گرا۔ انگوٹھے پر گرنے والے ڈبے نے زیادہ کام دکھایا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طوبیٰ نے دہشت زدہ چیخیں ماریں اور بلقیس سمیت کئی افراد اس کی طرف بھاگے۔ بلقیس کے کئی منٹ انتظامیہ سے معذرت کرنے اور طوبیٰ کی مرہم پٹی کروانے میں گزر گئے۔ ان لوگوں کا کوئی نقصان نہ ہوا تھا اس لیے فراخ دلی سے نہ صرف معذرت قبول کر لی بلکہ بچی کی مرہم پٹی بھی خود کروائی۔

اپنی کی ہوئی شاپنگ کا بل ادا کرنے کے بعد بلقیس، طوبیٰ سمیت پارکنگ میں پہنچی تو اسے گھڑی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ کافی لیٹ ہو چکی ہے۔ دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا تا کہ ماہ بانو کو اپنے دیر سے آنے کی اطلاع دے سکے۔

اس کا نمبر ٹرائی کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا موبائل آف ہے۔ بلقیس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ کلینک پہنچ کر ہی ماہ بانو کو اپنی تاخیر کا سبب بتا سکتی تھی۔ دس منٹ میں کلینک تک کا سفر طے کر کے گاڑی باہر روکنے کے بعد وہ اندر پہنچی تو اسے ماہ بانو انتظار گاہ میں دکھائی نہ دی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسپشنسٹ سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ تو تقریباً بیس منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہیں۔'' اس نے بتایا تو بلقیس کچھ اور شرمندہ ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی تاخیر سے گھبرا کر ماہ بانو خود ہی گھر واپس چلی گئی ہے۔ اس نے فوراً گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلے اپنی خریدی ہوئی اشیا اور طوبیٰ کو اندر پہنچایا۔

''آرام سے اپنے بیڈ پر لیٹی رہو۔ یہاں سے ہلیں تو میں سخت خفا ہو جاؤں گی۔'' طوبیٰ کو اس کے کمرے میں پہنچا کر اس نے سختی سے ہدایت کی اور خود سیدھی انیکسی کی طرف چلی گئی۔ وہاں کا دروازہ بند تھا اور اندر کسی کی موجودگی کا گمان نہیں ہو رہا تھا پھر بھی اس نے دستک دے کر دیکھا۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں سی اُبھر آئیں۔

ماہ بانو کو اس سے پہلے ہی یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہ موجود نہیں تھی۔ اس نے چند منٹ اور انتظار کا فیصلہ کیا وہیں انیکسی کے سامنے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران اُس نے ایک دو بار پھر اس سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر ہنوز بند جا رہا تھا۔ دل میں کچھ گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک موہوم سی اُمید کے سہارے اسلم کا نمبر ملایا۔

''جی باجی! کہیے، کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' اسلم نے فوراً ہی کال ریسیو کی اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اُس کے انداز نے بلقیس کو بتا دیا کہ اس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا ہے۔ ماہ بانو وہاں بھی نہیں پہنچی ہے۔

''ہیلو بلقیس باجی!..... کیا ہوا آپ کو؟..... کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟'' اُدھر سے اسلم پریشان سا پوچھ رہا تھا۔

''میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں فون کیا تھا کہ ماہ بانو وہاں تو نہیں آئی ہے؟'' بلقیس نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہاں.....؟'' اسلم کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''وہ تو آپ کے ساتھ کلینک گئی تھی اور وہاں سے اسے آپ کے ساتھ ہی گھر واپس جانا تھا۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی پریشانی تھی۔

''ہاں لیکن وہ مجھے کلینک پر نہیں ملی۔ میں قریبی شاپنگ سینٹر سے خریداری کر کے کلینک پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ گھر آ گئی ہو گی لیکن وہ یہاں بھی نہیں ہے۔''

بلقیس نے گھٹے گھٹے لہجے میں اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے اور اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ اسے اس کا سب سے قیمتی اثاثہ گم ہونے کی اطلاع دی جا رہی

تھی۔ ایسے میں وہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھتا بھی تو کیسے.....؟

اسلم کو اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ماہ بانو غائب ہے..... یہ جان کر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ اُسے اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا اور اس کے بغیر خود کو ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بغیر روح کے مٹی کا بے جان جسم ہو۔

''آپ نے کلینک میں اچھی طرح دیکھا تھا باجی! ہو سکتا ہے وہ وہیں ہو اور واش روم وغیرہ چلی گئی ہو۔ اکیلی وہ وہاں سے کیسے کہیں جا سکتی ہے؟'' مبہم سی امید کے سہارے اس نے اپنی رُکتی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

''میں نے ریسیپشن پر معلوم کیا تھا اور ان لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ مسز مہرین اسلم، ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے بعد روانہ ہو چکی ہیں۔''

بلقیس جو اپنی جگہ خود بہت پریشان اور شرمندہ تھی، آہستہ سے بولی۔ مہرین، ماہ بانو کا وہ نام تھا جو اس کی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے شہریار نے اسے دیا تھا اور وہ اسی نام سے امریکہ آئی تھی۔

''میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ وہاں سے کہیں جا ہی نہیں سکتی۔'' اسلم بڑبڑانے کے انداز میں بولا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

بلقیس نے پریشانی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر ذرا ہمت سے کام لے کر مصطفیٰ کا سیل نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے اپنی کوشش میں ناکامی ہوئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں مصروف تھا جو اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔

اس طرف سے ناکام ہو کر اس نے کشور کا نمبر ملایا۔ اس گھر کے علاوہ پورے آرلینڈو میں واحد وہی جگہ تھی جہاں ماہ بانو ہسپتال سے نکل کر جا سکتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کشور نے اپنے شائستہ لہجے میں کال کا جواب دیا اور ذرا چہک کر بولی۔

''بلقیس بھابی! کیسی ہی آپ؟ میں آپ لوگوں کو یاد ہی کر رہی تھی۔''

''کن کن لوگوں کو.....؟'' بلقیس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا جس پر وہ ہنسی اور پھر بولی۔

''آپ کی اور ماہ بانو کی فیملی کو۔ کیسی ہے وہ؟ ایسی حالت میں جاب کرنے سے پریشانی تو محسوس نہیں کر رہی؟'' کشور کی باتوں سے ہی ظاہر تھا کہ ماہ بانو اس کے ہاں نہیں پہنچی پھر بھی بلقیس نے اس سے پوچھ لیا۔

''ماہ بانو تمہارے گھر تو نہیں آئی کشور؟''

''نہیں تو..... کیا اُسے آنا تھا؟..... کب نکلی تھی وہ گھر سے؟'' کشور کو حساس ہوا کہ بلقیس کے لہجے کی شگفتگی غائب ہے اور وہ کچھ پریشان لگ رہی ہے۔

جواب میں بلقیس نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ اطلاع سن کر کشور لمحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئی۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ ماضی میں بھی کئی بار ماہ بانو غائب ہو چکی تھی اور غیاب میں اکثر اس کے اپنے والد بزرگوار چودھری افتخار عالم شاہ کا ہوتا تھا۔ وہ نیویارک میں چودھری کے وسیع اختیارات کا ایک مظاہرہ بذاتِ خود بھگت چکی تھی۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ شک کرنے میں حق بجانب تھی کہ یہاں بھی اس کے والد نے ہی کوئی ہاتھ دکھایا ہے اور اگر وہ آرلینڈو تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو یہ سوچنا غلط نہیں تھا کہ وہ اور آفتاب بھی بچی سمیت خطرے میں ہیں۔

''ہیلو کشور!..... تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر بلقیس نے اسے پکارا تو وہ ہوش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آئی۔

''میں نے آپ کی بات سن لی ہے اور سوچ رہی ہوں کہ وہ کہاں جاسکتی ہے۔ اصولاً تو اسے کلینک پر ہی آپ کا انتظار کرنا چاہئے تھا اور اگر دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی روانہ ہوگئی تھی تو اب تک گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ بہرحال تھوڑی دیر اور انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں پھر میں آفتاب کے ساتھ آپ کے گھر آجاؤں گی۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا تو بلقیس کو تھوڑا حوصلہ محسوس ہوا۔

''پلیز کشور! تم لوگ ذرا جلدی آجاؤ۔ باہر بارش شروع ہو چکی ہے اور یہاں کے موسم کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کیا رُخ اختیار کر لے۔ میں طوبیٰ کے ساتھ گھر میں اکیلی ہوں۔ مصطفیٰ اپنے کسی کام سے گئے ہوئے ہیں اور آج واپس بھی نہیں آئیں گے۔ میں کوشش کر رہی ہوں لیکن میرا اُن سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

گھر میں تنہا رہنا بلقیس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ ہی وہ بہت کمزور اعصاب کی مالک عورت تھی لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ماہ بانو کی گمشدگی کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی۔

''آپ گھبرائیں نہیں بھابی! ہم کوشش کرتے ہیں کہ جلد آپ کے پاس پہنچ جائیں۔'' اُس کی کیفیت محسوس کر کے کشور فی الحال اپنی تشویش کو بھول گئی اور اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔

بلقیس ایک بار پھر مصطفیٰ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس بار میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مصطفیٰ کے گھر سے دور رہنے کی صورت میں اس سے رابطہ نہ ہوسکنا بھی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا کہ اپنے کام میں کھو کر بیوی اور بچی کو بھلا بیٹھتا تھا لیکن آج اُسے مصطفیٰ کی یہ عادت ہمیشہ سے زیادہ بری طرح کھلی اور اس نے طے کر لیا کہ واپس آنے کے بعد اُسے اُس کی حرکت پر خوب باتیں سنائے گی۔

⊛----✪----⊛

اسلم کو اس وقت ماہ بانو کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بھول گئی تھی۔ وہ اسٹور، دیگر ملازمین پر چھوڑ کر باہر سے نکل کھڑا ہوا تھا اور دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے فرض شناسی دکھانے کی خاطر ماہ بانو کو اکیلا چھوڑ دیا۔

جو معاملہ اس کے علم میں آیا تھا، اس کے مطابق وہ بلقیس کو بھی زیادہ قصوروار نہیں قرار دے سکتا تھا۔ قصور تو اسے بس اپنا ہی لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی سب سے قیمتی شے کی ذمے داری کسی اور کو سونپی ہی کیوں جبکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کچھ ایسے دشمن ہیں جو اسے ہر حال میں اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

پریشانی اور پچھتاوے کی ملی جلی کیفیت میں وہ ایک کیب میں اس کلینک کے لیے روانہ ہوا جہاں ماہ بانو اپنا چیک اپ کرواتی تھی۔ کلینک پہنچ کر اس نے استقبالیہ سے معلومات حاصل کیں تو اسے بھی وہی جواب ملا جو بلقیس کو دیا گیا۔

''آپ لوگ اچھی طرح چیک کریں۔ ہوسکتا ہے وہ یہیں ہو اور آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔'' اس نے خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے استقبالیہ پر موجود شخص سے کہا۔

''غلط فہمی کی بات ہی نہیں ہے سر! ہم نے پوری ذمے داری سے آپ کو یہ اطلاع دی ہے۔'' اس شخص نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔ میری بیوی یہاں آئی تھی اور یہاں سے وہ اکیلی کہیں نہیں جاسکتی۔'' اس شخص کی

بے نیازی پر لحہ بھر میں ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہو۔ تم گھر جا کر انتظار کرو، ایک آدھ دن میں واپس.....'' اُس کے طیش میں آنے پر وہ شخص بھی بدگوئی پر اُتر آیا لیکن اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور اسلم کے ایک زوردار گھونسے نے اس کے ہونٹوں کو پھاڑنے کے ساتھ دو دانت بھی توڑ دیے۔

''الزام لگاتا ہے۔ میری پاکباز بیوی پر اُنگلی اُٹھاتا ہے۔'' اس نے صرف مُکا مارنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ گردن سے پکڑ کر اس شخص کو کاؤنٹر کے پیچھے سے کھینچ کر نکال لیا۔ فوراً ہی وہاں افراتفری مچ گئی۔ ریسپشن پر اس کے ساتھ کھڑی لڑکی نے چیخ کر گارڈ کو پکارا۔ گارڈ کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی وہاں آگئے۔ پھر بھی اُنہیں بپھرے ہوئے اسلم کو قابو میں کرنے میں وقت لگا کہ وہ ماہ بانو کی شان میں گستاخی کرنے والے کو چار چھ ہاتھ مزید جڑ چکا تھا۔

''چھوڑو مجھے۔ میں اس شخص کو بتاؤں گا کہ کسی عزت دار عورت پر الزام لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

کئی افراد نے مل کر اسے جکڑ رکھا تھا پھر بھی وہ فرطِ جوش سے چلّا رہا تھا۔ اسی اثنا میں وہاں پولیس پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے آتے ہی سب سے پہلے تو اسے ہتھکڑی لگائی پھر دیگر لوگوں سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگے۔ مضروب شخص کو پہلے ہی طبّی امداد کے لیے وہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔

مضروب شخص کی ساتھی لڑکی نے سب سے پہلے اپنا بیان دیا۔ پولیس کو کال کرنے والی بھی وہی تھی۔ اپنے بیان میں اس نے کبھی بھی کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لینے کے بجائے واضح الفاظ میں اسلم کی پریشانی اور اپنے ساتھی کے روّیے سے پولیس والوں کو آگاہ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک پاکستانی کو خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے پولیس والوں کے انداز میں تھوڑی نرمی آگئی۔

''ہم تمہارا مسئلہ سمجھ گئے ہیں مسٹر! لیکن تمہیں چاہئے تھا کہ تشدد سے کام لینے کے بجائے پولیس کو انفارم کرتے۔ ان حالات میں ہم سے زیادہ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ بہرحال، تم یہاں آرام سے بیٹھو اور چاہو تو اپنے وکیل یا کسی دوسرے مددگار کو بلا لو۔ مجھے یقین ہے کہ زخمی ہونے والا شخص تمہارے خلاف قانونی کارروائی ضرور کرے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری بیوی کی بازیابی کے لیے کیا، کیا جاسکتا ہے۔''

سارجنٹ نے اسے سپاٹ لہجے میں حالات سے باخبر کیا اور خود اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ اسلم بھی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اپنے دماغ پر قابو پا سکے تاکہ اس صورتِ حال سے نمٹ سکے۔

اُس کی خواہش پر اُسے ایک گلاس پانی پلایا گیا۔ ابھی وہ پانی پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی۔ پولیس والوں کی طرف سے اسے کال ریسیو کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ کال کرنے والا آفتاب تھا جو اس سے ماہ بانو کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

اس نے مختصر الفاظ میں اسے اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا جس پر آفتاب تشویش میں مبتلا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں وہاں پہنچنے کا عندیہ دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اس دوران پولیس والوں نے ماہ بانو کے بارے میں جو تحقیقات کیں، ان کے مطابق یہ حقائق سامنے آئے کہ مسز مہرین اسلم نے لگ بھگ تین گھنٹے قبل ڈاکٹر سے اپنا روٹین کا چیک اپ کروایا تھا اور کسی سے کچھ بھی کہے بغیر فوراً ہی کلینک سے باہر چلی گئی تھیں۔ کلینک پہنچنے کے بعد ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

اسلم نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ چیک اپ کے بعد اسے وہیں ٹھہر کر مسز مصطفیٰ خان کا انتظار کرنا تھا جو کہ اسے پک کرنے کے لیے وہاں آنے والی تھیں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ ماہ بانو اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرضی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔

کلینک میں نصب ویڈیو کیمروں نے بھی عملے کے اس بیان کی تصدیق کی تھی جس پر اسلم بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے ایسی کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی جسے ماہ بانو کے ازخود کہیں چلے جانے کا سبب قرار دے سکے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی سوچ پا رہا تھا کہ ماہ بانو کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے لیے کلینک سے باہر نکلی ہو گی لیکن کسی ناگہانی آفت نے اسے واپس نہیں آنے دیا۔ اس نے سارجنٹ پر بھی اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا۔

''اوکے، ہم چیک کر لیتے ہیں لیکن ہمارے ریکارڈ کے مطابق شہر میں ٹریفک کا ایسا کوئی حادثہ نہیں پیش آیا ہے جس میں کسی خاتون کے متاثر ہونے کی اطلاع ملی ہو۔ اغوا وغیرہ کی بھی کوئی واردات نہیں ہوئی ہے۔ بہرحال، تم اپنی مسز کا سیل نمبر مجھے دے دو۔ وہ اپنی مرضی سے یا زبردستی جہاں بھی گئی ہے، ہم اس کا پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔'' سارجنٹ نے غیر جذباتی انداز میں اس سے کہا تو اس نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر اسے ماہ بانو کا سیل نمبر دے دیا۔ اسی اثنا میں آفتاب وہاں پہنچ گیا۔

''تم نے رپورٹ میں چودھری صاحب پر شک ظاہر کیا ہے یا نہیں؟'' اس نے پہلے وہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کیں، پھر اسلم سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ چودھری صاحب بھلا یہاں کہاں؟'' اس نے نڈھال سی حالت میں جواب دیا۔

''تم انہیں کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ حضرت اپنی سگی بیٹی اور مجھے کرائے کے غنڈوں سے ہلاک کروانے کی کوشش کر چکے ہیں۔'' آفتاب نے اسے جواب دیا اور پھر مڑ کر سارجنٹ سے اس بارے میں بات کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے، ہم چیک کر لیتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں سے دھواں دھار برستی بارش صاف نظر آ رہی تھی۔ آفتاب نے اسلم کے کندھے پر تسلی دینے والے انداز میں تھپکی دی اور خود اس شخص کی خیریت معلوم کرنے چلا گیا جو اسلم کے ہاتھوں مجروح ہوا تھا۔

اس شخص سے مل کر اس کا اشتعال دور کرنے اور اسلم کے لیے ہمدردی کے جذبات جگانے میں اسے کچھ وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکا کہ اسلم کو اپنے ساتھ گھر لے جا سکے۔ اس دوران بارش نے مزید زور پکڑ لیا تھا اور طوفانی جھکڑ چلنے لگے تھے۔

آفتاب یہاں بلقیس کی گاڑی میں آیا تھا۔ موسم کی شدت کے باعث اسے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھنی پڑ رہی تھی۔ برابر والی سیٹ پر کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھے اسلم نے بھی کوئی بات نہیں کی اور بس ونڈ اسکرین کو دیکھتا رہا، جہاں تیزی سے چلتے وائپرز شیشے سے پانی کی چادر کو ہٹانے کی پوری کوشش کر رہے تھے لیکن لمحہ بھی نہیں گزرتا تھا اور یہ چادر دوبارہ تن جاتی تھی۔

دُھندلائے ہوئے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں دُھندلا گئیں اور دل میں ہوک سی اُٹھی کہ جانے اس خطرناک موسم میں ماہ بانو کہاں ہو گی اور کن مشکلات میں گھری ہوئی ہو گی۔ آسمان پر گاہے بگاہے کڑکتی بجلی اس کے اعصاب کو بھی جھٹکے لگا رہی تھی۔ اس شدید موسم میں تو ماہ بانو اور ان کے ہونے والے بچے کو اس کے مضبوط بازوؤں کی پناہ کی ضرورت تھی لیکن نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔

راستے بھر انہی سوچوں میں گھرا جب وہ آفتاب کے ساتھ مصطفیٰ خان کے گھر پہنچا تو گاڑی سے اُترکر

سیدھا انیکسی کا رخ کیا۔ آفتاب نے چاہا کہ اسے پکارے اور زبردستی سب کے درمیان لے جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اسے جو جھٹکا لگا تھا، اس سے سنبھلنے کے لیے تنہائی درکار تھی۔

ادھر اسلم ہر چیز سے بے نیاز انیکسی میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف ماہ بانو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بلامقصد ہی اِدھر سے اُدھر گھومنے لگا۔ ان کی چھوٹی سی اس جنت میں ہر شے قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھی اور کہیں گرد و غبار کا معمولی سا بھی نشان نہیں تھا۔ خواب گاہ میں موجود بیڈ کی بے شکن چادر میں اسے ماہ بانو کے ریشمی جسم کی سرسراہٹیں محسوس ہوئیں تو وہ گھبرا کر وہاں سے نکل آیا اور کچن میں پہنچ گیا۔

جگمگ کرتے صاف ستھرے کچن میں چولہے پر دھری دیگچی کا ڈھکن کھول کر دیکھا تو اس میں بریانی کے لیے تیار کی گئی یخنی نظر آئی۔ اپنے ٹوٹتے ہوئے اعصاب کے باوجود وہ سمجھ سکتا تھا کہ آج رات کے کھانے میں ماہ بانو اس کے لیے بریانی بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے دیگچی فریج میں رکھنے کے ارادے سے اُٹھا لی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کلینک پہنچنے سے قبل بنائی گئی یخنی گرم ہونے کی وجہ سے وہ فریج میں رکھنے کے بجائے باہر ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس کی بنائی گئی یخنی کو محفوظ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ واپس آ کر اس سے بریانی تیار کر سکے۔

فریج کا دروازہ کھول کر یخنی اندر رکھتے ہوئے اس کی نظر کسٹرڈ کے پیالے پر پڑی۔ اس کے گلے میں یک دم ہی کوئی گولا سا پھنس گیا۔ کہنے والوں نے کتنی آسانی سے کہہ ڈالا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے لیکن یہاں سارے آثار تو یہ بتاتے تھے کہ اسے لوٹ کر واپس یہیں آنا تھا اور اپنے ادھورے کاموں کو مکمل کرنا تھا۔

وہ سخت آزردہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ بیٹھا۔ استری اسٹینڈ پر انگوری رنگ کا لباس رکھا ہوا تھا۔ یہ لباس ماہ بانو پر خوب سجتا تھا اور اسلم کا من پسند تھا شاید اسی لیے اس نے نکال کر استری کرنے کے لیے رکھا تھا تاکہ جب شام ڈھلے وہ واپس آئے تو اس کے من پسند لباس میں اس کا استقبال کر سکے۔ وہ شام ڈھلنے سے بہت پہلے واپس آ گیا تھا لیکن استقبال کرنے والی کا کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔

بڑے بڑے سورماؤں سے بے جگری سے ٹکرا جانے والے اسلم کا یہ سب دیکھ کر جگر پاش پاش ہونے لگا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر کسی ننھے بچے کی طرح دھواں دھار رونے لگا۔ آسمان سے برستے پانی نے اس کا دکھ بانٹنے کے لیے کچھ اور شدت سے برسنا شروع کر دیا اور نشریاتی اداروں سے خبر نشر کی جانے لگی کہ آرلینڈو میں ایک اور ہری کین آنے کو ہے۔

⊛----✪----⊛

مال گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑ لی تھی اور وہ اندھیری رات میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں اتنی ایمرجنسی میں وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کہ وہ اپنی منزل کا بھی تعین نہیں کر سکے تھے۔ بس خوش قسمتی یہ تھی کہ پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئے تھے اور فی الحال محفوظ تھے۔ لیکن یہ سلامتی بھی انہیں پریم ناتھ جیسے قیمتی آدمی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بدلے میں حاصل ہوئی تھی۔

''یہاں سے نکلنے کے بعد تمہارے پاس کوئی دوسرا ٹھکانہ ہے؟'' شہریار نے سرگوشی میں کلام سے دریافت کیا۔

''میرا ذاتی تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے لیکن ایک آدھ جگہ رابطہ کرنے پر انتظام ہو جائے گا۔'' کلام نے بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھیمے لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ البتہ سلّو ان سے بے نیاز اندھیرے میں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے کسی نادیدہ شے کو تلاش کر رہا ہو۔

''ٹھیک ہے۔ پھر تم جہاں مناسب سمجھو، وہاں اُتر کر اپنے اس محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جانا۔ تمہارا موبائل تو تمہارے پاس ہی ہے نا؟ بھاگ دوڑ میں کہیں گرا تو نہیں؟''

موبائل محفوظ ہے۔'' کلام نے مختصر جواب دیا۔

''بس تو پھر تم اپنے لیے بندوبست شروع کر دو۔ پریم ناتھ کے تمہارے گاڑی سے بازیاب ہونے کے بعد وہ لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ نمبر بھی معلوم کر لیں اور اس کی مدد سے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔'' شہریار نے مشورہ دیا۔

''یہ نمبر میرے نام پر رجسٹرڈ نہیں ہے اور صرف وہی لوگ اس نمبر سے واقف ہیں جو میری اصلیت سے بھی واقف ہیں۔ میری جان پہچان کے عام لوگوں کے پاس میرے فلیٹ میں موجود لینڈ لائن کا نمبر ہی ہوتا ہے۔'' اس نے اطمینان سے اسے بتایا پھر بولا۔ ''آپ مجھے اُترنے کا مشورہ دے رہے ہیں یعنی خود میرے ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے؟''

''تم ٹھیک سمجھے۔ ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے اور پھر تم سے رابطہ کریں گے۔ حالات خراب ہونے کی صورت میں بھی تمہارے محفوظ رہنے سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ پیچھے والوں کو ہمارے انجام کی خبر ہو جائے گی اور وہ کسی دوسری ٹیم کو اس مشن کی تکمیل کے لیے بھیج سکیں گے۔'' اس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا تو کلام خاموش ہو گیا۔ ان کے پیشے میں جذبات کو پس پشت ڈالنا پڑتا تھا۔ اس وقت شہریار جو کہہ رہا تھا، وہی مناسب تھا۔

جس پل ان کی یہ گفتگو اختتام پذیر ہوئی، اسی پل سلّو یوں بھڑک کر کھڑا ہوا جیسے کسی جنگل میں خطرے کی بُو سونگھ کر غزال وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ان پر ایک جال آ پڑا اور وہ اس میں اُلجھ کر رہ گئے۔

''اپنے ہتھیار پھینک کر اُلٹے لیٹ جاؤ۔ ورنہ گولیوں سے بھونے جاؤ گے۔'' سخت لہجے میں دھمکانے والے نے اپنی طاقت کا عملی ثبوت دیا اور ان کے کانوں نے مشین گن چلنے کی آواز سنی۔

شہریار نے ہل جل کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن جانے جال کس انداز میں پھینکا گیا تھا کہ وہ اس میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ سلّو اور کلام نے بھی شاید اپنے طور پر کوشش کر کے دیکھی تھی لیکن انہیں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''اگر تم لوگوں نے میرے تین تک گننے تک اپنے ہتھیار نہیں پھینکے تو تمہارے جسموں کو چھید دیا جائے گا۔'' اس دھمکی کے ساتھ ہی فضا ایک بار پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ لیکن اس بار مشین گن مخالف سمت سے چلائی گئی تھی۔

اُنہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کے مقابل آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر موجود ہیں جبکہ وہ درمیانی خلا پر ہونے کی وجہ سے کسی طور محفوظ نہیں تھے۔ ان پر جال نہ بھی پھینکا جاتا تو اس پوزیشن میں وہ کسی صورت اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' شہریار نے سرگوشی میں ان دونوں سے کہا اور خود سب سے پہلے عمل کیا۔

کلام اور سلّو کے پاس بھی ان کی پیروی کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ ہتھیار پھینکنے کے بعد وہ

حسبِ ہدایت مال گاڑی کے آہنی فرش پر اُلٹے لیٹ گئے۔ فوراً ہی آگے پیچھے کے ڈبوں کی چھتوں پر سے چند افراد دھنا دھن نیچے کُودے اور ان کے ہتھیاروں کو قبضے میں لے لیا۔ پھر ایک شخص عین ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پیر تک سیاہ چست لباس میں چھپا ہوا تھا جس کی محض آنکھوں اور ناک کی جگہ پر سوراخ تھے۔

''اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے حکم صادر کیا تو ان تینوں نے فوراً ہی عمل کیا۔ فرش پر اُلٹے لیٹے رہنے کے مقابلے میں بیٹھنا زیادہ بہتر تھا۔ کم از کم اس طرح وہ اپنے مقابل کو دیکھ تو سکتے تھے۔

بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر طاقتور ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی جس نے ان کی آنکھیں چندھیا کر رکھ دیں۔

''کس کے آدمی ہو؟'' اس نے چہروں سے انہیں شناخت کرنے میں ناکام ہو کر سرد لہجے میں پوچھا۔

''کسی کے نہیں۔'' حسبِ روایت جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی اور ٹارچ بند ہو جانے کے بعد مخاطب کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں وہ اپنے سیاہ چست لبادے کی وجہ سے محض ایک سائے کی طرح ہی نظر آ رہا تھا جسے وہ کسی طور شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ پولیس والا نہیں ہوسکتا۔ وہ لوگ محض اتفاقاً ہنگامی بنیادوں پر اس مال گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور یہ کسی طور ممکن نہیں تھا کہ پولیس والے ان کے انتظار میں پہلے سے وہاں چھپے بیٹھے ہوں۔

''چلتی مال گاڑی پر کیوں سوار ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور سوال داغا۔ یوں تو وہ تنہا ہی ان سے گفتگو کر رہا تھا لیکن وہ اس جیسے مزید سایوں کو اپنے اردگرد محسوس کر سکتے تھے۔ تیز حسیات والا سلّو انہی سایوں کی موجودگی کو بھانپ کر اپنی جگہ سے حرکت میں آیا تھا لیکن اسے تاخیر ہو گئی تھی۔

''اپنی جان بچانے کے لئے۔'' شہریار نے اختصار سے کام لیا۔ وہ خود کو گھیرنے والوں کی اصل حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا اس لیے بہت احتیاط سے گفتگو کر رہا تھا۔

''کس سے جان بچا کر بھاگے تھے؟'' اس کی طرف سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔

''پولیس۔'' وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق پولیس سے نہیں ہے اس لیے یہ جواب دینے میں قباحت محسوس نہیں کی۔

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''ایک پولیس والے کی ٹھکائی کر دی تھی۔''

''کس لئے؟''

''سالا رشوت مانگتا تھا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''ڈیٹیل میں سب بتاؤ۔'' وہ آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جواب میں شہریار چپ رہا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟'' وہ غرّایا۔

''تم اتنا سب پوچھ کر کیا کرو گے؟ میں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے۔ مال گاڑی رُکے گی تو اُتر کر اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔'' شہریار نے لہجے میں بیزاری محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ تجھے اُگلنا ہوگا کہ تُو کس کا آدمی ہے اور اس مال گاڑی پر کیوں چڑھا جس میں بھائی جی کا مال جا رہا ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولا اور ایک لات شہریار کے شانے پر رسید کر دی۔

ضرب شدید تھی لیکن اس کی توجہ اپنی تکلیف سے زیادہ اس کے الفاظ پر تھی۔ بھائی جی سے اس کا غائبانہ تعارف پہلے بھی تھا۔ ممبئی میں دخل ہونے کے بعد وہ لوگ تواتر سے یہ نام سن رہے تھے۔ بار بار بھائی جی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آدمیوں سے ان کا ٹاکرا ہو جاتا تھا۔ ایک بار پھر وہ لوگ ان کے سامنے تھے اور یقیناً انہیں اشوک کا ساتھی سمجھ رہے تھے۔

''منہ بند کیے ٹکر ٹکر کیا دیکھے جا رہا ہے؟..... میری بات کا جواب دے۔'' اس سے شہریار کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی اور اسے ایک اور لات دے ماری۔

''ہم کون ہیں، اس سوال کا جواب میں عبدالرحمٰن کے سامنے دینا چاہتا ہوں۔'' اس بار شہریار نے ذرا تیز لہجے میں جواب دیا۔ یہ تعین ہو جانے کے بعد کہ وہ بھائی جی کے آدمی ہیں، اس کے لیے اس شخص سے گفتگو کرنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔

''کس عبدالرحمٰن کی بات کرتا ہے..... اپنے عبدل بھائی کی؟'' اس نے ذرا استعجاب اور بے یقینی سے استفسار کیا۔

''ہاں اسی کی۔ اب مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر ہاتھ اُٹھانے کی غلطی مت کرنا ورنہ خود تمہارا انجام برا ہو سکتا ہے۔'' اس نے اپنے لہجے کو مزید سخت اور سرد کر لیا۔ اُس کے اس رویّے نے مقابل کو متذبذب کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہو لیکن یقین نہ کر کے کسی بدسلوکی کی ہمت بھی نہ کر پا رہا ہو۔

چند لمحے اسی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد بالآخر وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا اور فضا میں مخصوص انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ایک آدمی فوراً حرکت میں آیا۔ شہریار اور اس کے ساتھی صبر سے نتیجے کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جال میں قید، کئی مسلح افراد کے نرغے میں ان کے پاس ہاتھ پیر چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

انتظار کے چند پل بیتے تو انہوں نے سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس اس آدمی کے پیچھے موجود ڈبے کی دیوار میں لمبائی کے رخ روشنی کا ایک مستطیل دیکھا۔ یہ ڈبے میں کھلنے والا دروازہ تھا جس کے اندر روشن مدھم بلب کی روشنی اندھیرے میں بہت نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں جال سے آزاد کیا جا رہا ہے لیکن یاد رکھنا کہ کسی بھی قسم کی چالاکی بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم تمہیں جو رعایت دے رہے ہیں، وہ عبدل بھائی کے نام کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنا آدمی مان لیا تو ہم پلکوں پر بٹھائیں گے ورنہ تو تم خود اپنا انجام سمجھ سکتے ہو۔''

اب تک ان سے گفتگو کے فرائض انجام دینے والے شخص نے جال سے آزادی کی نوید سناتے ہوئے دھمکی دینا بھی ضروری سمجھا۔ ان کا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تیزی سے چلتی مال گاڑی سے چھلانگ لگانے کی صورت میں اگر کسی طرح ان کی ہڈیاں سلامت رہ بھی جاتیں تو وہ گولیوں کی اس برسات سے کس طرح بچتے جو فائرنگ کے لیے تیار کھڑے افراد کی طرف سے کی جاتی۔ ان کے حق میں یہی سب سے بہتر تھا کہ وہ لوگوں سے تعاون کرتے اور عبدالرحمٰن تک پہنچ جاتے۔

پولیس کے مخبر ونود کو قتل کرنے کے بعد کلام کے ایک ٹھکانے پر وہ لاش کو کسی محفوظ جگہ پر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے تب عبدالرحمٰن وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بلڈنگ سے فرار ہوا تھا جہاں پولیس نے ریڈ مارا تھا اور وہاں سے پولیس کے ساتھ مقابلہ کرنے والے آہستہ آہستہ پسپا ہوتے جا رہے تھے۔

انہوں نے اس موقع پر عبدالرحمٰن کو پناہ دینا قبول کر لیا تھا اور عبدالرحمٰن نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ انہیں کبھی ضرورت پڑے تو وہ ممبئی شہر میں کسی سے بھی عبدل کا ٹھکانہ پوچھ لیں۔ ٹھکانہ

معلوم کرنے کی تو نوبت نہیں آئی تھی لیکن وہ بھائی جی کے ساتھیوں سے آ ٹکرائے تھے۔ اسی بھائی جی کے ساتھیوں سے جس کا عبدالرحمٰن دایاں ہاتھ مانا جاتا تھا۔ اسلحے کی چھاؤں میں انہیں دروازے سے گزار کر ڈبے میں پہنچا دیا گیا۔

ڈبے کا بیشتر حصہ فرش سے چھت تک ترتیب وار رکھے لکڑی کے مضبوط ڈبوں سے بھرا ہوا تھا اور درمیان میں بس اتنی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی کہ چند افراد سما سکیں۔

ان تینوں کو وہاں بچھی دری پر بٹھا یا گیا۔ اسلحہ بردار اب بھی ان کے سروں پر سوار تھے حالانکہ اس ڈبے میں داخل ہونے سے قبل وہ ان کی جامہ تلاشی لے کر یہ چیک کر چکے تھے کہ پھینکے ہوئے اسلحے کے سوا ان کے پاس کوئی اور ہتھیار تو موجود نہیں ہے۔

''اپنے نام بتاؤ۔ میں ابھی عبدل بھائی سے تمہارے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔'' وہ شخص جو شاید یہاں کا انچارج تھا، شہریار کی طرف منہ کر کے بولا۔ اب تک ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہے وہ یہ اخذ کر چکا تھا کہ جیسے اپنے ساتھیوں میں سے گفتگو کرنے کے اختیارات اس کے پاس ہیں اسی طرح ان تینوں میں سے شہریار ہی اس کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

''میں نوشاد ہوں اور یہ قمرو..... اس تیسرے کو تمہارا عبدل بھائی نہیں جانتا۔ ہمیں بھی پہچاننے سے انکار کرے تو یاد دلا دینا کہ ہم وہی ہیں جن کی موجودگی میں اس نے ایک گھر کے ٹینک میں چھپ کر پولیس سے اپنی جان بچائی تھی۔'' شہریار نے اسے وہی نام بتائے جو کلام کے ٹھکانے پر بتا چکا تھا۔

''ٹھیک ہے، اپن بھائی سے بات کرتا ہے۔ جب تک تم ادھر آرام سے بیٹھو۔ کسی گڑبڑ کا سوچنا بھی نہیں۔ اس ڈبے میں گولی چلی تو سمجھو قیامت آ جائے گی۔'' دھمکیاں دینا شاید اس کی عادت تھی۔

''ہم کسی گڑبڑ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ رہی گولی چلنے کی بات تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے آدمی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ انہیں خود بھی معلوم ہو گا کہ بارود کے اس ڈھیر میں کوئی چنگاری پیدا کرنے کا کیا انجام ہو گا۔'' شہریار کو یک دم ہی اسے چھیڑنے کی سوجھی تو سلگانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان سے بولا۔

''کیا مطلب؟..... تمہیں کیسے معلوم کہ یہ بارود کی پیٹیاں ہیں؟'' وہ ٹھٹک گیا۔

''بھائی جی کا مال ہے تو ان پیٹیوں میں آم اور جامن تو ہونے سے رہے۔ سفید پاؤڈر وہ بیچتا نہیں ہے تو پھر ان پیٹیوں میں اسلحہ اور بارود ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تو کامن سینس کی بات ہے۔'' اس نے نہایت سکون سے جواب دیا جس پر وہ اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔

''عبدل بھائی بولتے ہیں کہ وہ تم لوگوں کو جانتے ہیں پر یہ مال گاڑی احمد آباد سے پہلے نہیں رُکنے والی اس لیے تمہیں ہمارے ساتھ وہاں تک چلنا پڑے گا۔ بھائی خود بھی وہاں آنے والے ہیں۔ وہ وہیں تم سے ملیں گے۔ جب تک تم آرام سے ہمارے ساتھ رہو۔ کھاؤ پیو اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بولو۔'' اس بار اس کا لہجہ واضح طور پر نرم تھا۔

''شکریہ۔ ہم بس تھوڑا سا پانی پینا چاہتے ہیں۔'' اس نے اپنی خواہش بیان کی جو فوراً پوری کر دی گئی۔ پانی پینے کے بعد وہ تینوں پیٹیوں سے ٹیک لگا کر اور ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ بھاگ دوڑ اور اعصابی کشیدگی کے بعد ملنے والا یہ تھوڑا سا آرام بھی بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن دل میں ایک ملال بھی تھا۔ پریم ناتھ جسے انہوں نے بڑی آسانی سے اغوا کر لیا تھا، اس سے بھی زیادہ آسانی سے ہاتھوں سے نکل گیا تھا اور یہ بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاف ظاہر تھی کہ اب وہ اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ نہیں آنے والا ہے۔ دوسری طرف ایک بار پھر ممبئی سے باہر جانے پر مجبور تھے۔ نہ جانے یہ شہر انہیں ٹکنے کیوں نہیں دے رہا تھا اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ پہلے بھی وہ یہاں سے نکل کر گجرات کے شہر گاندھی نگر پہنچے تھے اور اب بھی گجرات کے ہی ایک دوسرے شہر احمد آباد لے جائے جا رہے تھے۔

⊛----✪----⊛

''کوئی رسپانس؟'' جاوید علی دستک دے کر اس کمرے میں داخل ہوا جس میں آج کل عالیہ ٹھہری ہوئی تھی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''نو رسپانس۔'' عالیہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اشتہار چھپتے ہوئے تین دن تو ہو گئے ہیں۔ انہیں اب تک تمہیں کال کر لینی چاہئے تھی۔'' جاوید علی نے فکرمندی سے کہا تو وہ کمرے میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی۔ یہ سیٹ خاص طور پر یہاں اس لیے رکھوایا گیا تھا کہ عالیہ کے بڑوں میں سے اگر کوئی رابطہ کرے تو وہ دن رات کے کسی بھی حصے میں اس کال کو ریسیو کرنے سے محروم نہ رہ سکے۔

''شاید انہیں شک ہو گیا ہے اور وہ جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں۔'' اس نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ابھی دن کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ہو سکتا ہے اس عرصے میں وہ رابطہ کر لیں۔'' جاوید علی نے اُمید سے جڑے رہنے کو ترجیح دی اور بتانے لگا۔ ''یہ فون نمبر جس فلیٹ کا پتہ شو کرتا ہے، اس کے ساتھ والا فلیٹ بھی ہمارے ایک ساتھی کا ہے۔ وہ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ بلڈنگ کا چوکیدار بھی ہمارا ہی بندہ ہے اس لیے ہم نے ہر طرف نظر رکھی ہوئی ہے۔ شک ہونے کی صورت میں بھی وہ لوگ تمہارے ذریعے ہم تک پہنچنے کی کوشش ضرور کرتے لیکن کسی نے وہاں سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب دوسری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ دور دور سے عمارت کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اس کا توڑ ہم نے یہ نکالا ہے کہ مذکورہ فلیٹ میں میرے ساتھی کی بیوی دن میں تین چار چکر لگا لیتی ہے۔ اس کا ناک نقشہ تم سے مختلف ہے لیکن قد کاٹھ اور بالوں کی رنگت ملتی جلتی ہے۔ ہماری ہدایت کے مطابق وہ کھڑکیوں کے پردے کھولتی بند کرتی رہتی ہے اور کچھ وقت وہاں گزارتی ہے لیکن اپنا زاویہ ایسا رکھتی ہے کہ اگر کوئی دور سے بھی دیکھ رہا ہو تو اسے چہرہ نظر نہ آئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عورت کے قد کاٹھ سے دھوکا کھا کر وہ تم سے ملنے ضرور آئیں گے۔''

''دیکھتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کس کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔'' عالیہ نے شانے اچکا کر بولتے ہوئے اپنی بے نیازی کا اظہار کرنا چاہا۔ لیکن ٹیلی فون کی بجنے والی گھنٹی نے اس کی بے نیازی کو قائم نہ رہنے دیا اور وہ یوں آنکھیں پھاڑے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگی جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا اور خود اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملا کر دھیمی آواز میں بات کرنے لگا۔

''ہیلو۔'' اعصاب زدہ عالیہ نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر دھیمی آواز میں کہا۔

''عالیہ.....؟'' دوسری طرف سے سوالیہ انداز میں اس کا نام پکارا گیا۔ کال کرنے والا کوئی مرد تھا۔

''یس۔'' اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے بہت محتاط ہو۔

''اپنا کوڈ نمبر بتاؤ۔'' دوسری طرف سے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ عالیہ نے اپنا کوڈ دہرا دیا۔

''اوکے۔ اب اس فلیٹ کا پتہ بتاؤ جہاں تم ٹھہری ہوئی ہو۔'' جاوید علی اسے پہلے ہی ایسے ممکنہ سوالوں کے جوابات ذہن نشین کروا چکا تھا اس لیے اس نے روانی سے پتہ بتا دیا۔

''ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا پیش آیا اور تم وہاں تک کیسے پہنچیں؟'' اس بار اس سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

''مساج سینٹر پر ریڈ ہوا تو میں گرفتاری کے ڈر سے سینٹر کی دیوار پھاند کر سائیڈ کی گلی میں کود گئی تھی اور وہاں سے ساتھ والے اسکول کی باؤنڈری کراس کر کے اسکول میں چھپ گئی تھی۔ بھاگ دوڑ میں میرا موبائل بھی کہیں گر گیا تھا اس لیے میں فوری طور پر کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میں کئی گھنٹے تک وہیں چھپی رہی اور جب یہ محسوس ہوا کہ اب پولیس وہاں سے جا چکی ہے تو وہاں سے نکل کر ایک راہ گیر سے گزارش کر کے اس کے موبائل فون سے ایک دوست کو کال کی۔ میرا وہ دوست فوراً مدد کے لیے راضی ہو گیا اور میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر مجھے پک کر لیا۔ پولیس کے ڈر سے میں اپنے اپارٹمنٹ واپس نہیں جا سکتی تھی اس لیے دوست سے ہی کسی محفوظ جگہ پہنچانے کی گزارش کی۔ اس نے کہا میری بیوی میکے رہنے گئی ہوئی ہے، تم میرے ساتھ ہی میرے گھر چلو۔ دو دن تک میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں رہی اور وہ مجھ سے پورا فائدہ اٹھاتا رہا۔ لیکن میں اس کے ذریعے اخبار میں اشتہار نہیں چھپوا سکتی تھی۔ وہ مجھ سے وجہ پوچھتا تو میں اسے کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔ تیسرے دن اس کی بیوی کو واپس آنا تھا اس لیے اس نے مجھے اپنے ایک ایسے فلیٹ میں منتقل کر دیا جو کرائے پر چلتا ہے اور آج کل خالی پڑا ہوا ہے۔ فلیٹ پر آنے سے پہلے میں اخبارات میں اشتہار چھپنے کے لیے دے کر آئی تھی۔ اپنے دوست کے گھر سے اس کے فلیٹ تک آنے کے لیے مجھے چہرہ نقاب میں چھپانا پڑا تھا کہ کہیں راستے میں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اب بھی میں جانتی ہوں کہ میں کس حال میں یہاں رہ رہی ہوں۔ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے، اس ڈر سے باہر نکلنا تو دور کی بات، کھڑکیوں تک جانے سے بھی ڈرتی ہوں۔ یہاں اس خالی فلیٹ میں ضرورت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ مجھے فرش پر سونا پڑتا ہے۔ نل کا سادہ پانی پیتی ہوں اور کھانے کے لیے ڈبل روٹی، جیم اور بسکٹوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ چیزیں بھی یہاں آنے سے پہلے میرے دوست نے دلا دی تھیں۔ کل اس کا فون آیا تھا کہ میں دو تین دن میں اس کا فلیٹ خالی کر دوں کیونکہ یہاں نئے کرائے دار آنے والے ہیں اور اسے پینٹ وغیرہ کروانا ہے۔ آپ لوگوں کی طرف سے کانٹیکٹ نہ کیے جانے پر میں سخت پریشان تھی کہ یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔ باہر کے حالات کی بھی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔ موبائل ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے کسی سے کانٹیکٹ بھی نہیں کر سکتی۔ سارے کام کے نمبر میرے موبائل میں ہی فیڈ تھے۔''

اس نے آواز کے زبردست اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک مربوط کہانی سنا ڈالی۔ ابتدا میں کال ریسیو کرنے سے پہلے اس پر اپنے آقاؤں کی جو دہشت طاری تھی، اس پر بھی اس نے بتدریج قابو پا لیا تھا۔

''اشفاق رانا کے قتل کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس کی ساری داستان سن کر اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے دوسری طرف سے بالکل اچانک پوچھا گیا۔

''کیا مطلب؟ کیا رانا قتل ہو گیا ہے؟'' عالیہ نے بے ساختہ حیرت کی بڑی خوب صورت اداکاری کی۔

''تمہیں نہیں معلوم؟..... یہ خبر تو سارے نیوز چینلز اور اخبارات میں آئی ہے۔'' دوسری طرف موجود شخص نے سرد لہجے میں استفسار کیا۔

جواب میں عالیہ نے ایک سرد آہ بھری اور بے چارگی سے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس بے سروسامانی کے عالم میں اخبارات اور نیوز چینلز کہاں دستیاب ہیں؟ میں تو بس اس چار دیواری کی قیدی ہو کر رہ گئی ہوں۔ پہننے کے لیے کوئی دوسرا جوڑا تک نہیں ہے۔ جسم پر موجود کپڑے سخت گندے ہو چکے ہیں۔ آپ لوگ کب تک میری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں؟''

عالیہ نے بڑے کام کا سوال پوچھا۔ اس کے قریب بیٹھا جاوید علی بھی یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے کان کے ساتھ ایک آلہ لگا ہوا تھا اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ عالیہ کی کارکردگی سے مطمئن ہے۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تمہارے پاس دو دن ہیں ابھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو دنوں میں تمہارے لیے کیا، کیا جا سکتا ہے۔ تم انتظار کرو۔ ہم کسی بھی وقت تم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''چالاک لوگ ہیں۔ جس نمبر سے کال کر رہے تھے، اس کی سم رجسٹرڈ نہیں ہے۔ لوکیشن بھی معلوم نہیں ہو سکی کیونکہ کال کرنے والا مستقل حرکت میں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔'' کال ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد جاوید علی نے اپنے کان سے لگا آلہ الگ کرتے ہوئے عالیہ کو بتایا۔

''ان سے تم حماقت کی توقع بھی نہیں کرنا۔ ان پر تم صرف اسی صورت فتح حاصل کر سکتے ہو کہ خود ان سے زیادہ چالاکی کا مظاہرہ کرو۔'' عالیہ نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔

''میں یہ بات سمجھتا ہوں اسی لیے کال آتے ہی اپنے ساتھی کو فون کر کے ہدایت دے دی تھی کہ اب اپنی بیوی کو اس فلیٹ پر مت جانے دینا۔'' جاوید علی نے بتایا۔

''بہت اچھے..... میں دعا کروں گی کہ اس جنگ میں تم ہی کامیاب رہو۔''

''آمین۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''یہ معاملہ نمٹ جائے تو میں تمہیں یہاں سے بہت اچھی جگہ شفٹ کر دوں گا۔ تم وہاں جب تک چاہو سکون سے رہنا اور اطمینان سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا۔ ہم میں سے ہر ایک تمہارے فیصلے کا احترام کرے گا۔''

عالیہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ بہت اچھی جگہ کون سی ہے لیکن وہ وہاں ٹھہرا ہی نہیں اور وہ اس کے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنتی رہ گئی۔

⊛----✪----⊛

''کیا میں اس کے لیے رونے کے سوا کچھ نہیں کروں گا؟'' جب وہ کافی دیر رو چکا تو یہ خیال چابک کی طرح اس کے دماغ پر آ کر لگا۔ وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری ماہ بانو اس طوفانی موسم میں کہیں باہر بھٹک رہی ہو اور میں ایک محفوظ چھت کے نیچے بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کی تلاش میں باہر نکلنا ہو گا۔''

وہ بلند آواز سے بڑبڑایا اور برساتی نکال کر اسے پہننے لگا۔ اسی پل ایک زوردار دھماکا ہوا اور اسے در و دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن اس کے اپنے پائے استقامت میں ذرا لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ یہ دھماکا آسمانی بجلی گرنے سے ہوا تھا۔

آرلینڈو کے رنگ بدلتے موسم میں آسمانی بجلی کا گرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگرچہ انہیں یہاں آئے ہوئے بہت طویل عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن چند ماہ میں ہی بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ باقی معلومات بلقیس نے بہم پہنچائی تھیں۔ یہاں دھوپ اتنی شدید نکلتی تھی کہ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگتا تھا۔ اور پھر اچانک ہی

گھرے بادل اُمڈ آتے تھے جو گرج چمک کے ساتھ بارش برساتے تھے۔ یہاں ہری کین، آندھیاں، طوفانِ بادوباراں اور ہوا کے تیز جھکڑ آتے رہتے تھے اس لیے گھروں کی تعمیر بھی ایک خاص طرز پر کی جاتی تھی۔ ہر گھر میں کنڈکٹر نصب ہوتے تھے جو گھر پر بجلی گرنے کی صورت میں اسے زمین میں لے جاتے تھے۔ یوں گھر جل کر خاکستر ہونے سے محفوظ رہتا تھا۔ مکینوں کو کچھ سہنا پڑتا تھا تو محض ایک زوردار دھماکا اور بس۔ اس نے بھی دھماکے کی آواز کو سنا اور یوں نظر انداز کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا تو پیچھے کسی کو اپنی خبر پہنچانے کی بھی فکر نہیں تھی۔ بس فکر تھی تو اس کی جو دنیا میں اس کا واحد رشتہ تھی اور جسے وہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ لوگوں کی رائے کا تو اس نے پہلے بھی یقین نہیں کیا تھا کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے۔ گھر پہنچ کر اسے مزید ثبوت مل گئے تھے کہ وہ یہاں واپس لوٹنے کے لیے ہی گھر سے باہر نکلی تھی اور واپس نہیں پہنچ سکی تھی تو اس کے نزدیک اس بات کا ایک ہی مطلب تھا..... وہ کسی حادثے یا مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے ہر حال میں باہر جانا تھا اور اپنی ماہ بانو کو تلاش کر کے واپس یہاں لانا تھا۔

وہ عجیب عالمِ دیوانگی میں وہاں سے نکلا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی پانی کے تھپیڑے سے اس کے منہ پر پڑے اور لمحہ بھر کے لیے قدم ڈگمگا سے گئے۔ لیکن اس نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھال لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ بارش اتنی شدت سے برس رہی تھی کہ آنکھوں کے آگے پانی کی چادر سی تن گئی تھی۔ یہاں تک کہ چند گز کے فاصلے پر موجود مین گیٹ بھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے خطرناک موسم میں اس جیسا کوئی دیوانہ ہی باہر جانے کا سوچ سکتا تھا چنانچہ وہ جا رہا تھا۔

گیٹ سے اس کا فاصلہ چند فٹ رہ گیا تھا، تب ایک بار پھر بجلی زور سے کڑک کر چمکی اور لمحہ بھر کے لیے اردگرد ماحول روشن ہو گیا۔ اس روشنی میں اسے مین گیٹ صاف نظر آیا اور قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ کئی ماہ کے مسلسل آنے جانے میں وہ اس وسیع و عریض گھر کے زیرِ استعمال حصوں سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اندھیرے میں بھی مین گیٹ کا لاک کھولنے والی ناب کو پکڑ کر آسانی سے گھما سکتا تھا لیکن اس بار عجیب ہی تجربہ ہوا۔ ناب گھومی ضرور لیکن لاک نہ کھلا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن نتیجہ وہی پہلے والا تھا۔ جھلا کر اس نے کچھ اور زور لگایا لیکن ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی پل اسے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے پانی کی دُھندلی سی چادر میں سے اس شخص کو گھور کر دیکھا۔ جواب میں اس نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

''یہاں وقت برباد کرنا بے کار ہیں۔ مسز مصطفیٰ نے گیٹ کو ڈبل لاک لگا رکھا ہے اور دوسرا لاک جس چابی سے کھل سکتا ہے، وہ ان کے پاس ہے۔''

اسلم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حرکت بالخصوص اسے باہر جانے سے روکنے کے لیے کی گئی ہے۔ ورنہ اتنے عرصے میں کبھی ایک بار بھی تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ کبھی گیٹ کو ڈبل لاک لگایا گیا ہو۔ مصطفیٰ خان کی رات میں غیر موجودگی کی صورت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا۔

''میں ابھی ان سے چابی لاتا ہوں۔'' وہ بلند آہنگ میں بولا۔ ویسے بھی ہوا اور بارش کا شور اتنا زیادہ تھا کہ دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بلند آواز میں بولنا ضروری تھا۔

''اوکے۔'' آفتاب نے اس سے بالکل بھی بحث نہیں کی اور دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے گھر کے اس حصے کی طرف بڑھے جہاں مصطفیٰ خان کی فیملی آباد تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصطفیٰ خان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ رئیس ابنِ رئیس تھا اور اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ان کی لمبی چوڑی جائیداد کا اکلوتا حق دار اور وارث بھی۔ کہنے کو اس نے اپنی انجینئرنگ کا استعمال کرتے ہوئے ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازمت کر رکھی تھی لیکن اس کے ٹھاٹھ باٹھ کا اس کی ملازمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے ہر ماہ ٹھیک ٹھاک منافع دینے والا سپر اسٹور بھی اپنے باپ کی جائیداد کے بل بوتے پر خریدا تھا اور یہ وسیع و عریض گھر بھی۔ جس کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ بلقیس چاہتی بھی تو اس کی صفائی ستھرائی کا کام خود نہیں سنبھال سکتی تھی۔ ایک جز وقتی ملازم آ کر یہ کام انجام دیتا تھا۔ وہی ملازم لان کی حالت بھی ٹھیک رکھتا تھا۔ البتہ گھر کا کچن مکمل طور پر بلقیس خود سنبھالتی تھی اور لانڈری بھی خود ہی نمٹا لیتی تھی۔ باغبانی کا اسے خود بہت شوق تھا اس لیے گاہے بگاہے اس طرف بھی نظرِ کرم رہتی تھی۔

مین گیٹ سے رہائشی حصے تک کا طویل فاصلہ طے کر کے وہ دونوں اندر پہنچے تو بلقیس اور کشور منتظر نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''اتنے خراب موسم میں کہاں جا رہے تھے اسلم؟'' بلقیس نے فوراً ہی استفسار کیا۔

''ماہی کو ڈھونڈنے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ، اسلم! مجھے میری ایک ذرا سی لغزش کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرے دل پر موجود بوجھ میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ ابھی میں تم سے نظریں نہیں ملا پا رہی۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو بعد میں ماہ بانو سے سامنا ہونے پر اس کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں گی۔'' وہ بولتے بولتے روہانسی ہو گئی۔

''میں نے آپ کو کوئی الزام نہیں دیا۔'' اسلم اس سے نظر چراتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''صرف زبان سے الزام نہیں لگایا ورنہ تمہاری آنکھیں، چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات مجھے یہی کہتی محسوس ہو رہی ہیں کہ میں تمہاری مجرم ہوں۔''

''پلیز بلقیس باجی! ایسی باتیں مت کریں۔ آپ تو ہمارے محسنوں میں سے ہیں۔ میں آپ کو کوئی دُکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن ابھی میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ ماہ بانو غائب ہے اور میں بس اسے تلاش کرنے جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لاک کھول دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی ورنہ مجھے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔'' اس کی سُوئی ایک ہی جگہ اٹکی تھی۔

''پلیز اسلم! ماہ بانو کی تلاش کا کام تم پولیس پر چھوڑ دو۔ اپنے وسائل کے ساتھ وہ لوگ یہ کام زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔'' اس بار آفتاب نے گفتگو میں مداخلت کی اور اسے سمجھانے لگا۔

''وسائل کتنے ہی ہوں، وہ مجھ جیسی لگن تو نہیں رکھتے ہوں گے نا۔'' اس نے دلیل دی۔

''جذباتی مت بنو اسلم! اگر یہ واقعہ پاکستان میں پیش آیا ہوتا تو تم تشویش میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ جانے پولیس صحیح طور پر کام کرے بھی یا نہیں۔ لیکن یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کتنے ہی بُرے سہی لیکن اپنے فرائض پوری تندہی سے انجام دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تم اس برفانی موسم میں باہر نکل کر کیا کر سکو گے؟ تمہیں تو یہاں کے سارے راستے بھی ڈھنگ سے یاد نہیں ہوں گے۔'' آفتاب عقلی دلائل دے رہا تھا لیکن اس کا معاملہ جذبات کا تھا۔ اس کے اندر کی بے کلی اسے چین سے بیٹھنے کہاں دیتی۔

''میں آپ سب سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت میں کسی کی کوئی بات ماننے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے ہر صورت میں جانا ہی ہو گا۔'' اپنا فیصلہ سنا کر اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے ابھی اس کا ہاتھ دروازے کی ناب پر ہی تھا کہ پیچھے سے اسے بلقیس کی آواز سنائی دی۔

''تمہیں ماہ بانو کی قسم ہے اسلم! اتنے خراب موسم میں تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے اور ماہ بانو کے معاملے میں پولیس کی رپورٹ کا انتظار کرو گے۔''

یہ الفاظ سن کر وہ ٹھٹک گیا اور قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ لیکن پھر لمحہ بھر میں ہی اس کے ساکت قدم حرکت میں آ گئے اور وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اپنے اس جذباتی وار کو ضائع جاتے دیکھ کر بلقیس گرنے والے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ آفتاب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شیشے کے شفاف دروازے سے عام حالات میں مین گیٹ فاصلے کے باوجود صاف نظر آتا تھا لیکن آج درمیان میں آسمان سے برستے پانی کی چادر تن گئی تھی۔ اس اجنبی چادر میں سے اسلم اپنے گہرے رنگ کے لباس کی وجہ سے ایک ہیولے کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ اچانک ایک دم ہی بجلی چمکی اور لمحہ بھر کے لیے روشن ہو جانے والے منظر کو دیکھ کر اس کے حلق سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ جذباتی سا اسلم ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کو رد نہیں کر سکا تھا اور یک دم ہی اپنے قدموں کا رخ واپس انیکسی کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اب اسلم کی نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی ماہ بانو کے نام سے دی جانے والی قسم کی زنجیر میں بندھ گیا تھا۔

''پلیز بھابی! ریلیکس ہو جائیے۔ اسلم کہیں نہیں گیا۔ انیکسی میں ہی ہے۔'' اس نے نڈھال سی بیٹھی بلقیس کو تسلی دی اور پھر کشور سے مخاطب ہوا۔

''آپ بھابی کو کوئی جوس وغیرہ پلائیے اور پھر طوبیٰ کو دیکھیے۔ بچی کتنی دیر سے اپنے کمرے میں اکیلی سو رہی ہے۔ اس سے کھانے پینے کو پوچھیے۔''

''جی اچھا۔'' کشور نے یوں مستعدی سے اس کے احکامات بجا لانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑی جیسے ساری زندگی کی مشق ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنی اونچی حویلی میں تو کبھی اس نے تنکا بھی دُہرا نہ کیا تھا۔ لیکن محبت کی طاقت نے مختصر عرصے میں اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ وہاں سے چلی گئی تو آفتاب ننھی اُمید کو بہلانے لگا جو ماں کے پیچھے جانے کے لیے مچل رہی تھی۔ بچی کو بہلاتے ہوئے بھی اس کا ذہن ماہ بانو کے خواب میں اُلجھا ہوا تھا اور پیشانی پر پھیلنے والا شکنوں کا جال بتا رہا تھا کہ اسلم چاہے اس خلوص کو سمجھ نہ سکے لیکن اس صورتِ حال پر وہ سب ہی بری طرح پریشان ہیں۔

⊛----✪----⊛

''ہم کب تک اِدھر پڑے رہیں گے؟ یہ ہمیں عبدالرحمٰن کا مہمان کہتے ہیں لیکن حقیقت میں قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ ہوتی ہے نا جیلوں میں بڑے لوگوں کے لیے اے کلاس۔ اس میں رہ رہے ہیں ہم۔ کھانے پینے سے لے کر ہر طرح کی سہولت ہے یہاں لیکن ہم اس چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتے اور مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔''

وہ لوگ مال گاڑی میں بھائی جی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد آباد پہنچ گئے تھے۔ یہاں انہیں ایک صاف ستھرے گھر میں رکھا گیا تھا اور ہر طرح کی آسائش بھی دستیاب تھی لیکن لانے والوں نے واضح کر دیا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن سے ملاقات ہونے تک کہیں نہیں جا سکیں گے اور ان کے بارے میں حتمی فیصلہ وہی کرے گا۔ یہ انہیں اس کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا اور یہ انتظار سلّو کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس کے چہرے پر چھائی بیزاری کو دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' سلّو نے فو
جواب دیا۔

''اس کے لیے کوئی پلان ہے تمہارے پاس؟'' شہریار کی سنجیدگی برقرار تھی۔

''ممبئی واپس پہنچ کر کوئی پلان بھی بنالیں گے۔ کم سے کم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے تو بہتر ہوگا
بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''تم غلط نہیں سوچ رہے ہو لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تمہارے بقول عبدالرحمٰن نے ہمیں یہاں قید
رکھا ہے تو لازمی ہے کہ اس کے آدمی ہماری نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ا
سے بھی اُلجھنا پڑے گا جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے کسی کا بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ فرض کرو ہم بلا
نقصان کے ممبئی پہنچ جاتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں پہلے کی طرح سازگار حالات نہیں ملیں گے۔ حلیے میں تبدیلی
کے اپنی تلاش میں پھرنے والے پولیس والوں سے تو شاید بچ جائیں لیکن پریم ناتھ تک رسائی اتنی آسان نہیں
ہوگی۔ وہ اپنی سکیورٹی کی طرف سے ہوشیار ہوگیا ہوگا اور ساتھ ہی ''را'' والے بھی الرٹ ہوں گے کہ اگر کوئی
پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے اپنی گرفت میں لے سکیں۔ یہ مت بھولو کہ ہم پریم ناتھ کے سامنے ا
پاکستانی ہونے اور بھارت میں موجودگی کی وجہ کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں بے حد شدومد
ڈھونڈا جا رہا ہوگا۔ ایسے حالات میں، میں عبدالرحمٰن کی دشمنی نہیں مول لینا چاہتا۔ اس کی طرف سے ایک
اعتبار سے دوستانہ رویّے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مارا ماری کی صورت میں یہ رویّہ تبدیل بھی ہوسکتا ہے ا
ہمارے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہ کریں۔' اس نے بہت رسان سے سلّو
سمجھانے کا فریضہ انجام دیا۔

''عادل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بھائی جی اور عبدالرحمٰن دونوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ
مسلمانوں کے ہمدرد ہیں چنانچہ ہمیں عبدالرحمٰن سے ایک ملاقات ضرور کر لینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے ہم اس
کوئی فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہیں۔''

کلام نے بھی گفتگو میں مداخلت کرتے ہو
ایک امکان پیش کیا۔ اس وقت وہ لوگ گھر کے کشا
لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اس لیے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ ان کی آپس میں کی جانے والی گفتگ
سنی یا ریکارڈ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اطمینان سے گفتگو جاری تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر آپ دونوں کی یہی رائے ہے تو میں بھی اس پر راضی ہو جاتا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ
میرے لیے اس طرح فارغ بیٹھ کر وقت گزارنا بڑا مشکل ہے۔ خیر..... اس مسئلے کا حل بھی نکالا جا سکتا ہے
آپ دونوں بیٹھ کر چائے پئیں، میں ذرا ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھ کر دل بہلاتا ہوں۔'' وہ اپنا چائے
کپ ہاتھ میں لیے اُٹھ گیا اور اندر کا رخ کیا۔

''بہت مختلف مزاج کا بندہ ہے۔ میں حیران ہو کہ اس مہم کے لیے آپ جیسے شخص نے اس کا انتخاب کیا
کیا؟'' اس کے جانے کے بعد کلام نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے یہ بہت کام کا بندہ ہے اس لیے اسے فراغت بالکل اچھی نہیں لگتی
شہریار نے مسکراتے ہوئے سلّو کی طرف داری کی۔

اسی وقت گیٹ کے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ چوکیدار نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔
ہی ایک لینڈ کروزر دندناتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے رُکتے ہی اگلے دونوں دروازے کھٹا کھٹ کھلے اور

طرف سے ڈرائیور اور دوسری طرف سے گن مین برآمد ہوا۔

ڈرائیور نے کمال مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے جو
دُبلا پتلا اور لمبا سا شخص برآمد ہوا، اسے پہچاننے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ عبدالرحمٰن تھا جس سے
وہ اس سے قبل کلام کے ٹھکانے پر پہلے بھی اتفاقاً مل چکے تھے۔ عبدالرحمٰن نے بھی انہیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ لیا
تھا چنانچہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائے سیدھا اسی طرف چلا آیا۔

''معاف کرنا، اپن کو آنے میں ذرا زیادہ ٹائم لگ گیا اور تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ لیکن میں نے اپنے
آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کا اچھی طرح خیال رکھیں۔ تمہیں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی نا؟''
قریب پہنچ کر تینوں سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

''بالکل نہیں، تمہارے آدمیوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا کہ ہمیں اپنی نظروں کے سامنے سے بھی نہیں ہٹنے
دیا۔ وہ دیکھو، ایک پٹھا ابھی بھی گن لیے چھت پر ٹہل رہا ہے کہ کہیں ہم یہاں سے بھاگ نہ جائیں۔'' اس کا
مخاطب شہریار تھا لیکن جواب سلّو نے جلے کٹے لہجے میں دے ڈالا جس پر عبدالرحمٰن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا
پھر مدبرانہ لہجے میں بولا۔

''یہ بے چارے اپنی ڈیوٹی کر رہے تھے۔ اگر تم لوگ مجھ سے ملے بغیر یہاں سے چلے جاتے تو ان کی
شامت آجاتی۔'' اس دوران اس نے ایک کرسی سنبھال لی تھی اور وہ لوگ بھی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔

''آخر تمہیں ہم سے ملنے کی اتنی خواہش کیوں تھی؟ ہم سے تو تمہاری بڑی سرسری آشنائی ہے بلکہ آشنائی
بھی کیا بس ایک اتفاقی ملاقات تھی جس کے بعد تم اپنے راستے اور ہم اپنے راستے چلے گئے تھے۔'' شہریار نے
بے حد سنجیدگی سے اس سے سوال کیا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ ہم اپنے اپنے راستے پر چل رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد بھی تم مجھ سے
ٹکرائے ہو اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے ذرا بات چیت کر کے معلوم تو کریں کہ یہ چکر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے
اپن تمہارے کسی کام آسکے۔'' وہ بھی فوراً سنجیدہ ہوگیا اور شہریار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے
جواب دیا۔

''کیسا ٹکراؤ؟..... اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے اسی مال گاڑی پر چڑھ گئے جس پر
بھائی جی کا مال جا رہا تھا لیکن وہ صرف ایک اتفاق تھا، ورنہ ہمارا تم لوگوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر شہریار ذرا سا چونکا لیکن نگاہیں عبدالرحمٰن کی آنکھوں سے نہیں ہٹائیں اور بالکل اسی
کے انداز میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا رہا۔

''غلط..... بالکل غلط۔ تم مال گاڑی پر چڑھنے سے پہلے بھی ہم سے ٹکرائے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ
تمہیں خود معلوم نہیں ہوا کہ تم کیا کر بیٹھے ہو۔'' عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کی تردید کی تو وہ چونک گیا۔

''کیا مطلب؟''

''کیا تم پولیس کے ریڈ کے ڈر سے سپنا اپارٹمنٹس سے فرار نہیں ہوئے تھے؟'' اس نے ایک اور چونکا
دینے والا سوال کیا لیکن شہریار نے خود کو سنبھال کر رکھا اور بڑے ہموار لہجے میں بولا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، میں اس سے انکار نہیں کروں گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان معاملات سے
تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق.....؟'' عبدالرحمٰن استہزائیہ انداز میں ہنسا اور پھر بولا۔ ''وہ سارا اسٹیج میں نے سجایا تھا۔ اس روز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر تم لوگ وہاں موجود نہیں ہوتے تو منظر بالکل مختلف ہوتا۔

''میں اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔'' شہریار نے ان کے الفاظ اور بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے طور پر کچھ اندازے قائم کر لیے تھے لیکن اس کی زبانی حقائق کو جاننا بہتر سمجھا۔

''تمہیں اپنی اور میری پہلی ملاقات تو یاد ہو گی۔ اس روز میں پولیس کے گھیرے سے نکل کر اس مکان میں پہنچا تھا جہاں تم اور تمہارے یہ ساتھی موجود تھے۔'' اس نے سلّو کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس روز میں ایک پارٹی کے ٹھکانے پر موجود تھا اور اتفاق سے میری موجودگی میں ہی وہاں دو آدمیوں کو غداری کے جرم میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ وہاں شاید ان کا کوئی تیسرا ساتھی بھی موجود تھا جس نے پولیس کو خبر کر دی اور پولیس نے آناً فاناً ریڈ کر دیا۔ لیکن بعد میں مجھے تحقیقات سے معلوم ہوا کہ قاتلوں کو گرفتار کرنا تو بہانہ تھا، پولیس اصل میں میری بُو سونگھتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ وہ جو بھائی جی کا دشمن ہے اشوک، وہ پولیس کے کتوں کو ہڈی ڈالتا رہتا ہے اور وہ لوگ اسے خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج کل اشوک کو بھوت چڑھا ہوا ہے کہ کسی طرح مجھے مروا کر بھائی جی کی کمر توڑ دے۔ اس لیے اُس نے اپنے کتوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ پولیس والوں کو ایک بار سبق سکھا دیا جائے۔ کیونکہ بھتا تو ہماری طرف سے بھی انہیں برابر ملتا ہے لیکن کچھ حرام کے پلّے ایسے ہیں جو سب کھا پی کر بھی ساتھ اپنے ہم مذہبوں کا ہی دیتے ہیں۔ ادھر اپنی طرف مسلمانوں کا رش ذرا زیادہ ہے اس لیے ان کی ہمدردیاں ہمارے بجائے اشوک ''صاحب'' سے ہیں۔'' اس نے اشوک کا نام لیتے ہوئے صاحب پر خصوصی زور دیا۔

''سپنا اپارٹمنٹس میں، میں نے خود جان بوجھ کر اپنی موجودگی کی خبر پولیس تک پہنچائی تھی اور پوری تیاری کے ساتھ ان کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی ایک کو بھی زندہ سلامت نہیں جانے دوں گا لیکن عین وقت پر تم لوگوں کی وجہ سے گڑبڑ ہو گئی۔ تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے اس لیے پولیس سے بچ کر بھاگ نکلنے کے چکر میں اسے اپنے پیچھے لگا بیٹھے اور ہماری ساری تیاری بے کار گئی۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ تمہارا ہمارا تعلق بنتا ہے یا نہیں؟''

شہریار نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور کھوجنے والی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ کہ ''تم ہم سے بھی بڑے چکر میں تھے'' اس کے لیے خاصے معنی خیز تھے۔ ان الفاظ سے اس نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی ڈکی سے پریم ناتھ کو زندہ نکال لیا گیا ہو گا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا ہو گا کہ اسے اغوا کرنے والے پاکستانی ایجنٹ تھے اور اس سے ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن ممبئی کے ایک بڑے گینگ میں خاص اہمیت کا بندہ تھا چنانچہ اس تک بھی یہ خبریں ضرور پہنچی ہوں گی۔ ادھر اتفاق سے وہ خود اس کے بندوں سے آنکرائے تھے اس لیے اس نے ان سے خود ملاقات کرنا بہتر سمجھا اور ساری معلومات جمع کر کے یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ شہریار پر تھا کہ وہ اس ملاقات کا مقصد کھوج کر خود کو اور اپنے ساتھیوں کو کس پوزیشن پر رکھتا ہے۔ ویسے جہاں تک وہ اندازہ لگا پایا تھا، عبدالرحمٰن کا انداز اس کے ساتھ دوستانہ تھا چنانچہ اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے براہِ راست بات کرنا مناسب سمجھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم ہمارے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہو لیکن سوال اب بھی یہی ہے کہ تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

اس سوال کو سن کر عبدالرحمٰن کھل کر ہنسا اور پھر بولا۔ ''اپن تم سے کیا چاہے گا؟ اپن تو خود تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے۔ ہاں، اس چکر میں اگر تھوڑا بہت فائدہ ہمیں بھی پہنچ گیا تو وہ برا نہیں ہو گا۔''

''تم اتنی بڑی پیشکش اپنی ذمے داری پر تو نہیں کر سکتے؟'' شہریار نے اسے کھوجا۔

''تم ٹھیک سمجھے۔ اپن نے بھائی جی سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی تمہیں یہ آفر کی ہے۔'' اس نے نہایت سادگی سے اعتراف کیا۔

''لیکن کیوں؟..... بے شک تم لوگ مسلمان ہو لیکن ہو تو بھارتی شہری اور میں ایسے کئی مسلمانوں کو جانتا ہوں جو بھارت کو اپنا وطن ہونے کی حیثیت سے پاکستان سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہے کہ تم لوگ صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری مدد کرنا چاہتے ہو، وہ بھی ایک ایسے معاملے میں جو دو ملکوں کے درمیان سلامتی اور طاقت کے توازن جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے؟''

وہ عبدالرحمٰن سے بحث کر کے اپنے سارے شکوک و شبہات دور کرنا چاہتا تھا۔ سلّو اور کلام نے اس دوران گفتگو میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن ان دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمے کا ایک ایک لفظ بغور سن رہے تھے۔

''تمہارے سوال اصولی طور پر درست سہی لیکن تم اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہو کہ یہاں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو بھارت میں رہتے ہوئے بھی پاکستان سے محبت کرتا ہے اور کھیلوں سے لے کر جنگ تک کے میدان میں ہمیشہ پاکستان کی سبقت پر خوش اور شکست پر اُداس ہوتا رہا ہے۔ بھائی جی، میں اور ہم جیسے کئی اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ بھائی جی کی پاکستان سے محبت کی چند اہم وجوہات بھی ہیں۔ پہلی وجہ دورانِ تعلیم پیش آنے والا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ بھائی جی ایک لائق اسٹوڈنٹ تھے اس لیے انہیں بڑی آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ کچھ ہندو انتہا پسند لڑکے ان کی ذہانت کو دیکھ کر نہلس ہونے لگے۔ اوپر سے بھائی جی تھے بھی بہت بے باک۔ انہوں نے کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا اور کسی بھی موقع پر بحث چھڑ جانے پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اسلام ہی اصل میں دینِ حق ہے۔ اس صاف گوئی اور بے باکی کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا، وہی نکلا اور ایک روز معاملہ زبانی بحث سے نکل کر ہاتھا پائی تک پہنچ گیا۔

بھائی جی بہادر اور جی دار تھے لیکن اکیلے اتنے سارے لڑکوں کا مقابلہ کہاں تک کرتے۔ نتیجے میں بری طرح زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئے۔ اس پر سے کالج انتظامیہ نے ان سے ہمدردی کرنے کے بجائے واقعے کی ذمے داری ان پر ڈال کر انہیں کالج سے ٹرمینیٹ کر دیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کے سیکولر ہونے کا کتنا بڑا دعویٰ کیا جائے، یہ اصل میں ہندوؤں کی سرزمین ہے۔ بھائی جی کو کالج سے نکالے جانے کا بہت غم ہوا۔ وہ بیمار رہنے لگے۔ ماں باپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو دل بہلانے کے لیے انہیں ساتھ لے کر پاکستان چلے گئے جہاں ان کے بہت سے رشتے دار ہجرت کر کے جا چکے تھے۔

پاکستان جا کر بھائی جی کو بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر اپنے ماموں کے گھر ان کا بہت دل لگا۔ دل لگنے کی وجہ ان کی ماموں زاد تھی۔ سلیقہ شعار، ذہین، مہذب اور خوب صورت لڑکی سے محبت نہ ہوتی تو عجیب ہوتا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ بھی ان سے محبت کرتی ہے چنانچہ اظہارِ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ شادی کی خواہش بھی کر ڈالی۔ جواب میں ان کی ماموں زاد نے جو کچھ کہا، وہ انہیں کبھی نہیں بھول سکا۔ اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بے شک میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں لیکن آپ سے بڑھ کر اس وطن سے محبت کرتی ہوں۔ میرے بزرگوں نے بے شمار قربانیاں دے کر پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں ان کے بچے سکون سے آباد ہو سکیں۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ میں صرف ایک شخص کی محبت میں لاکھوں قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان جا کر کیسے بس سکتی ہوں؟''

ادھر بھائی جی کی مجبوری تھی کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس صورت میں انہیں اپنے والدین سے جدا ہونا پڑتا اور وہ اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ محبت کی بہت سی داستانوں کی طرح ان کی داستان بھی ادھوری رہ گئی لیکن وہ خود بخود ہی اس وطن سے محبت کرنے لگے جس کی خاطر ان کی محبوبہ نے انہیں چھوڑنا منظور کر لیا تھا۔ انہیں ساری زندگی اپنے والدین سے بس ایک ہی شکوہ رہا کہ وہ بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح پاکستان ہجرت کر کے کیوں نہیں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا بھارت میں کبھی دل نہیں لگ سکا۔ پھر حالات بھی موافق نہیں رہے اور قدم قدم پر ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ناانصافیوں نے انہیں انڈر ورلڈ کا حصہ بنا دیا جہاں وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے مقام بناتے ہوئے ممبئی کے بادشاہ بن گئے۔ لیکن ان کی یہ بادشاہت ہندو انتہا پسندوں کو اچھی نہیں لگتی اور وہ اشوک جیسوں کو مقابلے پر لا کر بھائی جی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن الحمدللہ بھائی جی کے ساتھ ان بے شمار مسلمانوں کی دعائیں ہیں جن کے گھر کا چولہا بھائی جی کی مہربانی سے جلتا ہے اس لیے دشمنوں کا منہ ہمیشہ کالا ہوا ہے۔''

اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے عبدالرحمٰن نے جو کہانی سنائی، وہ اپنی جگہ بڑی دلچسپ اور انوکھی تھی۔ اے سی کی جاب سے شروع ہو کر وطن کے محافظ کے روپ میں ڈھل جانے والی عملی زندگی کے مختصر دورانیے میں اسے ایسی کتنی ہی عجیب و غریب کہانیاں سننے کو مل چکی تھیں جنہوں نے زندگی کے حقائق سے جنم لیا تھا لیکن خود غیر حقیقی لگتی تھیں۔

''ٹھیک ہے، میں نے مان لیا کہ بھائی جی پاکستان اور مسلمانوں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں لیکن میں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک بھائی جی سے براہِ راست ملاقات نہ کر لوں۔'' اس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنی شرط بیان کی کیونکہ ہر یقین دہانی کے باوجود یہ خدشہ باقی تھا کہ انڈر ورلڈ کا بادشاہ اس کی مدد کے بہانے یقیناً اپنے بھی کچھ مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

''اس ملاقات کا انتظام ہو جائے گا۔ تم لوگ کل صبح تیار رہنا۔ صبح ہم ممبئی واپس چلیں گے۔'' عبدالرحمٰن نے کوئی بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ قبول کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

⊛----✪----⊛

''فلیٹ کی نگرانی کرنے والا ایک بندہ میری نظر میں آ گیا ہے۔ وہ سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر موجود ہے اور ٹیلی اسکوپ کی مدد سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے آج بھی دو بار اپنی بیوی کو وہاں بھیجا تھا اور وہ نہایت احتیاط سے بس ذرا دیر کے لیے پردہ سرکا کر اوٹ میں رہتے ہوئے باہر جھانکنے کے بعد کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ اس وقت میں خود ٹیلی اسکوپ سنبھالے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا اور جانتے ہو مجھ پر کیا خوفناک انکشاف ہوا؟'' جاوید علی کا ساتھی اسے فون پر رپورٹ دے رہا تھا اور اس کے لہجے میں خاصا ہیجان تھا۔

''کیا انکشاف ہوا؟'' اس کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے رسان سے پوچھا۔

''اس آدمی کے پاس دور مار رائفل تھی اور وہ اسی کے ساتھ منسلک ٹیلی اسکوپ سے فلیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ میری بیوی اگر چند سیکنڈ اور اپنی جگہ پر کھڑی رہتی تو مجھے یقین ہے کہ اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا ہوتا۔''

''اوہ نو.....'' اس کی بات سن کر جاوید علی کو جھٹکا لگا۔ عالیہ کی جگہ اپنے ساتھی کی بیوی کو اس فلیٹ پر چلنے پھرنے کی ہدایت دینے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ دشمن کو وہاں عالیہ کی موجودگی کا یقین آ جائے لیکن وہ لوگ تو تصور سے زیادہ عیار اور گھٹیا نکلے تھے۔ انہوں نے خود کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا تھا کہ عالیہ ہی کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ تو اس کے ساتھی کی بیوی خوش قسمت نکلی کہ گولی چلنے سے پہلے وہاں سے ہٹ گئی ورنہ خود جاوید علی کے حصے میں بے حد شرمندگی اور پچھتاوا آ جاتا۔

''اب تم بالکل بھی اپنی بیوی کو وہاں مت بھیجنا بلکہ اپنے فلیٹ میں بھی احتیاط سے رہنا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی مستقل بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔'' سراسیمگی کی کیفیت میں اس نے اپنے ساتھی کو ہدایات دیں۔

''آف کورس یار! میں یہی کروں گا۔ میری اکلوتی بیوی ہے اور خاصی عزیز بھی۔ میرا کہیں کسی دوسری عورت سے چکر بھی نہیں چل رہا کہ اپنی بیوی سے جان چھڑانے کے لیے اسے موت کے منہ میں بھیج دوں۔'' اس کے ساتھی نے تیزی سے اپنے ہیجان پر قابو پا لیا تھا اور اب ہلکے پھلکے لہجے میں بولتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سوری یار! مجھے اس چکر میں بھابی کو انوالو ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ انہیں ذرا بھی نقصان پہنچتا تو مجھے شدید دکھ اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔'' جاوید علی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''اِٹس او کے۔ غلطی صرف تمہاری نہیں، میری بھی ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسی سچویشن کا خیال نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے بچت کر دی۔ اب ہمیں گزری ہوئی باتوں پر پچھتانے کے بجائے آگے کی بہتر پلاننگ کرنی چاہئے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آگے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ وہ فون نمبر تو ٹریس نہیں ہو سکا جس سے اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کی گئی تھی۔'' اپنے ساتھی سے اتفاق سے کرتے ہوئے اس نے اسی سے مشورہ مانگا۔

اسٹیٹ ایجنٹ کو آنے والی کال کا قصہ یہ تھا کہ کسی نامعلوم آدمی نے فلیٹس کے بیرونی حصے میں نکلی ہوئی دکانوں میں قائم ایک اسٹیٹ ایجنسی پر کال کر کے یہ بات کہی تھی کہ اس نے سنا ہے فلاں نمبر کا فلیٹ کرائے کے لیے خالی ہے اور وہ اس فلیٹ کو کرائے پر لینا چاہتا ہے۔ ایجنٹ نے اسے جواب دیا کہ وہ مالک سے بات کر کے ہی کچھ کہہ سکے گا کیونکہ فلیٹ بے شک کرائے پر تو چلتا ہے لیکن مالک خود براہِ راست کرائے داروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے جاوید علی کے ساتھی سلمان سے رابطہ کیا تھا کیونکہ اس کے علم میں یہی تھا کہ اس فلیٹ کا مالک پڑوس میں رہنے والا سلمان ہے۔ یہ اور بات کہ سلمان کے کرائے دار عموماً سی ایف پی سے ہی تعلق رکھنے والے ایسے افراد ہوتے تھے جنہیں چند ماہ کسی ضرورت کے تحت وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ سلمان نے اسٹیٹ ایجنٹ سے سی ایل آئی پر آنے والا نمبر لے لیا کہ وہ خود اس شخص سے بات کر لے گا۔ ایجنٹ نے نمبر اس شرط پر دیا کہ اسے متوقع کمیشن ادا کیا جائے۔ سلمان نے کمیشن کی رقم ادا کرنے کے ساتھ زبان بندی کی شرط عائد کر دی لیکن رقم دے کر حاصل کیا جانے والا وہ نمبر کسی کام نہیں آیا تھا اور وہ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذریعے کسی تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔

''ابھی تو ہمارے سامنے وہ رائفل والا ہی ہے جو سامنے والی بلڈنگ کی چھت پر گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے چھاپ لیں تو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔'' سلمان نے مشورہ دیا۔

''مجھے شک ہے کہ وہ کرائے کا کوئی قاتل نکلے گا لیکن ٹھیک ہے، اسی کو دیکھ لیتے ہیں۔ کچھ نہ کرنے سے تو یہی بہتر رہے گا۔''

جاوید علی نے مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اس شخص کے خلاف کارروائی کے لیے کیا طریقہ کار بہتر رہے گا۔ کیونکہ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ عالیہ کے سابق آقاؤں نے اردگرد اپنے مزید ہرکاروں کو گھات میں بٹھا رکھا ہو اور وہ جیسے ہی رائفل مین پر ہاتھ ڈالیں، چھپے ہوئے دشمن میدان میں اُتر آئیں۔ مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن اس سے اصل مقصد کا حصول ضرور دشوار ہو جاتا۔ وہ نیچے کے دو چار یا آٹھ دس بندوں کو گرانے میں بے شک کامیاب ہو جاتے لیکن اصل چہروں تک نہ پہنچ پاتے۔

تھوڑے سے غور و خوض کے بعد وہ حکمتِ عملی وضع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق سلمان کو اپنی جگہ پر ہی رہتے ہوئے بدستور نگرانی کا کام انجام دیتے رہنا تھا جبکہ جاوید علی اس ٹیم کو لیڈ کرتا جو رائفل بردار کی گرفتاری کے لیے حرکت میں آتی۔

فون بند کرنے کے بعد جاوید علی اس سلسلے میں انتظامات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے نوٹس پر اس نے سٹی گورنمنٹ کے تحت کام کرنے والے ایک محکمے سے تین گاڑیاں عملے سمیت حاصل کر لیں۔ یہ وہ محکمہ تھا جو شہر میں صحت و صفائی کا ذمے دار تھا اور اس سلسلے میں طے شدہ شیڈول کے مطابق مختلف کیڑے مار ادویات کا اسپرے کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن محکمے کی طرف سے یہ فریضہ کم ہی انجام دیا جاتا تھا اور کرتا دھرتا شہریوں کی صحت و زندگی کا سودا کر کے رقم اپنی جیبوں میں بھر لیتے تھے۔ ایسے سست اور بے پروا محکمے کے ملازم ایک گھنٹے میں مکمل تیاری کے ساتھ حاضر ہو گئے تو اس میں کمال اوپر سے ملنے والے احکامات کا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جاوید علی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ محکمے کی ایک گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ایک ایمبولینس کو بھی الرٹ کر دیا گیا جبکہ سی ایف پی کے چند نوجوان ایک علیحدہ گاڑی میں کسی ممکنہ تصادم سے نمٹنے کے لیے علیحدہ سے پیچھے ہو لئے۔ ان نوجوانوں کو ہر ممکن طور پر خود کو کسی کی نگاہوں میں آنے سے محفوظ رکھنا تھا۔

جاوید علی تین گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچا تو لوگوں نے دلچسپی سے ان گاڑیوں کو دیکھا اور یہ جان کر خوش ہوئے کہ شہری انتظامیہ کو بھی اس بات کا خیال آ گیا ہے کہ مختلف علاقوں میں مچھر مار اور دیگر ادویات کا اسپرے کروایا جائے۔ اس علاقے میں بڑی تعداد میں رہائشی پلازا موجود تھے۔ جاوید علی نے دو گاڑیاں تو عملے سمیت غیر متعلقہ عمارتوں میں اسپرے کے لیے بھیج دیں جبکہ خود اس گاڑی میں اپنے ساتھیوں سمیت موجود رہا، جسے اس پلازا میں اسپرے کا کام انجام دینا تھا جس کی چھت پر رائفل بردار موجود تھا۔

''وہ آپ کی گاڑی کو دیکھ رہا ہے لیکن اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش نہیں کی۔'' پلازا کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایئر پیس میں سلمان کی سرگوشی سنی۔

''اچھا ہے، ہم آسانی سے اپنا کام کر لیں گے۔'' اس نے قدم روکے بغیر جواب دیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی عملے کے دیگر افراد جیسا لباس پہنے ہوئے تھے لیکن دیگر افراد کو سمجھا دیا گیا تھا کہ ان کے کسی کام میں مداخلت نہ کریں اور وہ جو کرتے ہیں، کرنے دیں۔ اس ہدایت کے ملنے پر وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ موجود افراد خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کسی نے ان سے فری ہونے یا مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

پلازا پرانا تعمیر شدہ تھا اور یہاں لفٹ کا انتظام نہیں تھا اس لیے انہیں چار منزلیں طے کر کے چھت تک جانے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ چھت پر جانے والی ان سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا مضبوط جالی دار دروازہ موجود تھا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ پلازا کے مکینوں کو کھلے عام چھت پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ کنڈی کے ساتھ لٹکے تالے نے اس خیال کو مزید تقویت بخشی۔ تالا کھلا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی چابی منسلک نہیں تھی اور زیادہ تر یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ تالے کو نقب زنی کے کسی حربے سے کھولا گیا ہوگا۔ ایک مبینہ کرائے کے قاتل کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا تھا۔

جاوید علی اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے کھلی چھت پر پہنچ گئے اور پہلی نظر میں ہی انہوں نے اس شخص کو دیکھ لیا جو وسیع و عریض چھت پر پانی کی ٹینکی کے قریب زمین سے چپکا لیٹا تھا اور اس بات سے قطعی بے نیاز تھا کہ چھت سورج کی گرمی سے تپ چکی ہے۔ اس کی توجہ اب بھی یقیناً سامنے والی بلڈنگ کی اس کھڑکی کی طرف مبذول تھی جہاں اس کے خیال میں عالیہ کو نمودار ہونا تھا۔ اسپرے کرنے والی گاڑیوں کا شاید اس نے اس لیے نوٹس نہیں لیا تھا کہ سمجھ رہا ہوگا وہ لوگ نیچے فلیٹس تک اسپرے کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ان لوگوں کے چھت پر آنے اور اسے دیکھ لینے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والوں نے یہ سارا کھڑاگ پھیلایا ہی اس تک پہنچنے کے لیے تھا۔ جب تک اسے چھت پر کسی کی موجودگی کا اندازہ ہوتا، صورتِ حال اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور وہ بیک وقت تین افراد کے نشانے پر تھا۔ اسے ہاتھ اٹھاتے ہی بن پڑی۔

ایک خطرناک رائفل کے ساتھ پکڑے جانے کے باعث وہ یہ پوچھنے کا تو اہل ہی نہیں تھا کہ اسے کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے خود کو گھیرنے والوں کی حیثیت کے بارے میں بھی کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ جاوید علی اور اس کے ساتھی اس ادارے کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے جس کا باقی عملہ اپارٹمنٹس میں کیڑے مار ادویات کا اسپرے کر رہا تھا لیکن یقینی طور پر ایک گھاگ مجرم یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ صرف بہروپ ہے جو اس تک پہنچنے کے لیے بھرا گیا ہے۔

''ہاتھ سر پر رکھ لو۔ کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنے کی غلطی مت کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔'' جاوید علی نے غراتے ہوئے اسے دھمکی دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں فوراً حرکت میں آ گئے۔ ایک ہاتھ اٹھائے شخص کے عقب میں پہنچا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس شخص کی جامہ تلاشی لینا چاہتا ہو لیکن عقب میں پہنچ کر اس نے بالکل اچانک ہی اپنی گن کا دستہ اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ یہ ایک بچا تلا وار تھا جس نے اس شخص کو فوراً ہی تیورا کر زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ دھپ کی زوردار آواز سے منہ کے بل گرا اور گرنے کے باعث اسے خاصی چوٹیں بھی آئیں جن میں پیشانی پر اُبھرنے والا گومڑ اور پھٹ جانے والے ہونٹ سب سے نمایاں تھے۔

وہ حالتِ بے ہوشی میں تھا۔ اسے بے ہوش کرنے والے نے پھرتی سے اس کی جامہ تلاشی لینا شروع کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی۔ جاوید علی مطمئن سا فون پر مصروف ہو گیا۔

''ہاں سلمان! کیا رپورٹ ہے؟''

''کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ٹیلی اسکوپ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے بلڈنگ کی چھت پر کی جانے والی ان کی کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

''ٹھیک ہے، ایمبولینس بھجوا دو اور ریزرو پارٹی سے کہو کہ چوکنا رہیں۔ اگر کوئی ہمارا پیچھا کرتا ہے تو انہیں اسے سنبھالنا ہوگا۔''

اس نے سلمان کو ہدایات دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران نہ صرف تلاشی لینے والے نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا بلکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی جدید طرز کی ٹیلی اسکوپک رائفل کے پارٹس کو کھول کر اسے تین حصوں میں منقسم کرنے کے بعد قریب ہی پڑے ایک چھوٹے سے بیگ میں منتقل کر چکا تھا۔ گھسا پٹا سا یہ بیگ بالکل اس طرز کا تھا جو پلمبر یا الیکٹریشن وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس بیگ میں تین حصوں میں منقسم ہو جانے والی رائفل رکھے جب وہ شخص پلازا میں داخل ہوا ہوگا تو کسی کو اس پر شک بھی نہیں گزرا ہوگا اور یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کسی فلیٹ کے مکین نے اپنی ضرورت کے تحت اس شخص کو کال کر کے بلوایا ہے۔

''اب چلنا چاہئے۔'' دور سے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر جاوید علی نے کہا اور پھر وہ تینوں اس بے ہوش آدمی کو اٹھا کر نیچے لے جانے لگے۔

''یہ سیڑھیوں سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔'' نیچے پہنچ کر جب کسی نے استفسار کیا تو بغیر رکے یہ مختصر جواب دے کر وہ آگے بڑھتے گئے۔

وہ نوجوان جو شاید اس پلازا کے ہی رہائشی تھے، مدد کے لیے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی ایمبولینس وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ اوپر سے اس کے ہوٹر کی آواز سنتے ہوئے آئے تھے۔ زخمی کو تیزی سے ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور دونوں نوجوانوں کو روک کر وہ تینوں بھی اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کو منزل کا علم تھا اس لیے اس نے فوراً ہی پوری رفتار سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پیچھے ان کے ساتھ آنے والا شہری حکومت کا عملہ حسبِ ہدایت اپنا کام کرتا رہا۔

جاوید علی اور اس کے ساتھی بالکل چوکنا بیٹھے اپنے گرد و نواح خصوصاً عقب پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب تک انہیں ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی جس پر یہ شک گزرتا کہ وہ ان کے تعاقب میں ہے۔ کافی فاصلے سے آتی اپنے ساتھیوں کی گاڑی البتہ انہوں نے پہچان لی تھی۔ وہ ایک ایسی سڑک پر سفر کر رہے تھے جو بہت دور تک سیدھی چلتی جا رہی تھی اور کافی آگے جا کر دو حصوں میں منقسم ہوتی تھی۔ اس دوراہے پر پہنچ کر ڈرائیور نے ایمبولینس کو دائیں طرف کی سڑک پر موڑ دیا۔ دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باعث اس سڑک پر ٹریفک کا اژدھام کم ہو گیا تھا۔

''سر! ٹرننگ سے دو گاڑیاں ایمبولینس کے پیچھے آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کے تعاقب میں ہیں۔'' پیچھے موجود گاڑی میں سے جاوید علی کو اس کے ایک ماتحت نے اطلاع دی تو اس نے بیک ویو مرر پر نظر ڈالی۔ اسے فوراً ہی ساتھ ساتھ چلتی ایک پراڈو اور شیراڈ نظر آ گئیں۔

''ٹھیک ہے، میں نے ان دونوں گاڑیوں کو دیکھ لیا ہے۔ تم لوگ بھی الرٹ رہنا۔'' اپنے پیچھے والوں کو یہ ہدایت دینے کے بعد وہ پوری توجہ سے ان مشکوک گاڑیوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو مبینہ طور پر ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی گفتگو سن لی تھی اس لیے وہ بغیر کسی ہدایت کے ہی اپنی جگہ

الرٹ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی گنز ان کے گھٹنوں کے درمیان رکھی ہوئی تھیں اور وہ کسی بھی لمحہ ضرورت پڑنے پر فائر کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ان کی طرف سے پہل اس لیے نہیں کی گئی تھی کہ پہلے وہ آنے والوں کے ارادے جاننا چاہتے تھے جو ان پر اگلے چند سیکنڈوں میں ہی واضح ہو گئے۔

شیراڈ کے ساتھ ساتھ چلتی پراڈو کی رفتار میں یک لخت اضافہ ہوا اور وہ ایمبولینس کو اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جس لمحے پراڈو، ایمبولینس کو اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، جاوید علی کی نظریں اس میں سوار افراد سے چار ہوئیں۔ ڈرائیور کے علاوہ تقریباً سب ہی لوگ ایمبولینس کی طرف متوجہ تھے۔ نظریں ملنے پر ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے دیکھا اور پھر پراڈو آگے نکل گئی۔

''خیال رکھنا، ہمیں ان میں سے کم از کم ایک آدمی زندہ حالت میں گرفتار کرنا ہے۔'' جاوید علی نے اپنے ساتھ ایمبولینس میں سوار افراد کے پیچھے گاڑی میں موجود اپنے ساتھیوں کو بھی یہ حکم دیا۔

ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور ایمبولینس بری طرح لہرائی۔ شیراڈ سے اس کے پچھلے پہیے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ردِعمل میں فوراً ہی ایک دوسرا دھماکا گونجا اور شیراڈ لہرائی۔ یہ فائر جاوید علی کے پیچھے آنے والے ساتھیوں میں سے کسی نے کیا تھا۔

پے در پے ہونے والے فائروں نے اس سڑک پر چلنے والی دوسری گاڑیوں کے ڈرائیورز کو ہراساں کر دیا تھا جو ان کے قریب تھے۔ وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گئے جبکہ پیچھے والوں نے مزید آگے آنے کی جرأت نہیں کی۔ کچھ وہیں گاڑیاں روک کر کھڑے ہو گئے اور کچھ واپس موڑنے لگے۔ ادھر ایمبولینس اور شیراڈ دونوں ہی کے ڈرائیوروں نے مہارت سے اپنی اپنی گاڑیوں کو قابو کر کے سڑک پر روک لیا تھا۔ پراڈو بھی اپنے اور ایمبولینس کے درمیان ٹریفک چھٹنے کے بعد سڑک پر ترچھی ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یوں آگے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔

پراڈو والوں نے رکتے ہی ایمبولینس پر ایک برسٹ مارا۔ نشانہ اس بار بھی پہیے ہی تھے۔ پے در پے ہونے والے دو دھماکوں نے ایمبولینس کے اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہونے کا اعلان کیا۔ ایمبولینس جس کا راستہ پہلے ہی مسدود تھا، بالکل ناکارہ ہو گئی لیکن اس میں سوار کسی فرد کے چہرے پر پریشانی کی معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ پُرعزم ہو گئے تھے۔

''شیراڈ والوں کو بھون ڈالو۔'' جاوید علی مسلسل پیچھے والوں سے بھی رابطے میں تھا۔ اس کی طرف سے حکم صادر ہوتے ہی دونوں طرف سے شیراڈ پر گولیاں برسنے لگیں۔ جاوید علی کے ساتھ ایمبولینس میں سوار اس کے دو ساتھی پیچھے شیراڈ پر فائرنگ کر رہے تھے جبکہ وہ خود ڈرائیور کے ساتھ مل کر پراڈو کی سمت فائر کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح پراڈو کے ٹائر ناکارہ کر دے تاکہ وہ لوگ فرار نہ ہو سکیں لیکن اس کا زاویہ نہیں بن پا رہا تھا۔ بیک وقت چلتے کئی ہتھیاروں سے برستی گولیوں نے فضا کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سڑک پر اپنی گاڑی لا سکتا۔ پہلے سے موجود گاڑیاں بھی کسی نہ کسی طرح نکل جانے کی کوشش میں تھیں۔

فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جاوید علی نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے وہاں بھی صورتِ حال کی خبر دے دی۔ اس دوران ایمبولینس کا ڈرائیور پراڈو کے ایک ٹائر کو ناکارہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ بے تحاشا ہوتی فائرنگ میں سب کے سب نشستوں کے درمیان دبک کر محتاط پوزیشن میں فائر کرنے پر مجبور تھے لیکن نہیں اندازہ تھا کہ ان کا دشمن بھی ان سے بہتر پوزیشن میں نہیں ہے۔ وہ تقریباً برابری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم مجھے کوّر دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح نیچے اُتر جاؤں۔'' جاوید علی کوشش کر کے ایمبولینس کے اگلے حصے میں پہنچ گیا اور ڈرائیور سے جو اُن ہی کا آدمی تھا، کہا۔

''اس میں خطرہ ہوگا سر!'' وہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔

''ہم جان کی بازی لگانے کا عہد کر کے میدان میں اُترتے ہیں پھر کسی خطرے سے کیا ڈرنا۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔'' جاوید علی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا جس کے بعد ڈرائیور مزید کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔

برستی گولیوں میں گاڑی سے اُتر کر اس کے نیچے سرک جانا یقیناً ایک مشکل کام تھا لیکن جاوید علی نے کامیابی سے یہ کارنامہ سرانجام دے لیا لیکن اس کی اسے قیمت ادا کرنی پڑی۔ کسی طرف سے آنے والی ایک گولی اس کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی لیکن یہ زخم اس کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ یہ وہ جاوید علی تھا جس سے نواب نوازش علی کی کوٹھی میں راج کرتی خواجہ سراؤں کی مسلح افواج کو تن تنہا قابو کیا تھا۔ وہیں وہ محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہوا تھا اور نواب کی بیٹی شازمین کو دل دے بیٹھا تھا۔ شازمین بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ لیکن دشمن کی سازشوں کے نتیجے میں ایک ایسے وقت جب وہ ہسپتال کے بستر پر زخموں سے چُور چُور پڑا تھا، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس نے رگوں کو کاٹ دینے والا شازمین کا جدائی کا غم بہت حوصلے سے سہا تھا اور دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لے گا۔ اس کے سامنے شازمین کے قاتلوں کی صورت میں کوئی ایک چہرہ نہیں تھا بلکہ وہ ہر وطن دشمن میں اس کے قاتل کو ڈھونڈتا تھا اور انہیں نیست و نابود کر کے سکون پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے مقابل کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ ''را'' کے سورما ہیں اس لیے اس کے جذبے کے ماند پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایمبولینس کے نیچے لیٹ کر اس نے اپنی گن سیدھی کی اور پراڈو کی طرف فائر کر دیا۔ اس بار اسے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور پراڈو کا اگلا ٹائر برسٹ ہوگیا۔ پراڈو والوں نے بھی بلا تکلف جوابی فائر کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ان پر ایمبولینس کے نیچے سے فائر کیا گیا ہے اس لیے اسی طرف رخ کر کے برسٹ مارا تھا۔ جاوید علی نیچے ہونے کی وجہ سے گولیوں سے تو محفوظ رہا لیکن گولیوں سے اُکھڑنے والی سڑک کا ایک ٹکڑا اُڑ کر اس کے ماتھے پر آ لگا۔ زخم آنکھ سے بس ذرا ہی اوپر لگا تھا۔ فوراً ہی خون بہنے لگا جو اس کی آنکھ تک بھی پہنچ گیا۔ اس نے خون کی وجہ سے دُھندلا جانے والی اپنی بصارت کو آستین کی مدد سے صاف کر کے واضح کرنے کی کوشش کی اور دوسرے ہاتھ سے زخم کو زور سے دبا کر پکڑ لیا تاکہ خون کے بہاؤ کو روک سکے۔

''آپ ٹھیک ہیں نا سر؟'' اپنے کان سے لگے ریسیور پر اسے اپنے ایک ساتھی کی پُرتشویش آواز سنائی دی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ اپنا دھیان پوری طرح دشمن پر رکھو۔ مجھے لگتا ہے کہ پراڈو والے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

اس نے گن اپنے ہاتھ سے رکھ دی تھی لیکن اپنی تمام حسیات کو دشمن پر ہی مرکوز کر رکھا تھا اس لیے وہاں ہونے والی غیر معمولی سرگرمی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ لوگ وقفے وقفے سے فائر کرتے ہوئے پراڈو چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پراڈو جیسی گاڑی کی وجہ سے انہیں ایک اچھی ڈھال بھی مل گئی تھی جس کی آڑ میں وہ اپنے فرار کی کوشش جاری رکھے

ہوئے تھے۔

یک دم ہی ان کی مخالف سمت سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں اور یوں لگا کہ پراڈو والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ فائرنگ کے شور کے باوجود جاوید علی نے واضح طور پر انسانی چیخیں سنیں۔

''ہم پہنچ گئے ہیں۔'' یک دم ہی اس کے کان کے ساتھ لگے آلے میں ذیشان کی جاں فزا آواز گونجی تو وہ مسکرا کر وہیں لیٹ گیا۔ سر اور بازو میں لگنے والے زخم صرف تکلیف ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ ان سے جاری خون نے اسے خاصی حد تک کمزور بھی کر دیا تھا۔ لیکن وہ لیڈر ہونے کی حیثیت سے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ذیشان اور اس کے ساتھیوں کی وہاں موجودگی نے اسے اطمینان بخشا اور اس نے نہایت ہموار لہجے میں جواب دیا۔

''میں زخمی حالت میں ایمبولینس کے نیچے پڑا ہوں سر! اب اس مشن کی کمان آپ کو سنبھالنی ہوگی۔'' اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آنے والے اپنا کام بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

⊛----✪----⊛

بڑھی ہوئی شیو، اُلجھے بال، ملگجا لباس اور چہرے پر کھنڈی زردی..... یہ اسلم تھا جسے ماہ بانو کی جدائی نے اس حال تک پہنچا دیا تھا۔

ایکسی کے دروازے پر کھڑے آفتاب نے نہایت تاسف سے اسے دیکھا۔ وہ خود محبت کے جذبے سے آشنا تھا اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ محبوب سے جدا ہو جانے والا یہ شخص اذیت کی کس انتہا سے گزر رہا ہوگا۔ ماہ بانو کی قسم دیئے جانے پر وہ طوفان میں باہر جانے سے تو رک گیا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ اپنے آپ سے بھی جدا ہو گیا ہو۔ خوراک کے نام پر بلقیس اور کشور بڑی مشکلوں سے اب تک اسے فقط آدھا گلاس دودھ، ایک کپ کافی اور دو بسکٹ کھلانے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ دو دن میں لی جانے والی یہ غذا ایک جوان مرد کے لیے تو کیا کسی شیر خوار بچے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ لیکن اسلم کو اس سے زیادہ مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اپنے اندر کی تمام تر وحشتوں کے ساتھ اس نے اگر ان سے اتنا تعاون بھی کیا تھا تو خود پر خاصا جبر کر کے ہی کیا ہوگا۔

''اسلم.....!'' آفتاب نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے آہستہ سے پکارا۔ جواباً اس نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر محض آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

''پولیس آفیسر تم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔'' آفتاب نے اسے اطلاع دی تو وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس سے کچھ بھی کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ پولیس آفیسر کو مصطفیٰ خان کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔ اسلم، آفتاب کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔

''کچھ معلوم ہوا آفیسر؟'' اسلم نے بے تابی سے اس سے سوال کیا۔

''ہاں۔ لیکن شاید وہ تمہارے لیے ناپسندیدہ ہو۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا جس پر اسلم کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھال لیا اور آہستہ سے بولا۔

''میں سننا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری وائف کو کلینک کے قریب واقع ایک اسٹور پر سے کسی شخص کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پھر وہ اسی آدمی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بھی نظر آئی تھی جہاں ان دونوں نے کافی پی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر تمہاری بیوی اور وہ آدمی ایک گاڑی میں ساتھ بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ عینی شاہدین کے مطابق وہ اپنی مرضی سے اس آدمی کے ساتھ گئی تھی اور ذرا بھی خوف زدہ یا ہراساں نہیں لگتی تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہو۔ بدقسمتی سے وہاں موجود کسی شخص کو گاڑی کا نمبر نوٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ورنہ ہم تمہیں اس جگہ تک بھی پہنچا دیتے جہاں وہ اس شخص کے ساتھ رہ رہی ہو گی۔''

پولیس آفیسر کے الفاظ نے اسلم کے چہرے پر سرخی پھیلا دی لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں اس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''سوری مسٹر! فی الحال ہم طوفان کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے اس کیس پر ابھی کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی صورتِ حال واضح ہے اور ہم کسی عاقل و بالغ شخص کے اپنی مرضی سے کہیں جانے پر پابندی عائد نہیں کر سکتے۔ اگر وہ تم سے بیزار ہو کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔''

اس نے نہایت بے رحمی سے اپنے معاشرے کی اقدار کے مطابق اسلم کو جواب دیا۔ اس بار اسلم خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر دہاڑا۔

''بکواس بند کرو۔ میں تمہیں اپنی پاکباز بیوی کے خلاف ایسے الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' ممکن تھا کہ وہ پولیس افسر پر حملہ بھی کر دیتا لیکن آفتاب نے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے اسے پہلے ہی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔

''جو سچ تھا، وہ میں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے تم تک پہنچا دیا۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اس سچ کو مان لو یا خود کو دھوکا دے کر بہلاتے رہو۔''

افسر نے طنزیہ انداز میں کہا اور اپنی کیپ سر پر جماتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی بلقیس اور کشور بھی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر گہری افسردگی تھی۔

''آپ دونوں میری ماہی کو جانتی ہیں نا۔ اس کی پاکبازی کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے اور وہ پولیس والا اس پر اتنا بڑا الزام لگا کر چلا گیا۔ بے وفا عورت ایسی ہوتی ہے کیا جو گھر سے نکلتے وقت گھر کو چمکا کر نکلے اور عجلت میں بھی شوہر کے پسندیدہ کھانے کی تیاری کر کے جائے۔ اس کی پاکبازی کا مجھ سے بڑھ کر کون گواہ ہو سکتا ہے؟..... میں نے اسے پرکھا اور برتا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہے، میں مر کر بھی ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتا جس سے اس کی عزت پر حرف آتا ہو۔ اسے اپنی آبرو اتنی عزیز نہیں ہوتی تو اتنے امتحانوں سے کیونکر گزرتی؟ چاند میں بھی داغ ہے لیکن میری ماہ بانو بالکل بے داغ ہے اور میں یہ ثابت کر کے رہوں گا۔''

رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ بولتے ہوئے اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا تو کشور خاموش نہیں رہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کے طویل امتحان کے سفر کا آغاز اس کے باپ کی بدنیتی سے ہی ہوا تھا۔ چنانچہ دل میں گہرا احساسِ ندامت تھا۔ بولی تو آواز اس احساس سے بوجھل تھی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اسلم صاحب! واقعی ماہ بانو ایک مثالی لڑکی ہے اور اس پر لگائے گئے الزام کو کسی صورت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقیناً کسی مشکل کا شکار ہو گئی ہے اور ہم سب کی دعا ہے کہ وہ اس مشکل سے جلد از جلد نجات پا لے۔''

''بالکل ٹھیک۔ میری بھی اس کے بارے میں یہی رائے ہے اور میرا اور مصطفیٰ کا فیصلہ ہے کہ ہم اسے

تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ میری آج صبح سویرے ہی مصطفیٰ سے بات ہوئی ہے۔ انہیں اس حادثے کا سن کر شدید شاک لگا ہے اور انہوں نے فوری طور پر واپس آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے آنے تک آپ تم تھوڑا سا صبر کر لو۔ ان کے خاصے سورسز ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کھوج لگا لیں گے۔'' بلقیس نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''پلیز بلقیس باجی! اب آپ مجھے کسی طرح مجبور مت کیجئے گا۔ پہلے ہی آپ نے ماہ بانو کی قسم دے کر میرے ہاتھ پیر باندھ دیئے تھے لیکن آپ نہیں جانتیں کہ میں کس کرب اور اذیت سے گزرا ہوں۔ شاید اتنی اذیت تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوتی جب طوفان میں باہر نکلنے کی صورت میں، میں کسی حادثے کا شکار ہو جاتا۔ لیکن خیر، آپ نے جو کیا، میرے بھلے کے لیے کیا۔ اس لیے مجھے آپ سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ لیکن اب آپ مجھے نہیں روکیں گی۔ میں باہر نکل کر خود اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس فکر سے بالکل آزاد ہو جائیں کہ میں دیوانگی میں خود کو کوئی نقصان پہنچا لوں گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ کیونکہ ماہ بانو کی زندگی محفوظ ہونے کا یقین کیے بغیر میں خود بھی نہیں مرنا چاہتا۔ میرے اندر اس کی خاطر زندہ رہنے کی آرزو ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی میری اس خواہش کو رد نہیں کرے گا۔''

ماہ بانو کے غیاب کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنے مربوط اور مضبوط انداز میں کوئی بات کر رہا تھا اور لہجے میں دیوانگی کے بجائے ایک عزم تھا۔ بلقیس سمیت کسی کی بھی ہمت نہیں ہو سکی کہ اس کی خواہش کو رد کر سکے چنانچہ اجازت دیتے ہی بن پڑی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ اور جو معلوم کر سکتے ہو کرو۔ لیکن رات تک لوٹ کر واپس آ جانا۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک مصطفیٰ بھی کسی اچھی خبر کے ساتھ یہاں موجود ہو۔'' بلقیس نے بڑی بہنوں کے سے خلوص کے ساتھ آہستہ سے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' آفتاب نے اسے پیشکش کی۔

''نہیں آفتاب صاحب! آپ مجھے اکیلے جانے دیں۔ آپ پاسبانِ عقل کی طرح ہیں اور فی الحال میرا جنوں آزادی چاہتا ہے۔ میں آپ کو اپنے ساتھ بھٹکانا نہیں چاہتا۔''

اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اتنی قطعیت کے ساتھ جواب دیا کہ آفتاب مزید اصرار نہیں کر سکا اور وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

سب سے پہلے اس نے انیکسی میں جا کر اپنا لباس تبدیل کیا اور بال سنوار کر گھر سے روانہ ہو گیا۔ شیو اس نے نہیں بنائی تھی کہ مزید وقت ضائع ہو گا۔ لباس کی تبدیلی اور بال سنوارنے کا عمل بھی بس ضرورتاً ہی تھا کہ ذرا مہذب حلیے میں موجود بندے کی بات لوگ نسبتاً زیادہ توجہ سے سنتے ہیں۔ گھر سے نکل کر اس نے اس علاقے کا رخ کیا جہاں وہ کلینک واقع تھا جس میں ماہ بانو اپنے روٹین کے چیک اپ کے لیے گئی تھی۔ کلینک کے اندر جا کر کچھ معلوم کرنا بے سود تھا کیونکہ یہ کوشش وہ اسی دن کر چکا تھا جس دن ماہ بانو غائب ہوئی تھی۔

اس روز اس نے غصے اور جذبات میں کلینک کے ایک ملازم کو بھی اس کی بدزبانی کا ٹھیک ٹھاک سبق سکھا ڈالا تھا۔ اس لیے اب اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی اس سے تعاون کرتا۔ اس نے کلینک کے قرب و جوار میں واقع شاپس اور ریسٹورنٹس سے معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

پولیس مین نے اسے یہ تو بتایا تھا کہ ماہ بانو کو ایک اسٹور اور ریسٹورنٹ میں کسی آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سا ریسٹورنٹ یا اسٹور تھا۔ اس علاقے میں صرف دو ریسٹورنٹس تھے جبکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاپس بہت ساری تھیں۔ اس نے پہلے ریسٹورنٹس سے کام کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ ماہ بانو کی تصویر اس کے پس میں موجود رہا کرتی تھی۔ یہی تصویر دکھا کر اس نے پہلے پڑنے والے ریسٹورنٹ کے عملے سے ماہ بانو کے بارے میں جاننا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا البتہ ایک ویٹریس نے اتنا ضرور بتایا کہ اس سے قبل ایک پولیس سارجنٹ بھی اس لڑکی کی تصویر لیے اسے ڈھونڈنے وہاں آ چکا ہے۔

اسلم سمجھ گیا کہ سارجنٹ نے تصویر ہسپتال کے ریکارڈ سے حاصل کی ہو گی۔ ویٹریس کے بیان سے اس کی بھی تصدیق ہو گئی کہ پولیس افسر نے یونہی آ کر انہیں کوئی داستان نہیں سنا ڈالی تھی بلکہ واقعی وہ ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ سے مایوس ہو کر وہ دوسرے میں چلا گیا۔ یہاں اس نے ریسیپشن سے کام کا آغاز کیا۔

''بہتر ہے آپ یہاں کے منیجر سے مل لیں۔ وہ اس سلسلے میں زیادہ بہتر طور پر آپ کی مدد کر سکیں گے۔'' ریسیپشن پر موجود لڑکی نے تصویر دیکھتے ہی اس سے کہا اور انٹرکام پر منیجر سے بات کرنے لگی۔

''آپ سیدھے ہاتھ چلے جائیں۔ وہیں آپ کی منیجر سے ان کے دفتر میں ملاقات ہو جائے گی۔'' ریسیور واپس رکھنے کے بعد اس نے کاؤنٹر سے دائیں جانب جانے والی گیلری کی طرف اشارہ کیا۔

اسلم دل میں ایک اُمید سی لیے اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ گیلری میں پہلے کمرے کے دروازے پر ہی منیجر کی تختی لگی تھی۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گیا۔ ایک فربہی مائل تقریباً پینتالیس سالہ خوش لباس شخص نے اس کا استقبال کیا۔

''مجھے ریسپشنسٹ نے بتایا ہے کہ آپ وہ بدقسمت آدمی ہیں جن کی بیوی دو دن قبل کہیں غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اور میرے عملے نے اس سلسلے میں سارجنٹ مورس سے مکمل تعاون کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس نے آپ کو بھی معلومات فراہم کر دی ہوں گی اس لیے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کی یہاں آمد کا کیا مقصد ہے؟''

اس سے ہاتھ ملانے کے بعد منیجر نے خود ہی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس کا لہجہ مہذبانہ لیکن الفاظ حوصلہ شکن تھے۔ وہ گویا دبے لفظوں میں اسے یہ جتا رہا تھا کہ ایک ایسی عورت کے لیے جو اسے چھوڑ کر بھاگ چکی ہے، وہ کیوں خوار ہوتا پھر رہا ہے۔

''ہاں، اس نے مجھے بتا دیا تھا لیکن مجھے اس کی فراہم کردہ معلومات پر یقین نہیں آیا اس لیے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اسلم نے خود پر بے پناہ ضبط کرتے ہوئے اسے جواب دیا کیونکہ وہ ہر ایک سے لڑ جھگڑ کر یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اُس ویٹریس کو بلا دیتا ہوں جس نے اُس جوڑے کو سرو کیا تھا۔ آپ خود ہی اس سے بات کر لیں۔''

منیجر اس سے کہہ کر خود انٹرکام پر مصروف ہو گیا جبکہ اسلم کے سینے میں ایک آگ سی دہکنے لگی۔ ''جوڑے'' کے لفظ نے اسے شدید تکلیف پہنچائی تھی۔ اس نے اس حقیقت کو تو بہت کھلے دل سے تسلیم کر لیا تھا کہ اس سے پہلے ہی ماہ بانو کے دل پر کسی کا قبضہ تھا لیکن وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے نکاح میں ہوتے ہوئے ماہ بانو کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ اس نے بالکل سرخ چہرے کے ساتھ منیجر کو انٹرکام پر بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ کسی روزی نامی ویٹریس کو اپنے کمرے میں بھجوانے کا حکم دے رہا تھا۔

''روزی آ رہی ہے، اس سے مل کر جس طرح چاہے آپ تسلی کر لیجئے گا۔'' ریسیور رکھنے کے بعد منیجر نے اسے اطلاع دی تو وہ فقط سر ہی ہلا سکا۔

دو منٹ سے بھی کم وقت گزرا ہو گا جب کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور ملائم نسوانی آواز نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ منیجر کے ''یس'' کہنے پر اپنی آواز ہی کی طرح لوچ دار اور ملائم نظر آنے والی تقریباً اٹھارہ اُنیس سالہ لڑکی نے اندر قدم رکھا۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی تھی جس کی لمبی ٹانگیں اس منی اسکرٹ میں اور بھی نمایاں ہو رہی تھیں جو وہاں کام کرنے والی لڑکیاں یونیفارم کے طور پر پہنتی تھیں۔

''روزی! یہ ان خاتون کے شوہر ہیں جن کے بارے میں سارجنٹ مورس نے تم سے معلومات حاصل کی تھیں۔ چونکہ تم نے ہی ان خاتون اور ان کے ساتھی کو سرو کیا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں ان سے ملوا دوں۔''

منیجر نے ایک طرح سے تعاون کی رسم ادا کی تو روزی نامی وہ ویٹریس اسلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں سر؟'' اس نے نہایت شائستگی سے اسلم سے دریافت کیا۔

''پہلے تم یہ تصویر دیکھ لو اور مجھے بتاؤ کہ کیا یہ وہی خاتون ہیں جن کے بارے میں تم نے سارجنٹ مورس کو بتایا تھا؟''

اسلم کے دل میں یک دم ہی خیال آیا تھا کہ ہو سکتا ہے ہسپتال کے ریکارڈ میں موجود پاسپورٹ سائز تصویر نے ویٹریس کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو، اس لیے اس نے اپنے پرس میں موجود تصویر اس کے سامنے کر دی۔

روزی نے چند سیکنڈ تک تصویر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنے لب کھولے۔

''یس سر!..... یہ وہی خاتون ہیں۔'' اُس کی تصدیق نے اسلم کے دل میں اُبھرنے والی اُمید کی کرن کو بجھا دیا۔

''کیا تم نے ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی گفتگو سنی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے؟''

اسلم نے اذیت کے صحرا سے گزرتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا۔ اسے یہ سوال کرنا بھی ماہ بانو کی توہین کے مترادف لگا تھا لیکن اسے تلاش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

''وہ دونوں شاید پرانے شناسا تھے کیونکہ مرد ماضی کے کسی عمل کے لیے ان خاتون سے معذرت کر رہا تھا اور پھر شاید ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا تھا کیونکہ بعد میں، میں نے انہیں مسکراتے ہوئے ایک ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا۔'' روزی نے جھکی نظروں سے جواب دیتے ہوئے اس کے اندر کی دنیا کو تہ و بالا کیا۔

''آپ کے ہاں نصب کیمروں نے ان کی فوٹیج تو ضرور تیار کی ہو گی۔ کیا آپ مجھے وہ فوٹیج دکھا سکتے ہیں تاکہ میں اپنی بیوی کے ساتھ موجود شخص کو شناخت کر سکوں؟''

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے اتنے ضبط سے کام لے رہا تھا ورنہ وہ تو وہ اسلم تھا جس نے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر ان پر بھی اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ جس کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے تھے اور جو اسلحے کے فیر بھی مقابل کے چھکے چھڑا سکتا تھا۔ یہ تو ماہ بانو ہی تھی جس نے اسے جنگل کی زندگی چھوڑ کر مہذب انسانوں کی دنیا میں آنے پر مجبور کیا تھا اور جس کی خاطر وہ اپنے دیس سے اتنی دور آ بسنے پر راضی ہوا تھا۔ ماہ بانو کی یک ہی نظر اس کے دل کو موم کر دیا کرتی تھی اور اب وہ اس کی جدائی میں خاک ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''روزی! تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔'' منیجر نے پہلے ویٹریس کو وہاں سے روانہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس سلسلے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ فوٹیج پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ آپ چاہیں تو پولیس سے رابطہ کریں۔''

منیجر نے اس انداز میں اسے جواب دیا جس سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اسے مزید اپنے آفس میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اسے یقیناً پولیس سے ہی رابطہ کرنا چاہئے تھا۔ وہ ایک بار فوٹیج دیکھ لیتا تو کم از کم یہ تو اندازہ ہو جاتا کہ ماہ بانو کے غیاب کا سبب بننے والا شخص کون تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس کا کوئی دشمن ہی رہا ہو اور وہ صرف اپنی نرم دلی کے سبب اس کے جال میں پھنس گئی ہو۔ یہ تو وہ بہرحال مان ہی نہیں سکتا تھا کہ اس نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ ماہ بانو کے نام نہ بتانے کے باوجود اس نے یہ بات پہلے ہی سمجھ لی تھی کہ وہ جس شخص کی محبت میں مبتلا ہے، وہ شہریار عادل ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ان دونوں کی آنکھوں میں حیا بھی دیکھی تھی۔ وہ دونوں ہی ایسے نہیں تھے کہ اخلاقی و شرعی حدود کو توڑنے کی کوشش کرتے چنانچہ اسے یقین تھا کہ یہ معاملہ ایسا نہیں جیسا دکھ رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، آپ کے تعاون اور مشورے دونوں کے لیے ہی بہت بہت شکریہ۔'' اسلم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس بار دونوں میں سے کسی نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

اسلم کمرے سے باہر نکل کر گیلری میں پہنچا تو یک دم ہی اس ویٹریس سے ٹکراؤ ہو گیا جس سے کچھ دیر قبل اس نے منیجر کے کمرے میں بات کی تھی۔

ویٹریس نے اس سے کچھ کہے بغیر کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ششدر سا اسلم اسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہاں مزید رُکنا مناسب نہیں ہے۔ کاغذ کا پرزہ اپنی مٹھی میں دبائے وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے اپنی مٹھی کھولی، اس میں دبے کاغذ کو کھول کر دیکھا۔

''رات دس بجے مجھ سے اس پتے پر ملو۔''

مختصر سے اس پیغام کے نیچے ایک پتہ درج تھا لیکن نام نہیں لکھا تھا۔ اسلم کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی اور لگا کہ ماہ بانو کی تلاش میں کوئی بہت اہم پیش رفت ہونے والی ہے۔

لیکن ابھی دس بجنے میں بہت دیر تھی۔ درمیان کے کئی گھنٹے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں گزار سکتا تھا چنانچہ اردگرد کی شاپس سے ماہ بانو کی تصویر دکھا کر معلومات حاصل کرنے لگا۔

ایک اسٹور کے مالک نے تصویر کو شناخت کر لیا۔ اس کے مطابق ماہ بانو نے وہاں سے جیلی، فریش کریم اور آئسنگ شوگر جیسے آئٹمز خریدے تھے اور پھر اپنے ساتھی مرد کے ساتھ اس حالت میں وہاں سے روانہ ہوئی تھی کہ اس نے ماہ بانو کی کمر میں اپنا دایاں بازو حمائل کر رکھا تھا۔ اس سے یہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے۔

اسلم اسٹور کے آخری ریمارکس پر توجہ دینے کے بجائے ماہ بانو کی خریدی ہوئی اشیاء کے بارے میں سوچنے لگا۔ فریج میں تیار کر کے رکھا ہوا کسٹرڈ وہ ماہ بانو کے غیاب کے دن ہی دیکھ چکا تھا اور جو چیزیں اس نے اسٹور سے خریدی تھیں، وہ سب ایسی تھیں جو کسٹرڈ کی سجاوٹ کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یعنی یہ طے تھا

کہ اسے لوٹ کر گھر ہی آنا تھا۔ لیکن جانے وہ کون تھا کہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا اور وہ ایسے غائب ہو گئی جیسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان کھا گیا ہو۔

اسٹور سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد اسے شدت سے اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ وہ اس شخص کو دیکھ سکے جسے ماہ بانو کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ریسٹورنٹ کی طرح اسٹور میں نصب کیمرے کی فوٹیج بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ چنانچہ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ پولیس اسٹیشن جائے اور وہاں سارجنٹ مورس سے مل کر اسے فوٹیج دکھانے پر آمادہ کرے۔ اس نے فوراً ہی اس بات پر عمل کیا اور پندرہ منٹ میں وہاں جا پہنچا۔ راستے میں وہ یہ بات نوٹ کرتا ہوا گیا تھا کہ طوفان کے بعد بحالی کا کام بہت تیزی سے ہوا تھا اور زندگی دوبارہ پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی تھی۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کی خواہش پر جب اسے سارجنٹ مورس کے پاس پہنچایا گیا تو مورس نے اسے اپنے سامنے موجود کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''میں وہ فوٹیج دیکھنا چاہتا ہوں جس میں میری بیوی اور وہ آدمی ایک ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ فوٹیج تمہاری تحویل میں ہیں۔'' اس نے فوراً اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیوں؟'' سارجنٹ نے اس سے یک لفظی سوال کیا۔

''اُس آدمی کو شناخت کرنے کے لئے۔ اس سے مجھے اپنی بیوی کو تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔'' اس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ حقیقتاً اسے سارجنٹ کا رویہ بری طرح چبھ رہا تھا جو شاید اسے تیسرے درجے کا شہری سمجھتے ہوئے اس طرح اس کے کیس میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی اسے لینی چاہئے تھی۔

''تمہاری بیوی کو تلاش کرنا ہماری ذمے داری ہے اس لیے تمہیں چاہئے کہ آرام سے گھر بیٹھ کر انتظار کرو۔ ہمیں جیسے ہی مزید کوئی خبر ملے گی، ہم تم تک پہنچا دیں گے۔'' وہ واقعی تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، یہ تمہارا کام ہے۔ پھر بھی تمہیں مجھے وہ فوٹیج دکھانی چاہئے۔ ممکن ہے کہ میں اس شخص کو شناخت کر سکوں اور پولیس کو اس تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔'' اس نے نہایت ضبط سے کام لیتے ہوئے اس سے اصرار کیا۔

''میں وہ فوٹیج جان بوجھ کر تمہیں نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تم مشرقی مردوں کی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے اگر اس شخص کو پہچان لیا تو سیدھے اس کے ٹھکانے پر پہنچو گے اور غیرت کے نام پر قتل و غارت گری مچا کر رکھ دو گے۔ جسے ظاہر ہے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم مجھ سے یہ اُمید نہ رکھو کہ میں تمہیں وہ فوٹیج دکھانے کی غلطی کروں گا۔''

اس نے ذرا تلخ لہجے میں اسلم کو یہ جواب دیا اور بے نیازی سے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسلم کو اس کا یہ انداز سخت گراں گزرا لہٰذا ذرا تند لہجے میں بولا۔

''مجھے اپنی بیوی کے کردار پر کوئی شک نہیں ہے آفیسر! مجھے یقین ہے کہ وہ کسی دشمن کے ہاتھوں میں پھنس گئی ہے اور میں اسے ہر حال میں وہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

''شواہد تو کچھ اور کہتے ہیں۔'' وہ ذرا طنز سے مسکرایا اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال، ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ تمہاری بیوی مل گئی تو تمہیں اطلاع دے دی جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم میرا مزید وقت برباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مت کرو۔'' اس نے اُکھڑے ہوئے انداز میں اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دے دیا۔

اسلم کا دل چاہا کہ اس کے دو چار دانت تو ضرور ہی توڑ دے لیکن پھر اس پیغام کا خیال آ گیا جو روزی نامی ویٹرلیس نے اس تک پہنچایا تھا۔ ممکن تھا کہ دس بجے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچنے کی صورت میں اسے ماہ بانو کا کوئی کلیو مل جاتا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اگر وہ اس بداخلاق پولیس والے سے اُلجھنے کی غلطی کر بیٹھتا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیتا۔ اس کی عقل نے بہت بروقت اس کے جنون کو قابو کیا اور وہ وہاں سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر اسے اپنے اس روّیے پر آفتاب یاد آ گیا جسے وہ اس لیے ساتھ لانے پر راضی نہیں ہوا تھا کہ کہیں وہ اس کے جنون کے راستے میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ لیکن اب کسی پاسبانِ عقل کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود خود بھی مصلحت پسندی سے کام لے رہا تھا۔

اپنی اس روش پر اس کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لیے اُداس سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ یونہی پیدل چلتے ہوئے اپنا تجزیہ کرنے لگا۔ دو دن جو اس نے گھر میں ہاتھ پیر ہلائے بغیر گزارے تھے، اس کے لیے بڑے قیامت خیز ثابت ہوئے تھے۔ ان دو دنوں میں اس کے اندر سے زندگی کا احساس ختم ہو گیا تھا اور بس یہی دل چاہتا تھا کہ سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ لیکن اب جبکہ وہ ماہ بانو کو عملی طور پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو لمحہ بہ لمحہ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے نہایت سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ کوئی حماقت کرتا تو نتیجے میں سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتا اور کچھ بھی کرنے سے قاصر ہو جاتا۔

اسے اگر ماہ بانو کو تلاش کرنا تھا تو خود بھی آزاد اور زندہ سلامت رہنا تھا۔ دل میں زندہ رہنے کی تمنا جاگی تو یہ بھی احساس ہوا کہ دو دن سے اس نے ڈھنگ سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے جس کے باعث اس کے جسم میں ہلکا ہلکا کمزوری کا احساس جاگ رہا ہے۔ جسم کی مشین کو چلاتے رہنے کے لیے غذا کے ایندھن کی ضرورت تھی تاکہ یہ مشین اپنی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔

وہ خود کو بمشکل آمادہ کر کے ایک کافی شاپ میں جا پہنچا اور کافی کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا۔ جلد ہی وہ دونوں چیزیں اس کی میز پر پہنچ گئیں۔

اس نے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اپنے منہ میں ڈالا۔ اسی پل دل میں یہ خیال آیا کہ نہ جانے ان دو دنوں میں ماہ بانو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ سینڈوچ کا وہ ٹکڑا اس کے حلق میں پھنس سا گیا جسے نیچے اُتارنے کے لیے اس نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا۔ کافی کی گرمی نے اس کی زبان اور حلق کو جلا ڈالا اور بے ساختہ ہی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔ یہ نمی کافی کی جلن کے باعث نہیں تھی بلکہ اس دکھ کے سبب تھی جو مسلسل اس کے سینے کو جلا رہا تھا۔

⊛----✪----⊛

لمبا قد، بے پناہ گوری رنگت، نیلگوں سبز آنکھیں، سیاہی پر غالب ہوتے چاندی جیسے سفید بال اور مضبوط و توانا جسم پر بے پناہ جچتا سفید براق کُرتہ پاجامہ..... یہ حلیہ تھا کبیر خان عرف بھائی جی کا جو بچپن سے بھی تجاوز کرتی عمر کے باوجود بلا جھجک وجیہہ اور ہینڈسم قرار دیا جا سکتا تھا۔

عبدالرحمٰن عرف عبدل کے ساتھ اس سے ملاقات کے لیے جانے والے وہ تینوں پہلی نظر میں ہی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

''تشریف رکھیے۔'' اس کا لہجہ نہایت نستعلیق تھا جس کی ممبئی کے کسی بدمعاش سے اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ظاہری شخصیت کی طرح اس کے لہجے نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

''یہ ملاقات شاید بہت پہلے ہو جاتی اگر آپ کے آدمی ہمیں شیواجی ہوٹل سے یہاں لانے میں ناکام نہ ہو جاتے۔'' شہریار نے مسکاتے ہوئے اس واقعے کا حوالہ دیا جب انہیں مخالف گروپ سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی اندو کی وجہ سے بھائی جی کے گرگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اچھا ہی ہوا کہ وہ لوگ ناکام ہو گئے ورنہ ہماری ملاقات بہت مختلف ماحول میں ہوتی۔'' بھائی جی نے نہایت نرم لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا لیکن کچھ تھا جس نے شہریار کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی اور وہ ایک بار پھر بھائی جی کی شخصیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ نہایت نفیس دکھائی دینے والے اس شخص کی اصل شخصیت کئی پرتوں میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ اس کے سادہ ہونے کا سوال پیدا بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کوئی سادہ آدمی ممبئی کی جرم نگری پر حکومت کر بھی نہیں سکتا تھا۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔ اس صورت میں ہم دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے روبرو ہوتے۔'' شہریار نے بظاہر اس سے اتفاق کیا لیکن بین السطور یہ جتایا کہ ملاقات کے ان لمحات میں دونوں طرف کے لوگ ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں اور کسی کو کسی پر برتری نہیں۔

بھائی جی کے چونک کر اپنی طرف دیکھنے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا پیغام پوری طرح ان تک پہنچ گیا ہے۔ بھائی جی چند ثانیوں کے لیے اسے غور سے دیکھنے کے بعد دھیرے سے مسکرا دیا۔

''نوجوان! تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ تم میں وہ ہمت اور جرأت ہے جو آدمی کو اس کی منزل تک لے جاتی ہے۔ تم بھی اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گے اور مجھے خوشی ہوگی کہ میں اس کام میں تمہاری مدد کر سکوں۔''

''لیکن کیوں؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''عبدل نے تمہیں میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ پھر یہ سوال کس لئے؟''

''میرے نزدیک ہمدردی کے لیے یہ وجہ ناکافی ہے کہ ہم ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آپ کی محبوبہ رہتی ہے۔'' اس نے بلا جھجک کہہ ڈالا لیکن بھائی جی کے چہرے پر اُبھرتے درد کے احساس نے تھوڑا سا شرمندہ کر دیا۔

''میرے نزدیک تو یہ ایک وجہ بھی بہت اہم ہے لیکن ساتھ ہی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ ہم بھارتی مسلمان جو اکثر و بیشتر ہندوؤں کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، نفسیاتی طور پر پاکستان کے استحکام میں ہی اپنی سلامتی محسوس کرتے ہیں۔ میرے جیسے طاقتور یہاں بہت کم ہیں، اکثریت کمزوروں کی ہے اور ان کمزوروں کو یہ آسرا رہتا ہے کہ اگر ان کے ساتھ ظلم ہوگا تو مذہب کے علاوہ بھی بہت سے رشتوں سے جڑے ہونے کے باعث پاکستانی عوام اور حکومت دنیا کے سامنے ان کے حق میں آواز اُٹھائے گی۔ میں اس سوچ کا حامی ہوں اور اپنی طاقتور پوزیشن کے باوجود جانتا ہوں کہ کسی بین الاقوامی فورم پر مجھ جیسے غنڈے کی نہیں، ایک مستحکم حکومت کی بات سنی جائے گی اس لیے پاکستان کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اللہ آپ کی یہ خواہش پوری کرے۔'' اس کی بات سن کر شہریار نے بے ساختہ دعا کی اور مزید بولا۔ ''فی الحال تو ہمارا ملک دشمنوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث بہت مشکل حالات سے گزر رہا ہے اور ہم سمیت بس چند گنے چنے لوگ ہی ہیں جو ان سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں۔ آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسی شخصیت کا ساتھ مل گیا تو ہمارا کام ذرا آسان ہو جائے گا۔ پیچھے ہٹنے والے تو بہر حال ہم نہیں ہیں۔''

''میں اب تک تمہارا ساتھ ہی دیتا رہا ہوں ورنہ بہت ممکن تھا کہ اب تک تم پولیس کی تحویل میں ہوتے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت تم لوگ ممبئی میں سب سے زیادہ مطلوب افراد ہو اور پولیس دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تمہارے اس ساتھی کی رہائش گاہ کو انہوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور اس سے معمولی واقفیت رکھنے والے لوگ بھی اس وقت سخت مشکل میں ہیں۔'' بھائی جی کا اشارہ کلام کی طرف تھا۔

''جس کنٹینر میں چھپ کر تم لوگ احمد آباد سے یہاں پہنچے ہو، اس کا تعلق اگر مجھ سے نہیں ہوتا تو تمہارا اتنی آسانی سے دوبارہ ممبئی میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ کتوں کی طرح تمہاری بُو سونگھتے پھرنے والے خفیہ اداروں کے آدمی اب تک تمہیں چھاپ لیتے۔ بہر حال، یہ سب بتانے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں تم پر کوئی احسان جتاؤں۔ میں صرف اپنے خلوص کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ساتھ ہی تمہیں ان مشکلات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں درپیش ہیں۔ پریم ناتھ نے اپنا جو بیان ریکارڈ کروایا ہے، اس کے بعد تمہارے لیے کوئی آسانی باقی نہیں رہی ہے۔ اور ان حالات میں تمہارے لیے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا بہت ہی دشوار ہوگا۔''

''اس کے باوجود ہم اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' شہریار نے مضبوط لہجے میں اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھیوں کے تاثرات نے اُس کے اس عزم میں شامل ہونے کا اظہار کیا۔

''اور اس کام کے آغاز کے لیے تمہارے سامنے پریم ناتھ کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' بھائی جی نے پورے وثوق سے کہا تو ان میں سے کوئی تردید نہیں کر سکا۔

''میری مان تو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ ایک ایسا درمیانی بندہ ہے جسے خفیہ ادارے تمہیں پھانسنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کریں گے۔ پھر اسے پکڑ کر تمہیں حاصل بھی کیا ہو گا؟ وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں کسی ایسے فرد کا نام بتا دے گا جس کا ''را'' سے تعلق ہو اور جس کی وجہ سے وہ ڈاکٹر فرحان جمیل کو خفیہ اداروں کی تحویل میں دینے میں کامیاب ہوا ہو۔''

''پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ اس کے سوا ہمارے سامنے ایسا کوئی فرد نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مقصد تک پہنچ سکیں۔'' شہریار نے اپنی مجبوری کا اعتراف کیا۔

''ایسا فرد میں تمہیں تلاش کر کے دوں گا۔ میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ یہ چھوٹا سا کام آسانی سے ہو جائے گا۔'' بھائی جی نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا اور پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

''اس کام کے بدلے تمہیں بھی میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟'' شہریار نے چونک کر استفسار کیا۔

''تمہیں میرے مخالف اشوک کو قتل کرنا ہوگا۔'' اس کی فرمائش نے ان تینوں کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ کبیر خان عرف بھائی جی خود اتنے وسائل کا مالک تھا کہ اس کے آدمی اُس کی اس خواہش کو پورا کر سکتے تھے پھر اسے ان سے یہ کام لینے کا کیوں خیال آیا تھا؟ تینوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والی اس اُلجھن کو شہریار نے سوال کی صورت اس کے سامنے رکھ دیا۔

''قتل کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ میں اشوک کو اور اشوک مجھے موقع ملنے پر ہلاک کر سکتے ہیں لیکن صرف اس لیے نہیں کرتے کہ اس صورت میں فسادات کی ایک آگ بھڑک اُٹھے گی اور دونوں طرف کے لوگ انتقام کے چکر میں ایک دوسرے کو کھیت ڈالیں گے۔ لیکن یہ کام اگر تم کر دو تو مجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے

گی بلکہ میں اعلان کر دوں گا کہ ایک ہندوستانی کو قتل کرنے والوں سے انتقام لیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس صورت میں اشوک کے بندے جوق در جوق میری طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اور اس کے بعد پورے ممبئی میں ایسا کوئی طاقتور گروہ باقی نہیں رہے گا جو میرے مقابلے پر آنے کی جرأت کر سکے۔''

بالآخر بلی تھیلے سے برآمد ہو گئی اور ان پر واضح ہو گیا کہ اس سے پہلے بھائی جی ان کی مدد کے لیے جو جذباتی وجوہات پیش کرتا رہا تھا، وہ محض لفاظی تھی اور اس کا حقیقی مقصد وہی تھا جو اس نے اب بیان کیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''تمہیں زخمی دیکھ کر افسوس ہوا لیکن ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ تم نے نہایت کامیابی سے دشمن کی چال کو ناکام بنا دیا۔'' زخموں کی مرہم پٹی کروا کر جاوید علی ہیڈ کوارٹر واپس پہنچا تو وہاں سب سے پہلے عالیہ سے سامنا ہو۔

''تمہارے جذبات کے لیے شکریہ۔ لیکن یاد رہنا کہ زخموں سے سپاہی کبھی نہیں گھبراتا۔ کیونکہ زخم ہی اس کے اصل میڈل ہوتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ کی بات کا جواب دیا تو وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اچھا خاصا خون بہہ جانے کے باعث اس کی رنگت میں ہلکی سی زردی در آئی تھی لیکن اس کے باوجود آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اس کی ذہانت اور جرأت کی گواہی دیتی تھی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں خاتون؟'' جاوید علی نے اسے ٹوکا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ جو لوگ اپنی زندگی کا درست نصب العین متعین کر لیتے ہیں، کتنے بہادر اور کھرے نظر آتے ہیں۔'' اس نے بے خودی کے عالم میں جواب دیا۔

''اس تعریف نے میرا کئی لیٹر خون بڑھا دیا ہے اور امید ہے کہ ڈاکٹر نے مجھے آئرن اور طاقت کی جو دوسری ادویات دی ہیں، اب ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس نے مذاق میں بات اُڑانے کی کوشش کی جس پر عالیہ کھل کر ہنس دی۔

جاوید علی نے محسوس کیا کہ یہ ہنسی اس سے بہت مختلف ہے جو مساج سینٹر میں وہ گاہکوں کو لبھانے کے لیے بکھیرتی تھی۔ یہ وہ خالص ہنسی تھی جو کسی بھی عام سی لڑکی کے ہونٹوں پر بکھرتی ہے۔

''تم اپنی تیاری کر لو۔ آج میں تمہیں اس جگہ لے چلوں گا، جہاں کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔'' گفتگو کے سلسلے کو مزید آگے بڑھائے بغیر وہ اسے ہدایت دے کر خود آگے بڑھ گیا۔

ہسپتال میں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرنے کے علاوہ خون اور گلوکوز کی ایک ایک بوتل بھی لگائی گئی تھی، اس کے باوجود وہ خفیف سی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کمزوری کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا اور ڈاکٹروں کے اصرار کے باوجود چند گھنٹوں سے زیادہ ہسپتال میں رکنے پر راضی نہیں ہوا تھا۔

اسے بے چینی تھی کہ آپریشن میں اپنے حصے میں آنے والی کامیابی کا جائزہ لے سکے۔ ویسے تو اسے وہاں اپنے ساتھ موجود ساتھی کے ذریعے یہ اطلاعات مل گئی تھیں کہ حملہ آوروں میں سے کسی کو بھی زندہ بچ نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں کُل ملا کر آٹھ افراد سوار تھے جن میں سے پانچ تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے، تین کو زخمی حالت میں وہاں سے گرفتار کر کے لے جایا گیا تھا۔ ان میں سے بھی ایک راستے میں دم توڑ گیا جبکہ دو زخمی حالت میں ان کی تحویل میں تھے اور ان سے تفتیش کی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جہاں عموماً مجرموں سے تفتیش کی جاتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ کو میجر صاحب بلا رہے ہیں۔" اس سے قبل کہ وہ اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچتا، اسے راستے میں ایک آدمی نے یہ پیغام دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میجر صاحب سے اس کی مراد ذیشان ہے جو وہاں نصب جدید آلات کی وجہ سے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بھی ماتحتوں کی آمدورفت سے باخبر رہتا تھا۔ حکم کی تعمیل میں وہ فوری طور پر اس طرف روانہ ہو گیا۔

"السلام علیکم سر!" اجازت ملنے پر اندر داخل ہو کر اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام..... آؤ بیٹھو۔" ذیشان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کیسا فیل کر رہے ہو؟"

"مچ بیٹر سر!" وہ مسکرایا۔

"لیکن ڈاکٹروں کا تو کہنا ہے کہ ابھی تمہیں ہسپتال میں رہ کر آرام کی ضرورت تھی؟" ذیشان نے سرزنش کرنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"میں ڈاکٹر کی رائے سے متفق نہیں تھا کیونکہ اپنی باڈی کے بارے میں، میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا تو ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نوجوان نے سی ایف پی میں اپنے انتخاب کو ہر لمحے درست ثابت کیا تھا۔ وہ اتنا باصلاحیت تھا، تب ہی تو جب شہریار، سلو والے کیس پر کام کرنے کراچی گیا تھا، اس نے کراچی یونٹ میں موجود ہر شخص کو چھوڑ کر اپنے ساتھ کے لیے جاوید علی کو منتخب کیا تھا جس نے شازمین کی جدائی کے تازہ زخم کے باوجود بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس کیس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چینی ہے جس پر تم کام کر رہے ہو۔ اطمینان رکھو۔ تم نے جو چند گھنٹے ہسپتال میں گزارے ہیں، انہیں ہم نے ضائع نہیں ہونے دیا اور دونوں گرفتار زخمیوں سے ٹھیک ٹھاک معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ان دونوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ "را" کے لیے کام کرتے ہیں لیکن وہ فائٹنگ ونگ کے بندے ہیں اور صرف ملنے والی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ پلاننگ کے شعبے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پلازا کی چھت پر جس رائفل بردار آدمی کو عالیہ کو قتل کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا، وہ ایک کرائے کا قاتل ہے جو بڑے معاوضے پر ایسے کام نہایت صفائی سے انجام دیتا ہے۔ تمہارا راستہ روکنے والوں کو اس شخص اور گرد و پیش کی نگرانی پر متعین کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ عالیہ کے قتل کی صورت میں کہیں نہ کہیں سے ردِعمل ظاہر ہوگا اور وہ ایسے افراد کو گھیرنے کی کوشش کریں گے جو زیادہ سرگرم نظر آئیں۔ رائفل بردار اپنے مقصد میں تو کامیاب نہیں ہو سکا لیکن تم لوگوں کو اسے ایمبولینس میں ڈال کر لے جاتے دیکھ کر نگرانی کرنے والوں نے سمجھ لیا کہ تم ہی ان کے مطلوبہ افراد ہو۔ چنانچہ انہوں نے تمہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ یہ نہیں جان سکے کہ پیچھے ایک گاڑی میں تمہارے مزید ساتھی بھی موجود ہیں اس لیے خود پھنس گئے۔ دوسرے انہیں تم لوگوں کو زندہ پکڑ کر لانے کی ہدایت کی گئی تھی اس لیے انہوں نے بہت سخت ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ پراڈو والوں کے پاس تو آٹومیٹک اسلحے کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ تک موجود تھے۔" ذیشان نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"ہمیں اغوا کر کے وہ کہاں لے جاتے؟" جاوید علی کا جوش اب بھی قائم تھا۔

"گلبرگ کی ایک کوٹھی کا پتہ بتایا تھا انہوں نے لیکن وہاں ریڈ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہاں موجود افراد ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سامان اور اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔ وہاں سے کوئی ثبوت بھی نہیں ملا۔ اسلحہ روسی ساختہ تھا لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ بس اسلحے اور وہاں موجود ورزش کے آلات دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کچھ لڑنے بھڑنے والے افراد کا ٹھکانہ تھا۔ اس جگہ کو پولیس کی کسٹڈی میں دے دیا گیا

ہے۔ اس کے علاوہ کرائے کے قاتل کو بھی پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس سے تفتیش کر کے پولیس خود ہی معلوم کر لے گی کہ اس نے کہاں کہاں اور کتنے افراد کو قتل کیا ہے۔ اس کیس سے نمٹنے کے لیے پولیس ہی بہتر ہے۔" ذیشان نے اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیا کیونکہ وہ جاوید علی کی اس معاملے میں دلچسپی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی ہم اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے؟" وہ جسم پر زخم کھا کر اتنا نڈھال نہیں ہوا تھا جتنا ان خبروں سے خود کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔

"فی الحال..... لیکن ہمیں مکمل طور پر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی ہمارے پاس وہ دونوں آدمی موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم ان سے مزید معلومات اگلوا سکتے ہیں۔" ذیشان نے اسے تسلی دی تو وہ دوبارہ پُرجوش ہو گیا۔

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں سر!"

"ٹھیک ہے۔" ذیشان نے فوراً ہی اسے اجازت دے دی کہ اس کے اندر جلتے الاؤ پر پانی ڈالنے کے لیے ایسے ٹاسک بہت ضروری تھے۔

اجازت ملتے ہی وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ان دونوں میں سے ایک کی موجودگی کی اطلاع دی۔ وہ شخص ایک کرسی پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کرسی میں نصب ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے حاصل شدہ معلومات کے مطابق یہ گولی کا زخم تھا۔ گولی نے اس کی ہڈی کو توڑ دیا تھا لیکن انہوں نے اسے ہسپتال لے جانے کی زحمت نہیں کی تھی اور سی ایف پی کے ایک ایسے اہلکار نے جو فوج میں میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہا تھا، اس کے پیر سے گولی نکال کر زخم پر بینڈیج باندھ دی تھی۔ یہ کوئی علاج نہیں تھا۔ اس شخص کو باقاعدہ آپریشن کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ اس کے لیے ایسے چونچلے نہیں اٹھا سکتے تھے اس لیے بس اتنے پر اکتفا کیا تھا کہ وہ فوری طور پر مرنے سے بچ جائے۔ اس کے سوجن زدہ چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ معلومات کے حصول کے لیے سی ایف پی کے جوانوں نے بھی اس کی خاطر خواہ مدارت کی تھی۔

اس وقت وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا جو شاید کسی پین کلر کی مہربانی تھی۔ جاوید علی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا تو وہ ایک کراہ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ اپنے سامنے جاوید علی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی اُتر آئیں۔

"موہن..... یہی نام ہے نا تمہارا؟" سپاٹ لہجے میں کیے گئے اس سوال کا جواب اس نے سر کی اثباتی جنبش سے دیا۔

"تم مجھے ایسا کیا بتا سکتے ہو موہن! جو اب تک تم نے میرے ساتھیوں کو نہیں بتایا؟" اس نے اسی سرد لہجے میں پوچھا جو مقابل کے وجود میں خوف کی لہر دوڑا دیتا تھا۔

"مم..... میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میرے پاس بتانے کے لیے اب کچھ نہیں ہے۔" اس نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر میرے پاس تم سے کرنے کے لیے ایسا سلوک ہے جو اب تک میرے ساتھیوں میں سے کسی نے تمہارے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ سرد لہجے میں بولا اور رُوئے سخن پہلے سے وہاں موجود سلمان کی طرف کر لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس کی بینڈیج کھول دو سلمان!''

سلمان نے فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بینڈیج کھلتے ہی موہن کے چہرے پر چھائے خوف اور تکلیف کے تاثرات پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اور منہ سے بے ساختہ ہی سسکاریاں نکلنے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو یقیناً بینڈیج نے کچھ سہارا دیا ہوا تھا، وہ بالکل آزاد ہوگئی تو درد بھی اس کی برداشت سے کھیلنے کے لیے آزاد ہوگیا اور زخم سے ایک بار پھر خون رِسنے لگا۔

''ہم اپنے اپنے وطن کے سپاہی ہیں اس لیے زخم تو ہم دونوں ہی کے حصے میں آئے ہیں لیکن فرق ہماری حیثیت کا ہے۔ تم غاصب اور بدنیت ہو اور اپنی سازشوں سے میرے وطن کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہو جبکہ میں تم جیسوں کے ساتھ اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہا ہوں اس لیے تم سے کوئی بھی سخت ترین رویہ اپنانے میں حق بجانب ہوں۔ ہمارے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ اس وقت میں مختار اور تم قیدی ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں تمہارا قیدی ہوتا تو تم مجھ سے بدترین رویہ اختیار کرتے اس لیے میں بھی بے شمار انسانوں کے قتل میں ملوث شخص سے کوئی بھی سلوک کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گا۔''

وہ عملی قدم اٹھانے سے پہلے اسے نفسیاتی حربوں سے زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور موہن کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے۔

''الیکٹرک راڈ لاؤ سلمان! اور اس کے زخم میں اس جگہ گھسا دو جہاں گولی نے سوراخ کیا ہے۔ اگر اس پر اس کا بھی اثر نہ ہوا تو پھر زخم میں نمک اور مرچیں بھر دینا۔''

یہ احکامات دیتے ہوئے اس کے چہرے سے نرمی کے تاثرات بالکل ختم ہو گئے تھے اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی نوجوان ہے جو کچھ دیر قبل عالیہ سے بہت اچھے موڈ میں بات کر رہا تھا۔

سلمان نے اس کے احکامات پر خاموشی سے عمل کیا اور جب وہ سرخ دہکتی ہوئی راڈ لے کر موہن کے قریب پہنچا تو موہن کا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ سلمان نے راڈ کو اس کے زخم سے جیسے ہی چھوا، وہ فلک شگاف آواز میں چیخا۔ یہ چیخ ایسی تھی کہ سننے والے کو اندازہ ہو جائے کہ اب اس میں مزید دم خم نہیں ہے۔ سلمان نے مشکل سے تین سیکنڈ کے لیے ہی راڈ اس کے زخم پر رکھی ہوگی لیکن یہ تین سیکنڈ بھی اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ وہ سر سے پیر تک پسینے سے بری طرح نہا گیا تھا۔

''کیا خیال ہے..... اس بار تین کے بجائے تیس سیکنڈ کے لیے راڈ تمہارے زخم پر رکھی جائے گی بلکہ پوری طرح اندر داخل کر دیں گے تو زیادہ ہی مناسب ہوگا۔''

جاوید علی نے بڑے پُرسکون انداز میں اس کی رائے طلب کی جس پر اس کی آنکھوں میں نفرت لہرائی تھی لیکن وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ اپنی نفرت کا اظہار کر سکے اس لیے صلح جُو انداز میں بولا۔

''میں پہلے ہی تمہارے ساتھیوں کو بہت کچھ بتا چکا ہوں اب مزید.....''

''میں نے کہا نا کہ مجھے وہ سننا ہے جو تم نے نہیں بتایا۔ اس لیے تمہارے لیے بہتر ہے کہ مجھے وہ بتاؤ جو میں سننا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرے پاس زبان کھلوانے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک طریقے موجود ہیں۔ تم اگر انہیں خود پر آزمانے کا شوق رکھتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' جاوید علی نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی اور سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی حرکت میں آیا۔

ابھی راڈ موہن کے زخم سے انچ بھر دور تھا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ چیخا۔

''بھگوان کے لیے اسے مجھ سے دور رکھو۔ میں تمہیں ایک بہت کام کی بات بتاتا ہوں۔''

سلمان نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

''بولتے رہو۔ رُکے تو ہم شروع ہو جائیں گے۔'' اس کی آمادگی کے باوجود اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا گیا۔ اس دھمکی نے خاصا اثر کیا اور وہ بغیر رُکے بولنا شروع ہو گیا۔

''میں ''را'' کے فائٹنگ وِنگ میں شامل ہوں۔ میں اور میرے ساتھی آرڈر ملنے پر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہر مشن کا پلان ہمیں اپنے انچارج سے مل جاتا ہے اور ہمارا اوپر والوں سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رہتا اس لیے ہم کسی کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ کلبرگ کی جس کوٹھی کا پتہ تم لوگوں کو بتایا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی ٹھکانے کا آفیشلی ہمیں علم بھی نہیں ہے لیکن میں اتفاق سے ایک ایسی جگہ کو جانتا ہوں جس کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہاں ہمارے کچھ بڑے رہتے ہیں کیونکہ اس بنگلے میں، میں نے اپنے انچارج کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ باقی کنفرم کرنا تم لوگوں کا کام ہے۔''

اس نے ایک ایسی بات بتائی تھی جس سے انہیں فائدہ ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ بہرحال، اس کلیو پر انہیں کام تو کرنا ہی تھا کہ ان کی فیلڈ میں امکانات پر ہی کام کیا جاتا ہے۔ موہن سے اس بنگلے کا پتہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسے مزید بھی ٹٹولتا رہا لیکن اس کے علاوہ کوئی خاطر خواہ بات معلوم نہ ہو سکی۔

''اس بنگلے کی نگرانی پر آدمی لگا دو۔ اس بار ہم ڈائریکٹ ریڈ کرنے کے بجائے موقع دیکھ کر کارروائی کریں گے۔'' وہ سلمان کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تو اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہو جائے گا۔ لیکن تم اپنا خیال رکھو۔ ابھی تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے اور تم ہسپتال سے اٹھ کر یہاں آ گئے ہو۔'' سلمان نے اسے ٹوکا۔

''میں ٹھیک ہوں یار!..... لیکن تم لوگ اتنا اصرار کر رہے ہو تو ریسٹ بھی کر لوں گا۔ یہاں سے میرا سیدھے گھر جانے کا ہی پروگرام ہے۔ امی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ بس تم مجھے حالات سے باخبر رکھنا۔''

''بے فکر رہو۔ میں تمہیں اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔'' سلمان نے اسے تسلی دی تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق وہ اپنا مختصر سامان پیک کر چکی تھی۔

''ریڈی ہو..... چلیں؟'' اس نے پوچھا تو عالیہ نے محض سر کی جنبش سے اسے اثبات میں جواب دیا اور ایک چادر اٹھا کر اسے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹنے کے بعد اس کے ایک پلّو سے نقاب کی طرح اپنے چہرے کو چھپا لیا جس پر جاوید علی کے چہرے پر ایک پسندیدہ تاثر اُبھرا لیکن زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی میں سوار وہاں سے جا رہے تھے۔

''تم نے ابھی تک بتایا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد عالیہ نے اس سے دریافت کیا۔

''جا تو رہے ہیں..... پہنچ کر تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔''

''بڑے پکے ہو بھئی۔ کچھ اُگلتے ہی نہیں۔''

''اتنی آسانی سے اُگلنے والا ہوتا تو وطن کے محافظوں میں کیونکر شامل ہوتا؟'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا تو عالیہ بھی مسکرا دی۔ اس کے بعد کا سفر انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں گزار دیا۔ آخر کار وہ ایک چھوٹے سے خوش نما مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ دونوں اپنی اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔ جاوید علی نے پہلے عالیہ کا بیگ پچھلی سیٹ سے اٹھایا، پھر گاڑی لاک کر کے مکان کی گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی دروازہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھل گیا اور سر پر دوپٹہ اوڑھے ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا۔

''اسلام علیکم امی!'' وہ فوراً ہی ان سے لپٹ گیا۔

وہ بھی سلام کا جواب دے کر اس کی بلائیں لینے لگیں۔ بازو کا زخم تو قمیض کی فل آستینوں میں چھپا ہوا تھا لیکن ماتھے کی چوٹ فوراً ان کی نظر میں آ گئی۔

''جب آتا ہے، کوئی نہ کوئی چوٹ سجا کر لاتا ہے۔''

''یہ تو تمغے ہیں امی! اور ایک سپاہی کی ماں کو انہیں دیکھ کر خوش رہنا چاہئے۔'' وہ انہیں ایک بازو کے حصار میں لے کر اندر کی طرف بڑھا، ساتھ ہی عالیہ کی طرف بھی توجہ دلائی۔

''دیکھیں تو سہی میرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔''

''یہ عالیہ ہے نا'' انہوں نے خود ہی فوراً اندازہ لگا لیا اور پھر براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ''معاف کرنا بیٹی! یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور اتنے اتنے دنوں بعد اپنی شکل دکھاتا ہے وہ مجھے اس کے سوا کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔''

''اِٹس اوکے آنٹی! میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔'' عالیہ نے فوراً ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس وقت وہ خود خاصی جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جاوید علی اسے اتنی عزت دے گا کہ اپنے گھر لے آئے گا۔

''جیتی رہو۔ مجھے جاوید نے فون پر بتا دیا تھا کہ کسی دن تمہیں لے کر یہاں آئے گا۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تمہارے آنے سے مجھے بیٹی بھی مل جائے گی اور میری تنہائی بھی بٹ جائے گی۔ تم جب تک چاہو، یہاں رہو۔ آج سے یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

انہوں نے اسے محبت سے گلے لگایا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برسوں کی آبلہ پائی کے بعد آج اس کے قدموں نے ایک ایسے گھر کی زمین کو چھوا تھا جہاں کے مکینوں نے اسے خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر کو اس کا گھر قرار دیا تھا۔

⊛----✪----⊛

''اندر آ جاؤ۔''

ٹھیک رات دس بجے اس نے روزی کے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اسے اندر آنے کا کہہ کر روزی دروازے سے ہٹ گئی۔ اسلم اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

ریسٹورنٹ میں منی اسکرٹ پہن کر گاہکوں کے آرڈر سرو کرتی روزی کے مقابلے میں نہا دھو کر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنی روزی اور زیادہ معصوم اور دلکش لگ رہی تھی لیکن اسلم کو اس کی خوب صورتی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی ماہ بانو کی تلاش میں اس تک آیا تھا۔

''تم کچھ پیو گے؟'' اسے اپارٹمنٹ کے مختصر لاؤنج میں ایک صوفے پر بٹھا کر روزی نے اس سے دریافت کیا۔

''پلیز، میں کسی قسم کی فارمیلیٹیز میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے میری بیوی کے بارے میں جو بتا سکتی ہو، بتا دو۔'' اسلم نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا تو اس نے اپنی نشیلی آنکھوں سے اسے غور سے دیکھا۔

''بہت چاہتے ہو اپنی بیوی کو؟''

''اپنی جان سے بھی زیادہ۔''

''خوش قسمت ہے وہ۔ میں نے اس کے لیے تمہاری محبت دیکھ کر ہی تمہیں حقائق بتانے کا فیصلہ کیا ہے ورنہ کسی کے علم میں یہ بات آ گئی تو شاید میری اپنی زندگی کے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

اس کے الفاظ نے اسلم کے جسم میں تناؤ پیدا کر دیا اور وہ پوری جان سے ہمہ تن گوش ہو گیا کہ روزی اسے کیا بتاتی ہے۔

''تمہاری بیوی کو میں نے جس شخص کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اس کا کوئی پرانا شناسا تو محسوس ہوتا تھا لیکن اچھا دوست یا رشتے دار نہیں۔ ان کے درمیان کچھ تلخی سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ اہم بات وہ ہے جو ایک اتفاق کی وجہ سے مجھے معلوم ہوئی۔ میرے گرینڈ پا، گالف کورس کے ساتھ بنے مکانات میں سے ایک مکان میں رہتے ہیں اور میں بھی کبھار ان سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ اس روز بھی میں اپنی جانب سے سیدھی وہیں گئی تھی اور باتوں باتوں میں گرینڈ پا نے مجھے بتایا تھا کہ آج انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ان کے مطابق وہ عادت کے مطابق ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے کہ انہیں سرخ رنگ کی کار میں ایک انڈین جوڑا نظر آیا۔ گاڑی مرد ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ اس کے برابر میں بیٹھی لڑکی ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ ایک دلدل کے قریب پہنچنے پر مرد نے گاڑی روکی اور ڈیش بورڈ پر سے کچھ اٹھا کر باہر نکلا۔ گرینڈ پا کا اندازہ ہے کہ وہ چیز موبائل فون تھا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مرد موبائل فون کو دلدل میں پھینکنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت تو میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن جب تمہاری بیوی کی تلاش کے سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کی گئی تو مجھے اس واقعے کا خیال آیا۔ میں نے پولیس کو کچھ بتانے سے پہلے گرینڈ پا سے اس جوڑے کا حلیہ معلوم کر لینا زیادہ بہتر سمجھا لیکن بہت جلد پولیس کا ایسا رویہ سامنے آیا کہ جیسے وہ اس کیس کو دبانا چاہتی ہے۔ ہم لوگوں کو ہدایت دے دی گئی کہ اس سلسلے میں کسی سے اس کے سوا کوئی بات نہ کی جائے جو پولیس کے ریکارڈ کا حصہ ہے۔ میں قانون پسند شہری ہوں لیکن تمہاری حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تمہاری بیوی کے بارے میں ضرور بتاؤں گی کیونکہ گرینڈ پا سے بات کر کے اس بات کی تو میں تصدیق کر چکی تھی کہ ان کے دیکھے ہوئے جوڑے کا حلیہ وہی تھا جو ہمارے ریسٹورنٹ میں آنے والے جوڑے کا تھا۔''

روزی تو شاید تیار ہی بیٹھی تھی کہ اس سے ملاقات ہوتے ہی سب کچھ اس کے گوش گزار کر دے، چنانچہ بولتی ہی چلی گئی۔

''مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ۔'' اسلم نے ساری بات سن کر اس سے کہا۔

جواب میں اس نے تفصیل سے اسے پورا حلیہ بتا دیا جسے سن کر اسلم نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں، میں اس حلیے کے کسی فرد کو نہیں جانتا۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں تمہاری جتنی مدد کر سکتی تھی، کر دی۔ حالانکہ مجھ پر سارجنٹ اور منیجر کی طرف سے خاصا دباؤ تھا۔'' اس نے امریکیوں کے مخصوص انداز میں شانے اچکائے اور اس سے یکسر بے نیاز نظر آنے لگی۔

''تھینک یو مس روزی! تم نے میری جو ہیلپ کی، اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' وہ بھی فوراً وہاں سے روانگی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ پہلا کلیو تھا جو ماہ بانو کے بارے میں ملا تھا لیکن جس نے پریشانی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مزید بڑھا دیا تھا۔

''گرینڈ پا کا خیال ہے کہ وہ گاڑی جنگل کی طرف گئی تھی۔'' وہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے سے روزی کی آواز سنائی دی۔

روزی کے اپارٹمنٹ سے نکل کر اس نے مصطفیٰ خان کے گھر کی طرف رخ کیا۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ ذرا سکون سے بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا۔

گھر پہنچا تو اچھا خاصا سناٹا چھا چکا تھا۔ اس نے اپنے پاس موجود چابی سے گیٹ کھولا اور سیدھا انیکسی کی طرف جانے کے بجائے مصطفیٰ خان کے رہائشی حصے کی طرف رخ کیا تاکہ اگر بلقیس جاگ رہی ہو تو اس سے معلوم کر سکے کہ آیا مصطفیٰ خان واپس آ گیا ہے یا نہیں۔ اور اس نے ماہ بانو کے بارے میں کیا معلومات حاصل کی ہیں۔

گلاس ڈور تک پہنچ کر دستک دینے سے پہلے ہی اسے طوبیٰ نظر آ گئی۔ اس نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اسلم اندر داخل ہو گیا۔

''آپ ابھی تک سوئی نہیں ہو؟'' اس نے طوبیٰ کے گال کو آہستہ سے تھپتھپا کر اس سے پوچھا۔

''نہیں لیکن آپ ممی کو مت بتائیے گا۔ وہ مجھے ڈانٹیں گی۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''نہیں بتاؤں گا۔ لیکن آپ جا کر انہیں بتا دو کہ اسلم انکل آئے ہیں۔''

''نو، میں نہیں بتا سکتی۔ آپ خود جا کر ان سے مل لیں۔ وہ اسٹڈی میں پاپا کے ساتھ کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہی ہیں۔'' وہ تمام شرارتی بچوں کی طرح بہت ذہین تھی اس لیے یہ غلطی نہیں کی کہ اسلم کے آنے کی اطلاع دینے ماں باپ کے پاس چلی جائے۔

اسلم نے اسٹڈی میں مصطفیٰ خان کی موجودگی کا سن کر خود وہاں چلے جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ لیکن اسٹڈی کے دروازے پر پہنچ کر ابھی اس نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ بلقیس کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

''اسلم تو پاگل ہو جائے گا۔ ماہ بانو میں اس کی جان اٹکی رہتی ہے اور آپ جو حالات بتا رہے ہیں، ان کے مطابق تو اسے بازیاب کروانا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے سامنے جو معلومات آئی ہیں، ان کے مطابق یہ بہت اوپر کے درجے کا معاملہ ہے۔ اور سارجنٹ مورس کو اس کیس پر کام کرنے سے باقاعدہ روک دیا گیا ہے۔ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے ایک تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنگلات میں زیر زمین ایک تجربہ گاہ قائم کی گئی ہے اور وہاں کسی بہت خفیہ پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ ماہ بانو سے پہلے بھی چند دوسری حاملہ خواتین کے غائب ہونے کی اطلاعات ہمارے پاس موجود ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان تمام خواتین کو جنگل کے آس پاس ہی آخری بار دیکھا گیا ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہاں قائم تجربہ گاہ میں حاملہ خواتین پر کوئی تجربہ کیا جا رہا ہے اور ماہ بانو بھی وہیں ہے، تب بھی تلاش کا کام آسان نہیں ہو گا۔ البتہ میں نے اپنے اندازے سے جنگل کے کچھ حصوں کا انتخاب کیا ہے جہاں میرے خیال کے مطابق کوئی تجربہ گاہ قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو۔''

اندر وہ کمپیوٹر کی اسکرین پر جنگل کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے بلقیس کو ان کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

اسلم وہیں کھڑا سب کچھ سنتا رہا اور پھر خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔ انیکسی میں پہنچ کر اس نے ایک بار پھر مصطفیٰ خان کی زبان سے سنی ہوئی باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا اور خود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے اپنے آپ کو کمپوز کر لیا تھا اور بہت سکون سے کام کر رہا تھا۔

اپنے طور پر ساری معلومات اکٹھی کرنے کے بعد وہ روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی رہی اور آخر کار صبح کی پہلی پو پھٹتے ہی وہ اپنی تیاری مکمل کر کے گھر سے نکل پڑا۔

آرلینڈو میں ابھی صبح پوری طرح نہیں جاگی تھی۔ نہ کوئی گاڑی نظر آ رہی تھی، نہ انسان۔ البتہ فطرت کے دوسرے لوازم آہستہ آہستہ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوا میں وہی تازگی اور خوشبو تھی جو صبح کے علاوہ دن کے کسی اور حصے میں محسوس نہیں کی جا سکتی۔ پیڑ پودے ہوا کے ساتھ آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں پرندے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اسلم کے سارے حواس بس ان چہچہاہٹوں کی طرف متوجہ تھے جو جنگل کی طرف سے آ رہی تھیں۔ وہ پرندوں کے ان نغموں میں اپنی ماہ بانو کی نغمگی کی آواز سن رہا تھا جو اسے پکار رہی تھی، اپنی طرف بلا رہی تھی اور وہ دیوانہ وار اس پکار پر لپکا چلا جا رہا تھا۔

آبادی کو چھوڑ کر اس نے جنگل میں قدم رکھا تو اس کے پیچھے کا سارا منظر سورج کی روشنی سے سنہرا ہو چکا تھا لیکن اب وہ خود تاریکی میں تھا۔ بے تحاشا گھنے جنگل میں سورج کی روشنی کا بھی گزر نہیں تھا۔ تاریکی میں قدم اُٹھاتا وہ اپنی زندگی کی روشنی کی تلاش میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن یکدم ہی زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیر زمین میں دھنستے جا رہے ہوں۔

اس نے کوشش کی کہ کھینچ کر اپنے پیروں کو باہر نکال سکے لیکن وہ کچھ اور بھی اندر دھنستے چلے گئے۔ گھنے تاریک جنگل میں، جہاں وہ کسی کو مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکتا تھا، ایک دلدل اسے نگلنے کے لیے تیار تھی۔

اس کی زندگی کے بہت سے ماہ و سال جنگل میں بیتے تھے۔ اسے جنگل سے کبھی خوف نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو ایک طرح سے اس کا دوست تھا جس نے زندگی کے بدترین دور میں اسے پناہ دی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر جنگل کی زندگی نے ہی اسے ماہ بانو جیسی نعمت عطا کی تھی۔

لیکن آرلینڈو کا یہ جنگل ذرا مختلف تھا۔ سورج کی روشنی تک کو رسائی نہ دینے والی یہ زمین کسی انسان کے قدموں کو اپنے اوپر کیونکر برداشت کر سکتی تھی؟ وہ اسلم کو اُس کی اس جرأت کی سزا دینے پر تُل گئی تھی اور اس کے وجود کو نگل لینا چاہتی تھی۔ وہ جوں جوں اپنے پاؤں اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مزید دھنستا جا رہا تھا لیکن وہ اس بات کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھا کہ اس کا وجود اس دلدلی زمین میں گم ہو جائے اور اس کی ماہ بانو بے یار و مددگار کسی ظالم تجربے کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اسے اپنی ماہ بانو کو بچانا تھا تو زندہ رہنا تھا اور آخری لمحے تک زندگی کے لیے جدوجہد کرنی تھی۔

آدمی میں جدوجہد کا حوصلہ ہو تو عمل کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ اس کے ہاتھ بھی اُمید کا ایک سرا آ گیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، گھنے درخت کی بے حد جھکی ہوئی شاخ تھی جو عین اس کے سر پر لہرا رہی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے اس نازک سی شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی چنچل دوشیزہ کی طرح کنی کاٹ گئی اور اس کے ہاتھ آئے بغیر ہوا کے جھونکے سے دُور ہٹ گئی۔

وہ اتنے نازک لمحات سے گزر رہا تھا کہ اُس کی اس ادا پر جھنجلا گیا لیکن اپنی نظر اس شاخ پر سے ہٹنے نہیں دی۔ شاخ بھی گویا اس سے اٹکھیلیاں کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لہراتی ہوئی قریب آتی اور پھر ایک جھٹکے سے دُور ہٹ جاتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخر کئی بار کی کوشش کے بعد اسلم اسے پکڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور اس کے سہارے آہستہ آہستہ اپنے بدن کو دلدل کی گرفت سے آزاد کروا کر اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے جوتوں میں مقید پیر آزاد ہو کر ہوا میں لہرانے لگے۔ اسی لمحے اسے شاخ کے تڑخنے کا احساس ہوا۔ اس نے خود کار ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک نزدیکی شاخ کو پکڑ لیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے والی شاخ ٹوٹ کر دلدل میں جا گری۔

اسلم کانپ کر رہ گیا اور دل کی گہرائی سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بروقت اس شاخ کو چھوڑ چکا تھا ورنہ خود بھی اس کے ساتھ اسی دلدل میں جا گرتا۔

خوف اور شکر گزاری کے ان لمحات سے گزرنے کے بعد اس نے آگے کے سفر کا آغاز کیا اور ہاتھ میں تھمی شاخ کے سہارے اوپر اٹھنے لگا۔ لہراتی ہوئی اس شاخ کو پکڑ کر آگے کھسکتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ بہت عجیب و غریب شاخ ہے جس میں نہ تو پھول پتے ہیں اور نہ ہی مزید ذیلی شاخیں۔ بس ایک گول اور کسی قدر پھسلواں ٹہنی ہے جس کے سہارے اوپر کھسکنے میں اسے خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ ٹہنی کی نرماہٹ بھی اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔

جنگل میں ایک عمر گزارنے کے باوجود اس نے کوئی ایسا درخت نہیں دیکھا تھا جس کی ساخت اتنی عجیب ہو۔ بس وہ یہی سوچ سکا کہ آرلینڈو کے اس جنگل کے درخت، اس کے وطن کے درختوں سے مختلف ہیں اس لیے عجیب محسوس ہو رہا ہے۔

دن کا وقت ہونے کے باوجود وہاں روشنی اتنی کم تھی کہ اس کے لیے اس شاخ کا ڈھنگ سے جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ یہاں کے درختوں پر ریسرچ کرنے تو آیا نہیں تھا جو زیادہ غور و خوض کرتا۔ بس جان بچا کر شاخ کے ذریعے موٹے تنے تک پہنچ گیا اور سکون کا سانس لیتے ہوئے ذرا دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔

اسی پل اسے اپنے نزدیک سرسراہٹ محسوس ہوئی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جس شاخ کو پکڑ کر وہ تنے تک پہنچا تھا وہ سرسراتی ہوئی اوپر کی طرف سفر کر رہی ہے۔ یکدم ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ جسے شاخ سمجھ کر بڑے اطمینان سے اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرتا رہا تھا، وہ درحقیقت کوئی شاخ نہیں بلکہ جیتا جاگتا، صحت مند اور طویل اژدھا تھا جو اپنی لمبی دُم لٹکائے اس درخت پر محوِ استراحت تھا۔ اللہ کے اس کرشمے نے اسے گنگ کر دیا۔ اژدھا جس کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ عام انسان اس کے قریب جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا، اس وقت اس کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر تہہ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس یقین کے ساتھ دوبارہ ماہ بانو کی تلاش کے لیے کمربستہ ہو گیا کہ اللہ اس کام میں اس کی مدد کر رہا ہے ورنہ خطرناک دلدل اور موذی جانور سے وہ کیونکر اتنی آسانی سے بچ نکلتا۔

⊛----✪----⊛

''کیا آپ نے اشوک کو قتل کرنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا ہے؟''

کلام کے اس سوال پر کمپیوٹر پر مصروف شہریار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بھائی جی کے ایک محفوظ ٹھکانے پر موجود تھے جہاں انہیں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا اور عملاً وہ وہاں فارغ بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔

''سچ پوچھو تو نہیں۔ میرے لیے انسانی جان کو ختم کرنا کبھی بھی آسان کام نہیں رہا ہے۔ وطن دشمنوں سے نمٹنا اور انہیں ان کے انجام تک پہنچانا الگ بات ہے لیکن جس طرح بھائی جی نے مجھ سے مطالبہ کیا ہے، مجھے خود پر کسی کرائے کے قاتل کا گمان ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر خاموشی سے کلام کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم عملاً مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بھائی جی کو ناراض کر کے اس ٹھکانے سے نہیں نکل سکتے ہیں اور نکل گئے تو پولیس اور خفیہ ایجنسیاں ہمیں نہیں چھوڑیں گی۔'' کلام نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''جب تم لوگ جانتے ہو کہ ہمارے پاس بھائی جی کی شرط ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس بحث کی کیا تک ہے؟ اشوک کون سا نیک اور عوام دوست آدمی ہے جو اس کی جان لینے پر آدمی شرمندگی محسوس کرے۔ وہ مرے گا تو اللہ کی مخلوق کو تھوڑا سکھ ہی محسوس ہوگا کہ زمین پر سے ایک شیطان کا وجود کم ہوا۔ تم دونوں کچھ مت کرنا، میں اُس کا کام تمام کر دوں گا۔ چھٹانک بھر کی گولی دل میں اُتار کر آدمی کی سانسیں بند کرنے میں محنت ہی کیا لگتی ہے؟ خاص طور پر اشوک جیسے بدذات کو تو میں بڑے شوق سے اوپر پہنچاؤں گا۔''

ان دونوں سے ذرا فاصلے پر نرم و دبیز قالین پر تکیوں کے سہارے نیم دراز سلّو نے اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیلتے ہوئے اچانک ہی ان کی گفتگو میں مداخلت کی اور مسئلہ ہی ختم کر دیا۔

اُس کے اس انداز پر شہریار اور کلام اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اب وہ ان سے بے نیاز ایک بار پھر پورے انہماک سے گیم کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اُس کے اس انداز پر بے ساختہ ہی شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

بظاہر لاابالی نظر آنے والا یہ نوجوان ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بڑھاتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اتنے دنوں کے ساتھ نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اتنا بے نیاز نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقتاً وہ ایک ذہین، چابک دست اور حساس شخص تھا جس نے اپنے آپ پر بے نیازی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ اس خول کے نیچے سے جھانکتی اس کی نرم اور حساس فطرت شہریار کو بہت پیاری لگتی تھی اور اس نے سوچ لیا تھا کہ ان بکھیڑوں سے نمٹنے کے بعد جب وہ وطن واپس جائیں گے تو وہ اس کے لیے اچھی زندگی کے انتظام کے لیے بھرپور کوشش کرے گا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سی ایف پی میں اس کی شمولیت کے لیے سفارش کر دیتا۔ بہرحال، ابھی وہ وقت دور تھا اور انہیں حال کے مسائل سے نمٹنا تھا۔

''کھانا تیار ہے جناب! آپ لوگ ڈائننگ روم میں آ جائیں۔ وہاں عبدل بھائی کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ جانے کتنی دیر تک سلّو کے بارے میں سوچتا رہا کہ ملازم کی مداخلت نے اسے واپس کمرے کے ماحول میں کھینچ لیا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو ہم آ رہے ہیں۔'' اس نے ملازم کو جواب دیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سلّو اور کلام نے بھی اس کی تقلید کی۔ کچھ دیر میں ہی وہ تینوں ڈائننگ روم میں موجود تھے جہاں عبدالرحمٰن ان کا منتظر تھا۔

''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، پھر کام کی بات کریں گے۔'' رسمی علیک سلیک کے بعد عبدالرحمٰن نے ان سے کہا تو وہ لوگ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

کھانا بڑے طریقے کا تھا۔ چکن کڑاہی، آلو مٹر کی بھجیا، ارہر کی دال، بگھارے چاول اور گرما گرم روٹیوں کے علاوہ سلاد، اچار اور رائتے کا بھی اہتمام تھا۔ ایسے متنوع دسترخوان سے ہر مزاج کا بندہ اپنا پیٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھر سکتا تھا۔

ان تینوں نے بھی اپنی اپنی پسند کے مطابق پلیٹوں میں کھانا نکالا اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ نمکین کے بعد میٹھے کا دور چلا اور پھر عبدالرحمٰن، ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دیتا ہوا ان تینوں کو لے کر واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں وہ کھانے سے قبل بیٹھے ہوئے تھے۔

''بڑے کام کی خبر لایا ہوں تم لوگوں کے لئے۔ دل خوش ہو جائے گا تمہارا۔'' کمرے میں داخل ہو کر اس نے بڑے شوق سے انہیں بتایا۔

''کام کی خبر ہے تو بتانے میں دیر کیسی؟.....فوراً سنا ڈالو۔'' اس کی بات کا شہریار نے جواب دیا۔

''سنانے سے زیادہ دکھانے کی خبر ہے۔'' وہ کمپیوٹر کے ساتھ جا بیٹھا اور اپنے بائیں ہاتھ میں موجود چمڑے کے بڑے سے پرس سے ایک سی ڈی باہر نکال کر لگانے لگا۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چند لمحوں بعد مانیٹر کی اسکرین پر متحرک تصویریں نظر آنے لگیں۔ ان تصویروں میں اشوک کا چہرہ ان کے لیے آشنا تھا لیکن ایک چہرے کے گرد بنے سرکل نے انہیں بتا دیا کہ عبدالرحمٰن انہیں کس کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ تیزی سے بدلتے مناظر میں ہر بار اسی چہرے کے گرد موجود سرکل نے مزید تصدیق کر دی کہ اصل اہمیت اسی کی ہے۔

یہ مختلف مواقع پر تیار کی گئی ویڈیوز تھیں جنہیں خاص طور پر اسی مقصد کے لیے یکجا کر دیا گیا تھا۔ یہ ویڈیو صرف متحرک تصویروں پر مشتمل تھی۔ اس میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور مانیٹر کی اسکرین پر متحرک مناظر میں وہ اس آدمی کو مختلف مواقع پر اشوک کے ساتھ دیکھ سکتے تھے۔ کہیں وہ اشوک سے ہاتھ ملا رہا تھا، کہیں اس کے ساتھ کسی دفتر نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ کسی جگہ اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں شراب نوشی سے لطف اٹھا رہے تھے۔ دو تین جگہ انہوں نے پریم ناتھ کو بھی اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس ویڈیو میں اس کا اندازِ نشست و برخاست بالکل ویسا ہی محسوس ہوا جیسا کسی بادشاہ کے دربار میں خوشامد سے اپنا کام نکالنے والے مصاحب کا ہوتا ہے۔

''یہ ارجن اگروال ہے۔ ''را'' کا ایک سینئر [illegible]۔ لیکن ظاہر میں دنیا اس کو ایک بڑے بزنس مین کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات سے واقف ہیں کہ بزنس تو محض ایک آڑ ہے ورنہ یہ بندہ ''را'' کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتا ہے۔ آئے دن اس کی سیکرٹریز بدلتی رہتی ہیں اور ہر ایک، دوسری سے بڑھ کر خوب صورت اور طرح دار ہوتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حسین عورتوں کی مدد سے ارجن بڑے بڑے بزنس مینوں اور سرکاری افسران کی جاسوسی کا کام لیتا ہے اور کئی افراد کو حاصل ہونے والی معلومات کے بل پر ''را'' کی طرف سے بلیک میل کیا جاتا ہے۔''

وہ تینوں غور سے ویڈیو دیکھ رہے تھے اور عبدالرحمٰن انہیں بتاتا جا رہا تھا۔

''ارجن کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات موجود ہیں، ان کے مطابق یہ بے حد سوشل آدمی ہے جس کے کاروباری حلقے سے لے کر سیاست دانوں، سرکاری افسران، فلم نگری کے ستاروں اور یہاں تک کہ جرم کی دنیا میں بھی گہرے روابط ہیں۔ ثبوت تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی رہے ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ ہم نے یہ ساری معلومات پریم ناتھ کی زندگی کو کھنگالتے ہوئے حاصل کی ہیں ورنہ ہم براہِ راست اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے۔ پریم ناتھ اور ارجن اگروال دونوں کا تعلق ایک ہی جگہ سے ہے۔ دونوں نے ہی ابتدائی تعلیم ایک ہی اسکول سے حاصل کی ہے۔ لیکن ارجن، پریم ناتھ کے مقابلے میں بے حد ذہین اور ہوشیار

طالب علم تھا۔ قسمت کی مہربانی سے اس کا پتا بہتر روزگار کے چکر میں اپنے گاؤں سے ممبئی پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے اپنی ذہانت اور چالاکی کو استعمال کرنے کا خوب موقع ملا۔ بہت سے مراحل طے کر کے یہ نہ صرف ''را'' میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا بلکہ ممبئی کے ایک بڑے بزنس مین کی اکلوتی بیٹی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس سے شادی بھی رچا ڈالی۔ بیاہ کے وقت چاہے لڑکی کا باپ خوش نہ ہو لیکن بعد میں جوائی نے ایسی ہوشیاری سے ایک اور ایک گیارہ بنائے کہ سسر بھی دنگ رہ گیا اور تسلیم کر لیا کہ ارجن ہی اس کا اکلوتا جوائی بننے کا صحیح حق دار تھا۔ اب سسر تو زندہ نہیں ہے لیکن یہ اُس کی دولت پر راج کرتا پھر رہا ہے۔ جن دنوں پاکستان سے ڈاکٹر فرحان جمیل آیا اور اپنے رشتے داروں کی سازش کی وجہ سے پریم ناتھ کے ہتھے چڑھا، ان ہی دنوں ارجن بھی اپنی اکلوتی ماسی کے کریا کرم میں شریک ہونے اپنے آبائی گاؤں پہنچا ہوا تھا۔ پرانی دوستی اور تعلق کی بنیاد پر پریم ناتھ نے بھی اس سے ملاقات کی۔

اس ملاقات کے بعد ہم اندازے ہی لگا سکتے ہیں کہ پریم ناتھ نے پرانی دوستی کی وجہ سے یا پھر ارجن کی اونچی حیثیت دیکھ کر اپنے آپ کو بھی اونچا ظاہر کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کا معاملہ اس کے سامنے بیان کر دیا اور اس کے بعد سارے معاملات پریم ناتھ کے ہاتھ سے نکل کر اس کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر فرحان کو ''را'' کی کسٹڈی میں پہنچانے کے ساتھ ہی اس نے پرانے دوست پر بھی مہربانی کی اور ترقی دلوا کر ایک چھوٹے سے گاؤں سے ممبئی میں لا بٹھایا۔ پریم ناتھ کے اشوک سے تعلقات دیکھتے ہوئے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ارجن نے دوست پر جو احسان کیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے نئے لیکن ہم پلّہ دوست اشوک کو پولیس کی بھرپور مدد مل جائے اور حالات بتاتے ہیں کہ واقعی پریم ناتھ، اشوک کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔''

عبدالرحمٰن نے اپنی بات ختم کی تو وہ تینوں جان چکے تھے کہ وہ پریم ناتھ کو اغوا کر کے اس کے ذریعے ''را'' کے جس افسر تک پہنچنا چاہتے تھے، اس تک بھائی جی نے اپنے وعدے کے مطابق بیٹھے بیٹھے ہی اُنہیں پہنچا دیا تھا۔

''کیا تمہارے لیے اس خبر کی اہمیت نہیں ہے؟'' اپنی بات ختم کر کے عبدالرحمٰن نے کچھ دیر شہریار کے تبصرے کا انتظار کیا لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی پا کر آخر کار خود ہی پوچھ بیٹھا۔

''اہمیت کیوں نہیں ہے؟ تم نے ہمارا ایک بہت بڑا کام کر ڈالا ہے۔ لیکن اب یہ بتاؤ کہ اس تک رسائی کیسے ممکن ہو گی؟ ہم ارجن تک پہنچیں گے، تب ہی تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کوئی سن گن ملے گی۔'' وہ جیسے کسی گہرے خیال سے باہر نکل کر بولا۔

''اس کی سکیورٹی بہت سخت ہے۔ اس نے نجی گارڈز بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں۔ تمہیں ارجن تک پہنچنے کے لیے بڑی نفری کے ساتھ پہلے اس کے گارڈز سے نمٹنا ہو گا۔ میں نے اپنے آدمیوں میں سے ایسے افراد کی لسٹ بنا لی ہے جو ہمارے گروپ سے تعلق رکھنے کی شہرت نہیں رکھتے۔ تم جب بھی ارجن سے نمٹنے جاؤ گے، ہمارے آدمی تمہاری مدد کے لیے جدید سلحے کے ساتھ تیار ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں نکلے گا جو تمہیں چھوڑ کر بھاگنے کا سوچ سکے۔'' ان کے پاس آنے سے پہلے وہ اپنا سارا ہوم ورک کر کے آیا تھا۔

''تھینک یو عبدالرحمٰن!.....ہمیں صرف اسلحے اور سواری کی ضرورت ہے، میں اپنے ساتھ زیادہ بھیڑ بھاڑ لے جا کر دشمن کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے، تمہیں جو چاہئے اس کی لسٹ بنا دو۔ تمہیں وقت پر سب مل جائے گا۔ آدمی بھی اسٹینڈ بائی رہیں گے۔ اگر تم چاہو تو ان میں سے کسی کا اپنی مدد کے لیے انتخاب کر سکتے ہو۔'' اس نے اپنی پیش کش پر زیادہ اصرار نہیں کیا اور جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اسے پہچانتے ہو عبدالرحمٰن؟..... ذرا اس کے بارے میں معلوم کرو کہ یہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آ رہا ہے؟'' اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے شہریار نے ختم ہو جانے والی سی ڈی کو پھر پلے کیا اور اشوک کے ساتھ اس کے دائیں جانب کھڑے ایک صحت مند اور ادھیڑ عمر آدمی کو پوائنٹ آؤٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، اپن کو یہ کوئی باہر کا آدمی معلوم پڑتا ہے لیکن آپ کہتے ہو تو اس کا پورا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیتے ہیں۔'' عبدل نے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر ساتھ ہی پیشکش بھی کر ڈالی۔

''تم صرف یہ معلوم کرو کہ اشوک کے ساتھ کیوں نظر آ رہا ہے؟'' شہریار نے مانیٹر کی اسکرین پر نظر جماتے ہوئے اسے جواب دیا۔ اس کے ساتھ موجود سلو اور کلام نے بھی اس تصویر کو غور سے دیکھا تھا لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس شخص کو پہچان نہیں سکے تھے۔

⊛----✪----⊛

''چائے۔''

جاوید علی اپنے بستر پر نیم دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز اُبھری اور اس کی طرف سے اجازت ملنے پر عالیہ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جن میں ایک اس نے جاوید علی کو پیش کیا اور خود اپنا کپ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تھینک یو..... میرا اس وقت چائے پینے کا بہت دل چاہ رہا تھا لیکن خود اٹھ کر بنانے کا موڈ نہیں تھا اور امی کو بے آرام کرنا مناسب نہیں لگا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عالیہ سے کہا اور کپ لبوں سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''زبردست۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی چائے بنا لیتی ہو گی۔'' پہلے گھونٹ پر اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

''شاید اسی خطرے کی وجہ سے تم نے مجھ سے چائے کی فرمائش نہیں کی تھی ورنہ یہ چھوٹا سا کام تو میں بھی کر سکتی تھی۔'' عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

جاوید علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیض اور گلابی اور آسمانی رنگ کے امتزاج کا دوپٹہ اوڑھے وہ پہلے کے مقابلے میں بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی اور کھوجنے پر بھی اس کے چہرے پر وہ تیزی اور مکاری نظر نہیں آتی تھی جو دیبا مساج سینٹر میں اس سے پہلی ملاقات کے موقع پر نظر آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ سی ایف بی کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ہی تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن یہاں آ کر تو اس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ جاوید علی نے کل اسے امی کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ دن بھر وہ زیادہ تر ان کے ساتھ ہی لگی رہتی تھی اور اسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر بہت خوش ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' عالیہ نے اسے ٹوکا تو وہ اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''کچھ نہیں، بس غور کر رہا تھا کہ تم نے اتنی معمولی سی بات کو کس انداز میں لے لیا۔ میں نے تو صرف

اس لیے تمہیں چائے کے لیے نہیں کہا تھا کہ تم دن بھر امی کے ساتھ لگی رہی تھیں، کہیں تھک نہ گئی ہو۔ ویسے بھی میں خود اتنی بری چائے بناتا ہوں کہ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ جو جاوید کے ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے، وہ دنیا میں کسی کے بھی ہاتھ کی چائے پی سکتا ہے۔'' اپنے عمل کی وضاحت دیتے ہوئے وہ آخر میں نیم مزاحیہ لہجے میں بولا تو وہ ہنس دی اور سادگی سے استفسار کیا۔

''کیا سچ مچ تم اتنی بری چائے بناتے ہو؟''

''کہو تو کسی دن تمہیں بنا کر پلا دوں گا۔'' اس نے یوں جواب دیا جیسے چائے پلانے کی پیشکش نہ کر رہا ہو، کوئی دھمکی دے رہا ہو۔

''نہ بابا!..... میں ایسا خطرہ مول لینے کے بجائے ہر بار خود ہی چائے بنانا پسند کروں گی۔'' وہ خوش گوار موڈ میں تھی چنانچہ ہنس کر جواب دیا۔

ہنستے ہوئے اس کے دائیں رخسار پر ڈمپل پڑتا تھا جس نے جاوید علی کو شازمین کی یاد دلا دی تھی۔ حالانکہ اس ڈمپل کے علاوہ عالیہ میں کوئی ایک بات بھی شازمین والی نہیں تھی۔ شازمین تو کسی نوخیز کلی کی طرح اتنی حسین تھی کہ نظر اس پر پڑ کر ہٹنا بھول جائے۔ جبکہ عالیہ اس کے مقابلے میں پختہ عمر کی ایک ایسی لڑکی تھی جس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا ورنہ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھا اور خود کو یہاں ایسے ایڈجسٹ کر لیا جیسے ہمیشہ سے ہی یہاں رہتی آئی ہو۔'' اپنے ذہن میں اُبھرنے والے خیال کو جھٹکتا ہوا وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو کچھ نہیں ہے۔ تم دیکھنا کہ بہت جلد میں آنٹی سے سب کچھ سیکھ لوں گی اور جب کبھی تم فرصت ملنے پر یہاں آؤ گے تو میں تمہیں بریانی، نرگسی کوفتے، نہاری سب پکا کر کھلاؤں گی۔'' اس نے جاوید علی کی پسندیدہ ڈشز کے نام گنواتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''ضرور، یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اچھی لڑکیوں کی طرح امورِ خانہ داری کی تربیت حاصل کرو لیکن میرا تمہیں مشورہ ہے کہ صرف ان کاموں میں ہی کھپ کر نہ رہ جاؤ۔ تم ذہین اور باصلاحیت ہو۔ کوشش کرو کہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کر سکو۔ مزید تعلیم سے لے کر کسی بھی قسم کے کورسز تک میں ہر معاملے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ بس ایک بار تم میرے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا۔'' جاوید علی نے خلوصِ دل سے اسے پیشکش کی۔

''تھینک یو۔ میں تمہاری اس آفر کو یاد رکھوں گی لیکن فی الحال میں کچھ عرصہ ایسے ہی گزارنا چاہتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک عام عورت کی طرح وقت گزارنے کا موقع ملا ہے اور یقین کرو مجھے بہت مزہ آ رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر واقعی خوشی کے رنگ تھے۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' جاوید علی نے بحث نہیں کی اور خالی کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک بار پھر تعریف کی۔ ''چائے سچ مچ بہت مزے کی تھی اور میں امید کر سکتا ہوں کہ جب تم کھانا پکانا سیکھ لو گی تو وہ بھی ایسا ہی مزے دار ہو گا۔''

''اِنشاء اللہ۔'' عالیہ نے مسکراتے ہوئے بے ساختہ کہا اور پھر خالی کپوں کو ٹرے میں رکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے جاتا دیکھ کر جاوید علی نے ایک بار پھر زیرِ مطالعہ کتاب ہاتھ میں لے لی جس پر عالیہ نے اسے ٹوکا۔

''تمہیں آرام کے لیے چھٹیاں دی گئی ہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم آرام بالکل نہیں کر رہے۔ رات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو بھی دیر تک تمہارے کمرے کی لائٹ آن رہتی ہے۔"

"میں بالکل فٹ ہوں یار! اور اب مجھے مزید آرام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سلمان کی طرف سے اشارہ ملتے ہی واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے معلوم ہے کہ کوئی کچھ بھی کہے، تم وہی کرو گے جو تمہارا دل چاہے گا۔" کچھ خفگی سے کہتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو جاوید علی مسکرانے لگا اور پھر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اسے ایک طرف رکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون اٹھا لیا۔

اُس کی ذہنی رو یکدم ہی بدل گئی تھی اور اب وہ سلمان سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال جاننے کا خواہش مند تھا۔ "را" کے فائٹنگ وِنگ سے تعلق رکھنے والے موہن نے جس بنگلے کی نشاندہی کی تھی، اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی جس کے نتیجے میں وہ لوگ اس بات پر پُر یقین ہو چکے تھے کہ اس بنگلے میں واقعی کچھ مشکوک افراد رہائش پذیر ہیں تاہم ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ لوگ کارروائی نہیں کرنا چاہ رہے تھے [illegible] مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔

"ہاں جاوید! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" سلمان کا نمبر ملانے پر اس کی طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی اور اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"میں بالکل فرسٹ کلاس فٹ ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ آج کی کیا خبریں ہیں؟ آج پورا دن تم نے مجھے کال ہی نہیں کی۔" اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے ساتھ اس نے شکوہ بھی کیا۔

"سوری یار! آج مصروفیت ذرا زیادہ ہی رہی۔ میں نے سوچا کہ پہلے سارے کام نمٹا لوں، پھر تمہیں فون کر کے کوئی اچھی خبر سناؤں گا۔" سلمان کے انداز میں دبا دبا جوش تھا جس نے جاوید علی کو چونکا دیا۔

"کیا مطلب..... کوئی خاص بات؟"

"ہاں یار! بہت خاص بات ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم اس بنگلے کی بیرونی نگرانی کے ساتھ ساتھ اندر کے حالات جاننے کے لیے بھی کوششوں میں لگے ہوئے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے کیونکہ ٹیلی فون پر وہ لوگ کھل کر کوئی بات کرتے ہی نہیں تھے اور ہم انہیں نگرانی کا احساس نہ ہونے دینے کے لیے بہت محتاط تھے۔ یہاں تک کہ نگرانی کرنے والے بھی بنگلے سے بہت دُور رہ کر ٹیلی اسکوپ کے ذریعے نگرانی کر رہے ہیں۔ ایسے میں کسی ایسی ڈیوائس کو جس کے ذریعے اندر کے حالات معلوم ہو سکیں، بنگلے کے اندر پہنچانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پھر شفیع کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس کے پاس چھوٹی نسل کا ایک بہت خوب صورت کتا ہے جو خاصا ذہین بھی ہے۔ ہم نے اس کتے کے گلے میں پڑے پٹے میں ایک چھوٹی سی ڈیوائس انیچ کر کے اسے بنگلے کی طرف بھیج دیا۔ وہ کتا اتنا خوب صورت ہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اسے نقصان پہنچانے کا سوچے۔

بنگلے کے گارڈز نے بھی اسے اندر جانے سے نہیں روکا اور ہماری خوش قسمتی کہ وہاں موجود افراد کو وہ کتا اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے اس کے مالک تک پہنچانے کی کوشش کرنے کے بجائے وہیں روک لیا۔ اب وہ وہاں بنگلے میں موجود ہے اور ہمیں اندر کے حالات کی سُن گُن مل رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آج رات اس بنگلے میں کوئی اہم میٹنگ ہونے والی ہے اور اس میٹنگ میں بڑے اہم لوگ شرکت کریں گے۔" سلمان نے تفصیل کے ساتھ اسے ساری بات بتائی تو وہ بھی جوش میں بھر گیا۔

"یہ تو ہمیں بڑا گولڈن چانس ملا ہے۔ اگر آج رات ہم وہاں بھرپور کارروائی کریں تو بڑی کامیابی

حاصل کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں پھر ساتھ بیٹھ کر کارروائی کے لیے پلاننگ کرتے ہیں۔ اس دوران تم اپنے طور پر جو انتظامات کرنا چاہو، کرتے رہو۔"

"لیکن یار! تم زخمی ہو۔ تمہیں چاہئے کہ آرام کرو۔ ہم لوگ انشاء اللہ سب سنبھال لیں گے۔" سلمان نے اسے روکنا چاہا۔

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ زخم بھر چکے ہیں اور میں کسی بھی کارروائی کے لیے خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے جیسا ضدی آدمی میرے روکنے سے رُکے گا تھوڑی۔" اس کا جواب سن کر سلمان نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا تو وہ سلسلہ منقطع کر کے روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ گھر سے روانہ ہو چکا تھا۔ اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے لیے اس نے ایک کاغذ پر پیغام لکھ کر ٹیبل کلاک کے نیچے رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کبھی ایمرجنسی میں روانہ ہونا پڑتا، ماں کے آرام میں خلل نہیں ڈالتا اور اسی طرح خاموشی سے پیغام لکھ کر روانہ ہو جاتا۔ بعد میں فون پر ان سے رابطہ کر کے انہیں تسلی بھی دے دیتا کہ بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ اُس کے اس طرزِ عمل پر ناراض ہوتی تھیں لیکن اب انہوں نے صبر کر لیا تھا اور سمجھ گئی تھیں کہ بیٹے کی رگوں میں دوڑتا شہید باپ کا لہو اسے وطن کی محبت سے زیادہ کسی محبت میں مبتلا نہیں ہونے دے گا اور جب وطن کو اس کی ضرورت ہو گی، وہ یونہی سب کچھ بھلا کر دوڑا جائے گا۔

⊛----✪----⊛

"پتہ نہیں بے چاری ماہ بانو کہاں ہو گی؟ پولیس تو اس معاملے میں انٹرسٹ نہیں لے رہی اور وہ سارجنٹ مورس اُلٹا یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کسی آشنا کے ساتھ گئی ہے۔ کم از کم میرے لیے تو یہ ایک بالکل ناقابلِ یقین بات ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہی نہیں اور اب تو ماں بھی بننے والی ہے۔ دنیا کی ہر ماں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی اولاد کے بارے میں سوچتی ہے تو ماہ بانو جیسی لڑکی کیسے نہیں سوچے گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے نہیں گئی اور کسی مشکل کا شکار ہے۔"

چچے کی مدد سے اُمید کو دلیہ کھلاتی کشور نے افسردہ سے لہجے میں آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی مصطفیٰ خان کی واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹ آئے تھے اور کسی نہ کسی طرح اپنے روزانہ کے معمولات کا آغاز کر دیا تھا لیکن دل و دماغ پیش آنے والے حادثے کے اثر سے متاثر تھے۔

"اس بات پر تو ہم سب متفق ہیں کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس کے عدمِ تعاون کے بعد ہم کس سے مدد کی توقع رکھیں۔ میں اس معاملے پر کافی سوچ بچار کرتا رہا ہوں اور میرے ذہن میں تو بس یہی ایک ترکیب آئی ہے کہ میں نیویارک کے جس اخبار کے لیے کالم لکھ رہا ہوں، وہاں کی انتظامیہ سے بات کروں۔ جب الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے پولیس پر تنقید کی جائے گی اور ان کی کارکردگی پر سوالات اُٹھائے جائیں گے تو پولیس کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ دوسری امید مجھے مصطفیٰ خان سے ہے۔ وہ ایک باحیثیت آدمی ہے جس کے تعلقات بھی خاصے وسیع ہیں۔ وہ اگر بھرپور طریقے سے کوشش کرے تو کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوشش تو وہ ضرور کریں گے۔ اس سلسلے میں تو ان پر بلقیس بھابی کا بھی خاصا دباؤ رہے گا۔ وہ ماہ بانو کے غائب ہونے پر بہت شرمندہ ہیں اور ہر وقت اس بات پر پچھتاتی رہتی ہیں کہ اس روز وہ اسے کلینک پر چھوڑ کر شاپنگ کے لیے گئی ہی کیوں؟'' اس نے امید کے منہ میں دلیے کا ایک اور چمچہ ڈالا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ان کا پچھتاوا اپنی جگہ لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر اسلم کی ہے۔ اس کی ذہنی حالت بالکل بھی نارمل نہیں ہے اور جوش میں وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' کشور نے اس سے اتفاق کیا۔ ''وہ جنون کی حد تک ماہ بانو سے محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔ میرے دل میں تو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں جنون میں وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ اس طرح کے حالات میں تو بہت زیادہ حساس لوگ ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتے ہیں اور جان لینے اور دینے پر تل جاتے ہیں۔''

''نہیں خیر، وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا کیونکہ اسے اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔'' آفتاب نے اس سے اختلاف کیا اور ہاتھ بڑھا کر پھرتی سے دلیے کا پیالہ اُمید کی پہنچ سے دور کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اُمید ہاتھ مار کر پیالے کو اُلٹ دیتی۔ اب وہ ایسی ہی چھوٹی موٹی شرارتیں کرنے لگی تھی جن کے باعث کشور کے کام میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ کشور ماتھے پر شکن لائے بغیر خندہ پیشانی سے تمام گھریلو امور انجام دیا کرتی تھی پھر بھی اسے اس بات کا احساس رہتا تھا کہ ناز و نعم میں پلی اس کی بیوی کو اس کے ساتھ رہ کر بڑی سخت زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔

''بلی بہت شریر ہوتی جا رہی ہے۔ کھانے پینے میں بھی تنگ کرنے لگی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا کہ زبردستی دلیہ کھلانے کی کوشش میں میڈم کا منہ کتنا گندا ہو گیا ہے۔''

بچی کے گال پر پیار سے ہلکی سی چٹکی نوچتے ہوئے کشور نے آفتاب کو بتایا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی کے درمیان موضوعِ گفتگو خود ہی تبدیل ہو گیا اور وہ اسلم اور ماہ بانو کو چھوڑ کر اپنی بچی کی چھوٹی موٹی باتیں اور شرارتیں آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔

اس دوران کشور نے اسے دلیہ کھلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شیشے کے چھوٹے سے باؤل میں موجود دلیہ ختم ہو گیا تو وہ اسے اٹھا کر منہ دُھلانے لے گئی۔ منہ دُھلانے کے بعد وہ تولیے سے بچی کا منہ خشک کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا تو آفتاب لکھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ عام لکھنے والوں کی طرح نازک مزاج نہیں تھا اور لکھنے کے دوران پیدا ہونے والے کسی خلل کی وجہ سے ناراضی کا اظہار نہیں کرتا تھا، اس کے باوجود کشور کی کوشش ہوتی تھی کہ کام کے دوران وہ ڈسٹرب نہ ہو۔ کیونکہ بہرحال اسے اپنے کام کے لیے ذہنی یکسوئی درکار تھی اور ڈسٹرب ہونے کی صورت میں کام کی رفتار میں فرق پڑتا تھا۔ اس وقت بھی وہ آفتاب کا خیال کرتی ہوئی جلدی سے تولیہ واپس اسٹینڈ پر لگا کر بچی کو گود میں لیے ہوئے فون کی طرف لپکی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''کیسی ہو کشور؟'' اپنی ''ہیلو'' کے جواب میں سنائی دینے والی آواز نے اس کے پورے جسم کو سُن کر دیا اور وہ اس قابل بھی نہیں رہی کہ زبان ہلا کر کیے جانے والے سوال کا جواب دے سکے۔

''کیا بات ہے گڑیا؟ تم نے اپنے بھائی کی آواز پہچانی نہیں یا گھبرا گئی ہو؟'' وہ سو فیصد مراد شاہ تھا اور

اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے کسی تصدیق یا ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اپنے فون پر اس کی آواز سن کر خوف زدہ ہو گئی تھی۔

نیویارک سے آرلینڈو منتقل ہوتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر مراد شاہ کو کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ خوف زدہ تھی۔ اسے نیویارک کے فلیٹ میں بیتی اپنی زندگی کی وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اس کے سگے باپ کے بھیجے کرائے کے قاتلوں نے ان کے فلیٹ میں زہریلی گیس چھوڑ دی تھی۔ اس رات اگر ان کی پڑوسن لارا اُنہیں اس خطرے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مدد نہیں کرتی تو وہ دونوں میاں بیوی، بچی سمیت اگلے دن کا سورج دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔

اس واقعے کے بعد جہاں انہوں نے آرلینڈو منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہیں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے نئے ٹھکانے سے کسی کو آگاہ نہیں کریں گے۔ لیکن ان کی اس احتیاط کے باوجود مراد شاہ نے ان تک رسائی حاصل کر لی تھی جو ایک تشویش ناک بات تھی۔

''کیا بات ہے کشور!..... تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ کیا میری آواز سن کر تمہیں برا لگا ہے؟'' اس کی مسلسل خاموشی پر مراد شاہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

اس بار کشور نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جذبات سے بھرپور تلخ لہجے میں بولی۔

''آپ میری کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں لالہ! میں بہت مشکلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھے اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ سکون سے جینے دیا جائے۔ مجھے نہ تو خاندانی نام و نسب سے کچھ لینا دینا ہے اور نہ ہی باپ کی بے تحاشا جائیداد میں سے اپنا حصہ چاہتی ہوں تو پھر آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہیں؟ بھول جائیں کہ چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں کبھی کسی کشور نامی لڑکی نے جنم لیا تھا۔ مُردہ تصور کر لیں مجھے اور میرے خیال تک کو کسی قبرستان میں دفن کر دیں۔''

''تم جذباتی ہو رہی ہو کشور! اور اپنے جذبات میں یہ تک نہیں سمجھ پا رہیں کہ تمہارا رویہ میرے لیے تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اباجی نے بہت زیادتی کی ہے لیکن یقین کرو کہ میرا اُن کے کسی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم مجھے بنا بتائے نیویارک سے غائب ہو گئیں تو مجھے بہت صدمہ ہوا اور میں ہر طرف تمہیں ڈھونڈتا رہا کہ کسی طرح تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہی یقین دلا سکوں کہ میں بے قصور ہوں۔ کتنی مشکل سے میں نے ایک اخبار کے دفتر سے تم لوگوں کا فون نمبر حاصل کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور ایسا میں نے اس لیے نہیں کیا کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں صرف اس محبت کی وجہ سے تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں جو ایک بھائی کی حیثیت سے میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔ تاجور اور صنوبر یہاں سے دور پاکستان میں ہیں لیکن فون اور نیٹ کے ذریعے میرا مستقل ان سے رابطہ رہتا ہے۔ وہ اپنے دُکھ سُکھ کہتی ہیں۔ میں ان کو اپنے حالات سے آگاہ کرتا ہوں لیکن تم..... تم یہاں رہ کر بھی مجھ سے دُور ہو۔'' مراد شاہ کی آواز میں دکھ تھا۔

''میں مجبور ہوں لالہ! عورت باپ اور بھائی کے رشتوں سے جو تحفظ اور اطمینان محسوس کرتی ہے، میرا دل اس سے خالی ہے اور میں ہر وقت اس خوف سے لرزتی رہتی ہوں کہ کہیں یہ رشتے مجھ سے میری چھوٹی سی جنت نہ چھین لیں۔''

وہ فون پر ہی سسک پڑی۔ اسے اس طرح روتے دیکھ کر اس کی گود میں موجود اُمید نے بے چینی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کی اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے رخسار پر پھسلتے آنسوؤں کو چھونے لگی۔ وہ ننھی سی بچی ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں پہنچی تھی کہ آنسوؤں کی زبان سمجھ سکتی اور انہیں چُننے کی کوشش کرتی لیکن اس کی معصومیت میں کی جانے والی حرکات نے کشور کے دل کو عجیب سی ڈھارس دی تھی اور اسے لگا تھا کہ اس کا درد کم ہونے لگا ہے۔

''تم ابھی میری بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ میں پھر کبھی تم سے رابطہ کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل سے میرے لیے کدورت ایک نہ ایک دن نکل ہی جائے گی۔ بس تم اتنا یاد رکھنا کہ چودھری افتخار عالم شاہ اور مراد شاہ میں بہت فرق ہے۔ ابا جی کے لیے دولت سب سے زیادہ اہم ہے اور میں اسے بہت کم اہمیت دیتا ہوں۔ میرے لیے میرے اپنوں کی محبت اور سلامتی ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ میں اگر ابا جی کے مزاج کا آدمی ہوتا تو پیر آباد میں رہ کر خوشی سے ابا جی کی گدی سنبھال رہا ہوتا۔ لیکن میں ان سب چیزوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں جو ابا جی کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے میں ان سے کوئی گستاخی نہیں کر سکتا اس لیے یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ خود کو ان کے طرزِ زندگی سے دور رکھوں۔'' اس نے اپنی صفائی میں تھوڑی سی وضاحت دی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ''اللہ حافظ'' کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کشور نے بھی بے جان ہاتھوں سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور خود ایک قریبی کاؤچ پر بیٹھ کر اُمید کو برابر میں بٹھانے کے بعد اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

خون کی کشش اس کے دل کو بھائی کی طرف کھینچ رہی تھی تو اپنے حالات کی سختی دور رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟.....کون تھا فون پر جس سے بات کر کے آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے؟'' اسے علم بھی نہیں ہوا کہ کب آفتاب اس کے برابر میں آ بیٹھا ہے۔ اُس نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے دریافت کیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر یکدم ہی اس کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رونے لگی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلاتا ہوا اسے حوصلہ دیتا رہا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد وہ کسی قدر خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکی۔ آفتاب نے اسے پانی پلایا اور ایک بار پھر اس سے اس کے رونے کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں اس نے آزردہ لہجے میں اسے مراد شاہ کی کال کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر دیا جنہیں سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموشی سے سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

''حقیقت یہ ہے کشور! کہ میں نے کبھی مراد بھائی کو غلط نہیں سمجھا لیکن ہمارے حالات ہی ایسے ہیں کہ ہم کسی شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اب بھی اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک طرح سے اپنے قابلِ بھروسہ ہونے کا ثبوت دیا ہے ورنہ وہ چاہتے تو ہم سے رابطہ کرنے کے بجائے ڈائریکٹ کوئی کارروائی کر سکتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو آپ اطمینان رکھیں کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔''

''دل تو میرا بھی نہیں مانتا کہ لالہ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن حالات نے ڈرا دیا ہے۔ زندگی میں چند دن سکون کے ملتے ہیں پھر جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑتا ہے۔ جب ہم کسی کو کچھ نہیں کہتے تو دوسرے بھی ہمیں ہمارے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ ہم سب کے بغیر بس آپ کے اور اپنی بچی کے ساتھ خوش ہوں۔ کوئی آ کر میری اس جنت میں دخل اندازی کیوں کرتا ہے؟'' وہ اب تک پوری طرح نہیں سنبھلی تھی اور بولتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے ساتھ بہت خوش ہیں لیکن خونی رشتوں کی کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جن دنوں نیویارک میں ہماری مراد بھائی سے ملاقات ہوئی تھی، آپ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ اندرونی خوشی نے آپ کو اتنا خوب صورت بنا دیا تھا کہ میری نظریں آپ کے چہرے پر نہیں ٹکتی تھیں۔ اس لیے میرا آپ کو مشورہ ہے کہ اگر مراد بھائی آپ سے رابطہ کرتے ہیں تو آپ ان سے بات کر لیا کریں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ باقی آپ کی اپنی مرضی ہے۔ میں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

اس کے بے حد رسان سے سمجھانے پر کشور کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔

اسی وقت ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس بار آفتاب نے خود فون اٹھایا جبکہ کشور، اُمید کی طرف متوجہ ہو گئی جو نیند آنے پر خود ہی کاؤچ پر سو گئی تھی لیکن ذرا بے آرام سی تھی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھایا اور اندر بیڈ روم میں لے جا کر بستر پر سلا دیا اور اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کر کے باہر نکل آئی۔ آفتاب ابھی تک فون پر مصروف تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات خاصے گمبھیر محسوس ہو رہے تھے۔

''آپ حوصلہ رکھیں بھابی! میں اور کشور شام میں آپ کی طرف چکر لگائیں گے۔'' اس کے منہ سے نکلنے والے اس جملے نے کشور کو یہ تو بتا دیا کہ وہ بلقیس سے بات کر رہا تھا لیکن مزید تفصیلات جاننے کے لیے اسے آفتاب کے فون بند کرنے کا انتظار کرنا پڑا۔

''بلقیس بھابی تھیں۔ اسلم گھر سے غائب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رات کو کسی وقت وہ واپس آیا تھا جس کا اندازہ اُنہیں انیکسی کی لائٹ جلتے دیکھ کر ہو گیا تھا پھر یہ سوچ کر اسے نہیں چھیڑا کہ ابھی آرام کر لے پھر صبح ناشتے پر اس سے ملاقات کر لی جائے گی۔ صبح وہ ناشتے کے لیے اسے بلانے گئیں تو وہ وہاں نہیں تھا۔ مصطفیٰ خان نے اپنے طور پر چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ بہت صبح سویرے اسے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ لوگ سیل فون پر بھی اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔''

''یا اللہ! کہیں اسلم کا دماغ تو نہیں اُلٹ گیا؟.....جنگل میں وہ کیا لینے گیا ہے؟'' آفتاب کی زبانی حالات جان کر کشور نے تشویش سے تبصرہ کیا۔

وہ بے وجہ اس طرف نہیں گیا ہے۔ مسز مصطفیٰ نے اشارے کنائے میں بتایا ہے کہ مصطفیٰ خان کو بھی چند ایسے آثار ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں لے جائے جانے کا امکان ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی ہے کہ اسلم کا اس طرح اُٹھ کر جنگل کی طرف چل پڑنا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی خیریت کی طرف سے سخت تشویش کا شکار تھیں۔'' آفتاب کی باتوں نے اسے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ دونوں بے چارے اچھی بھلی زندگی گزار رہے تھے اور اب تو ان کے ہاں ننھا مہمان بھی آنے والا تھا۔ ایسی حالت میں معلوم نہیں بے چاری ماہ بانو جانے کہاں پھنسی ہوئی ہے اور کس حال میں ہے اور ساتھ ہی اسلم نے بھی خود کو خطرے میں ڈال لیا ہے۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے کہ جانے دونوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اللہ ان دونوں کی حفاظت کرے۔'' اپنی تشویش کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے خلوصِ دل سے دعا بھی کی۔

''آمین۔'' آفتاب نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ''بس اسی طرح دعا کرتی رہیں۔ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ باقی ہم دیکھیں گے کہ عملی طور پر کیا، کیا جا سکتا ہے۔ میں نے بلقیس بھابی سے کہہ دیا ہے کہ شام کو ہم ان کی طرف آئیں گے۔ میں مصطفیٰ خان کے ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کروں گا کہ اسلم کی مدد کے لیے ہم کیا عملی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقدامات اٹھا سکتے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس طرح کی گفتگو قطعی مناسب نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس دوران میں گھر کے ضروری کام نمٹا لیتی ہوں۔ اُمید سو رہی ہے، آپ بھی چاہیں تو اطمینان سے اپنا کام کر لیں۔"

وہ مراد شاہ کا فون آنے کے بعد خود پر طاری ہونے والی کیفیت فراموش کر چکی تھی اور اب ماہ بانو اور اسلم کے لیے فکرمند بس ان کی سلامتی کے لیے دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔

⊛----✪----⊛

سبز گھاس پر اُچھلتا کودتا چھوٹا سا لمبے لمبے نرم و ملائم سفید بالوں والا کتا بہت ہی خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ اتنا مہذب تھا کہ اس نے لان میں موجود پھول پودوں کو ذرا بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کھیلتے کھیلتے کسی پھول دار پودے کے قریب پہنچ بھی جاتا تو ایک ادا سے پھولوں کو سونگھنے کے بعد واپس پلٹ آتا اور اپنی اگلی ٹانگوں سے باری باری اس بڑی سی رنگین بال کو کِک لگانے لگتا جو کسی نے شاید اس کی اداؤں سے متاثر ہو کر ازراہِ محبت اسے عطا کر دی تھی۔

"کتا تو واقعی بڑا پیارا ہے۔ بنگلے والوں نے اسے بھگانے کے بجائے مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا ہے تو یہ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی ان کا تعلق جس خبیث قوم سے ہے، اسے یوں بھی ہماری ہر اچھی چیز کو ہتھیا لینے کی فکر رہتی ہے۔"

دُوربین کی مدد سے بنگلے کے لان کا منظر دیکھتے جاوید علی نے تبصرہ کیا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی یہاں پہنچا تھا۔ اس سے قبل اس نے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اپنی واپسی کی رپورٹ کی تھی اور سلمان کے ساتھ حالات کے مطابق منصوبہ بندی بھی کر ڈالی تھی۔ اب وہ اور سلمان بنگلے سے کافی فاصلے پر موجود ایک بلند عمارت کی پانچویں منزل پر موجود تھے۔

پانچویں منزل کے جس کمرے میں انہوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا وہ ایک تجارتی ادارے کے دفتر کا حصہ تھا۔ اس عمارت میں زیادہ تر دفاتر ہی تھے اور ان میں سے بیشتر شام پانچ سے چھ کے درمیان بند ہو جاتے تھے۔ سلمان کے ساتھ علاقے کا دورہ کرنے کے بعد جاوید علی نے اس دفتر کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دُور دُور سے نگرانی اپنی جگہ لیکن کوئی ایسا انتظام بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس عمارت کا بصری جائزہ لے سکیں۔ چنانچہ اب وہ یہاں تھے۔

دفتر کے دروازے کا تالا کھول کر اس میں داخل ہو جانا ان کے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا اور وہ باری باری آرام سے دُوربین کی مدد سے جائزہ لے لیتے تھے۔ بنگلے کی مرکزی عمارت میں کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں، اُنہیں علم نہیں تھا اور وہ صرف مین گیٹ پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ لان میں جھانک لینے تک محدود تھے یا پھر اس ڈیوائس کے ذریعے کوئی بات کانوں میں پڑ جاتی تھی جو کتے کے گلے میں پڑے پٹے کے ساتھ منسلک تھی۔

"اُس کی ناز برداری کر اور اپنی ڈیوٹی پر جا۔ تجھے معلوم نہیں ہے کیا کہ آج کتنی خاص میٹنگ ہے۔ سکیورٹی میں ذرا بھی کمی نہیں رہنی چاہیے ورنہ کسی کی بھی خیر نہیں ہو گی۔" ٹیلی اسکوپ نے انہیں لان میں موجود دو افراد کی شکلیں دکھائیں اور کتے کے پٹے کے ساتھ منسلک ڈیوائس نے یہ ڈائیلاگ سنا تو وہ گویا اس منظر کا حصہ بن گئے۔

"تجھے پتہ تو ہے یار! کہ مجھے کتے کتنے پسند ہیں۔ ہمارے ساتھ سکیورٹی میں مدد دینے والا ٹیری پچھلے مہینے مرا تو میں کتنا اُداس ہو گیا تھا۔ آج اس کتے کو دیکھ کر بڑے دنوں بعد میرا من خوش ہوا ہے تو تجھ کو پریشانی ہو رہی ہے۔"

ان دو میں سے ایک جو پہلے سے ہی لان میں موجود تھا اور کتے کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اپنے ساتھی کے اعتراض پر منہ بنا کر بولا اور کتے کو اٹھا کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"من تو تیرا استاد خوش کرے گا۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میٹنگ روم کی سکیورٹی کے بارے میں انوپم نے ابھی تک رپورٹ کیوں نہیں دی ہے؟"

"ارے باپ رے۔ میں تو سچ مچ بھول گیا تھا۔" اپنے ساتھی کے تلخی سے کہنے پر انوپم کے نام سے پکارے جانے والا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا اور کتے کو گود میں لیے ہوئے تیزی سے عمارت کی طرف مڑ گیا جبکہ اس کا ساتھی بھی وہاں سے چل پڑا۔ اب ان کے سامنے بس خالی لان تھا جبکہ آواز کوئی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے کان کے ساتھ لگا آلہ ایک بار پھر جاگ اُٹھا اور اس پر آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"میٹنگ روم کی چیکنگ کر لی انوپم؟" کسی کا سخت لہجے میں کیا گیا استفسار سنائی دیا۔

"یس سر! سب اوکے ہے۔" انوپم نے رپورٹ دی۔

"ایک بار پھر چیک کر لو۔ آج کی میٹنگ میں میڈم بھی ہوں گی اور ان کی سخت انسٹرکشن ہے کہ کہیں کوئی غفلت نہیں ہونی چاہیے۔" اسی سخت لہجے والے نے ہدایت دی۔

"اوکے سر! میں ری چیک کر لیتا ہوں۔" انوپم نے فوراً ہامی بھر لی۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ انوپم وہاں سے ہٹ گیا ہو، انہیں اُس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"چلو یار ٹیری جونیئر!..... ایک بار پھر چیکنگ کر لیتے ہیں۔ آرڈر تو آرڈر ہوتا ہے نا۔" کچھ دیر انہیں معمولی آہٹیں سنائی دیتی رہیں پھر دوبارہ انوپم کی بڑبڑاہٹ شروع ہو گئی۔

"اے سی اے ون، کھڑکیوں کی جالیاں بالکل فٹ، یہ بٹن آن کرو تو کھڑکی کے دروازے سب میں کرنٹ دوڑنے لگے گا۔ ادھر سے کوئی آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ کوئی زبردستی اندر گھس سکتا ہے۔ گھسے گا تو خود مرے گا۔ یعنی میٹنگ بالکل سیف طریقے سے ہو سکتی ہے اس لیے مجھے ٹینشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پتہ نہیں وہ خود کلامی کر رہا تھا یا کتے سے مخاطب تھا لیکن انہیں بڑی اہم معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

"او یار ٹیری جونیئر! تم بھی عجیب ہی کتے ہو۔ میں اتنی دیر سے تم سے باتیں کر رہا ہوں اور تم یہاں ٹیبل کے نیچے گھس کر سو گئے ہو۔ چلو سوتے رہو۔ میں بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔" انوپم کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سچ مچ کتوں سے بہت پیار کرتا تھا۔

"سب کو بتا دو کہ بہت محتاط رہنا ہے اور ابھی کسی قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنی ہے۔ دُور رہ کر بس یہ نظر میں رکھیں کہ میٹنگ میں شرکت کے لیے کتنے افراد آتے ہیں اور ان کی شناخت کیا ہے۔ ہمیں جو بھی کارروائی کرنی ہو گی، ان لوگوں کی واپسی کے موقع پر کریں گے۔"

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی خفیف سی آوازوں کے بعد جب کوئی دوسری آواز نہیں اُبھری تو یہ واضح ہو گیا کہ واقعی انوپم کتے کو میٹنگ روم میں سوتا چھوڑ کر خود باہر نکل گیا ہے۔ جاوید علی نے دو تین منٹ کے وقفے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد سلمان کو یہ ہدایت دی اور خود دُور بین سے تاک جھانک میں مصروف رہا۔ لان بدستور خالی تھا لیکن مختلف پوائنٹس پر پہرے دار نظر آ رہے تھے۔

''اگر یہ کتا میٹنگ کے دوران اندر ہی موجود رہے تو کتنا اچھا ہوگا۔ ہمیں وہاں ہونے والی ساری گفتگو سننے کا موقع مل جائے گا۔''

ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایات دینے کے بعد سلمان نے بڑی اُمید سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''ہوں..... لیکن ایسا ہونا ذرا مشکل ہی ہے۔ میٹنگ کے وقت کتا اندر رہ گیا تو انوپم کی شامت آ جائے گی۔ جو لوگ اپنی سکیورٹی کے معاملے میں اتنے حساس ہوں کہ محفوظ ترین کمرے میں میٹنگ کا انعقاد کریں، وہ کمرے میں کتے کی موجودگی کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟''

جاوید علی نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا تو سلمان کو اس سے اتفاق کرنا پڑا۔ اگلے ایک گھنٹے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی، بس سست روی سے گزرتے وقت کے ساتھ رات نے اپنا کچھ اور سفر طے کر لیا۔ رات کا وقت ہونے کے باوجود انہیں بنگلے پر نظر رکھنے میں دشواری نہیں پیش آ رہی تھی۔ طاقتور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی نے سارا منظر واضح کر رکھا تھا۔ پھر اس بنگلے کے علاوہ اس کے اردگرد کے دوسرے بنگلوں میں سے بھی تھوڑی بہت روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود ان کے پاس نائٹ ویژن گاگلز موجود تھے جو کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات میں ان کے کام آ سکتے تھے۔

گھنٹے سے دو تین منٹ ہی اوپر ہوئے تھے کہ انہوں نے انوپم اور اس کے ایک ساتھی کو مرکزی عمارت سے باہر نکلتے دیکھا۔ انوپم کچھ پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ باہر آنے والا شخص تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

مشکل سے اسی نوے سیکنڈ کی گفتگو کے بعد انوپم نے وہاں سے حرکت کی اور پھر انہوں نے ایک بائیک پر سوار اسے بنگلے سے روانہ ہوتے دیکھا۔ سلمان نے فوراً ہی اپنے ایک آدمی کو اس کے تعاقب کے احکامات دے ڈالے۔ اس واقعے کے بعد آدھا گھنٹہ مزید گزر گیا۔ انوپم کے تعاقب میں جانے والے سلمان کے ساتھی نے اس دوران انہیں رپورٹ پیش کر دی تھی۔

''انوپم یہاں سے سیدھا ہاسپٹل گیا ہے۔ وہاں اس کی ماتا جی ایڈمٹ ہیں اور ان کی حالت خاصی خراب بتائی جا رہی ہے۔ ایک طرح سے ڈاکٹر نے انہیں جواب دے دیا ہے۔'' ساتھی کی رپورٹ نے انہیں انوپم کی اچانک روانگی کی وجہ سے آگاہ کر دیا۔

''پتہ نہیں کتا اب بھی میٹنگ روم میں ہے یا نہیں؟'' بوریت کے شکار سلمان نے سوال اُٹھایا۔

''میرے خیال میں تو وہ اب بھی اندر ہی موجود ہے۔ دوسری صورت میں ہمیں کوئی آواز ضرور سنائی دیتی۔'' جاوید علی نے جواباً اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''سارا دن کھیل کُود کرتا رہا ہے شاید اس لیے لمبی نیند سو گیا ہے۔ ویسے بھی عابد کا کہنا ہے کہ اس کا کتا رات بھر لمبی تان کر سوتا ہے اور مشکل سے ایک دو بار جاگتا ہے۔ اگر آج بھی یہ طویل نیند سوتا رہا تو ہمارا بھلا ہو جائے گا۔ کیونکہ میرے خیال میں انوپم جتنی ایمرجنسی میں یہاں سے گیا ہے، اسے بالکل بھی یاد نہیں رہا وہ گا کہ کسی کے ذمے کتے کو میٹنگ روم سے باہر نکالنے کا کام لگا دے۔''

سلمان کے لہجے میں ایک اُمید سی تھی۔ اسی وقت انہوں نے ایک گاڑی بنگلے کی طرف آتے دیکھی۔ یہ

بالکل نئے ماڈل کی کلٹس تھی۔

چوکیدار نے گاڑی دیکھتے ہی تیزی سے بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ بنگلے میں موجود افراد میں سے ایک نے اس کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔

کتے کے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں سوئے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ لوگ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے سے محروم رہے۔

کلٹس کے بعد چند منٹوں کے وقفے سے تین گاڑیاں مزید بنگلے میں پہنچیں اور آسانی سے اس کے وسیع پورچ میں سما گئیں۔ وہ دونوں جس زاویے سے بیٹھے نگرانی کر رہے تھے، اس سے یہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ گاڑیاں چلانے والے کون ہیں۔ وہ بس اسی وقت ان کی صورت دیکھتے تھے جب گاڑی سے اُترنے کے بعد بنگلے میں ان کا استقبال کیا جاتا تھا۔

آخری گاڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں پہنچی۔ جاوید علی کو اس کا چہرہ کچھ شناسا لگا لیکن وہ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا اور وہ چند سیکنڈ ہی باہر رکنے کے بعد اندر چلی گئی۔

اس کے اندر جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے وہ بالکل تاریکی میں چلے گئے کیونکہ اب نہ تو کچھ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی سنائی لیکن پھر کان سے لگے آلے میں پہلی آواز سنائی دی تو وہ دونوں خوش ہو گئے۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کتا ہنوز میٹنگ روم میں سویا پڑا ہے اور وہ وہاں ہونے والی گفتگو سن سکتے ہیں۔ وہ دم سادھے میٹنگ کے باقاعدہ آغاز کا انتظار کرنے لگے جس کے لیے انہیں زیادہ زحمت نہیں اُٹھانی پڑی اور رسمی ہیلو ہائے کے بعد کسی نے گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ یہ میٹنگ کیوں ارینج کی گئی ہے۔ ہم برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں اور ان برسوں میں کئی بار ہمیں اُتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن کچھ عرصے سے تو حالات ہمارے لیے بہت ہی خراب ہو گئے ہیں اور ہمیں کئی بڑے نقصان اٹھانا پڑے ہیں۔ بلتستان میں ہمارا ٹریننگ کیمپ تباہ ہوا، نواب نوازش علی کی کوٹھی کی تباہی سے خواجہ سراؤں کی مدد سے بنائے گئے سیٹ اپ کو خاصا نقصان پہنچا، مساج سینٹروں میں بھی کافی گڑبڑ ہو چکی ہے اور حد یہ ہے کہ ہمارے لیے کام کرنے والی ایک لڑکی عالیہ کی وجہ سے ہمیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ خبر نہیں کیسے وہ دشمنوں کے کیمپ سے جا ملی ہے اور اس کے دھوکے کی وجہ سے ہمیں اپنے فائٹنگ وِنگ کے اہم ورکرز سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری جانی پہچانی حکومتی ایجنسیوں کے علاوہ بھی کوئی خفیہ ایجنسی ایسی ہے جو ہمارے خلاف کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارے سامنے جو اہم ترین نام ہے، وہ کرنل توحید کا ہے۔ ہم اپنے سورسز سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ آج کل کرنل توحید پنڈی میں ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ کرنل کو وہاں سے اغوا کر لیا جائے اور اسی سے ساری انفارمیشن حاصل کی جائے۔ اغوا کے لیے منصوبہ مس سنتھیا نے تیار کر لیا ہے۔ یہ اپنا منصوبہ آپ لوگوں کے سامنے رکھیں گی تاکہ اگر اس میں کوئی خامی ہو تو دُور کر لی جائے..... پلیز سنتھیا! اپنا منصوبہ سب کے سامنے بیان کرو۔''

گمبھیر مردانہ آواز بلند ہوئی تو انہیں ایک زنانہ آواز سنائی دینے لگی۔ بولنے والی کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سخت طبیعت کی مالک ہے۔ اس کے لہجے کی ہی طرح اس کا منصوبہ بھی سخت خطرناک تھا۔ جاوید علی کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ شناسا محسوس ہونے والی عورت، ڈاکٹر ماریہ کی ماں سنتھیا جوزف ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ عورت بہت سی وجوہات کی بنا پر اُنہیں پہلے ہی مطلوب تھی چنانچہ اس کی یہاں موجودگی کا جان کر وہ خاصا پُر جوش ہو گیا تھا۔ ان کے ریکارڈ کے مطابق یہ عورت ڈبل ایجنٹ تھی اور ''را'' کے ساتھ ساتھ ''موساد'' کے لیے بھی کام کرتی تھی بلکہ اس کی حقیقی وفاداری تو ''موساد'' کے ساتھ ہی تھی لیکن وہ ''را'' کے ساتھ بھی بخوبی اس لیے چل رہی تھی کہ مقصد تو دونوں کا ایک ہی تھا۔ پاکستان کو نقصان پہنچانا اور یہاں کے حالات کو اس نہج پر لے جانا جہاں پہنچ کر پاکستان کا نام ونشان مٹانا آسان ہو جائے۔

''ہم کرنل توحید کی روٹین کو مسلسل واچ کر رہے ہیں اور میں نے سوچ لیا ہے کہ کرنل کو جس روز کڈنیپ کیا جائے گا، اس روز آدھے گھنٹے پہلے مینارِ پاکستان کو بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں بھی سارا ہوم ورک کر لیا گیا ہے۔ البتہ منصوبے کو ہر طرح کی خامی سے پاک رکھنے کے لیے اسے بھی میں آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں۔ آپ میں سے جو بھی چاہے، اپنی رائے دے سکتا ہے۔''

وہ لوگ اپنے ناپاک منصوبے کو آپس میں ڈسکس کرنے لگے۔ ان کی یہ باتیں سن کر جاوید علی اور سلمان دونوں ہی کے چہرے طیش سے سرخ ہو رہے تھے۔

دشمن اُن کے وطن کو بے شمار نقصانات پہنچانے کے بعد اب ان سے ایک ایسی یادگار بھی چھین لینا چاہتا تھا جس کے بارے میں پاک سرزمین کے ہر بچے کو نہایت فخر سے یہ بتایا جاتا تھا کہ یہ مینارِ عین اس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے جہاں 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی۔ دشمن نے نہایت خباثت سے بڑی گہری چال سوچی تھی۔ ایک طرف وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانا چاہتے تھے تو دوسری طرف قوم کو ایک ایسے صدمے سے دوچار کرنے والے تھے جو انہیں سکتے میں مبتلا کر دے۔ ان حالات میں ان کے لیے کرنل توحید کے اغوا کی مذموم سازش پر عمل کرنا آسان ہو جاتا۔

''میری ایک تجویز ہے میڈم! ہمیں چاہئے کہ مینارِ پاکستان کے علاوہ بھی دوسری جگہوں پر بلاسٹ کریں۔ ضروری نہیں کہ وہ جگہیں مینارِ پاکستان کی طرح ہی اہم ہوں لیکن ہونی پبلک پلیس ہی چاہئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہلاکتیں ہوں اور پورا ملک لرز اُٹھے۔''

ایک قدرے باریک آواز والے نے نہایت سفاکی سے تجویز پیش کی جو سنتھیا کو بہت پسند آئی اور اس نے اس پر عمل کی منظوری دیتے ہوئے تجویز دینے والے کو فری ہینڈ دے دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں جیسے چاہے یہ کام انجام تک پہنچا دے۔

سازشیوں کے اس ٹولے کی میٹنگ ایسی ہی چند باتوں کے بعد اختتامی مرحلے میں داخل ہو گئی۔ جاوید علی اور سلمان نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ماتحتوں کو ہدایت دینے لگے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ میٹنگ کے لیے آنے والے چاروں اہم افراد کو بنگلے سے دور جا کر گھیرنا چاہتے تھے کیونکہ بنگلے میں جو حفاظتی انتظامات تھے، وہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ وہ کافی بڑی فورس کے ساتھ ہی بنگلے پر چڑھائی کر کے کامیابی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس میں بھی یہی خدشہ تھا کہ مقابلے کے دوران سرکردہ افراد میں سے کسی کی جان نہ چلی جائے۔ ان کے لیے ان افراد کی ہلاکت سے زیادہ انہیں زندہ گرفتار کرنا سودمند ہوتا۔ باقی چھوٹی مچھلیوں سے تو بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔

''میں سنتھیا کے پیچھے جاؤں گا۔ تم کلفٹن والے سے نمٹ لینا۔ اس کے علاوہ راشد اور خیری سے کہہ دو کہ وہ دو دو کے گروپ میں باقی دونوں سے نمٹ لیں۔'' وہ جس عمارت کے ایک دفتر سے بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے، اب اس کی پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔ پارکنگ میں پہنچ کر اس نے سلمان سے کہا اور لپک کر اپنی

بائیک پر سوار ہو گیا۔

یوں تو وہ زیادہ تر گاڑی کا استعمال کرتا تھا لیکن یہاں آتے ہوئے گاڑی ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ کر بطورِ خاص بائیک پر آیا تھا۔ دو پہیوں والی یہ سواری یوں تو تھوڑی خطرناک تھی لیکن اپنی رفتار اور ٹریفک کے رش میں آسانی سے جگہ بنا کر نکل جانے کے باعث خاصی باسہولت بھی لگتی تھی۔

''بنگلے سے ان لوگوں کی روانگی شروع ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے کلفٹن والا نکلا ہے اور اس کا رخ علاقے سے باہر کی طرف ہی ہے۔''

وہ دونوں اپنی اپنی سواریوں کو اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے باہر نکل رہے تھے جب نگرانی کرنے والوں میں سے کسی نے اطلاع دی۔ ان دونوں ہی نے اپنے اپنے آپریٹس پر یہ اطلاع سنی۔

''جانے دو، کسی کو بالکل بھی چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید علی نے سختی سے حکم دیا جس پر پوری طرح عمل کیا گیا اور ایک ایک کر کے انہیں چاروں ہی کی روانگی کی اطلاع مل گئی۔

ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ بنگلے کے گیٹ سے ہی تعاقب شروع کر دیں کیونکہ اس پوش علاقے سے مین روڈ تک پہنچنے کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ جاوید علی نے بھی سنتھیا کی گرے سوک کو جلد ہی پا لیا لیکن اس سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر مخصوص فاصلے سے ٹریفک کے اژدھام میں اسی طرح اپنی بائیک چلاتا رہا جیسے بہت سے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی ایک غیر متعلقہ شخص ہو۔ راستے میں ہی اس نے ہیڈ کوارٹر رابطہ کر کے اب تک کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ مزید نفری کی درخواست کر دی کیونکہ بنگلے کو کلیئر کرنے کے لیے ان کو زیادہ افراد کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسے اس سلسلے میں تسلی دے دی گئی۔

''میرا شکار یہاں سے دور نہیں گیا ہے اور علاقے کے ہی ایک دوسرے بنگلے میں پہنچ گیا ہے۔'' سنتھیا کا تعاقب کرتے ہوئے اسے اپنے آپریٹس پر خیری کی آواز سنائی دی۔ یہاں آتے ہوئے وہ اس بات کا بندوبست کر کے آئے تھے کہ ایک دوسرے سے مستقل رابطے میں رہیں۔

''ٹھیک ہے، فی الحال اسے مت چھیڑو اور باہر ہی رہ کر نگرانی کرو۔ اس کا بعد میں بندوبست کر لیں گے۔'' اس نے خیری کو ہدایت دی اور بہت سی دوسری گاڑیوں کے ساتھ اس روڈ پر مڑ گیا جس کا سنتھیا نے رخ کیا تھا۔

روڈ آگے جا کر کئی شاخوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ سنتھیا نے اپنی گاڑی دائیں بائیں جانے والے راستوں میں سے کسی طرف موڑنے کے بجائے بالکل سیدھ میں موجود پُل پر چڑھا دی۔ ٹریفک کے حصوں میں منقسم ہو جانے کے باعث پُل پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ جاوید علی کو بھی ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش تھی۔ اس نے یک دم ہی اپنی بائیک کی رفتار تیز کی اور سنتھیا کی سوک کے قریب سے اس طرح تیزی سے لے گیا جیسے عموماً مردوں کی طرح خاتون ڈرائیور کو ڈرانا مقصود ہو۔

آگے جا کر اس نے ایک تماشا کیا اور بگڑے ہوئے، تھرل کے متلاشی لڑکوں کی طرح دونوں ہینڈلز پر سے ہاتھ اٹھا کر گاڑی چلانے لگا۔

اُس کی ان حرکتوں کے باعث ممکن ہی نہیں تھا کہ سنتھیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔ وہ زور زور سے اپنی گاڑی کا ہارن بجانے لگی کہ کسی طرح اس ایڈونچر کے چکر میں پڑے لڑکے سے اپنے لیے راستہ صاف کروا سکے لیکن وہ کسی طرح اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا تھا۔

اُس کی یہ بے نیازی سنتھیا کے لیے اشتعال کا سبب بنی اور اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا کر سائیڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نکلنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں شاید اس کی گاڑی کا کوئی حصہ بائیک کو ذرا سا چھو گیا۔ دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ بائیک کا توازن بگڑا اور اس کا سوار ہوا میں اُڑتا ہوا گرے سوک کے بونٹ پر جا گرا۔

سنتھیا نے گھبرا کر اپنی گاڑی کو بریکس لگائے۔ جاوید علی بچنے کی کوشش کرتا ہوا جھٹکے سے نیچے گرا۔ لیکن وہ اس زاویے سے گرا تھا کہ گاڑی کے سامنے نہیں آیا تھا ورنہ گاڑی رُکتے رُکتے بھی اسے کچل ڈالتی۔

گاڑی رُکنے کے بعد غصے میں بھری سنتھیا باہر نکلی۔ رواں ٹریفک میں سے بھی ایک دو افراد نے اپنی گاڑیاں روک لی تھیں اور نیچے گرے ہوئے جاوید علی کا جائزہ لے رہے تھے۔

''اس ایکسیڈنٹ میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ غلطی اس کی ہی تھی۔ یہ چلتی سڑک پر کرتب دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

غصے اور پریشانی میں مبتلا سنتھیا نے چیخ کر اپنی صفائی پیش کی جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ اس جوان کے لیے بھی تشویش میں مبتلا تھے جو زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میڈم! آپ کی غلطی نہیں ہے۔ لیکن اسے ہسپتال تو لے جانا ہی پڑے گا۔'' ایک شخص نے انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے اہم نکتہ پیش کیا۔

''میں اسے ہسپتال لے کر جاؤں گی تو پولیس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔'' وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ویسے بھی ایک ایسی عورت جس کے اشارے پر سینکڑوں بے گناہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے، کسی انسان کی زندگی بچانے میں کیا دلچسپی رکھ سکتی تھی۔ وہ تو بس اضطراری عمل کے طور پر وہاں رک گئی تھی اور اب لوگوں کی وجہ سے پھنسی ہوئی تھی۔

''آپ مجھے ہسپتال لے چلیں۔ میں آپ کے خلاف کوئی بیان نہیں دوں گا۔'' زخمی جاوید علی نے کراہ کر اس سے استدعا کی تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں رہا۔

''اچھی بلا گلے پڑ گئی ہے۔'' لوگوں کے جاوید علی کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے تک وہ بڑبڑاتی رہی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی گاڑی کے ذریعے کچل کر وہاں سے روانہ ہو جائے۔

''آپ اتنی ناراض نہ ہوں۔ ہسپتال کا بل میں خود ادا کروں گا۔'' جاوید نے کچھ چڑانے والے انداز میں اسے تسلی دی۔

ایک زخمی شخص کا یہ انداز دیکھ کر وہ کچھ چونک گئی۔ لیکن اب تو گاڑی اسٹارٹ کر کے چلا ہی چکی تھی چنانچہ لب بھینچے خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔

''میری بائیک پُل پر پڑی ہوئی ہے۔ حالت خاصی خراب ہے، اسے وہاں سے اُٹھوا لینا۔'' اپنے ماتھے سے بہتے وائے خون پر رومال رکھتے ہوئے اس نے کسی کو یہ ہدایت کی تو ڈرائیونگ کرتی سنتھیا چونک گئی۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ لب ولہجہ کسی عام شخص کا نہیں ہو سکتا۔

''کون ہو تم؟'' سوال کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تیزی سے ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔

''اونہہ..... ایسی کوئی غلطی مت کرنا مسز سنتھیا جوزف! ورنہ تمہارا یہ طرح طرح کی ڈائیز سے رنگے بالوں والا سر سلامت نہیں رہے گا۔'' جاوید علی نے اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا پسٹل اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔

''تو تم جان بوجھ کر میری گاڑی کے آگے آئے تھے..... وہ بھی اس وقت، جب ہم ایک فلائی اوور پر سفر کر رہے تھے؟'' وہ سخت متعجب تھی البتہ لہجے میں خوف کا کوئی عنصر نہیں تھا۔

''ہاں بس اچانک ہی اس پاگل پن کے لیے دل مچلا اور دیکھو کتنی سہولت ہو گئی۔ میں اپنی کھٹارا بائیک سے تمہاری اس آرام دہ گاڑی میں شفٹ ہو گیا۔'' وہاں بھی قابلِ دید اطمینان تھا۔ ورنہ سچ یہ تھا کہ اپنی اس عجیب وغریب حرکت کے نتیجے میں اسے ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود خاصی چوٹیں لگی تھیں۔

''مجھے کچھ شک سا تو ہوا تھا لیکن پھر یہی سوچا کہ کوئی شخص ایسی حماقت کیوں کرے گا۔ بہرحال اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور خود تمہارا تعلق کس ادارے سے ہے؟'' وہ زبردست خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ابھی تک اس کے انداز میں کوئی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پہلے جتنی اسپیڈ کے ساتھ ہی پورے سکون سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

''فی الحال تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں اپنے دونوں سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔''

وہ سنتھیا سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ پہلی بار ڈیش بورڈ کے خانے سے پسٹل نکالنے کی کوشش کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

''اور بدلے میں تم مجھ سے اپنے بہت سے سوالوں کے جواب چاہو گے۔'' اس کا لہجہ مستفسرانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ابھی تک جاوید علی نے اسے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی چنانچہ وہ اپنی مرضی سے سیدھی گاڑی دوڑائے جا رہی تھی۔

''یہاں سے لیفٹ لے لو۔'' ایک چوراہے پر پہلی بار جاوید علی نے اسے کوئی ہدایت دی لیکن اس نے اَن سنی کر دی۔

''تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا؟'' جاوید علی اس کی کھوپڑی پر پسٹل کا دباؤ بڑھاتے ہوئے غرّایا۔

''میں صرف اپنی مرضی کرنے کی عادی ہوں۔'' اس نے ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا تو جاوید علی کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے بڑی مشکل شے کو ہینڈل کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔

''سر پر رکھی پسٹل کی نال کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی کرنے کی کوشش کرے تو اس کے سوا کچھ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ایسا شخص خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' وہ ذرا جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

''وہ تو کوئی تمہاری حرکت کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن دیکھو تم صحیح سلامت بیٹھے ہو۔'' وہ اس طرح مسکرا کر بولی جیسے اس کا مقابل کوئی ننھا بچہ ہو اور وہ اس کی کیفیت سے پوری طرح لطف اٹھا رہی ہو۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اب جو موڑ آئے گا، وہاں سے یوٹرن لے لینا۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔''

سنتھیا کی مسکراہٹ نے اسے مزید تپا دیا اور وہ پہلے سے زیادہ جھنجلا کر اسے دھمکی دینے لگا۔

''اچھا سلوک تو تم میرے ساتھ کسی صورت نہیں کر سکتے بلکہ اگر میں تمہاری بات مان کر شرافت سے تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی تو میرے ساتھ یقینی طور پر بہت برا سلوک ہو گا اور عمر کے اس حصے میں، میں زیادہ تشدد برداشت کرنے کی اہل نہیں ہو سکتی اس لیے بہتر ہے کہ میں وہی کروں جو میں خود مناسب سمجھتی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا اور گاڑی ایک اور فلائی اوور پر چڑھا دی۔

جاوید علی کو احساس ہوا کہ وہ اس کے سامنے بے بس ہے۔ جو شخص مرنے سے نہ ڈرتا ہو، اسے پھر کس چیز سے دھمکایا جا سکتا ہے۔

''او کے بوائے! پھر ہم دونوں ہی ایک ساتھ اوپر چلتے ہیں۔ اپنے اس آخری سفر کو تم عالمِ بالا میں بھی یاد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھو گے۔"

بھرپور اطمینان کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے یکدم ہی اسٹیئرنگ موڑ دیا۔ گاڑی زوردار دھماکے سے فلائی اوور پر لگے حفاظتی جنگلے سے ٹکرائی اور اسے توڑتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔

یہ جاوید علی کی زندگی کا خوفناک لیکن شاید سب سے خوش قسمت لمحہ تھا۔ گاڑی نیچے جا کر گرنے کے بجائے جنگلے میں ہی اٹک گئی۔

سنتھیا نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھ رکھی تھی چنانچہ ونڈ سکرین کو توڑتی ہوئی نیچے رواں ٹریفک کے درمیان جا گری۔ جاوید علی نے اگر ڈرائیونگ سیٹ کی پشت گاہ کو نہ تھام لیا ہوتا تو شاید اس کا بھی یہی انجام ہوتا۔ اب بھی وہ خاصے خطرے میں تھا۔ جنگلے سے جھولتی گاڑی کسی بھی لمحے نیچے گر سکتی تھی اس لیے سنتھیا کی فکر چھوڑ کر وہ سب سے پہلے اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے گاڑی کے دروازوں پر قسمت آزمائی کی لیکن دروازے لاک ہو چکے تھے۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ شیشے توڑ دے لیکن اس کے لیے بھی اسے اپنے ہاتھوں سے ہی کام لینا پڑتا۔ پسٹل تو پہلے ہی جھٹکا لگنے سے اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی اور دائیں ہاتھ کا زوردار گھونسہ مار کر ایک جانب کا شیشہ توڑ دیا۔

اسی وقت اسے اوپر سے جھانکتے دو چہرے نظر آئے۔ یہ یقیناً وہ چشم دید گواہ تھے جنہوں نے حادثہ ہوتے دیکھا تھا اور اب بدقسمت گاڑی کے سواروں کا حال جاننے کے لیے نیچے جھانک رہے تھے۔ رات ہو رہی تھی اس کے باوجود ابھی اتنا وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک بڑے شہر میں ٹریفک کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے۔ پُل کے اوپر اور نیچے سے مسلسل گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

"میرا ہاتھ پکڑو بھائی صاحب!" جاوید علی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر ان میں سے ایک نے اسے پکارا۔ جاوید علی نے فوراً اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے اوپر اٹھنے میں مدد دینے لگا جبکہ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ خود وزن کی وجہ سے اُلٹ کر نیچے نہ جا گرے۔ چند لمحوں کی کشمکش کے بعد جاوید علی موت کے منہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"شاید آپ کا ساتھی....." اسے گاڑی سے نکلنے میں مدد دینے والے شخص نے نیچے رک جانے والی ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔ یقینی طور پر وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔

اس کے اشارے پر جاوید علی نے پُل سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ اتنی بلندی سے گر کر کسی کا بچنا ویسے بھی محال تھا اور وہ تو لازماً کئی گاڑیوں کے نیچے بھی کچلی گئی ہو گی جبھی گوشت کے لوتھڑے کی صورت اس زمین پر پڑی تھی جسے اس نے ساری زندگی برباد ہی کرنے کی کوشش کی تھی پھر بھلا اسے اس زمین پر امان کیوں ملتی؟

⊛----✪----⊛

پُر پیچ و سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
ایسے مزید واقعات کے لیے جلد ششم کا مطالعہ کیجیے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk